شخصیت 16
نوائے برگ
ثریا اعجاز
مفلوک الحالی کا دکھ سہا تو اس کی تحریر سحر انگیز ہوئی

عکس زندگی 44
سرور ادب
عائشہ انور
ادب کی پذیرائی دیکھ کر ہجرت پر آمادہ ہوا

خراج تحسین 51
نغمات اقبال
انصار احمد
علامہ اقبال نے قیام پاکستان سے قبل ملی نغمے لکھے تھے

شکاریات 55
جنگل میں ہلچل
سید احتشام
شکاریات پر ایک مزے دار تحریر

فلم نگری 72
معمار
انور فرہاد
پاکستانی فلمی دنیا کے سنہرے دور کا بیان

تحقیق 103
ملکہ
فرزانہ نکہت
جب وہ پیڑ پر چڑھی تو شہزادی لیکن اتری تو ملکہ تھی

واقعات 107
یاجوج ماجوج
شکیل صدیقی
پیر علی محمد راشدی کا بیان کردہ دلچسپ واقعہ

سفر کہانی 111
سفر پہلا پہلا
ندیم اقبال
الفاظ کی جادو بیانی کا شہکار ایک الگ انداز کی سفر کہانی

معلومات 147
مطبع
ظفر عابدی
مطبع نے کس طرح ترقی حاصل کی

158 معاشرت
روسیاہ
عاطر شاہین
ایک شوریدہ سر نوجوان
کی جنوں خیزی

186 پہلی سچ بیانی
درد آشنا
سبین
ساس کے فیصلے نے
اس کی زندگی بدل دی

195 دوسری سچ بیانی
سفرِ آخرت
عمران قریشی
زندگی کے فیصلے میں
اس نے کیا کھویا کیا پایا

201 تیسری سچ بیانی
رانگ نمبر
عنایشہ چوھدری
رانگ نمبر نے
اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا

220 چوتھی سچ بیانی
خبط الحواس
اسیہ مظہر
ایسی ہی ساس بہو
کا گھر توڑ دیتی ہے

227 پانچویں سچ بیانی
بھوک، روٹی، دوستی
جرار احمد جعفری
دوست وہ جو دوست
کی زندگی بدل دے

233 چھٹی سچ بیانی
مظلوم
امجد اقبال خان
آمنہ کی زندگی مجبوریوں
سے بھری تھی

244 ساتویں سچ بیانی
لاٹری
مراد خان
اس کی یہ شادی
نہیں لاٹری تھی

255 آٹھویں سچ بیانی
انتخاب
ساگر تلوکر
والد کے تجربے سے
فائدہ نہ اٹھانے کا انجام

259 نویں سچ بیانی
ہم سفری
شہناز احمد
اس نے شوہر کے ساتھ
زندگی سے منہ موڑ لیا

265 دسویں سچ بیانی
کھیل قسمت کا
کاوش صدیقی
باس کی سابقہ بیوی
نے اس کی زندگی بدل دی

نوائے برگ

زویا اعجاز

اس نے زندگی کو بڑے قریب سے پرکھا تھا، حالات کے شکنجے کیسے کستے ہیں، کس طرح مجبور کردیتے ہیں اس کا ادراک اسے تھا۔ غربت کی چکی میں پس کر وہ کندن بنا تھا۔ اسی احساس نے اسے قلم کا ساحر بنایا۔ اس کی تحریریں جاویداں کہلائیں کیونکہ عوامی جذبے کی ترجمان جو ہوتیں۔ سچّے جذبے کی ترجمانی نے ہی اسے انفرادیت بخشی تھی۔ اس نے قلم کا حق ادا کیا، جو کچھ لکھا وہ منفرد کہلایا۔

ایک بڑے قلم کار کے روز و شب کا احوال، قصہ مآل

امرتسر کے گلی کوچوں میں سرما کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

مرد حضرات اپنے روزگار پر روانہ ہوچکے تھے۔ خواتین گھر کے سب کام نمٹانے کے بعد اب دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں مگن تھیں۔ میاں عبدالعزیز کے گھر میں بھی یہی معمولات جاری تھے۔ خاتون خانہ نے اپنی والدہ سے سبزی کی پرات پکڑی اور خاموشی سے باورچی خانہ کا رخ کرلیا۔ ان دونوں خواتین کے چہروں پر فکر کی پرچھائیاں تھیں۔

''خانم! آپ گھر پر ہی ہیں ناں؟'' دروازے پر دستک کے بعد ایک مدبر آواز آئی۔

''جی ہاں! رک کیوں گئیں آپ؟ چلی آیئے اندر!'' ادھیڑ عمر خاتون نے جواب دیا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور نقوش اس عمر میں بھی بہت جاذب نظر تھے۔ اس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ وہ امرتسر میں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی تھی۔ داماد میاں عبدالعزیز 'ٹائم ٹریڈر' تھا۔ اس کا تعلق لدھیانہ سے تھا لیکن فی الوقت وہ امرتسر میں مقیم تھا۔ گزر بسر اچھی ہوجاتی تھی۔ کمی تھی تو صرف ایک ہی چیز کی۔ بیٹی کی گود اب تک سونی تھی۔

''کیسی ہیں خانم؟ چھوٹی خانم تو ٹھیک ہے ناں؟'' تو وارد خاتون نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''ہاں! ٹھیک ہے۔ بس دعا کرنا کہ اس بار بھری جھولی سے فارغ ہو۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''اس مسئلے کے حل کی خاطر آپ منت کیوں نہیں مان لیتیں؟'' مہمان خاتون نے تجویز دی۔

''منت' دعائیں' التجائیں سبھی کچھ تو کر کے دیکھ لیا۔'' خاتون خانہ مہمانداری کے لوازمات لیے باورچی خانہ سے باہر آئی۔

''میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں بہن! اس بار میرے کہنے پر ایک منت مان کر دیکھو۔ انشاء اللہ سب مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔'' اس نے خلوص سے کہا۔ دونوں خواتین چوکنا ہوگئیں۔ مہمان خاتون نے انہیں ایک خصوصی منت ماننے کا مشورہ دیا جس کے تحت بچے کی پیدائش کے بعد اس کا نام حضرت عباسؓ کی نسبت سے 'غلام عباس' رکھا جاتا اور ایک مخصوص عرصہ تک اسے حضرت امام حسینؓ کے فقیر کا روپ دے کر 'عزاداروں' میں بھیک مانگنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

''یہ کیسی بات کر رہی ہو؟ ہمارے ہاں تو ایسا کوئی تصور نہیں۔'' خانم نے اپنی مخصوص علمیت کی بنیاد پر کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس منت کا تعلق عجز و انکسار سے ہے۔'' خاتون نے رسان سے سمجھایا۔ ''اب دیکھیے ناں! یہاں کئی صاحب حیثیت چودھری گھرانے موجود ہیں۔ انہیں کسی نعمت کی کمی ہو اور وہ اس کے لیے کسی دیگ کے چڑھاوے کی منت مان لیں تو ان کی دولت' رتبے اور شان میں کس چیز کی کمی ہوئی پھر؟ اگر نعمت کی طلب سچی ہے تو منت میں بھی بھرپور عاجزی و قربانی کا جذبہ ہونا

چاہیے کہ نہیں؟ میری ایک عزیزہ کو بھی آپ کی بیٹی جیسا مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے یہی منت مانی۔ مولا نے اس کی جھولی بھر دی۔ میں نے تو آپ کی محبت میں ایسا بتا دیا۔ عمل کرنا یا نہ کرنا تو آپ ہی کا فیصلہ ہوگا۔'' محلہ دار خاتون نے کندھے اچکائے اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے لوٹ گئی۔

دونوں خواتین اب ایک نئی سوچ میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ شام کو میاں عبدالعزیز کی آمد ہوئی تو اہلیہ نے یہ سارا معاملہ شوہر کے گوش گزار دیا۔

''مجھے بھی ایک شناسا نے یہ منت ماننے کا مشورہ دیا تھا۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔'' شوہر کی رضامندی پاتے ہی وہ پُرسکون ہوگئی۔ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی دعائیں تو پہلے ہی قبولیت کا شرف پا چکی تھیں۔ سترہ نومبر کے ایک سرد دن میں میاں عبدالعزیز کے گھر اولاد نرینہ نے جنم لیا۔ بچے کا نام 'حسب منت' غلام عباس رکھا گیا۔ گھر والوں کو ایک نئی مصروفیت میسر آتے ہی زندگی ایک نئے دھارے پر منتقل ہوگئی۔ معاملات بے حد ہموار تھے کہ تقدیر نے ایک کاری وار کر دیا۔ میاں عبدالعزیز کی وفات نے گھر کا نظام ہی تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ زندگی کی گاڑی بمشکل گھسٹنے لگی۔ اس دوران غلام عباس کی نانی کی ایک بہن بھی انہی کے ہاں قیام پذیر تھیں۔ اس خاتون کا پاؤں کچھ خراب تھا۔ اس جسمانی عیب کو اس نے کبھی اپنی کمزوری نہ بنایا اور مساوی طور پر شیر خوار غلام عباس کی پرورش میں دیگر دو خواتین کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ ننھے غلام عباس کی یتیمی اور اپنی بیوگی، والدہ کی زندگی کا روگ بننے لگی تھی۔ شوہر کی وفات نے انہیں کسی نخلستان سے صحرا میں لا کھڑا کیا تھا۔

ابتدائی چار سال کسی طرح گھسیٹ کر گزر گئے۔ اس کے بعد تینوں خواتین مشترکہ فیصلے کے تحت امرتسر سے لاہور آ گئیں اور یہاں تاریخی 'بھاٹی دروازہ' کے نزدیک ایک مکان لے لیا۔ ان دنوں یہ علاقہ مختلف ادیبوں' مفکرین' سیاستدانوں اور علم دوست افراد کی آماجگاہ تھا جس کی وجہ سے اسے لاہور کا چیلسی بھی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں 'نیرنگ خیال' اور 'ہزار داستان' جیسے ادبی رسائل بھی وہیں سے نکلتے تھے۔ باپ کی شفقت سے محروم چار سالہ غلام عباس ماحول کی اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ والدہ کا تابعدار تھا اس لیے ساتویں محرم کو سبز لباس پہن کر منت کی تکمیل کی غرض سے بھیک مانگنے چلا جاتا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ تینوں خواتین معاشی اور معاشرتی طور پر کس جبر کا شکار ہیں۔ تین بے سہارا خواتین کی تنہا رہائش اس دور میں یقیناً ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ان حالات میں ہر فرد متاثرہ خاندان کی خبر گیری کرتا اور پھر اس عمل کے سہارے ذاتی مفاد پورا کرنا اپنا فرض سمجھنے لگا اگر کوئی خلوص دل سے مدد کا خواہش مند ہوتا تو دیگر افراد کی نظریں' طعنے و تشنیع عزت نفس مجروح کیا کرتیں۔ ان حالات سے تنگ آ کر غلام عباس کی والدہ نے شریعت کی پابندی ضروری سمجھی اور سوچ بچار کے بعد ایک بھلے آدمی کا ہاتھ تھام لیا۔ نکاح ثانی نے ان کی زندگیوں میں بہت آسانیاں پیدا کر دیں۔ معاشی مسائل حل ہوئے اور معاشرتی طور پر بھی ایک مضبوط سہارا میسر آ گیا۔ بوڑھی خانم بھی شاید اسی وقت کی منتظر تھیں۔ بیٹی کو آسودہ دیکھتے ہی انہوں نے یہ خوشگوار منظر بصارت میں قید کر کے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں۔ سوتیلے والد نے غلام عباس کو سگے باپ سے زیادہ نہی سہی لیکن کم پیار بھی نہیں کیا۔ عباس نے بھی زندگی میں پہلی بار والد کی شفقت اور محبت کا امرت نوش کیا جو بلاشبہ اپنی مٹھاس اور تاثیر میں بے مثال تھا۔ اسے اپنے گھر کا پُرسکون ماحول بہت بھانے لگا۔ اب وہ سمجھداری اور شعور کے زینے چڑھ رہا تھا۔ وہ نامور ادباء کو اپنے علاقے میں دیکھتا اور معصوم سی حیرت سے اپنی والدہ سے سوالات کرنے لگتا۔ ان کے تسلی بخش جوابات سننے کے بعد غلام عباس میں بھی شعر و ادب سے لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ گھر میں اس کا زیادہ تر وقت نانی کی بہن کے ساتھ گزرتا۔ وہ اسے اکثر فارسی قصے اور داستانیں سنایا کرتی۔ غلام عباس کا ذہنی افق تبدیل ہونے لگا۔ یہ داستانیں اور قصے سن کر اسے اپنے علاقے کے ادباء میں مزید کشش محسوس ہونے لگی تھی۔

تھوڑا وقت اور گزرا تو والدہ نے اسے 'دیال سنگھ ہائی اسکول' میں داخل کروا دیا۔ لاہور میں اس نام کی اہمیت مسلمہ تھی۔ غلام عباس کو کتابوں سے بہت محبت تھی۔ اسکول میں اس کا دل خوب لگنے لگا۔ عباس کی عمر اب نو سال ہو چکی تھی۔ زندگی بہت ہموار اور پُرسکون بسر ہو رہی تھی کہ تقدیر ایک بار پھر اپنا وار کرنے چلی آئی۔ سربراہ خاندان اور غلام عباس کے سوتیلے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کی والدہ کا غم بہت بھاری تھا۔ اس دکھ کی گھڑی میں انہیں سب سے زیادہ فکر اپنے بیٹے کی ہی تھی۔

''غلام عباس کہاں ہے خالہ؟'' انہوں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تو محلے کے لونڈوں کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔''

''میرا ایک کام کر دیجیے خالہ! بڑا احسان ہوگا۔ غلام عباس ان سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کم عمری میں ایسا صدمہ سہنا اس کی ذہنی نشوونما کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔ آپ کسی بھی طرح اسے یہاں سے بھیج دیجیے۔ میں جنازہ جلد اٹھوانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ اسے یہی بتایئے گا کہ ابا جان سو رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! میں کچھ حل نکالتی ہوں۔'' انہوں نے بھانجی کو دلاسا دیا اور کمرے سے پیسے لے کر باہر چلی آئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دوستانہ اور رازدارانہ انداز میں عباس کو پیسے تھما کر دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا لالچ دیے گھر سے دور بھیج چکی تھیں۔ دیر گئے واپسی ہوئی تو اس کی دنیا ایک بار پھر بدل چکی تھی۔ گھر کا اکلوتا کمانے والا خاک نشین ہوگیا تھا۔ معاشی صورتِ حال ابتری کا شکار ہونے لگی تو غلام عباس کی شعر و ادب کی شائق والدہ نے کسی مرد ہی کی طرح میدانِ عمل میں اترنے کا فیصلہ کرلیا۔ بچے کھچے سرمایہ سے گھر کے سامنے سڑک پر پان، سگریٹ اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ محلہ دار خواتین اس عمل پر کافی چیں بہ چیں ہوئیں۔

''جوان جہان عورت ہوکر اس طرح کا کام کروگی؟ ہمیں کہہ دیا ہوتا۔ ہم صدقات یا زکوٰۃ سے تمہاری کوئی مدد کردیتے۔'' کسی خاتون نے کہا۔

''زکوٰۃ سال میں ایک بار دی جاتی ہے خالہ جی! صدقات دینے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ مجھ سے کچھ خریداری ہی کر لی جائے۔ آپ جہاں دیدہ ہیں۔ مرد کی فطرت کو مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ آج اگر کوئی میری مدد کرے گا تو جواب میں کچھ نہ کچھ طلب کرنے گھر چلا آئے گا۔ پھر آپ لوگ ہی سب سے پہلے میرے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گی۔ سر بازار کوئی بھی غلط بات کرتے ہوئے اپنی عزت کے بارے میں ایک بار تو ضرور سوچے گا۔'' وہ صاف گوئی سے بولیں تو خاتون مزید کوئی دلیل نہ دے سکیں۔

غلام عباس کسی خاموش سامع کی طرح یہ سب باتیں سن کر بہت تحمل سے برداشت کرتا رہا۔ اس نے اسکول کی پڑھائی کے علاوہ ادبی کتابوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہ ساتویں جماعت میں آچکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب رفتہ رفتہ الفاظ نے خیالات کی تال پر دھیمے رقص کا آغاز کیا۔ اسے

عطاءاللہ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایک اور کہانی مشہور ہے

عطاءاللہ خان کی یہ کیفیت تھی کہ کچھ بھی ہوجائے وہ گانا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس پر سخت گیر باپ نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ ''میرے گھر میں رہنا ہے تو بندے دا پتر بن کے رہو۔ میراثی بنا ہے تو میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔''

اور گانے بجانے کا شوقین عطاءاللہ ان کی نظروں سے دور ہوگیا۔ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ گھر کی آسائش، آرام اور اہمیت کا احساس گھر سے دور ہونے پر ہوتا ہے۔ کمسن عطاءاللہ خان کو بھی گھر چھوڑنے کے بعد بڑی شدت سے اس بات کا احساس ہوا۔ جب بھوک لگی تو بے اختیار اس کے قدم ایک ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہوٹل پہنچ کر جب روٹی خریدنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔

اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے منیجر کے پاس جاکر کہا۔ ''میرے لائق یہاں کوئی ملازمت ہوگی؟''

منیجر بولا۔ ''ہاں مل جائے گی نوکری، بیرا گیری کی۔ کرلوگے؟''

''ہاں ہاں یہ کام تو میں کرلوں گا۔'' اس طرح اس کی روٹی کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ گاہک نہ ہوتے تو ساتھی ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر گاتا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کے علاوہ ہوٹل کے منیجر اور مالک بھی اسے پسند کرنے لگے۔ ہوٹل میں آنے والے گاہکوں سے بھی اس کی یاری دوستی شروع ہوگئی۔ اس کے دوستوں میں کچھ ٹرک ڈرائیور بھی تھے جو اس کے اخلاق، اطوار اور خاص طور پر اس کے گانے سے بہت متاثر تھے۔ انہی میں سے ایک نے پوچھا۔ ''تجھے اس نوکری میں کیا مل جاتا ہے؟''

''بس دو وقت کی روٹی، پیٹ بھر کے۔'' اس نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

''چھوڑ اس کام کو اور چل ہمارے ساتھ ٹرک چلا۔ تجھے اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔''

''ٹرک!'' وہ زور سے ہنسا۔ ''ارے یار! میں تو سائیکل بھی نہیں چلا سکتا۔ تو مجھے ٹرک چلانے کو کہتا ہے۔''

''کبے سیکھنے سے سب آجاتا ہے۔ ٹرک کیا ہوائی جہاز چلانا بھی تو سیکھ لے گا۔''

قصہ مختصر یہ کہ اس کے ٹرک ڈرائیور دوستوں نے اسے ٹرک چلانا سکھا کر ہوٹل کی نوکری سے فارغ کیا اور ٹرک ڈرائیور بنا دیا۔ اب اس کا حلقۂ احباب کئی شہروں میں پھیل گیا۔ اس کے گانے لوگ ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کر کے بعد میں سنتے۔ ایسا ہی ایک ریکارڈ گانا ایک شخص نے سنا اور کیسٹ بنوا کر مارکیٹ میں لادیا پھر تو ہر گلی ہر کوچے میں اس کے گانے گونجنے لگے۔

اپنے وجود میں بے قراری کا احساس ہونے لگا۔ رقص کرتے الفاظ اب اسے گدگدانے بھی لگے تھے۔ وہ ان کی سرکشی کو کسی بھی طرح اپنا تابع کرلینا چاہتا تھا۔ یہ کٹھن ترین صورتِ حال ازل سے ہر تخلیق کار ہی برداشت کرتا آیا ہے۔ غلام عباس کے وجود میں بھی ایک متلاطم کیفیت تھی۔ خیالات کی یہ اٹھا پٹخ بالآخر 'بکری' نامی کہانی پر منتج ہوئی۔ صفحہ قرطاس پر بکھرے الفاظ دیکھ کر وہ خود بھی حیران تھا، پھر یہ حیرانی سرشاری میں تبدیل ہوگئی۔ الفاظ کا رقص عارضی طور پر تھم گیا اور اسے اپنی بے قراری کو قرار میں منتقل کرنے کا طریقہ معلوم ہوگیا۔ اس کے بعد غلام عباس نے اپنے مطالعے کو مزید مہمیز دیا۔ تیرہ سال کی عمر تک اس نے شررؔ، سرشارؔ، رسواؔ، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسے ادباء کی تمام تخلیقات پڑھ لیں۔ وہ شررؔ سے اس قدر متاثر ہوچکا تھا کہ ان کی تاریخ پر مبنی کتابیں بھی بہت رغبت سے مکمل کیں۔ 'طلسم ہوش ربا' ختم کرنے کے بعد اسے اپنے وجود میں ایک بار پھر ہلچل کا احساس ہونے لگا۔ اس وقت تک غلام عباس نہم جماعت میں آچکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کی تخلیق کردہ چند اصناف اسکول میں ایک استاد کے ہاتھ لگ گئیں۔

"یہ تمہاری ہی تصنیف ہیں کیا؟" استاد صاحب حیران تھے۔

"جی! دو سال سے بس یونہی ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔" وہ شرما گیا۔

"خیر! اسے ٹامک ٹوئیاں تو نہیں کہا جاسکتا۔ تمہارے قلم میں اچھی خاصی روانی ہے۔" انہوں نے متاثر کن انداز میں کہا۔

"اچھا جی! لیکن مجھے تو آج تک تسلی ہی نہیں ہو پائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک پہاڑ موجود ہے۔ دل سے آواز آتی ہے کہ میں اس پر چڑھ بھی سکتا ہوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ چڑھائی کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ وہ سہارا ہی مل کے نہیں دے رہا۔"

"تمہاری کیفیات بالکل فطری ہیں۔ یہ ہر تخلیق کار کا آفاقی مسئلہ ہے۔" استاد صاحب نے خلوص سے سمجھایا۔ "تمہیں بہرحال جس سہارے کی ضرورت ہے وہ دو طرح سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تم بھاٹی دروازے کے رہائشی ہو۔ وہاں تو قدم قدم پر ادیب اور شاعر بستے ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارو۔ تمہارا ذہنی افق وسیع ہوگا۔ چڑھائی کے رستے معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد غیر ملکی ادب کے تراجم پر توجہ دو۔ تراجم کرنے سے تمہارا قلم مزید رواں ہوتا جائے گا۔ طبع زاد لکھنے کے لیے رہنمائی ملے گی، پھر راہیں خود بخود نظر آنے لگیں گی۔" غلام عباس نے استاد کی یہ باتیں ذہن نشین کرتے ہوئے اپنا حلقہ احباب وسیع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس زمانے میں رسالہ 'نیرنگ خیال' کو نکلے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اسی دوران ایک ادب دوست شخصیت "بدرالدین بدر" نے پانی والے تالاب کے قریب مناسب جگہ پر پانوں کی دکان کھول لی۔ اب وہاں ہر روز شام کو ڈاکٹر تاثیر، عبدالرحمن چغتائی، نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن، ڈاکٹر سید نذیر احمد، لاہوری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے خطیب مولوی بخش اکٹھے ہوا کرتے۔ ان قدآور شخصیات میں غلام عباس بھی اپنا وقت بسر کرنے لگا۔ وہ پان پر پان کھاتے رہتے اور ادب، وآرٹ پر گفتگو جاری رہتی۔ پان کی یہ دکان گویا اس کے لیے ایک درسگاہ بن گئی تھی۔ غلام عباس کا رجحان اب انگریزی نظموں اور کہانیوں کو اردو قالب میں ڈھالنے کی طرف منتقل ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ موسیقی میں دلچسپی بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ پہلے پہل اسے 'وائلن' بجانے کا شوق ہوا۔ اس وقت مال روڈ پر ایک گوانس کا اسکول ایسا مقام تھا جہاں یورپی موسیقی سکھائی جاتی تھی۔ فیس دس، پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ غلام عباس نے اپنے شوق کے پیش نظر وہاں داخلہ لے لیا اور اگلے تین تین ماہ تک وائلن پر یورپی دھنیں بجانے کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد عباس نے ہندوستانی موسیقی کے ادارے گندھرو دیالیہ میں داخلہ لیا جہاں مراٹھے وائلن نواز پنڈت ڈھنڈی راج وائلن سکھاتے تھے۔ پنڈت جی کی وائلن نوازی نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے مغربی موسیقی کو خیرباد کہہ کر انہی کی شاگردی اختیار کرلی (یہ شاگردی اگلے دو سال تک جاری رہی تھی)

موسیقی کی اس تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ غلام عباس کا رجحان انگریزی ادب پڑھنے اور لارنس گارڈن میں کھیلنے کی طرف مائل تھا۔ اسکول کی پڑھائی اب کہیں پس پشت جا چکی تھی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ نہم جماعت کے امتحانات میں ناکام ہوگیا، اس کی یہ ناکامی والدہ کے لیے بہت گہرا صدمہ تھی۔

"میری محنت اور لگن میں کہاں کمی رہ گئی تھی غلام عباس؟ میں نے تمہاری پڑھائی اور گھریلو گزراوقات کے

لیے مختلف اوقات میں زمین اور زیورات تک فروخت کیے ہیں۔ اس کے باوجود ایسا نتیجہ......" وہ غم و غصہ سے بے حال تھیں۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میری غلطی ہے کہ میں دونوں معاملات میں توازن قائم نہیں رکھ سکا۔" وہ والدہ کی حالت پر نادم تھا۔

"تمہاری ندامت میرے نقصان کی تلافی تو نہیں کر سکتی۔ پیسے درختوں پر تو اگتے نہیں جو میں اتار اتار کر تم پر لٹاتی رہوں گی۔ اب سے تم کوئی کام کاج یا نوکری ہی ڈھونڈو گے۔ خود کماؤ گے تو اندازہ ہوگا کہ اپنی کمائی کا درد کیا ہوتا ہے۔"

والدہ کے اس سخت فیصلے پر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اسے اپنی کوتاہیوں کا مکمل احساس تھا۔ وہ کسی اشاعت خانہ سے رابطہ کر کے انگریزی نظموں اور کہانیوں کے ترجمہ کا تھوڑا بہت معاوضہ حاصل کرتا رہا تھا لیکن وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرے ہی کے مترادف تھا۔ اتنی سی رقم سے تعلیمی اور گھریلو اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے خاموشی سے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ والدہ نے کسی عزیز سے کہہ سن کر اسے اسٹیشن کے مال گودام پر ملازمت دلوادی۔ تنخواہ تیس روپے مقرر ہوئی۔ اس ملازمت اور تبدیل شدہ معمولات کے باوجود غلام عباس کے جنون میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے متبادل راہ اختیار کرلی۔ وہ والدہ کا دیا گیا کھانا اسٹیشن پر کھانے کی بجائے قریبی قبرستان میں لے جاتا اور وہیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر ترجمہ کا کام بھی کرلیا کرتا۔ اس دوران رسالہ 'ہزار داستان' کے مدیر حکیم احمد شجاع نے اس سے معاہدہ طے کیا جس کی رو سے غلام عباس نے فی ہفتہ پانچ روپے کے عوض ٹالسٹائی کے ناول 'The Long Exile' کا ترجمہ کرنا تھا۔ غلام عباس نے یہ ذمّے داری بہت لگن سے نبھائی اور 'جلاوطن' کے عنوان سے باقاعدگی سے ترجمہ فراہم کرتا رہا۔ اس دورِ حیات میں اس کا ذخیرہ الفاظ بہت محدود تھا۔ ٹالسٹائی کا ناول اردو قالب میں ڈھالنا بھی آسان کام نہ تھا۔ غلام عباس نے بہت کٹھنائی سے سہل ترین زبان کا استعمال کرتے ہوئے ہمت جاری رکھی۔ 'ہزار داستان' کے اس مترجم ناول کا ردِعمل بہت شاندار رہا۔ غلام عباس کی استعمال شدہ زبان کو بہت پذیرائی ملی۔ تعریفی نوٹ اس کا سیروں خون بڑھایا کرتے اور وہ مزید لگن سے کام میں جت جاتا۔ ہزار داستان کے علاوہ اسے 'حکیم یوسف حسن' کے دوسرے رسالے 'تازیانہ' میں بھی قلم کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ اس زمانے میں اس کے تراجم تازیانہ، ہزار رنگ، نیرنگ خیال، ہمایوں، بجلی، امرتسر جیسے ادبی رسائل میں شائع ہونے سے حلقہ احباب میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس دور کی تحریروں میں "چاند کی بیٹی" (جاپانی کہانیاں) ماخوذ شدہ ڈراما "جادو کا لفظ" (1926) ڈراما ثریا کی گڑیا (1927)، برف کی بیٹی، بچوں کی محبوبہ، غم نصیب سپاہی، آسیا، نگار خانہ حسن، ترکی ٹوپی شامل تھیں۔ چاند کی بیٹی اور ثریا کی گڑیا چھوٹے کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہوئیں۔ یہ دور درحقیقت غلام عباس کے لیے ارتقائی زمانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کاغذ و قلم سے ناتہ شوق اور جنون کی بنیاد پر تھا۔ معاوضے کا حصول معمولی سہی لیکن اپنی ہنر شناسی کا احساس ہی اس کے لیے بے حد قیمتی تھا۔ نانی کی بہن کی داستانوں میں دلچسپی لے کر انگریزی ادب کو ترجمہ میں منتقل کرنے والے غلام عباس کی زندگی میں خوش قسمتی دستک دیتے چلی آئی۔ اس دستک کا جواب دینے کے بعد غلام عباس بطور ادیب باقاعدہ طور پر تخلیقی عمل میں مصروف ہوگیا۔

سوانحی خاکہ

نام: غلام عباس

تاریخ پیدائش: 17 نومبر 1909 (سن پیدائش میں محققین کی آراء متضاد ہیں۔ کئی مقامات پر 1907 بھی مذکور ہے)

جائے پیدائش: امرتسر

تاریخ وفات: 2 نومبر 1982

جائے وفات: کراچی

پیشہ: افسانہ نگار، ناول نگار، ادیب اطفال، شاعر، ایڈیٹر، مترجم

ملازمت: آل انڈیا ریڈیو

وجۂ شہرت: افسانہ نگار

اعزازات: ستارۂ امتیاز

چند مشہور تخلیقات: آنندی، کن رس، جاڑے کی چاندنی، جزیرہ سخن وراں، جلا وطن، دھنک، اوورکوٹ، گوندنی والا تکیہ، جلا وطن، الحمرا کے افسانے۔

☆.....☆

1928ء کا آغاز ہو چکا تھا۔

غلام عباس نے گودام کی نوکری اور تراجم کی ذمے داریوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پڑھائی کا سلسلہ گھسیٹ رکھا تھا۔ اس کا ذہنی ارتقاء بتدریج ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ یہ لاہور کا وہ زمانہ تھا جب پرانی تہذیب غیر محسوس طریقہ سے اپنی اہمیت کھونے لگی تھی۔ لوگوں کے رہن سہن' لباس' عادات و اطوار اور وضع قطع میں نئی روایات کے اثرات دکھائی دینے لگے۔ مغربی دنیا ان دنوں مختلف ایجادات سے مستفید ہو رہی تھی اور ہندوستان میں انگریزی عملداری کے باعث یہاں کے عوام بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان تبدیلیوں کی زد میں تھے۔ وہ وقت بہت عجیب تھا۔ ایک جانب روشن خیال افراد زمانہ کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قائل تھے تو دوسری جانب قدامت پسندوں کی بھی کمی نہ تھی جو ہر نئی چیز کی مخالفت کرنے پر تلے رہتے۔ اپنی اس مخالفانہ روش میں وہ کسی نئی ایجاد کی افادیت بھی متعصبانہ طریقہ سے نظر انداز کر دیا کرتے۔ کئی سالوں سے لاہور کے اہم ترین علاقہ بھاٹی کا رہائشی غلام عباس بھی اسی ماحول سے متاثر ہو رہا تھا۔ نئی تہذیب کی آمد کے بعد معاشرتی فضا بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدل رہی تھی۔ لاہور میں اخبارات' قصے' داستانیں' مذہبی اور اخلاقی رسائل بکثرت شائع ہوا کرتے۔ مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر اصلاحی و تعلیمی رسائل بھی منظر عام پر آ رہے تھے۔ غلام عباس کا گھر 'اردو بازار' کے قریب ہی واقع تھا۔ اس کے لیے یہ تبدیلیاں اور کتابوں کی اشاعت کسی نعمت سے کم نہ تھیں۔ اس ماحول میں غیر ملکی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے مختلف تکیوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہ پنجابی مشاعرے' دو نامی گرامی گویوں کے استادی گانوں کا مقابلہ' حال و قال کی محفلیں دیکھتا اور روسی ناول پڑھتا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات 'سید امتیاز علی تاج' سے ہوئی۔ وہ ادبی دنیا کی ایک قد آور شخصیت تھے۔ ان کے دارالاشاعت پنجاب سے دو نامور رسائل 'پھول' (بچوں کے لیے) اور 'تہذیب نسواں' (خواتین کی اصلاح کے لیے) شائع ہوتے تھے۔ رسالہ پھول کی اشاعت کا آغاز 1909 میں لاہور کے دارالاشاعت پنجاب سے 'شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی' کی جانب سے ہوا تھا۔ حفیظ جالندھری' نشتر جالندھری' عبدالمجید سالک اور وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے نامور ادیب بھی اس کی ادارت کر چکے تھے۔ غلام عباس نے ان دونوں رسائل میں ہی اپنی کہانیاں شائع کروائی تھیں۔ سید امتیاز علی تاج اس نوجوان کے ہنر اور صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے غلام عباس کو پھول کے ادارتی عملہ سے منسلک ہونے کی پیشکش کر دی۔ وہ خوشی سے گنگ رہ گیا۔ ہر ادیب کی طرح اپنے شوق کو روزگار میں منتقل ہوتے دیکھنا اس کے لیے بہت خوش آیند تھا۔ وہ خوشی خوشی گھر پہنچا اور مٹھائی کا ڈبا والدہ کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کس لیے بھئی؟'' نانی کی بہن نے تجسس سے پوچھا۔ والدہ بھی حیرت سے اس کا چمکتا چہرہ دیکھنے لگیں۔ نہم جماعت میں ناکامی کے بعد غلام عباس نے جس محنت اور لگن سے تمام معاملات سنبھالے تھے والدہ کا دل فخر' خوشی اور عجز کے جذبات سے لبریز رہتا تھا۔

''سید امتیاز علی تاج صاحب نے مجھے پھول اور تہذیب نسواں میں ادارتی فرائض سونپنے کا عندیہ دیا ہے۔'' اس انکشاف نے دونوں خواتین کو حیرت و خوشی سے گنگ کر دیا۔ علم و ادب کی شائق ہونے کے باعث انہیں بخوبی علم تھا کہ تاج صاحب اور مذکورہ رسائل کس اہمیت و معاشرتی رتبہ کے حامل ہیں۔ والدہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو بھر آئے۔

''پروردگار تمہارے لیے ہر قدم پر آسانیاں پیدا فرمائے میرے بچے! تمہارے قلم میں تاثیر اور روزی میں برکت عطا فرمائے۔ بس ہمیشہ اپنے قلم کی حرمت کا خیال رکھنا۔ تمہارے کندھوں پر ایک بہت نازک ذمے داری آن پڑی ہے۔'' والدہ کی بات پر غلام عباس نے خلوص سے دونوں خواتین کو یقین دلایا کہ وہ انہیں اور علم دوست افراد کو کبھی مایوس نہیں کرے گا اور یوں اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

ہفت روزہ پھول کی خوبی یہ تھی کہ تنخواہ وقت پر مل جایا کرتی۔ خرابی محض یہ تھی کہ کم ملتی تھی۔ ساٹھ روپے سے زیادہ ملنا ناممکن تھا۔ غلام عباس کے لیے یہی اطمینان بہت تھا کہ اتنی تنخواہ پر اس کے تمام پیش روؤں اور اس سے کہیں زیادہ تجربہ کار' نامور ادیبوں نے کام کیا تھا۔ 'پھول' ہندوستان کے بہت سے مقامات تک پہنچنے والا جریدہ تھا۔ یہ ایک اخبار ہی نہیں بلکہ ایک ادارہ بھی تھا۔ اس کا مقصد ایک طرف ملک کے نونہالوں کے دلوں میں علم کی لگن جگانا' اخلاق سازی اور ذوق ادب کی پرورش تھا تو دوسری جانب ملک بھر کے ادیبوں کی ذہنی تربیت بھی ضروری تھی تاکہ وہ اس قدر سلیس

زبان استعمال نہ کریں جو بچوں کی ذہنی سطح سے اوپر ہو بلکہ ایسی زبان استعمال کریں جو بچوں کی ذہنی استطاعت کے عین مطابق ہو۔ محض اپنی علمیت ثابت کرنے کے لیے تحریر میں فارسی و سنسکرت کا تڑکا ہرگز ضروری نہیں۔ غلام عباس نے اس ادارے کے وضع کردہ تمام تر اصول ذہن نشین کیے اور اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے ساتھ تخلیقی عمل بھی تیز کر دیا۔

پھول کے ہر شمارے کی ابتداء میں مختلف عالمی واقعات کو آسان اور سلیس زبان میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد چار یا پانچ کہانیاں شامل ہوتی تھیں۔ وہ ادارت سنبھالنے کے ساتھ کہانیاں بھی لکھتا رہا۔ 1928 کے پھول میں 'سات' 1929 کے رسالہ میں 'اکیس' 1930 میں نو کہانیاں شائع ہوئیں۔ اس کے ساتھ 'تہذیب نسواں' میں بھی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ جنتی چڑیا، خاندانی تحفہ، سبز طوطا کے علاوہ کچھ تحاریر افسانوی انداز میں نظر آئیں۔ سید امتیاز علی تاج اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے۔ گویا اس دوران غلام عباس کے اسلوب کی سلاست اور سادگی تشکیل میں آ رہی تھی۔ 1932 کے رسالہ 'فردوس' میں 'جاپان کی شاعرہ عورتیں' نامی مضمون پیش ہوا جس کے اختتام پر اس نے اپنا نام 'مولانا غلام عباس' لکھا۔ اس زمانے کا یہی دستور تھا کہ ادیبوں کے نام سے قبل لفظ 'مولانا' استعمال کیا جاتا تھا۔ ان تخلیقی اصناف کے بعد ٹالسٹائی کے ناول The Long Exile کا ترجمہ (جلاوطن) اور مشہور امریکی ناول نگار 'واشنگٹن ارونگ' کے کارنامے 'Tales From Alhambra' کا ترجمہ (الحمرا کے کارنامے) کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا۔ 1933 میں امتیاز علی تاج اور محمد دین تاثیر کے جریدہ 'کارواں' میں پہلا تخلیقی افسانہ 'مجسمہ' منظر عام پر آیا۔ اس سے اگلے برس 'محبت کا گیت' نامی افسانہ اسی رسالہ میں شامل ہوا۔ یہ دونوں افسانے رومانوی انداز میں لکھے گئے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ غلام عباس کو اس وقت یہی رومانیت پسند بھی نہ تھی۔ اس دور میں منظر نامہ کچھ ایسا تھا کہ علی عباس حسینی 'منشی پریم چند' کی تقلید کرتے تھے۔ احمد اکبر آبادی سمیت کچھ افراد نیاز فتح پوری کے انداز میں لکھتے تھے۔ اس زمانے میں ٹیگور کی ادبی شخصیت سب سے قد آور تھی۔ وہ ہر ادیب کے ذہن پر حاوی تھے۔ غلام عباس نے بھی ٹیگور ہی سے متاثر ہو کر ان افسانوں میں شاعرانہ انداز اختیار کیا تھا۔ افسانوں کو کافی پذیرائی تو ملی لیکن خود مصنف اس انداز سے بھاگنے لگا۔ انہی دنوں وہ روسی ادب کی طرف بھی مائل ہونے لگا تھا۔ چیخوف اور گورکی کا مطالعہ کیا تو افسانوں کی ایک نئی طرز سے آشنائی ہوئی۔ اس طرز تحریر کے بعد رومانوی اور حسن و عشق کے رنگ میں رنگے یہ افسانے دوبارہ کبھی کھول کر بھی نہ دیکھے۔ پھول اور تہذیب نسواں کی ادارت کے ساتھ تخلیقی عمل و تراجم بے حد تیز رفتاری سے جاری رہے۔ اسی دوران 1936 سے 1937 کے درمیان رسالہ 'شیرازہ' میں 'جزیرہ سخن وراں' شائع ہوتا رہا۔ یہ رسالہ 'چراغ حسن حسرت' لاہور سے ہی نکالتے تھے۔ یہ افسانہ مشہور فرانسیسی طنز نگار 'آندرے موروا' کی تصنیف 'دوڑا اوپے ای دیزارتی کول' سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ (یہ افسانہ بعد ازاں 1941 میں دلی کے 'کتب خانہ ہزار داستان' سے اور 1961 میں کراچی سے دوبارہ کتابی شکل میں چھپوایا گیا۔ اس میں فیض احمد فیض اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے بھی شامل تھے۔ اردو ادب میں غلام عباس کی پہچان کا آغاز اسی تحریر سے ہوا تھا)

غلام عباس کی زندگی بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ ایک جانب پیشہ وارانہ میدان میں کامیابیوں' توصیف' پذیرائی اور قدر و قیمت میں اضافہ ہو رہا تھا تو دوسری جانب اس کی ذاتی زندگی کا ایک پہلو بے حد تاریک' ناقابل برداشت اور اذیت ناک ہو چکا تھا۔ غلام عباس کی شادی ایک بے حد طرح دار' حسین کشمیری خاتون غزالہ سے ہوئی تھی۔ اولاد کی نعمت سے بھی جلد سرفرازی ہوئی۔ غلام عباس اور غزالہ کے مابین کبھی ذہنی ہم آہنگی پروان نہ چڑھ سکی۔ ان کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ غزالہ قدرے مادیت پرست اور آسائش طلب تھی۔ اسے شوہر کے مزاج' فطرت' عادات' بے نیازی' پیشہ' ہر ایک بات پر اعتراض تھا۔ گھریلو ماحول گھٹن کا شکار ہو گیا۔ غزالہ ساس کو خاطر میں لاتی' نہ ہی شوہر کے درد کا درماں ہوتی۔ اس کی یہی آرزو تھی کہ وہ عام شوہروں کی طرح اس کے ناز نخرے اٹھائے' بھرپور وقت دے' جی حضوری کرے' ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھے اور کوئی منافع بخش نوکری کر کے گھر میں ہر مغربی سہولت فراہم کرے۔ اس کے برعکس غلام عباس کے کیا معمولات تھے؟ وہ ایک بے نیاز شخص تھا۔ سادگی اس کے مزاج کا خاصا تھی۔ قہقہہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا' کاغذات کا شکم بھرتے وہ اپنے ادارتی فرائض کو یادگار انداز میں سرانجام دینے یا تخلیق کا کرب برداشت کرنے کے بعد چند روپوں کے

حصول پری قانغ ہو جاتی۔ ایسے شوہر کا تو اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ مزید بد قسمتی یہ ہوئی کہ ان کی چار سالہ اولاد (اس ضمن میں متضاد بیانات موجود ہیں۔ کچھ محققین نے ہولاد ترینہ کا ذکر کیا ہے جبکہ غلام عباس کی اہلیہ زینب نے رضیہ نامی بچی کی وفات کے بارے میں لکھا ہے) نمونیہ کی وجہ سے جانبر نہ ہوئی۔ غزالہ نے یہ گناہ بھی شوہر کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس کی زبان درازی نے غلام عباس کی والدہ کو دوٹوک بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ ساس بہو میں خاصی تخ کلامی ہوئی۔ غزالہ اپنی ہٹ دھرمی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس نے علیحدگی اختیار کر کے کسی قصاب سے شادی کر لی۔ غالباً اسے اپنے تمام تر معیار اس قصاب میں مل گئے تھے۔ گھر ٹوٹنے اور بچے کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن قدرت خود ہی اس کے لیے آسانیاں پیدا کر کے راہیں ہموار کر رہی تھی۔ پھول اور تہذیب نسواں میں طویل مدت گزارنے کے بعد غلام عباس کو دہلی میں 'آل انڈیا ریڈیو' سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ اس نے والدہ اور نانی کی بہن کو ساتھ لیا اور خاموشی سے رخت سفر باندھ کر دہلی روانہ ہو گیا۔

☆......☆

آل انڈیا ریڈیو میں غلام عباس کے ذمے انگریزی خبروں کا اردو ترجمہ تھا۔ اس خبرنامے کا نام 'Hindustani News' تھا۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے رسالے کی ایڈیٹری بھی اسے سونپ دی گئی۔ کچھ روز ہی گزرے تھے کہ ڈپٹی کنٹرولر پروفیسر احمد شاہ بخاری نے اسے اطلاع دی کہ ن۔م۔راشد کو بھی ریڈیو میں ہی ملازمت مل گئی ہے۔ عنقریب اسے بھی دہلی طلب کر لیا جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ خبروں کے ترجمے کا کام اسے ہی سونپ دیا جائے لہٰذا غلام عباس اس کی خبر گیری اور دلجوئی کرتا رہے۔

چند روز بعد راشد دہلی آیا اور شام کی خبروں کے بلٹن کا مترجم بن گیا۔ غلام عباس از راہِ مروت اس سے ملاقات کے لیے اس کے دفتر چلا گیا۔ لاہور شہر' ثقافت' ادب' شاعری اور سیاست پر گفتگو نے ایسا رنگ جمایا کہ تکلفات کے بھی پردے چاک ہو گئے۔ واپسی سے قبل غلام عباس نے ... ہوٹل میں قیام کی بجائے عارضی طور پر اپنے ہاں منتقل ہونے کی دعوت دے دی جو راشد نے بلا تامل قبول کر لی۔ غلام عباس کی والدہ ان دنوں اسپتال میں تھیں جس کے باعث وہ اگلے ایک ماہ تک اسی کے گھر قیام پذیر رہا۔ ان دونوں کی یہ شناسائی گہری دوستی میں ڈھل گئی۔ وہ باہمی دلچسپی کے امور پر گھنٹوں بلا تکان گفتگو کیا کرتے۔

"یار عباس! تمہارا 'جزیرہ سخن وراں' بہت ہی دھانسو ہے۔ تمہاری تحریروں کی سادگی اور دھیما پن دل چھو لیتا ہے۔ اس قدر آسان الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرنے والا ادیب تو میں نے کوئی دیکھا ہی نہیں۔" راشد جھومتے ہوئے کہتا۔

"کبھی دیکھو گے بھی نہیں۔" غلام عباس ہنس کر جواب دیتا۔ اسے ماضی قریب میں اپنے ذخیرہ الفاظ کی کمی یاد آتی۔ ان دونوں کا یہ دوستانہ تعلق ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط ہوتا رہا۔ غلام عباس نے ایک معصوم شرارت کے زیر اثر اس ناول میں راشد کا کردار ایک باغی شاعر کے طور پر استعمال کر کے اسے سخن ناشناسوں کا نشانہ بھی بنوا دیا لیکن راشد کے جذبات میں کوئی بھی تبدیلی نہ آئی۔

ان سب شرارتوں اور ادبی نشستوں سے قطع نظر غلام عباس کی آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی کا سفر نہایت احسن انداز میں رواں تھا۔ وہ اپنے کام سے مخلص اور مکمل پیشہ وارانہ ایمانداری کا قائل تھا۔ اس کے باوجود حاسدین نے اعتراض جڑنے کے لیے اس کے کمزور ترین پہلو پر ضرب لگا دی۔ ریڈیو کے پروگراموں کے رسالہ 'آواز' میں اس کے پیش رو آغا اشرف اور مجاز تھے۔ ان کے بعد غلام عباس کی تقرری پر اسمبلی میں اعتراض جڑ دیا گیا کہ ریڈیو میں جانبداری کا دور دورہ ہے۔ غیر تعلیم یافتہ افراد بھرتی کیے جانے لگے ہیں۔ غلام عباس نامی جس ادیب کو یہ اہم ذمے داری سونپی گئی ہے اس کے پاس کسی بھی یونیورسٹی کی سند ہی نہیں۔ یہ اعتراض سن کر پطرس بخاری کو بہت طیش آیا۔ انہوں نے فوراً جواب لکھ بھیجا۔

"اس شخص کو غیر تعلیم یافتہ کہا جا رہا ہے جس نے چالیس سے پچاس بنگالی' روسی اور مغربی ادیبوں کے شاہکاروں کے تراجم مختلف معتبر رسائل میں شائع کروائے ہیں۔ یہ تصانیف اس قدر شاندار ہیں کہ ان میں سے بیشتر نام معترض نے سنے بھی نہ ہوں گے۔"

پطرس بخاری نے اپنی جانب سے بالکل کھرا اور دو ٹوک جواب پہنچایا تھا لیکن افسوس ناک امر یہ تھا کہ جس وقت اسمبلی میں جواب دیا گیا' اعتراضات جڑنے والے موصوف غیر حاضر تھے۔ بخاری نے ہمت نہ ہاری۔ وہ غلام عباس کے دامن سے یہ داغ مٹوانا چاہتے تھے۔ وہ فوری

طور پر اس سے ملے اور اپنے خلوص سے کہنے لگے۔

''حقائق سے کب تک نظریں چراتے رہو گے؟ اس وقت تو میں تمہاری مدافعت کے لیے موجود ہوں۔ مستقبل میں بھی ہر ممکن طور پر ایسا ہی کرتا رہوں گا لیکن زندگی کا کیا بھروسا؟ اگر کل میں نہ رہا اور کسی نے پھر ایسا ہی اعتراض جڑ دیا تو تمہیں بہت تکلیف ہوگی۔''

''پروردگار آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ میں اس مسئلہ کا کوئی حل نکالتا ہوں۔''

''حل تو پہلے سے ہی موجود ہے۔ تم یونیورسٹی کی کوئی سند حاصل کر کے ان سب کا منہ بند کروا دو۔'' بخاری کی تجویز پر اس نے مکمل رضامندی ظاہر کر دی۔ دوسری جانب ریڈیو میں اس کی ذمے داریاں بڑھنے لگی تھیں۔ اس وقت تک آل انڈیا ریڈیو سے پندرہ روزہ رسالہ 'آواز' شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ہندی رسالا کا اجراء کر دیا گیا۔ یہ تجویز بھی درحقیقت غلام عباس ہی کی تھی۔ 'آواز' کا نصف حصہ اردو میں جبکہ بقیہ نصف ہندی میں شائع ہوتا تھا جسے ہندی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اسے خواہ مخواہ اردو کے ساتھ ہندی کا حصہ پہنچ جاتا تھا اور جسے اردو کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اسے بھی ہندی کے ساتھ اردو حصہ برداشت کرنا پڑتا۔ غلام عباس نے حکام کو تجویز دی کہ رسالے کے دو ایڈیشن شائع کیے جانے ہی بہتر ہیں۔ حکام کو اس مشورے میں کافی افادیت محسوس ہوئی۔ انہوں نے فوراً جواب دیا۔

''ہندی رسالے کا نام تم ہی رکھ لو، یقیناً یہ کام تم سے بہتر کوئی نہیں کر سکے گا۔''

''میرے ذہن میں ایک ہی لفظ مچلتا ہے 'سارنگ' اس کی موزونیت اور گہرائی ہی رسالہ کے لیے بہترین رہے گی۔''

''اس لفظ کا مطلب بھی جانتے ہو کیا؟'' ایک عمر رسیدہ شخص نے قدرے جتلاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں! یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب لفظ ہے۔ اس کے سترہ، اٹھارہ مختلف معنی ہیں۔ کہتے ہیں تو سب دہرا دیتا ہوں۔'' اس نے وقار سے جواب دیا۔ اس لمحہ اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ ڈگری کا حصول کس قدر اہم اور ناگزیر ہو چکا ہے۔ اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ بعد ازاں محکمہ جاتی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس رسالہ کے ادارتی عملہ کا ہر شخص ہندی کا امتحان ضرور پاس کرے گا۔ اس سلسلہ کی پہلی تشکیل کردہ کلاس میں سجاد سرور نیازی اور غلام عباس سمیت دو، تین افراد مزید شامل ہو گئے۔ یہ لوگ چھ ماہ تک ہندی سیکھتے رہے۔ غلام عباس نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماسٹر جی سے دوستی گانٹھ لی۔ اس عمل سے یہ فائدہ ہوا کہ مقررہ وقت اور محکمہ جاتی قواعد سے قطع نظر بھی اسے یہ زبان سیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ ہندی اس کے لیے نا آشنا ہرگز نہیں تھی۔ لاہور میں قیام کے دوران ہندی کے ایک مہاودیالہ میں دو سال تک اس زبان کے اسرار و رموز سیکھے تھے۔ اس سے قبل موسیقی کی تربیت حاصل کرنے کے دوران بھی اس سے مستفید ہوتا رہا تھا۔ مہم جو طبیعت کے باعث اس نے ہندی میں ایسا افسانہ لکھنے کی کوشش بھی کی جس کا ہر ایک لفظ اسی زبان سے مستعار تھا تاہم یہ تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ پانچ، چھ صفحات لکھنے کے بعد ہی وہ اوب گیا اور یہ افسانہ دھول مٹی کی نذر ہو گیا۔

محکمہ جاتی مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا۔ مصروفیات اب بھی بے تحاشا تھیں۔ 'آواز' اور 'سارنگ' کی ادارت سنبھالنے کے ساتھ وہ ریڈیو میں کہانیاں اور ادبی گفتگو نشر

غلام عباس کے شاہکار افسانے 'آنندی' پر 1983 میں بھارت میں 'منڈی' نامی ایک فلم بھی بنائی گئی۔

غلام عباس نے بچوں کی نظموں کے علاوہ غزل اور مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ مشفق خواجہ کے پاس ایک غزل محفوظ ہے۔ اس کے اختتام پر ایک نوٹ لکھا گیا تھا ''کہ غزل مطلع سے عاری ہے۔ مقطع بھی اس صورت میں موجود ہے کہ میرا تخلص بحر، ساحل یا عزم تصور کیا جائے۔'' یہ معاملہ بھی راز ہی ہے کہ اس نوٹ میں 'آپ' سے مراد قارئین ہیں یا کوئی خاص شخصیت جسے دکھانے کے لیے یہ غزل پیش کی گئی تھی۔

بے پر و بالی نہیں منت کش معنی ہنوز
منتہائے اوج ہے حد نظر میرے لیے
یہ مرصع آسماں یہ ماہ و انجم بحر و بر
محو حیرت ہوں کہ کیوں یہ کروفر میرے لیے
ہیں بنات النعش بھی وارفتہ رسم جنوں
ٹوٹنا انجم کا ہے رقص شرر میرے لیے
روکش خورشید ہے ہر قطرہ خوناب اشک
ہے تماشا عشرت عرض ہنر میرے لیے
موج بحر زندگی سرگشتہ ساحل نہیں
ہر نفس ہے دعوت عزم سفر میرے لیے

کرتا۔ ڈرامے اور لمبی اقساط والے پروگرام کی نگرانی کرتا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اس کے دل و دماغ میں ریڈیو کو ایک نئی جہت دینے کا خیال کلبلانے لگا۔ اس نے اپنے زرخیز ذہن کی پٹاری سے ایک اور انوکھا خیال برآمد کر کے نیا اعلان نشر کر دیا۔

''پیارے بچو! ادھر آؤ! دیکھو ہم نے تمہارے دل بہلاوے کا کیسا سامان نکالا ہے۔ اب سے پہلے تمہارے ابا میاں' امی جان' بھائی جان سب کے سب ریڈیو پر بس اپنی ہی مطلب کی چیزیں سنا کرتے تھے۔ کبھی گانا سن لیا' کبھی تقریر سن لی' کبھی خبریں اور کبھی آٹے دال کا بھاؤ۔ تمہاری دلچسپی کی کوئی بات نہ ہوتی تھی لیکن اب ہم نے انتظام کر لیا ہے کہ اگر ہر روز نہ سہی تو کم سے کم ہفتے میں ایک بار آدھا گھنٹا ریڈیو تم سے اور فقط تم سے باتیں کرے۔ تمہیں اپنی اچھی کہانیاں اور پیارے گیت سنائے۔''

اس اعلان کا ردِعمل بہت شاندار رہا۔ کامیابیاں اس کی قدم بوسی کر رہی تھیں۔ پیشہ وارانہ طور پر ذہن پُرسکون تھا۔ گھریلو زندگی بھی خاصی ہموار ہو چکی تھی۔ اس کی والدہ کی ملاقات 'ذاکرہ' نامی خاتون سے ہوئی۔ ذاکرہ کا تعلق 'علی گڑھ' سے تھا۔ والدین اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تو دادی اپنی اکلوتی پوتی کو کلکتہ لے آئی۔ دادی کا گھر خاصہ بڑا اور معاشی طور پر بھی خاصی خوشحالی تھی۔ دادی کے پاس کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ اپنی چچی کے ہاں کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گئی۔ غلام عباس کی والدہ کی اس سے ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ اٹھارہ سالہ ذاکرہ انہیں بے حد بھائی۔ انہوں نے بلا تاخیر بیٹے کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ ابھی کم عمر ہے اور میں ایک بیوی کا تلخ تجربہ بھگتا چکا ہوں۔ عمر میں بھی اس سے کم از کم ایک دہائی بڑا ہوں۔'' اس نے پہلو بچایا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ذاکرہ کی چچی کو تمہاری شادی کی ناکامی کا علم ہے۔ انہوں نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔'' والدہ نے ٹوکا۔ ''باقی رہی بات عمر کے فرق کی تو کم عمر لڑکی بیاہنے کا یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ بہت جلد شوہر کی عادات اور مزاج میں ڈھل جاتی ہے۔''

غلام عباس ان سے مزید بحث نہ کر سکا۔ والدہ کی تنہائی کے خیال سے اس نے ایک بار پھر یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں ذاکرہ اس کی شریکِ حیات بن کر بکھرے ٹوٹے گھر کو سنبھالنے کے لیے چلی آئی۔ گھریلو زندگی میں ایک ترتیب میسر آئی تو قلم کا سفر مزید مہمیز ہو گیا۔ اس نے رسالہ 'پھول' کے لیے کئی کہانیاں لکھیں۔ جزیرہ سخن وراں کے بعد بھی رسالہ 'شیرازہ' میں اس کے افسانے اور ڈرامے شائع ہوتے رہے۔ ان ادبی مصروفیات کے دوران تقدیر اسے دہلی کے اس 'مقام خصوصی' پر لے گئی جسے دیکھ کر اس کے دل میں وہ افسانہ تخلیق کرنے کا خیال پیدا ہوا جسے اشفاق احمد کے 'گڈریا' عبداللہ حسین کی 'اداس نسلیں' اور بانو قدسیہ کے 'راجا گدھ' کی طرح ادبی دنیا میں اس کی دائمی شناخت بننا تھا۔

☆.....☆

دوسری جنگ عظیم کے بادلوں نے ابھی برصغیر کے سیاسی افق کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ غلام عباس کی مصروفیات آل انڈیا ریڈیو اور اس کے رسائل سے ہی وابستہ تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کا مشہور بازار 'چاوڑی' طوائفوں سے خالی کروانے کے بعد انہیں 'کوبرن بچین روڈ' پر رہائش دے دی گئی تھی۔ یہ سڑک پرانے شہر کے باہر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ ریلوے لائن اور اس سڑک کے درمیان لوہے کا ایک اونچا کٹہرا بنایا گیا تھا۔ اس سڑک پر دن رات تانگوں اور موٹروں کی آمد و رفت تو خوب رہتی لیکن اس کے باوجود یہاں رہائشی مکان یا دکانیں وغیرہ کہیں بھی موجود نہ تھیں۔ بس سڑک کے دونوں طرف خالی زمین پڑی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی کی میونسپل کمیٹی نے یہ غیر آباد علاقہ طوائفوں کو الاٹ کر دیا تاکہ شرفائے شہر کے کردار میں خرابی کا تناسب کم ہی رہے اور دوسری جانب وہ طوائفیں بھی یہاں مکان بنا کر اپنے روزگار کا سلسلہ پھر سے جاری کر لیں۔

اس دور میں آل انڈیا ریڈیو کا دفتر دہلی کی 'علی پور روڈ' پر واقع تھا اور غلام عباس کا گھر مخالف سمت میں نئی دہلی کی ایک لین میں تھا۔ دفتر آتے جاتے اس کا گزر اسی برن بچین روڈ سے ہوا کرتا تو علاقے کی تعمیری سرگرمیاں ایک معمول کی طرح اس کی نظروں سے گزرنے لگیں۔ غلام عباس نے دیکھا کہ پہلے پہل تو وہ جگہ کئی ہفتوں تک ویسی کی ویسی ویران پڑی رہی، پھر دھیرے دھیرے اس میں نشو و نما کے آثار سامنے آنے لگے۔ اب اسے راج مزدور' نقشہ نویس' ٹھیکیدار' انجینئر' منشی اور متعدی بھی وہاں چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے۔ وقت کچھ اور آگے سرکا تو تعمیر کی لگن اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ دن کے علاوہ رات رات بھر بھی گیسوں کے لیمپ کی روشنی میں کام ہونے لگا اور چند ہی ماہ میں وہاں

کئی مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب غلام عباس اپنی آمد و رفت کے دوران سوچنے لگا تھا کہ چاوڑی اور برن بجین روڈ کا درمیانی فاصلہ ایک میل سے بھی کم ہے۔ اس طرح ایک شہر کے اندر دوسرا شہر بسانا کیسے ممکن ہوگا؟ پھر دوسری سوچ اس خیال پر غالب آجاتی کہ طوائف بازی تو اس ثقافت کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ 'شرفائے شہر' اس لت سے کیوں کر اور کتنا عرصہ گریز کر سکیں گے۔ ایسے ہی ایک روز انہی خیالات میں گھرا جب وہ گھر پہنچا تو اس کے ذہن پر ایک دھند طاری تھی جس کے پار کچھ الفاظ مبہم سے انداز میں رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور کسی وجدانی قوت کے زیر اثر لکھنا شروع کر دیا۔

''بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے' نہایت فصاحت و بلاغت سے تقریر کر رہے تھے اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔''

رات بھیگتی رہی' خیالات مچلتے رہے' الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے رہے اور قلم کی روانی رکنے کے ہی نہ دی۔ وہ جادوئی لمحے تھے۔ غلام عباس کسی ایسی انوکھی کیفیت کے زیر اثر تھا جسے کوئی بھی نام دینا خود اس کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ افسانہ نہیں لکھ رہا تھا بلکہ ایک منفرد تجربہ کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی کہانی کو افسانوں کے روایتی ماحول و کرداروں سے بالکل الگ رکھا۔ یہاں کوئی ہیرو تھا' نہ اینٹی ہیرو۔ کوئی ہیروئن تھی' نہ دیگر ضمنی کردار۔ وہ پورے معاشرے کو واحد کردار کے طور پر معرض وجود میں لا رہا تھا۔ اس تخلیق کے دوران اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ کرداروں اور واقعات سے محروم کہانی میں قارئین کی دلچسپی کیونکر قائم رہ سکے گی لیکن اس روز ہر مشکل خود بخود حل ہوتی جا رہی تھی۔ غلام عباس نے کہیں نثر میں ایک قسم کی ہلکی رعنائیت پیدا کرنے کی کوشش کی تو کہیں اسے نظم منثور (پروز پوئم) کا رنگ دے دیا۔ رنگ آمیزی' رنگین بیانی' زبان کے چٹخارے اور طنز کے پیرائے کا سہارا لیتے ہوئے اس نے 'آنندی' مکمل کر کے ملک و قوم کے چند نام نہاد خیر خواہوں اور دردمندوں کو یہ آئینہ دکھایا کہ اگر وہ اپنے شہر سے زنان بازاری نامی بدی کو نکال کر یہ گمان کرتے ہیں کہ اس کا دائمی خاتمہ ہو گیا ہے تو وہ حماقت اور خوش فہمیوں کی معراج پر ہیں۔ ممکن ہے کہ سو دو سو برس کے لیے اصلاح ہو جائے اور شر خیر کی صورت اختیار کر لے لیکن بدی کا خمیر اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ وہ اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے اور پھر کسی روز موقع پاتے ہی اپنے اخراج کا رستہ تلاش کر لیتا ہے۔

'ادب لطیف' میں آنندی کی اشاعت ایک تہلکہ ثابت ہوئی۔ وہ غلام عباس جسے کچھ عرصہ قبل اسمبلی میں ملازمت کے لیے نااہل قرار دیا جا رہا تھا' اب یکدم ہی ایک مستند اور قد آور ادیب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ہم عصر ادیب رشک و حسد کے جذبات میں مبتلا تھے تو نقاد انگشت بدنداں۔ وہ سب اسی حیرت سے سنبھل نہ پا رہے تھے کہ ''افسانہ اس انداز میں بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔''

کچھ افراد نے اسے 'اناطول فرانس' کے افسانے سے مماثل بھی قرار دیا لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ ماخوذ کہیں یا طبع زاد۔ اردو ادب میں ایک شاہکار تخلیق ہو چکا تھا۔

☆.....☆

'آنندی' کی تخلیق کے بعد غلام عباس کی مصروفیات کا وہی عالم رہا۔ اس کے حلقہ احباب میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سب دوست ایک دوسرے کے گھر محفل جما کر خوب ہلہ گلہ کرتے۔ کبھی وہ پطرس بخاری کے گھر جمع ہو جاتے تو کبھی ڈاکٹر تاثیر اور ذوالفقار میزبان بن جایا کرتے۔ اپنی تازہ تحاریر ایک دوسرے کو سنائی جاتیں۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ رات گئے تک یہ جمع برخاست ہوتا تو گھر پہنچتے صبح کے چار بھی بج جایا کرتے۔

اسی طرح ایک بار وہ دوستوں کے ساتھ رات کے گیارہ بجے کار میں ہوا خوری کے لیے نکلا۔ دوست احباب بہت ترنگ میں تھے۔ اس نے بہتیرا کہا کہ مجھے ڈھنگ کا لباس تو پہن لینے دو لیکن انہوں نے سن کے ہی نہ دی۔ غلام عباس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ افراتفری کے عالم میں اسی کے اوپر اوورکوٹ پہن لیا اور گلے میں گلوبند لپیٹ لیا تاکہ معقول صورت معلوم ہو سکے۔ کار میں تاثیر /

فیض اور پطرس بھی موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پطرس نے سنبھال رکھی تھی۔ بات چیت، ہنسی مذاق اور چٹکلوں میں ایسے محو ہوئے کہ سامنے سے آتا ہوا ٹرک دکھائی ہی نہ دیا۔ متوقع حادثے نے ان سبھی کو یکدم گنگ کر دیا۔ گھر آنے کے بعد بھی غلام عباس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ لاشعور میں ایک خلش کلبلا رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی کیفیت میں اپنا اوورکوٹ اتارنے لگا تو ذہن میں یکدم جھماکا ہوا اور ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔ اس وقت ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اگر اس حادثے میں ٹرک سے ٹکراؤ ہو جاتا تو زخمی یا مردہ حالت میں اسپتال پہنچائے جاتے۔ اسپتال کا عملہ اس کا اوورکوٹ اتارتا تو اندر سے ایک پرانی سی بنیان نکلتی۔ یہ صورت کس قدر شرمناک ہوتی کہ بظاہر جینٹل مین نظر آنے والا یہ شخص اندر میلی بنیان پہنے ہوئے تھا۔ غلام عباس پر ایک بار پھر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس لمحہ اس نے اپنے اردگرد لاہور کی جانی پہچانی خوشبو محسوس کی۔ دھند کے پار الفاظ کا رقص تھم کر اس کے سامنے قطار در قطار آ کھڑا ہوا۔ اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنا شروع کیا۔

''جنوری کی ایک شام کو خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پہنچا اور چیئرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصہ فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں، بادامی رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سنک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔''

رات پھیلتی رہی، الفاظ قطار در قطار کھڑے اپنی باری کے منتظر رہے، قلم رواں رہا اور اردو ادب میں 'اوورکوٹ' کی پیدائش ہوگئی۔ (اس تحریر کو 'گوگول' کے مشہور افسانہ Overcoat سے مماثل بھی قرار دیا گیا لیکن خود مصنف نے ہمیشہ اس بات کی تردید کی)

دہلی کا یہ قیام غلام عباس کے لیے تخلیقی اعتبار سے بہت زرخیز ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ تانگے میں حوض قاضی سے فتح پوری جاتے ہوئے ایک سنگ تراش کی دکان پر ایسا پتھر دیکھا جس پر محض ایک نام لکھا ہوا تھا۔ اس کتبے کو دیکھ کر اسے فوری طور پر یہ خیال آیا کہ اس میں متعلقہ شخص کے مرنے کے بعد دوسری تفصیلات کا اضافہ کیا جائے گا۔ اسی لمحہ دماغ میں افسانہ مکمل ہوا اور رات کے چند ہی گھنٹوں میں 'کتبہ' جیسا دل چھو لینے والا افسانہ تخلیق ہوگیا۔

افسانہ نگاری کے علاوہ اسے پطرس بخاری سے کیا گیا وعدہ بھی فراموش نہیں ہوا تھا۔ اس نے مصروفیات کے باوجود کسی نہ کسی طرح پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ 1941 میں 'ادیب عالم' 1942 میں 'ایف اے' کا امتحان پاس کر کے بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ (غلام عباس کا گریجویشن تقسیم ہند کی نذر ہوگیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود امتحان نہیں دے پایا تھا) گھریلو زندگی بھی بہت پُرسکون انداز میں رواں تھی۔ 1942 میں ہی بڑی بیٹی 'شہرزاد' 1944 میں دوسری بیٹی 'ناہید' اور 1946 میں بیٹے 'علی سجاد' کی پیدائش نے زندگی میں بہت سے نئے اور پُرکیف رنگ بھر دیئے۔ آنندی کا جادو سات برس گزرنے کے بعد بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایک سال قبل 1945 میں رسالہ 'انصاری' میں محمد حسن عسکری' کا مضمون 'کچھ آنندی کے بارے میں' شامل ہوا۔ پھر رواں برس غلام عباس ہی سے 'آنندی' نامی ریڈیو ڈراما لکھوا کر نشر کروایا گیا۔ اسی سال 'وقار عظیم' کے مرتب کردہ رسالہ 'نیا افسانہ' میں بھی آنندی شامل کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب برصغیر کے سیاسی افق پر تقسیم کی گھٹاؤں کا راج تھا۔ حالات بے حد تبدیل ہو چکے تھے۔ ہر ایک فرد غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا۔ 'حلقہ ارباب ذوق' کے تحت پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حامد علی خاں، ن م راشد، فیض، سید محمد جعفری، اعجاز حسین بٹالوی، ضیا جالندھری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، محمد طفیل الرحمٰن، پریم ناتھ، عبادت بریلوی اور خود غلام عباس سمیت کئی نئے ادیب و شاعروں کا اجتماع برس ہا برس کا معمول تھا۔ بعد ازاں راشد کو فوج میں ملازمت ملی تو وہ اس حلقہ میں پڑھی جانے کے لیے اپنی تازہ نظمیں غلام عباس کو بھجوا دیا کرتا۔ بہت اہتمام اور محبت سے جاری شدہ یہ سلسلہ بھی اس زمانے میں بے یقینی سی کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ ہر اتوار کو باقاعدگی سے ہونے والے اجلاس فسادات کی زد میں آ گئے۔ تقسیم ہند کے موقع پر بھڑکنے والی فسادات کی

آگ میں ادیبوں کا گھر سے نکلنا اور جائے جلسہ 'اینگلو عربک کالج' تک پہنچنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود ان سب کی ادب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جہاں بھی دو چار ادیب جمع ہوتے' حلقے کا اجلاس منعقد کر لیتے۔ ان دنوں غلام عباس کی رہائش منٹو روڈ پر تھی۔ عبادت بریلوی کا مکان اس کے گھر سے کافی قریب تھا۔ وہ خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کسی بھی طرح پانچ منٹ میں اس کے پاس پہنچ جاتا، ایک مرتبہ یوں بھی ہوا کہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب عبادت اس کے گھر آیا تو فسادات پر گفتگو کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی دوران حلقے کے اجلاس کا ذکر ہوا تو غلام عباس نے اتوار کے روز اپنی رہائش گاہ پر ہی اکٹھے ہونے کی تجویز دے دی۔ اس کا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ چند احباب کی آمد سے ہی سہی لیکن جلسہ بہر صورت منعقد ہونا چاہیے۔ عبادت نے ہر ممکن طریقے سے مختلف ادیبوں کو اطلاع پہنچا دی اور اتوار کو شام چار بجے منٹو روڈ پہنچ گیا۔ ایک گھنٹے بعد صرف ایک اور شاعر کی آمد ہو سکی۔ انتظار کی مزید طویل گھڑیوں کے بعد عبادت نے بوجھل دل سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جلسہ شروع کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! کیے لیتے ہیں۔'' اس کا دل بھی افسردہ تھا۔

''آپ اس اجلاس کے صدر ہیں۔ افسانہ پڑھ دیجیے۔'' عبادت نے کہا۔ ''میرے پاس ایک مختصر مضمون ہے وہی پڑھ لوں گا۔ نظم کے لیے شاعر بھی موجود ہے۔ اب صرف ایک اور سامع کی ضرورت ہے۔ ممکن ہو تو کوئی انتظام کر دیجیے۔'' اس کی بات پر غلام عباس خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور اذیت کی پرچھائیاں تھیں۔ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''میرے پاس ایک کتا ہے۔ اس کو بٹھا لیتے ہیں۔ وہ ضرور ہماری نگارشات سے لطف اندوز ہو گا۔ بہت سمجھدار اور فرماں بردار ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بھاری قدموں سے اٹھا اور اپنے کتے کو کمرے میں لے آیا جس کے بارے میں کیا جانے والا دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ سکون سے بیٹھا ان تینوں کا مضمون' افسانہ اور نظم سنتا رہا۔ شہر میں بھڑکنے والی فسادات کی آگ اور خون خرابہ کے باوجود حلقہ ارباب ذوق دہلی کا یہ عجیب و غریب اجلاس تلخ اور ان مٹ نقوش چھوڑ کر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

☆.....☆

غلام عباس کے مسودات میں ایک مثنوی بھی پائی گئی۔ ایک نوٹ بک پر لکھی گئی اس مثنوی کے ہر صفحے پر پانچ اشعار درج تھے جبکہ کل تینتالیس صفحات پر دو سو سے زائد اشعار موجود تھے۔ اس مثنوی کو شاعر کی جانب سے کوئی عنوان یا سن اشاعت نہیں دیا گیا۔ اغلب امکان یہی ہے کہ یہ 'چاند تارا' کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

''کبھی چین میں ایک تھا بادشاہ
ہمارا تمہارا خدا بادشاہ
تھا فرخندہ بخت اور روشن جبیں
اسے خلق کہتی تھی خاقان چیں
وہ عادل تھا اور نیک دل نیک خو
تھا شہرہ ان اوصاف کا چار سو
رعایا تمکن اور خوش تھی سپاہ
تھا آزاد ہر فکر سے بادشاہ
اسے حسن سے تھا عجب ہی لگاؤ
وہ صنعت گری کا بھی رکھتا تھا چاؤ
محل تھا سفید اس کا بلور کا
یہ سمجھو بنا تھا وہ بس نور کا''

ہندوستان کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل مسلمان سرکاری ملازمین سے خصوصی طور پر پوچھا گیا تھا آیا وہ پاکستان جانا چاہتے کہ یہیں قیام کریں گے۔ غلام عباس کی دور اندیشی کہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کے لیے سرزمین ہند تنگ ہو جائے گی، یہ بھانپ گئی تھی۔ اس نے بلا تامل اپنا نام پاکستان منتقلی کے لیے لکھوا دیا۔ دہلی میں شاندار اور یادگار برس بسر کرنے کے بعد وہ بذریعہ ریل گاڑی دہلی سے لاہور آیا تو اس وقت قائداعظم محمد علی جناح کا وہ پہلا مسودہ بھی اس کے پاس موجود تھا جو قیام پاکستان کے موقع پر پوری قوم کو سنانے کے لیے بطور خاص تیار کیا گیا تھا۔ غلام عباس کا لاہور تک بخیر و عافیت سفر بھی کسی خوش قسمتی سے کم نہ تھا۔ وہ ریل گاڑی اپنی نوعیت میں تاریخ ساز تھی کیونکہ اس کے بعد روانہ ہونے والی ہر ایک گاڑی پر بلوائیوں کی جانب سے حملے کیے گئے تھے۔ فسادات کا خونریز سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ لاہور آمد کے فوری بعد اس کے ہاں ایک اور بچی کی ولادت ہوئی۔ طاہرہ کی پیدائش کے بعد اسے ریڈیو پاکستان کراچی

میں ملازمت مل گئی اور اسی برس وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کراچی منتقل ہو گیا۔ اگلے ایک برس میں حالات بہتر ہوتے ہی ریڈیو پاکستان کے پندرہ روزہ اردو رسالہ 'آہنگ' کا اجرا ہوا۔ اس کی ادارت کے لیے غلام عباس کے سوا کوئی دوسرا بہترین انتخاب نہ تھا۔ روزگار کا سلسلہ توازن ہوا تو مکتبہ جدید کی جانب سے 'آنندی' بطور افسانوی مجموعہ شائع کر دیا گیا۔ صاحب کتاب ہونے کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات سے وابستہ ہو کر کرنل مجید کے ماتحت اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ناقدین کی جانب آنندی کتاب کو ملنے والی پذیرائی اور توصیف اسے سرشار رکھتی۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں اور ناقدین کی جانب سے اس افسانہ کو اردو ادب کے دس بہترین افسانوں میں شامل کر دیا گیا۔ اس مجموعہ پر تبصروں کے علاوہ 1948ء میں ہی پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس لاہور نے نقد انعام سے نوازا۔ اس وقت صنف نظم کے لیے صوفی تبسم کے مجموعہ 'جھولے' اور نثر میں 'آنندی' نے میدان مار لیا تھا۔ دوسری جانب ریڈیو پاکستان میں اس کی اہمیت اور قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ اس کی سفارش کا سہارا لے کر مستحق افراد کو نوکری دلوائی جاتی۔ اسی برس نومبر میں سعادت حسن منٹو نے ایک خط لکھ بھیجا۔

''تمہارا افسانہ 'دوسری بیوی' شاید عنوان کچھ اور ہے خوب تھا، مجموعہ مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں تمہاری شرکت بے حد ضروری ہے۔ تمہارے قریب قریب سارے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں جو بھی نیا لکھا ہو بھیج دو۔ ممنون رہوں گا۔ لاہور کب آؤ گے؟''

ان دوطرفہ پیشہ وارانہ کامیابیوں کے خمار میں غلام عباس کا تخلیقی عمل قدرے سستی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس دور میں 1949 کے رسالہ 'ماہ نو' میں ایک فرانسیسی افسانے کا ترجمہ بعنوان 'ترکی ٹوپی' شائع ہوا لیکن یہ بھی تازہ تخلیق نہ تھی۔ یہ ترجمہ 1927 کے رسالہ 'نیرنگ خیال' میں پہلے بھی شائع ہو چکا تھا۔ غلام عباس اپنے مزاج کی اس سستی اور قلم پر طاری جمود سے نجات حاصل کرنے کے لیے راہیں ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ تقدیر ایک اور بہترین موقع کے ساتھ اس کے در پر دستک دینے لگی۔

☆.....☆

مشاہدات، تجربات اور مردم شناسی کے دلدادہ غلام عباس کا دل کچھ عرصہ سے ولایت سفر اور قیام کے لیے مچلنے لگا تھا۔ بحیثیت ادیب اسے اچھی طرح علم تھا کہ مختلف علاقوں کی سیاحت، نت نئے لوگوں سے ملاقات اور ماحول کی تبدیلی اس کے کرداروں اور تحریروں کو یقیناً نیا دوام بخشے گی۔ اس کے علاوہ احباب سے بی بی سی لندن کے قصے سن کر قوت تسخیر آزمانے کا میلان بھی بڑھنے لگا تھا۔ اتفاق سے 1949 میں بی بی سی لندن میں ایک پروڈیوسر کے لیے آسامی نکلی۔ غلام عباس نے امتحان دیا اور منتخب بھی ہو گیا۔ اسے تین سال کے لیے بی بی سی اردو پروگرام کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس وقت لندن کے بی بی سی میں کل سات آدمی تھے جن میں سے صرف غلام عباس کی نوکری پکی تھی۔ تنخواہ بارہ سو پاؤنڈ سالانہ مقرر ہوئی۔ احباب اس تقرری پر بیک وقت خوش اور تشویش زدہ تھے۔ پطرس بخاری نے دیرینہ رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے اسے حقائق سے آشنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا۔

''آپ کا خط کل ملا۔ آپ کی ترقی کا حال پڑھ کر از حد مسرت ہوئی۔ بی بی سی میں کچھ عرصہ ملازمت کا خیال دلکش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بی بی سی والے آپ کے کام اور شرافت طبع سے بے حد مطمئن ہوں گے اور آپ کو عزت سے رکھیں گے۔ نہ معلوم آپ کے چلے جانے کی کیا صورت ہے؟ کیا دوران ملازمت پاکستان کی کسی آسامی پر آپ کا استحقاق قائم رہے گا یا نہیں؟ بی بی سی میں جو پاکستانی یا ہندوستانی نوکر ہوتے ہیں انہیں بیشتر وطن واپس آ کر تکلیف ہوتی ہے۔ کئی عرصے تک ان کے پاؤں جمنے نہیں پاتے اور وہ ڈانواں ڈول رہتے ہیں۔ واپس تو ایک دن آنا ہی ہوگا۔ اس امر کا خیال ضرور رکھ لیجیے کہ واپسی کی کیا صورت ہوگی؟''

اس متن نے غلام عباس کو چوکنا کر دیا۔ تمام امکانات ذہن میں رکھتے ہوئے وہ لندن روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اہل خانہ کو ساتھ لے جانے کی خواہش اور کوشش پوری نہ ہو سکی۔ لندن پہنچنے کے بعد کام کا آغاز ہو گیا۔ کام کی نوعیت بلاشبہ اس کے معیار کے مطابق تھی لیکن اہل خانہ سے دوری اور تنہائی مزاج پر قنوطیت طاری کرنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی سے برکت و آسانی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ وہ کبھی افراد خانہ سے اتنا عرصہ دور نہیں رہا تھا۔ احساس تنہائی ہی کیا کم تھا کہ وہاں سب ذاتی کام بھی خود ہی کرنے پڑتے۔ افسردگی اور قنوطیت کے دور لمبے طویل

ہونے لگے۔ افسردگی اب بیزاری اور چڑچڑے پن میں ڈھلنے لگی تھی۔ اپنی پینتالیس سالہ زندگی میں ایسی کیفیات پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھیں۔ چھ ماہ اسی کشمکش میں بیت گئے۔ دھیرے دھیرے اسے احساس ہونے لگا کہ جمود کی اس کیفیت کو خود ہی مضبوط قوت ارادی سے شکست دینی ہوگی۔ غلام عباس نے وقت گزاری کے لیے وائلن، گٹار اور بانسری کی گھنٹوں مشقیں کیں۔ لاہور میں استاد عبدالوحید سے سیکھے گئے رموز موسیقی خوب کام آرہے تھے۔ اس کے بعد وہ روزانہ پرانی کتابوں کی خریداری کرنے لگا۔ مصوری سیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن اس میدان میں کامیابی بہرحال کوسوں دور ہی رہی۔ بازاروں کی خاک چھاننے کے دوران اسے موسیقی کے ریکارڈ جمع کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ وہ بلاناغہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مغربی موسیقی کو ہندوستانی موسیقی کے قواعد میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ موسیقی، کتابوں اور مصوری کے ساتھ ساتھ اس کا میلان صنف نازک کی طرف بھی بڑھنے لگا تھا۔ اہل خانہ اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھے غلام عباس کے معمولات میں یہ تبدیلی غیر فطری نہیں تھی۔ فضاؤں کی لطافت اور کثافت انسانی کردار پر بہرصورت اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ اس زمانے میں دو خواتین کے ساتھ رومانوی معاملات عروج پر رہے۔ غلام عباس اپنی ان تبدیلیوں کی وجہ سے بے زاری میں بھی مبتلا ہونے لگتا۔ ان خواتین کے ساتھ بسر کیا گیا وقت سرشاری اور خمار سہی تاہم کبھی کوئی ایسا لمحہ بھی آتا جب اسے ایک احساس تازیانہ بن کر لگتا کہ فرنگیوں کے دیس میں آکر وہ انہی کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہ کشمکش یونہی جاری رہتی لیکن ایک جھٹکے نے اسے سنبھلنے پر مجبور کردیا۔ ایک خاتون نے اپنے تعلقات کا نتیجہ اولاد کی صورت میں برآمد ہونے کی خبر سنائی تو حیرت، صدمہ اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ مادر پدر آزاد مغربی معاشرے میں یہ بات ایک معمول سہی لیکن غلام عباس جیسے مشرقیت پسند شخص کے لیے ایسے نتائج اور اپنے نام کے ساتھ بدنامی سہنا کیونکر ممکن تھا؟ اس نے اپنی غیر نصابی سرگرمیاں فوراً ترک کردیں۔ کچھ عرصہ پھر وہی تنہائی، بے زاری اور افسردگی غالب رہی پھر اس کی ملاقات Christian سے ہوئی۔ 'کرس' کہلائی جانے والی یہ انگریز نژاد خاتون اس کی زندگی میں اب تک آنے والی تمام خواتین سے مختلف تھی۔ اس سے گفتگو اور کسی بھی موضوع پر تبادلہ خیال کے دوران پیدا ہونے والی سرشاری تو غزالہ اور ذاکرہ سے بات چیت میں بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ غلام عباس نے اسے اپنے حلقہ سب کچھ سچ بتا دیا۔ اس نے اپنے پرس میں موجود بچوں کی تصویریں بھی کرس کو دکھائیں۔ وہ اس کی ہر ایک بات نہایت توجہ اور وقار سے سنتی۔ اسے بھی اس پاکستانی مصنف سے بہت انسیت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں سیر و تفریح کرتے۔ باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے نہ تھکتے۔ غلام عباس نے یہ حقیقت تسلیم کرلی تھی کہ اس کی روح آج تک کرس جیسی محبت اور خلوص کی چاشنی کی ہی متلاشی تھی۔ انہوں نے مقامی قانون کے مطابق شادی کی اور لندن میں Elsworthy Terrace کے ایک فلیٹ میں اکٹھے رہنے لگے۔

جذباتی بحران اور تلاطم پُرسکون ہوا تو پیشہ وارانہ ذمے داریاں بھی مزید لگن سے ادا ہونے لگیں۔ بی بی سی لندن میں اس کا کام انگریزی خبروں کو اردو میں منتقل کرنے کا تھا۔ بعدازاں اسے اردو پروگرام کی نگرانی کا کام بھی سونپ دیا گیا۔ ادبی میدان میں بہرحال جمود طاری تھا۔ 'پھول' میں چند کہانیوں کی اشاعت کے علاوہ صرف 'نادود' کے لیے افسانہ 'سایہ' 'سرخ جلوس' اور ڈراما 'کنارہ' ہی تخلیق ہوسکے۔ 'سایہ' میں غلام عباس کا قلم اپنے جوبن پر نظر آیا۔ اس کی کہانی ایک ٹھیلے والے کے گرد گھومتی تھی جس نے معزز خاندان کے گھر کی دیوار تلے برسہا برس ٹھیلا لگایا اور ایک مکمل نسل کو اپنے سامنے جوان ہوتے دیکھا۔ اسی دوران گھر کی بڑی لڑکی کی شادی طے ہوگئی۔ اپنے کمرے کی بند کھڑکی کے پیچھے بے چینی سے ٹہلتی اس لڑکی کا احوال اور افسانے کی دیگر جزئیات نے قارئین کو اپنے سحر سے نکلنے ہی نہ دیا۔ کہانی لطافت سے دھیمے دھیمے انداز میں اپنی کلائمکس کی طرف بڑھتی رہی۔ قاری کو قطعی طور پر یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ لڑکی پر آخر کیا گزری تھی؟ وہ شادی طے ہوتے ہی بیمار اور مضطرب کیوں رہنے لگی تھی؟ کیا وہ اپنے بھائی کے اس دوست کو پسند کرتی تھی جو اکثر کھیلنے کے لیے ان کے گھر بھی آتا؟ کیا اس کی زندگی میں کوئی اور روگ تھا؟ غلام عباس نے کہانی صرف ٹھیلے والے کی آنکھ سے دکھا کر لڑکی کے انجام سے بے خبر رکھا۔ افسانے کو ٹھیلے والے کی تشویش اور بے چینی پر ختم کرنا فنکارانہ تکنیک تھی۔ ان جانی تذبذب قاری کو یہ تحریر فراموش کرنے ہی نہیں دیتی۔ اس کہانی نے بھی پسندیدگی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔

☆.....☆

غلام عباس کا تین سالہ لندن قیام رفتہ رفتہ اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔

کرس کے ساتھ فرانس اور اسپین کے تاریخی مقامات دیکھتے ہوئے اسے اپنی روح تک سرشاری محسوس ہوا کرتی۔ اس تمام تر سیر و سیاحت کے ذریعہ وہ اپنے ادبی سفر کا مزید ایندھن جمع کر رہا تھا۔ سیر و سیاحت کے علاوہ ایک اور سرگرمی بھی اسے بہت مرغوب تھی۔ اس زمانے میں لندن میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی مشترکہ طور پر ادبی جلسہ یا مشاعرہ منعقد کروایا کرتے تھے۔ وہ بصد شوق ان جلسوں میں شریک ہوتا۔ ایک روز اسے پطرس بخاری کا خط ملا۔ پطرس اس وقت نیویارک کے اقوام متحدہ میں نمائندگی کر رہے تھے۔ خط میں اقوام متحدہ میں کسی ملازمت کی گنجائش کا ذکر موجود تھا۔ غلام عباس نے اپنی رضامندی تو ظاہر کر دی لیکن حالات قدرے الجھ گئے تھے۔ پہلے کرس نے اپنی ناپسندیدگی جتاتے ہوئے اپنے شوہر کے محض ایک تخلیق کار ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ پطرس بخاری کے اگلے خط نے صورتِ حال کچھ واضح کی۔

''حالات یہ ہیں کہ اب یو۔ این والے پھر راشد کی طرف راغب معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے آپ کا نام یوں آگے چلایا تھا کہ راشد سے آنے کی اُمید بالکل مٹ چکی تھی۔ وزارت نشریات نے مجھے اطلاع دی کہ راشد کو وہ مستعار دینے پر تیار ہیں۔ وزارت ہی نے آپ کا نام راشد کے بدلے تجویز کیا۔ اس پر میں نے آپ کو لکھا' پھر آپ کے کوائف یو۔ این والوں کے پاس بھیجے۔ ان کے کہنے پر آپ کی آواز کے ریکارڈ بھی انہیں بھجوائے۔ چند دن ہوئے معلوم ہوا کہ ادھر نہ یو۔ این والے پھر سے راشد کو بلانے پر غور کر رہے ہیں اور ادھر راشد استعفیٰ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب میں بالکل بے خبر ہوں کہ راشد آخرالامر استعفیٰ دے کر کراچی کو خیرباد کہیں گے یا نہیں؟ ان کا استعفیٰ وہاں منظور ہوگا یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب ابھی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ راشد صاحب تو یو۔ این والوں کا اوّل انتخاب ہیں لیکن باقی مسئلے ابھی الجھے ہوئے ہیں۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ آپ اپنا پروگرام یو۔ این سے بے نیاز ہو کر مرتب کیجیے۔ آتا ہو تو ہاتھ نہ دیجیے۔ جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے۔ اس کے علاوہ اندریں حالات اور چارہ ہی کیا ہے۔ کوئی بات پتے کی اور محکم معلوم ہوئی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ مگر جیسے حالات ہوں گے اس کے مطابق آپ اپنے دستورالعمل میں ردوبدل کر سکتے ہیں۔''

پطرس کا یہ صاف گو خط پڑھ کے غلام عباس کو سابقہ تشویش بھی یاد آ گئی۔ واپسی کا وقت نزدیک تر تھا۔ اس سے قبل اپنے تحفظات دور کرنے کا یہی مناسب موقع تھا۔ پطرس کے چھوٹے بھائی زیڈ۔ اے بخاری اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کی لندن آمد کے دوران غلام عباس کی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی تھی۔ بخاری نے اس سلسلہ میں مدد کا وعدہ بھی کیا۔ واپسی کے بعد کے حالات کے بارے میں دونوں کی خط و کتابت بھی رہنے لگی۔ ایسے ہی ایک خط میں زیڈ۔ اے بخاری نے جواب میں لکھا۔

''کل آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے آپ بھی وجوہ ولایتی ہو گئے ہوں۔ توبہ اتنی بھی ہوا خوری کیا معنی؟ اتنا عرصہ سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی جو مستقل تنخواہ ہے اس سے کم آپ کو ملنے کا امکان نہیں۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد کہ بجوزہ تنخواہ ایڈیٹر' آہنگ' کی تنخواہ سے کم ہے' آپ کی معاملہ فہمی پر دلالت نہیں کرتا۔ آپ کا یہ ارشاد کہ آپ وزارت امور کشمیر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں اور اس آسامی کی تنخواہ سات سو پچاس سے شروع ہوتی ہے' آپ کی ہمہ گیر علم کی غمازی نہیں کرتا کیونکہ آپ وزارت امور کشمیر کو الوداع کہہ چکے ہیں اور اس حق سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ جو آپ کا مشاہرہ ہزار پاؤنڈ سالانہ کی شرح سے مقرر کیا ہے' ہر چند کہ باعث خوشنودی ہوا اور ہم بے بضاعت اور کم مایہ لوگوں کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہوا تاہم آپ کی مسلمہ وقت نظری کا شاہد نہیں کیونکہ اس مشاہرے میں بہتہ بھی شامل ہے اور غیر ملکی مصالح بھی کارفرما ہیں۔''

اس خط کے بعد غلام عباس نے خاموشی سادھ لی۔ حالات و واقعات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ان دنوں مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری جی۔ احمد سرکاری کام سے لندن آئے۔ انہوں نے بی بی سی لندن کے مسلم اسٹاف کو چائے پر مدعو کر لیا۔ ان افراد میں اسلم ملک' حفیظ جاوید' نور احمد چوہان' صدیقی احمد صدیق' امجد علی اور غلام عباس شامل تھے۔ ان میں غلام عباس کے علاوہ کسی کی ملازمت بھی مستقل نہ تھی۔ عارضی ملازمین نے بہت جتن کر کے یہ نوکری حاصل کر رکھی تھی۔ اس روز جی۔ احمد صاحب بہت حب الوطنی سے سرشار تھے۔ وہ

مہمانوں کا مزاج بھانپے بغیر اپنی ہی لے میں گفتگو کرتے رہے۔

''گورے ہمارا ملک تو آزاد کر گئے لیکن ہمارے دل و دماغ سے غلامی کے جراثیم ختم نہ ہو سکے۔'' انہوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''جی ہاں! بات تو درست ہے۔ یہاں تعصب اور نسل پرستی میں آج بھی ہم ایشیائی افراد کو 'کالے آدمی' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔'' ایک مہمان نے بتایا۔

''پھر بھی آپ سب کو انگریزوں کی نوکری کا اتنا شوق ہے کہ یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے وطن واپس آئیے۔ ہمارے ہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ ہم گرم جوشی سے بانہیں وا کیے آپ کا استقبال کریں گے۔'' ان کی بات پر کچھ افراد نے ناپسندیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان سب نے اتنے جتن واپس جانے کے لیے تھوڑے ہی کیے تھے۔ انہوں نے میزبان کی بات سنی ان سنی کر دی لیکن یہ نکتہ غلام عباس کے دل میں گھر کر گیا۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ اس نے بی بی سی کی جانب سے ملنے والی برطانوی شہریت' غیر معمولی تنخواہ' عہدنامہ میں مزید تین سالہ توسیع سمیت ہر پیشکش ٹھکرا دی۔ یہ فیصلے کرتے ہوئے اسے ذرا بھی ملال محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے لندن میں خریدی گئی کتابیں اور موسیقی کے ریکارڈ بھی فروخت کر دیئے۔ دو جولائی 1952 کو وہ 'لیور پول' سے بذریعہ بحری جہاز پاکستان روانگی کے تیار تھا۔

''تو بالآخر آپ جا رہے ہیں۔'' کرس نے اپنی افسردگی کو مسکراہٹ کے نقاب میں چھپایا۔

''ہاں! بالآخر جانا تو تھا ہی۔''

''مجھے بھول تو نہیں جائیں گے؟'' اس نے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات تمہیں بھی پتا ہے۔'' وہ سختی سے بولا۔

''پاکستان میں آپ کی بیوی بچے موجود ہیں۔ ان سے آپ کا رشتہ مجھ سے زیادہ پرانا اور پائیدار ہے۔ وہاں جانے کے بعد دل بدل بھی سکتا ہے۔''

''تم سے میرے رشتے کی گہرائی لامحدود ہے۔ میں آخری سانس تک تم سے وابستہ یہ بندھن نبھاؤں گا۔'' اس کا انداز چٹانی تھا۔

''آپ وہاں جا کر اپنے گھر والوں سے بات کرتے ہی مجھے بلا لیں۔ میں سب کچھ چھوڑ کر آنے کے لیے تیار ہوں۔'' کرس نے بھی جوابی وعدہ کیا۔

''ٹھیک ہے! میں کراچی میں ایک نئے مکان کا بندوبست کر کے تمہیں بلوا لوں گا۔''

وہ دونوں ہی زبان کے دھنی ثابت ہوئے۔ غلام عباس کا خط پا کر انگلستان سے تنہا روانہ ہوئی اور بائیس اکتوبر کو کراچی پہنچ گئی۔ بندرگاہ پر غلام عباس اسی کا منتظر اور سراپا چشم تھا۔ وہ اسے اپنے اہل خانہ سے ملوانے چلا آیا۔ وہ علاقہ قدرے پسماندہ تھا۔

''کچھ دن پہلے ہی سب کو لاہور سے یہاں بلوایا ہے۔ ابھی عارضی طور پر اس علاقہ میں مقیم ہیں' پھر سرکاری گھر تو مل ہی جائے گا۔'' راستے میں اس نے کرس کو بتایا۔ وہ جواب میں محض سر ہلا کر رہ گئی۔ کرس فطری طور پر کچھ جھجک رہی تھی۔ بچوں نے بڑی شائستگی سے شرماتے ہوئے اسے سلام کیا۔ کرس نے مسکراتے ہوئے خوشدلی سے جواب دیا۔ اتنے میں غلام عباس کی والدہ نے اس کی تھکاوٹ کا احساس کرتے ہوئے بازو سے تھاما اور ایک کمرے میں لے گئیں۔ اگرچہ کرس کو ان کی زبان بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی اس کے باوجود وہ لہجہ کی اپنائیت مکمل طور پر بھانپ رہی تھی۔ کمرے کا قالین' فرنیچر' بستر کی چادریں پرانی لیکن نفیس اور صاف ستھری تھیں۔ کچھ دیر بعد غلام عباس بھی کمرے میں چلا آیا۔ وہ کچھ کترایا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مقامی انداز میں سلا بھورے رنگ کا کاٹن کا سوٹ تھا۔

''یہ ذاکرہ نے تمہارے لیے سیا تھا۔''

''میں ان کی ممنون ہوں۔'' کرس نے جواب دیا اور وہ کھلا سوٹ تھام لیا۔ وہ ذاکرہ کا سامنا کرنے کے باوجود کافی ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ ذاکرہ کی نرم طبع اور خلوص کے باوجود کرس بھانپ گئی تھی کہ وہ اپنی اذیت و کرب کس مشکل سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔

''میں ساتھ والے کمرے میں موجود ہوں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' شوہر کی بات پر وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

''میرے ساتھ کیوں نہیں رہیں گے؟''

''ماں جی کا حکم ہے کہ پہلے ہم اسلامی طریقہ سے نکاح کریں۔ وہ پیپر میرج کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔'' غلام عباس نے بتایا۔ کچھ روز بعد اس کے ایک آرٹسٹ دوست 'نقی' کے گھر پر نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔ کرس نے

مولانا احتشام تھانوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور 'زینب عباس' کے روپ میں عقد نکاح میں بندھ گئی۔ غلام عباس اپنے وعدوں اور ذات کی تکمیل پر بے حد خوش تھا۔ اسے اپنے در پر کھڑی کٹھنائیوں کی طویل قطار نظر ہی نہ آ رہی تھی۔ خوشی و سرشاری نے آنکھوں میں اس قدر چمک بھر دی تھی کہ کچھ تاریک پہلو دکھائی ہی نہ دیئے جو اس کی کچھ غفلتوں کا بھرپور تاوان وصول کرنے آئے تھے۔

☆—☆

لندن سے کراچی آمد کے بعد غلام عباس اسی گمان میں تھا کہ اسے رہائش کے لیے نیا مکان فراہم ہوگا۔ دوست احباب اس کی واپسی سے بہت خوش ہوں گے۔ وہ مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ اس دوران چیف انجینئر باری صاحب نے صاف گوئی سے دریافت کیا۔ "واپس کیوں آ گئے تم؟ یہاں کرو گے کیا؟"

"بھئی! نوکری کروں گا اور کیا؟"

"رہو گے کہاں؟" انہوں نے معنی خیزی سے اسے دیکھا۔

"میری جگہ جو ایڈیٹر رکھا گیا اسے مکان وکان تو ملا ہی ہوگا۔"

"کیسا مکان؟ وہ تو اپنے بھائی کے ساتھ رہتا ہے۔" وہ ہنسے۔ "خیر! کتنی پونجی جمع کر کے لائے ہو؟"

"پونجی کیسی؟ میں کون سا وہاں قارون کے خزانے پر بیٹھا تھا۔ بارہ سو سالانہ پاؤنڈ ٹیکس وغیرہ کی کٹوتی کے بعد صرف 'پچانوے' رہ جاتے۔ وہاں میں ہوٹل کی تیسری منزل پر رہتا تھا۔ نیچے ٹرامیں چلتی تھیں۔ ہوٹل والے ہمیں چائے تک پکانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ روزانہ پچاس' ساٹھ روپے کھانے پینے اور کرائے میں صرف ہو جایا کرتے تھے پھر ایک فلیٹ لیا۔ اس کے خرچے پورے کرنے میں پیسے خرچ ہوتے رہے۔"

"پھر تو بڑی حماقت کر دی یہاں آ کر۔" اسے تاسف سے بتایا گیا۔ غلام عباس ان رویوں سے الجھ کر رہ گیا تھا لیکن بعد ازاں پیش آنے والے اقتصادی مسائل نے لوگوں کی ان باتوں کی کچھ نہ کچھ افادیت ثابت کر دی۔ ریڈیو پاکستان میں ملازمت کے بعد رہائش کا مسئلہ تھا۔ اس زمانے میں 'پی ای سی ایچ سوسائٹی' نو زائیدہ تھی۔ کسی مہربان نے زمین الاٹمنٹ کا مشورہ دیا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس کی تاریخ گزر چکی ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں! گزر تو چکی ہے مگر تم پھر بھی درخواست دائر کر دو۔ لکھ دینا کہ ڈیپوٹیشن پر ملک سے باہر تھا لہٰذا ابھی زمین الاٹ کی جائے۔" غلام عباس نے یہ تجویز مان لی اور مشکل تجربہ سے گزر کر چھ سو گز کا ایک قطعہ اراضی حاصل کیا تو دیگر اخراجات کا خیال اعصاب پر تھکاوٹ سوار کرنے لگا۔ لندن سے لائے گئے پیسے تحائف اور دیگر خرچوں میں قریب الختم تھے۔ اس نے کسی طرح زمین کی 'اٹھارہ سو' روپے کی قسط ادا کی۔ دو تین سو روپے بچ گئے۔ اس کے بعد ایک اور مہربان نے مشورہ دیا کہ حکومت اٹھارہ ماہ کی تنخواہ کے برابر قرض فراہم کرتی ہے۔ اس نے قرض لے کر فوراً مکان کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ مشکلات ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ اس نے کسی 'مسز قلاں' کے میسن میں بمشکل چار ماہ کے قیام کی راہ نکالی۔ اسے واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ چار ماہ کے بعد بلالحاظ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ غلام عباس کے پاس تسلیم کر لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ دو قسطوں میں قرض حاصل کر کے مکان کی تعمیر جاری رکھی۔ ساڑھے تین سو روپے فی ٹن لوہا' پونے چار روپے میں سیمنٹ کی بوری' دو روپے یومیہ مزدوروں کی دیہاڑی اور تین روپے یومیہ مستری کی مزدوری کے اخراجات پورے کرتے کرتے رقم ایک بار پھر ختم ہو گئی۔ وہ اپنی اولاد کے سوا ہر ذاتی ملکیت فروخت کر چکا تھا۔ اس معاشی بحران نے اسے سخت تناؤ زدہ کر رکھا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تخلیق کے سوتے بھی بنجر ہونے لگے ہیں۔ اس کا ایک دوست 'عزیز احمد' محکمہ اطلاعات و نشریات کا ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ ماہنامہ 'ماہ نو' کا نگراں ایڈیٹر تھا۔ وہ اکثر اس سے کسی نہ کسی افسانے کی فرمائش کرتا رہتا لیکن جمود و یاسیت میں گھرا غلام عباس ہر بار وعدہ کر کے ٹال دیتا۔

"اپنا قلم اور ہنر لندن میں ہی بھول آئے ہو کیا؟ اماں یار! کچھ تو لکھو۔" عزیز احمد نے ایک روز اسے پھر گھیر لیا۔

"کیا لکھوں یار؟ موڈ ہی نہیں بنتا۔" وہ پژمردگی سے ہنسا۔

"بھئی! میں تو کہتا ہوں میرے لیے ہر ماہ ہی ایک کہانی لکھو۔ اب میں کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ معاوضہ کی فکر نہ کرنا۔ اس وقت مصنفین کو پچیس' تیس روپے دیئے جاتے ہیں۔ میں تمہیں ہر کہانی کا زیادہ سے زیادہ 'سو روپے' دوں گا۔" عزیز احمد کی اس مخلصانہ پیشکش پر وہ مزید الجھ گیا۔ ہر ماہ

باقاعدگی سے کہانی لکھنا ممکن ہی کہاں تھا۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی مشکلات بھوت بن کر رقص کرنے آجاتیں۔ پیٹ کا دوزخ بھڑک اٹھے تو اس کے شعلوں سے دماغ ہی سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے۔ وہ سوچتا رہا' الجھتا رہا اور اپنے قلمی جمود کو ختم کرنے کے جتن کرتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ذہن میں 'جزیرہ سخن وراں' کی طرح کچھ اقساط پر مشتمل ناول لکھنے کا خیال آیا لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اعتماد اور سکون کی دولت سے محروم ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ اب اسے 'ادب برائے رقم' لکھنا ہوگا۔ دوسری طرف گھریلو اخراجات اور مسائل منہ پھاڑے اسے نگلنے کے لیے بے تاب۔ کنبے کا راشن' بچوں کا تعلیمی سلسلہ' پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کی سوچ اس کی نیند و سکون برباد کر چکی تھی۔ زائد آمدنی کے لیے لے دے کر قلم کی مزدوری ہی بچتی تھی۔ اس کے ذہن میں عرصہ دراز سے اپنے بچپن کا ماحول بطور پس منظر دکھاتے ہوئے ناولٹ لکھنے کا خیال تو موجود تھا لیکن لاہور' دہلی اور پھر لندن میں مسلسل ملازمت کے باعث اس کی کبھی تکمیل ہی نہ ہو سکی۔ یکدم اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پطرس بخاری سے اس ناولٹ پر گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ذہنی کیفیت اور قسط وار کہانی کے متعلق اپنی ہراساں الجھن خط میں لکھ بھیجی۔ اسے اُمید تھی کہ وہ ضرور کوئی بہترین مشورہ دیں گے۔ پطرس نے جواب میں لکھا۔

''آپ کا پچیس فروری کا خط آج ملا۔ یاد آوری اور مستعدی کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ 'باؤ نو' یاد نہیں کہ کبھی نظر سے گزرا ہو۔ بہر حال میں پوچھوں گا اگر یہاں آتا ہے تو آپ کا ناول شوق سے پڑھوں گا۔ آپ نے اس کا جو خاکہ مجھے کراچی میں بتایا تھا وہ تو از حد اشتہا انگیز تھا۔ خدا آپ کو ہر طرح کامران کرے۔ قسط بازی طبیعت پر بوجھ تو ہوگی لیکن تاریخ ادب میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ بعض پائے کے ناول اسی طرح لکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے تخلیق ابل رہی ہو تو اقساط کے جبر سے نہیں دبتی بلکہ یہ جبر شاید آپ کے لیے مفید ہی ثابت ہو۔ بہر حال بحران آپ پر ضرور طاری رہتا ہوگا۔''

پطرس کے جواب نے ہمت بندھائی اور اس نے 'گوندنی والا تکیہ' پر کام شروع کر دیا۔ اس کہانی کے راوی نے دو دہائیاں ملک سے باہر گزارنے کے بعد اپنے پرانے قصبے کا رخ کیا تھا۔ اسے پرانی یادیں قصبے تک کھینچ کر نہیں

غلام عباس کی تحریروں میں فنی پختگی اپنے عروج پر پائی جاتی ہے۔ پلاٹ' کردار نگاری' مکالمہ نگاری اور جزئیات نگاری کے بعد تشبیہات کا استعمال ایسی لطافت سے ہوتا ہے کہ قاری جھوم اٹھے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں۔

''جتنی دیر سورج غائب رہتا ہے ہلکی ہلکی نیلی دھند مکڑی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔'' (ہمسائے)

''لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح مایوس پلٹیں گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو جسے دکاندار اپنی سستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔'' (ہمسائے)

''اس کی آنکھوں میں سرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی۔'' (ناک کاٹنے والے)

''لمحہ بھر کے لئے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔'' (ناک کاٹنے والے)

''دن بھر دھوپ اور لو کے تھپیڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی جیسے مرگھٹ کے اس مردے کی جس کے چہرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو۔'' (چکر)

لائی تھیں۔ وہاں اس کی کچھ آبائی جایداد تھی جس میں چند حصے دار اور بھی تھے۔ جایداد کی فروخت کے سلسلہ میں اس کی قصبے میں موجودگی ضروری تھی۔ قصبے کے ہوٹل میں کمرا لینے کے فوری بعد وہ اس تکیے کی تلاش میں نکلا جہاں موجود گوندنی کے آٹھ دس درختوں سے اس کے بچپن' لڑکپن اور نوجوانی کی بہت سی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔ بہت کوشش کے باوجود اسے وہ تکیہ کہیں نظر نہ آیا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ تکیے کے پرانے متولی نگینہ سائیں کے انتقال کے بعد وہ جگہ اوباشوں کا اڈا بن گئی تھی۔ بازاری عورتوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو قصبے کے شرفاء نے درخت کٹوا کر وہاں مدرسہ تعمیر کروا دیا۔ مایوسی میں گھرا وہ ہوٹل واپس آ کر فلیش بیک کی صورت میں قصبہ کا ماضی یاد کرنے لگا۔ اس تحریر کا بیانیہ غلام عباس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کینوس قدرے چھوٹا لیکن دلکشی میں بے مثال تھا۔ کردار نگاری اور واقعات بھی دلفریب ہے۔ 'گوندنی والا تکیہ' قارئین کو اس قدر پسند آیا کہ جنوری 1954 میں اس کی بارہویں اور آخری قسط

شائع ہوتے ہی دہلی میں کسی متوالے نے بلا اجازت اور بلا تاخیر اسے کتابی شکل میں (بعنوان 'محبت روتی ہے') شائع کروادیا۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ کتاب کے دوسرے صفحہ پر ''جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں'' درج کر کے انتساب میں لکھا گیا۔

''بارگاہ محبت
گوندنی والے تکیے
کے نام''

پسندیدگی کا نیا گراف بنانے والی یہ تحریر غلام عباس کی 'سوتیلی اولاد' کے عہدہ پر ہی فائز رہی۔ اسے ہمیشہ یہی خلش ستاتی تھی کہ یہ ناول پیسوں کے لیے لکھا تھا۔ عوامی پذیرائی کا یہ عالم تھا کہ کچھ عرصہ بعد 'حمید کاشمیری' نے مصنف کی اجازت سے اسے ڈرامائی تشکیل دلوا کر کراچی سے ہی نشر کیا۔ غلام عباس کو معقول معاوضہ دیا گیا۔ ڈراما بھی بہت مقبول ہوا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تخلیق کے لیے کوئی خصوصی جذبات پروان چڑھا ہی نہ سکا۔

پیشہ وارانہ زندگی کے علاوہ اس کی گھریلو زندگی بھی اس دوران کافی اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتی رہی۔ مارچ 1953 میں زینب کے بطن سے پہلی بیٹی 'مریم' کی ولادت ہوئی۔ اگلے برس زینب کے ہاں 'کامران' نے جنم لیا۔ وہ شوہر کے مصائب سے خود بھی بہت پریشان تھی۔ اس نے بچوں کی پرورش کی ذمے داری اپنی ساس کے سپرد کی اور گھریلو مسائل کے حل کے لیے پچیس جولائی 1959 سے 'دو سو روپے' ماہانہ تنخواہ پر کراچی کے ایک اسکول میں پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ یہ ملازمت تو اس نے چھ ماہ بعد چھوڑ دی تاہم دیگر اسکولوں میں سلسلہ ملازمت جاری رکھا۔ اسی دوران 1956 میں دوسری بیٹی 'نیلوفر' اور ذاکرہ کی تیسری بیٹی 'تسنیم' بھی اس دنیا میں چلی آئیں۔ زینب کے ہاں تیسری بیٹی کوثر نے 1959 میں جنم لیا۔ اولاد کی مصروفیات کے باوجود وہ اپنی وفا اور خلوص نبھاتے ہوئے روزگار میں اس کی مددگار بنی رہی۔ اس نے اپنی محبت کا وقار کسی بھی لمحہ سرنگوں نہیں ہونے دیا تھا۔

☆.....☆

معاشی تنگی کے بادل چھٹ گئے تو غلام عباس کا ذہنی تناؤ اور جمود بھی دور ہونے لگا۔ قلم سے بھرپور ناتا ایک بار پھر استوار ہو گیا۔ 'چکی بائی' (اس کا ماہِ اشاعت مصدقہ نہیں ہے) اپریل کے ماہِ نو میں 'ایک دردمند دل' (اس کی کہانی ایک ولایت پلٹ جوڑے کی وطن آمد پر درپیش مسائل کا احاطہ تھا۔ دردمند دل میں مصنف کے بہت سے ذاتی کرب بھی شامل تھے) ستمبر میں 'صغریٰ و کبریٰ' اکتوبر میں 'چپا' اپریل 1955 میں 'چند خطوط' مارچ 1956 میں 'آپ بیتی' نومبر میں 'زہریلی مکھی' جنوری 1957 میں 'جیب کترا' نامی افسانہ اور 'حاضرات' نامی ڈراما کے بعد مارچ کے ماہِ نو میں 'باجے والا' کی اشاعت سے اس کا قلمی سفر رواں رہا۔ اس دوران غلام عباس نے تنقیدی مضامین پر بھی طبع آزمائی کی۔ جون 1955 کے ماہ نو میں ''اردو کا ایک غیر معروف ناول' افتاد جوانی'' پر تعارفی و تنقیدی مضمون لکھا۔ اکتوبر 1955 کے ماہِ نو میں ہی اردو کے غیر معروف ناول 'جنون انتظار' پر مضمون شائع ہوا۔ 1956 میں ''انگریزی کے تین بڑے شاعر (ملٹن' جان ڈرائیڈن' الیگزینڈر پوپ)'' نامی مسودہ تحریر کیا۔ اسی سال کے رسالہ 'ہم قلم' میں ''افسانہ میری نظر میں'' نامی مضمون شائع ہوا جس میں غلام عباس نے افسانہ نگاری پر اپنا جامع نقطہ نظر پیش کر کے گویا ایک تاریخی دستاویز مرتب کر دی۔ اس طویل مضمون کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ویسے میں افسانے کو یوں بھی ختم کر سکتا ہوں کہ پھر ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو گئی' پھر ان کے بچے پیدا ہوئے' وہ بچے.... بڑے ہو گئے۔ مدرسے جانے لگے' پھر اب کی شادیاں ہو گئیں۔ پھر ہیرو اور ہیروئن دادا دادی نانا نانی کہلانے لگے اور آخر ایک دن آیا کہ اجل نے باری باری دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ان کی قبریں اس کی وصیت کے مطابق پہلو بہ پہلو فلاں قبرستان میں واقع ہیں اور مٹی کا ایک ایک پیالہ ان کی قبر کے سرہانے نصب ہے جن سے چڑیاں پانی پیتی ہیں۔

لیکن اس طرح بچوں کی طرح سمجھانا میں سمجھتا ہوں کہ قاری کی توہین ہے۔ البتہ قاری کو میرے کسی افسانے کے انجام سے تشفی کا احساس ہوتا ہو تو وہم ممتاز رہے کہ اپنے ذہن میں جس طرح چاہے مکمل کر لے۔''

☆.....☆

غلام عباس کی زندگی اپنے مخصوص مدار میں گردش کرتی رہی۔ وقت کی رتھ کا سفر بہت ناہموار ہو چکا تھا۔ سعادت حسن منٹو کی وفات کا ذاتی صدمہ ہی کم نہ تھا کہ پانچ دسمبر 1958 کو دیرینہ اور پُرخلوص دوست پطرس بخاری کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی موت ادبی دنیا کا بہت بڑا سانحہ

تھا۔ 1959 میں رسالہ 'نقوش' کے مدیر نے ایک خط لکھ کر 'بخاری نمبر' کے لیے مضمون کی درخواست کی۔ اس کے بعد قیوم نظر نے بھی اپنے رسالہ 'راوی' میں شائع کرنے کے لیے مضمون لکھنے کی استدعا کی۔ ان دونوں حضرات کو یقین تھا کہ پطرس بخاری کی شخصیت کشی غلام عباس جیسے دیرینہ رفیق سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ خود غلام عباس کا یہ عالم تھا کہ ناسازی طبع اور رفقاء سے دائمی جدائی کچھ بھی لکھنے کے قابل ہی نہ ہونے دیتی۔ تحریر شدہ تین چار صفحات 'پطرس کی یاد میں' نامکمل مسودہ کی صورت میں جوں کے توں پڑے رہے۔ بالآخر اس نے محمد طفیل کو ایک خط ارسال کر دیا۔

''عزیز طفیل صاحب!

پطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا اور آپ ہیں کہ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں اور اپنے تاکیدی خطوں سے حواس مختل کیے دیتے ہیں۔ بھیا مضمون تو آپ کو پچیس' تیس جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے' وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ ان دونوں میں کہاں اور لکھنا کہاں۔ لہٰذا صبر کیجیے یا پھر جی کڑا کر کے اپنی اسکیم سے نکال دیجیے۔

آپ کا غلام عباس''

قیوم نظر کے اصرار اور تقاضوں سے مجبور ہو کر اس نے دوٹوک جواب دیتے ہوئے لکھا:

''میری صحت اچھی نہیں۔ ہفتہ میں تین دن اچھا رہتا ہوں تو چار دن بیمار اور یہ سلسلہ پچھلے تین چار ماہ سے جاری ہے۔ ایسی مردگی کے عالم میں مضمون لکھنے کا کس کو یارا ہے۔ بخاری صاحب پر جو مضمون میں نے لکھنا شروع کیا تھا تین چار صفحوں سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اب ایسے تنگ وقت اور علالت کی حالت میں اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میں اس سے اور برادر ڈاکٹر نذیر احمد سے اس باب میں حد درجہ شرمندہ ہوں۔ ازراہ کرم مجھے معاف کر دیجیے اور اگر ہو سکے تو میری تندرستی کی دعا کرتے رہیے۔''

والسلام

خاکسار' غلام عباس

ایک طویل ذہنی کشمکش اور علاج معالجہ کے بعد 1960 میں اس کی طبیعت سنبھلنے کا آغاز ہوا تو وہ بائیس اپریل کو 'آل انڈیا اردو رائٹرز کنونشن' میں شرکت کے لیے ہندوستان روانہ

ہوگیا۔ اس سفر کی یادیں ایک انگریزی مضمون میں سموئی گئیں۔ اسی برس جولائی میں اس کے افسانوں کا مجموعہ 'جاڑے کی چاندنی' شائع ہوا۔ اس کتاب کے سرورق کی تصویر عبدالرحمن چغتائی نے بنائی۔ تمہید ن م راشد نے لکھی۔ وہی راشد جس سے غلام عباس کی شناسائی دہلی میں ہوئی تھی۔ کم وبیش دو دہائیوں پر محیط یہ رشتہ بے حد گہرا تھا۔ راشد دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوتا' غلام عباس سے خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ میں ضرور رہتا۔ ملاقات ہوتی تو ایک دوسرے کی تخلیقات پر خوب سیر حاصل گفتگو ہوا کرتی' شطرنج کی بازیاں جمتیں' خوش گپیاں ہوتیں' ذاتی رسالہ نکالنے کے منصوبے بنتے بگڑتے اور کامیابی نہ ملنے پر ایک دوسرے کا غم غلط کیا جاتا۔ بلاشبہ یہ دونوں دوست بہترین ادبی جوڑیوں میں سے ایک تھے۔ راشد نے یہ تمہید اس قدر خلوص اور دلجمعی سے لکھی کہ اکثر ناقدین اسے غلام عباس کی افسانہ نگاری سمجھنے کے لیے بہترین تحریروں میں شمار کرتے ہیں۔

'جاڑے کی چاندنی' نے بھی توصیف و پذیرائی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اکتوبر 1960 میں رسالہ 'سات رنگ' میں تبصرہ منظر عام پر آیا۔ پچیس فروری 1961 کو ریڈیو پاکستان سے ڈاکٹر صفدر حسین کا تبصرہ نشر ہوا۔ جون 1961 میں کراچی ہی سے "The Cultural Scene in Pakistan 1960-61" کی انگریزی رسالہ چھپا تو اس میں افسانہ 'اس کی بیوی' کا انگریزی ترجمہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اس مجموعہ پر ایک مضمون لکھا۔ ان سب سے قطع نظر 'جاڑے کی چاندنی' کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اسے 'پہلا آدم جی' انعام ملا۔ آدم جی انعام سے نوازے جانے کی خوشی ہی کم نہ ہوئی تھی کہ اسلوب احمد انصاری کے ایک خط نے اس کی مسرتوں میں مزید اضافہ کردیا۔ اسلوب نے لکھا تھا۔

''رسائل کے ذریعے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ حکومتِ پاکستان نے آپ کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ 'جاڑے کی چاندنی' پر آپ کو انعام دیا ہے۔ مجھ سے آل انڈیا ریڈیو دہلی والوں نے چودہ فروری کے پروگرام میں اردو کی نئی مطبوعات پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کی کتاب بھی اس میں شامل کردوں۔ اگر آپ ایک نسخہ بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔ خط کا جواب جلد دیں تاکہ ریڈیو والوں کو اپنی پسند کی کتابوں کی فہرست بلا تاخیر بھیج سکوں۔''

جاڑے کی چاندنی کی اس ہمہ گیر کامیابی کے بعد غلام عباس نے اپنے ذاتی اشاعت خانہ 'سجاد کامران' سے جزیرہ سخن وراں کی ایک ہزار کاپیاں دوبارہ شائع کروائیں۔ اس بار بھی اخبارات اور ریڈیو نے خوب تعریفیں کیں۔ ایک کٹھن ترین اقتصادی بحران کا سامنا کرنے والے غلام عباس کے مسائل میں نمایاں کمی ہوچکی تھی۔

☆.....☆

غلام عباس کے لیے پچاس کی دہائی اپنے آغاز سے انجام تک یادگار رہی تھی۔ زینب سے نکاح' جبری ناول کے بعد جاڑے کی چاندنی کو ملنے والی پذیرائی کا سفر بلاشبہ بہت ناہموار تھا۔ بہرحال معاملات اب پُرسکون تھے۔ 'آنندی' ہنوز ادب پسندوں کے لیے خمار تھا۔ 1962 میں اس افسانہ کو چیکوسلواکیہ میں ادبی انعام دیا گیا جو اس مبینہ ادبی مقابلے کا 'فرسٹ پرائز' تھا۔ غلام عباس کو اس اعزاز نے خوشی سے زیادہ اس بات نے کوفت زدہ کیا کہ ہندوستانی نژاد نذیر احمد زبیری' نے اردو سے چیک زبان میں ترجمہ کے لیے اس سے ایک بار بھی اجازت لینے کی زحمت نہ کی تھی۔ 'گوندنی والا تکیہ' کے بعد ہونے والی یہ حرکت اسے طیش میں مبتلا کرگئی۔ اس نے دومرتبہ انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اس عمل پر احتجاجی مراسلات ارسال کیے۔ 1963 میں نذیر احمد زبیری نے بذریعہ خط اپنی اس پیشہ وارانہ کوتاہی کی معذرت کرکے معاملہ رفع دفع کردیا۔ اسی برس مارچ میں غلام عباس نے اپنی دیرینہ محبت 'پھول' کا انتخاب چھپوایا۔ یہ کتاب 'ترقی اردو بورڈ' کے تعاون سے سجاد کامران پبلشرز نے دو ہزار کاپیوں کی صورت میں شائع کی۔ دس علمی و ادبی مضامین' تیئس کہانیوں' چار ڈراموں' ستائیس نظموں اور چھ لطیفوں پر مشتمل اس کتاب کا پانچ صفحات پر مشتمل دیباچہ خود غلام عباس نے لکھا۔ اس دیباچہ میں پھول کی تاریخ' غلام عباس کی افسانہ نگاری کے بنیادی عناصر اور زباندانی سے متعلق سید امتیاز علی تاج کے سمجھائے گئے اصول بہت جامع انداز میں بیان کرکے انہیں ہمیشہ کے لیے امر کردیا۔

'پھول' کے انتخاب کی اشاعت کے بعد ایک ناخوشگوار واقعہ نے اس کے قلم سے اس قدر شاندار فکشن تخلیق کروایا جسے اس وقت کا کوئی بھی اردو رسالہ شائع کرنے کی ہمت ہی نہیں کر پایا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ زینب عباس نے اسکول

نوکری ترک کر کے ایک ایسا ذاتی ادارہ سنبھال لیا تھا جہاں بچوں کو مصوری اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس ادارہ کا آغاز ہوتے ہی مختلف مذہبی فرقوں نے متفقہ طور پر تحریک چلاتے ہوئے دھمکیوں کا بازار گرم کر دیا۔ اس واقعہ نے ان دونوں ہی کے دل و دماغ میں خلش پیدا کر دی۔ غلام عباس کی بے چینی البتہ شدید تر تھی۔ اس کے لاشعور میں کوئی خیال بار بار دستک دیتا۔ یہ کیفیت بڑی جانی پہچانی تھی۔ اسے علم تھا کہ 'آنندی' 'اوور کوٹ' اور 'کتبہ' کی طرح ایک اور تحریر اپنے اخراج کا راستہ تلاش کر رہی ہے۔

''اتنا نہ سوچا کریں عباس! اللہ پاک نے اب ہمیں روزگار میں آسانی دے رکھی ہے۔ میں کوئی اور کام کر لوں گی۔'' زینب نے اسے سمجھانا چاہا۔

''میرے اندر ایک گرہ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کیفیت یونہی میری جان نہیں چھوڑے گی۔ میں جب تک اپنا غبار صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کر لوں' سکون نہیں آئے گا۔''

''کوئی کہانی گوندھ رہے ناں آپ؟'' زینب چونکی۔

''ہاں! ایک اچھوتا خیال آیا ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اس تحریر کا آغاز ایک کثیر المنزلہ عمارت کے ٹاپ فلور سے ہوگا۔ وہاں بہت سے سائنسدان اور اہم عہدیدار کھڑے ہیں۔ اس روز پاکستان کا پہلا خلاء باز چاند پر قدم رکھنے جا رہا ہوگا۔ سب اس تاریخی لمحہ کے منتظر ہوں گے بلکہ یہ تاریخی منظر دنیا بھر میں ٹیلی ویژن پر نشر کیا جائے گا۔ پاکستان اس وقت دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوگا۔ چاند تسخیر کرنے کا یہ عمل کچھ مخصوص طرز فکر رکھنے والے افراد کو ناگوار گزرے گا۔ وہ اسے 'کفر' اور خدائی نظام میں خلل ڈالنے کا گناہ کا فتویٰ لگا کر ملک میں ایک تحریک شروع کریں گے۔ ملکی حالات خراب ہونے لگیں گے۔ یہ مخصوص طبقہ سیاسی نظام پر قابض ہو کر عوام کی زندگیاں ہی تبدیل کر دے گا' پھر دھیرے دھیرے اس طبقہ میں بھی اختلافات پیدا ہونے شروع ہوں گے۔ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینچ کی مسجد بنا کر عوام کو یہ باور کروائے گا کہ صرف وہی راہِ حق کا راہی ہے۔ بقیہ طبقات گمراہی پر ہیں۔ ملک میں خانہ جنگی کی صورتِ حال اس قدر بھیانک صورتِ حال اختیار کر جائے گی کہ سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اختتام کچھ اس طرح کا ذہن میں چل رہا ہے کہ سیاحوں کا ایک ٹولہ یہاں سیر کرنے آیا ہے۔ انہیں ہر جانب کھنڈرات دکھائی دے رہے ہیں۔ گائیڈ ایک جانب اشارہ کر کے بتائے گا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے پاکستانی خلاء باز چاند تسخیر کرنے گیا تھا۔''

''خدا کی پناہ! یہ بہت بڑا رسک ہوگا عباس! اسے کوئی شائع نہیں کرے گا۔ آپ کیوں منٹو کی طرح متنازعہ ہونا چاہتے ہیں؟ (اس وقت امریکا کی جانب سے نیل آرم اسٹرانگ نے بھی ابھی چاند پر قدم نہ رکھے تھے۔ عوامی نقطۂ نظر سے یہ خیال ہی بہت مضحکہ خیز محسوس ہوتا تھا) مذہبی جماعتیں آپ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی۔ وہ اسے فکشن نہیں بلکہ ذاتیات اور مذہب پر حملہ کہیں گی۔'' زینب بے چین ہو گئی۔

''میرا مقصد ہرگز تنقید نہیں ہے۔ کوئی شائع نہیں کرتا تو نہ کرے۔ مجھے یاد ہے منٹو نے ایک تحریر 'اوپر نیچے اور درمیان' خود شائع کی تھی۔ اسے پڑھ کر بھی سب بدک جاتے تھے۔ میں اپنے اگلے مجموعہ میں یہ کہانی ضرور شامل کروں گا۔'' وہ پُرعزم تھا۔

''اچھا! اس بارے میں تو بعد میں بھی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔'' زینب نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔ ''آپ نے پھول کا انتخاب تو شائع کروا دیا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ خود بچوں کے لیے چند نظمیں بھی لکھیں۔ ان نظموں کے ساتھ میری بنائی گئی تصویریں شامل کر لی جائیں۔ اس طرح تھوڑے عرصہ کے لیے ہی سہی' میں بھی کسی سرگرمی میں مصروف ہو جاؤں گی۔''

''خیال برا نہیں بیگم صاحبہ! تیاریاں شروع کر دیجیے۔'' وہ فراخدلی سے بولا۔ زینب بہت خوش ہوئی اور خلوص دل سے کتاب کو کامیاب کرنے کے لیے کمر کس لی۔ اس کی کوششوں کے باوجود یہ معاملہ دو سال تک التوا کا شکار رہا۔ اس دوران کبھی فیض احمد فیض کے ہاں اہل خانہ کی دعوت ہوتی تو کبھی وہ دونوں دوست پرانی کتابیں خریدنے کے لیے شہر بھر کی خاک چھانا کرتے۔ شہر کے بیشتر کباڑیے انہیں 'چچا جی' پکارنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ زینب جب بھی کسی نجی کام کے سلسلے میں انگلستان جاتی تو ان کی جانب سے کتابوں کی فہرست پہلے ہی تیار کر کے تھما دی جاتی۔ ن۔م۔ راشد سے خط و کتابت بلاتعطل جاری تھی۔ ملاقات کی صورت میں شطرنج کی بازیاں بھی جوبن پر ہوتیں۔ کتاب کے سلسلہ میں زینب کی محنت اگلے دو برس جاری رہی۔ اشاعت کا مرحلہ نزدیک تر آیا تو چھ مئی 1965 کو ان کی چھ

سالہ بیٹی کوثر گھر کے نزدیک سڑک پر ٹرک کے نیچے کچلی گئی۔ گھر پر اس وقت صرف زینب اور بیگم ایلس فیض موجود تھیں۔ ان کے کچھ بھی کرنے یا اسپتال لے جانے سے پہلے ہی وہ ملنسار' محبت کرنے والی' ہمہ وقت اچھل کود کرتے رہنے اور دلکش ہنسی کی مالک کوثر انتقال کر گئی۔ اہل خانہ کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ دوست احباب' عزیز و اقارب کے تعزیتی خطوط کبھی دلاسہ فراہم کرتے تو کبھی زخم ایک بار پھر ہرے کر دیتے۔

وقت کا کام ہے گزرنا' سو گزرتا رہا۔ بیٹی کی دائمی جدائی کے بعد بھی معمولات زندگی یونہی برقرار رہے۔ زینب کی مصوری اور غلام عباس کی نظموں کا مجموعہ 'چاند تارا' دو ہزار کاپیوں کی صورت میں منظر عام پر آیا اور چھا گیا۔ کامیابی نے اس بار بھی ان کی قدم بوسی کی۔ سادہ اور دلنشیں نظموں نے ہر خاص و عام کے دلوں میں گھر کر لیا۔

''قطرہ قطرہ مل کر دریا
ذرہ ذرہ مل کر صحرا
رائی رائی مل کر پربت
پل پل مل کر جگ کہلائے
ہم بھی اگر ہو جائیں اکٹھے
ایک بڑی طاقت بن جائے''
(نظم 'قطرہ قطرہ')

.....

''نور کا تڑکا' ٹھنڈی ہوائیں
مہکی مہکی ہماری فضائیں
پھول کھلے ہیں باغ میں ہر سو
بھینی بھینی جن کی خوشبو
ڈالی ڈالی چہکیں پرندے
بھنورا گونجے' کوئل کو کے
اللہ میاں نے صبح بنائی
کام میں لگ گئی ساری خدائی''
(نظم 'صبح')

☆.....☆

'چاند تارا' کی اس کامیابی نے زینب کی محنت قومی سطح پر نمایاں تر کر دی۔ وہ اس سے قبل بھی دو کتابوں کی مصوری کر چکی تھی۔ ان تینوں کتب کی بدولت 'نیشنل بک کونسل آف پاکستان' نے دسمبر 1965 میں اسے Illustrator's Award for1965 انعام سے نوازا تاہم تین ماہ قبل ہونے والی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے رقم منسوخ کر دی گئی۔ غلام عباس اور زینب قطعی بے نیاز تھے۔ اب وہ زندگی کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں معاشی مسائل حل ہو چکے تھے۔ اولاد بھی اپنی زندگیوں میں کامیابی سے سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ سجاد ان دنوں شہرزاد کی مدد سے کینیڈا جانے کی تیاری میں تھا۔ ناہید کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اقتصادیات کے امتحانات میں مگن تھی۔ امتحان کے بعد اس کی شادی اور مزید پڑھائی کے لیے انگلستان جانے کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ غلام عباس بچوں کی ترقی سے بہت خوش رہتا۔ اس دوران اسے زینب کے ساتھ لاہور سفر کی دھن سوار ہو گئی۔ وہ اپنا بچپن ایک بار پھر جینا چاہتا تھا۔

وہ دونوں فروری 1966 میں لاہور پہنچے تو زینب اپنے شوہر کی توانائی و چستی دیکھ کر حیران تھی۔ وہ ہر ایک گلی' کوچے اور عمارت کو پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غلام عباس نے سب سے پہلے بھاٹی دروازہ جانے کا فیصلہ کیا۔

''تمہیں پتا ہے زینب! بھاٹی گیٹ کی لاہور میں وہی اہمیت ہے جو کراچی میں لالو کھیت' پنڈی میں راجا بازار اور پشاور میں قصہ خوانی بازار کی ہے۔'' اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ زینب اسے ٹوکنا چاہتی تھی کہ یہ سب باتیں وہ اسے کئی بار بتا چکا ہے لیکن اس وقت وہ کسی اور ہی لے میں تھا۔

''یہ دیکھو! اس مقام پر میں اپنے دوستوں سے ملتا تھا۔ وہ دیکھو! اس جگہ ہماری فلاں باتیں ہوتی تھیں۔ یہ سرخ اینٹوں والا مکان دیکھ رہی ہو! یہ 'فقیر نجم الدین' کا مکان تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتداء یہیں ایک تھڑے سے کی تھی۔ کل داتا دربار چلیں گے۔ وہاں سے میں تمہیں بازار حکیماں' فقیر خانہ میوزیم بھی لے چلوں گا اور ہاں! تمہیں پتا ہے یہ عجائب خانہ جس حویلی میں قائم ہے اس کی نچلی منزل کی ایک بیٹھک میں علامہ اقبال اپنے دوستوں کے ساتھ محفل جماتے تھے۔'' وہ بلاتکان بولتا چلا گیا اور زینب محبت و خلوص سے اس کی تمام باتیں سن کر مناسب ردعمل دیتی رہی۔ اسے اپنے شوہر کی سادہ دلی' بے ساختگی اور شہر سے محبت پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ دوسری جانب غلام عباس بھی اپنی ان کیفیات پر حیران تھا۔ اس نے زینب کے ساتھ ہی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالرحمن چغتائی سے ملاقات کی اور خوشگوار یادوں کا ایک خزانہ سمیٹے واپس کراچی

لوٹ آیا جہاں کچھ عرصہ ہی بعد وہ ایک حادثہ کا شکار ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ پیدل جاتے ہوئے ایک گاڑی نے اسے ٹکر ماری تھی۔ زخم بہت زیادہ خطرناک تو نہ تھے تاہم پیٹھ زخمی ہونے کے باعث اگلے چند ماہ کے لیے اسے بستر نشین ہونا پڑا۔

یہ حادثہ بھی قدرت کی جانب سے ایک بہترین حکمت عملی تھی۔ کچھ روز بعد اسے حکومت پاکستان کے وزارت اطلاعات ونشریات کے سیکریٹری 'الطاف گوہر' کا خط موصول ہوا جس میں صدر پاکستان ایوب خان کی تصنیف Friends Not Masters کو اردو قالب میں ڈھالنے کی پیشکش تھی۔ غلام عباس نے کچھ صفحات ترجمہ کر کے ارسال کر دیئے۔ الطاف گوہر نے جواب میں لکھا۔

''جناب صدر نے اردو ترجمہ کے ابتدائی پچھتر صفحات دیکھ لیے ہیں اور انہیں پسند کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ نے جس عمدگی سے ان کے خیالات کو اردو میں منتقل کیا ہے اس کے لیے ان کے جذبات تشکر و امتنان آپ تک پہنچا دوں۔ میں آج کل ترجمے کو دیکھ رہا ہوں اور چند روز بعد آپ کو مطلع کر دوں گا۔ اس اثناء میں آپ بقیہ ترجمہ جلد از جلد مجھے دے دیں۔''

غلام عباس نے یہ ذمے داری نہایت احسن انداز میں نبھائی۔ اس ترجمہ کا عنوان 'جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی' رکھا گیا تھا۔ یہ کتاب 1967 میں 'آکسفورڈ یونیورسٹی پریس' سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس ترجمہ ہی کے باعث غلام عباس کو سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ کافی عرصہ سے ملازمت چھوڑ کر پنشن حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ماضی قریب میں اس پنشن سے قرض ادا کرنے کے لیے فنڈز حاصل کرنے کے بعد ماہانہ رقم صرف چھ سو روپے رہ چکی تھی لیکن اب وہ ایسے مسائل سے بے نیاز تھا۔ تقدیر اس پر مہربان ہو چکی تھی۔ صدر ایوب خان کی کتاب کے ترجمہ کے بعد مسلسل ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے چودہ اگست 1968 کو اسے 'ستارۂ امتیاز' سے نوازا۔ اس انعام کا حصول بلاشبہ کامیابی کی ایک معراج سے کم نہ تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میڈل پر ہاتھ پھیرتے جانے کون سے نقوش تلاشتا رہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں عباس؟'' زینب نے ملائمت سے پوچھا۔ ''آپ کو خوشی نہیں ہوئی کیا؟''

''بہت خوش ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور ایک توقف سے بولا۔ ''اگر تم سے کچھ مانگوں تو انکار تو نہ کرو گی؟'' اس کے انداز پر زینب چونک گئی۔

''نہیں! بلکہ مانگنا کیوں؟ آپ حکم کیجیے۔''

''جب میرا انتقال ہو جائے تو یہ میڈل ذاکرہ کو دے دینا۔ مجھے اصل خوشی تبھی ہو گی۔'' اس کی فرمائش بے حد انوکھی سہی لیکن زینب انکار نہ کر سکی اور شوہر سے وعدہ کر لیا۔

''مجموعہ کن رس کی تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''چل رہی ہیں بس۔ میں نے سوچا ہے کہ 'دھنک' لاہور کے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھوں گا۔ اس تحریر کا ردِعمل جاننے کا وقت آ گیا ہے۔''

''میں آج بھی آپ سے یہی کہوں گی کہ ردِعمل بہت منفی اور شدید ہو گا۔''

''ہاں! مجھے علم ہے لیکن میں پھر بھی اسے شائع کرواؤں گا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

زینب اور غلام عباس کے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ حلقہ ارباب ذوق میں بحث و مباحثہ اور الزام تراشی کا ایک بازار گرم ہو گیا تھا۔ صدر صاحب کو اجلاس برخاست کرتے ہی بنی۔ غلام عباس کو ان کے ردِعمل کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اسے اپنی نیت پر بھروسا تھا۔ راشد اور ڈاکٹر نذیر احمد جیسے کئی احباب اخلاقی سطح پر اس کے ساتھ تھے۔ اس مجموعہ کی تیاریاں ابھی جاری ہی تھیں کہ اگست 1969 میں اس نے سابقہ مکان کے قریب ہی ایک اور رہائش گاہ بھی خرید لی۔ پہلا مکان ذاکرہ اور اس کے بچوں کو دے دیا گیا۔ زینب اور دیگر بچے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ان سب کو مضبوط معاشی سہارا فراہم کر دینا چاہتا تھا۔ اسی سال سترہ اکتوبر کو اس کی والدہ نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند کر اس کے وجود میں دائمی خلاء پیدا کر دیا۔ کوثر کے بعد والدہ کی جدائی نے دل پر ایک اور زخم لگا دیا جس سے رستے لہو کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔ اس نے اپنی سرگرمیاں نہایت محدود کر دیں 'دھنک' اور 'کن رس' کی اشاعت کے بعد ذاتی تخلیقات کی تعداد بہت کم رہی۔ 1970 کے بعد مختلف رسائل میں اس کے انٹرویوز منظر عام پر آنے لگے۔ اب وہ اردو ادب کے ایک 'بزرگ' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جدید اردو ادب پر اس کے خیالات کو ہر افسانوی مجموعہ ہی کی طرح پسند کیا جانے لگا۔ ان محدود

سرگرمیوں میں پانچ سال بیت گئے۔ اس کا زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور خط و کتابت میں گزرتا تھا اور پھر نو اکتوبر 1975 کو لندن سے خبر آئی کہ ن م راشد کا انتقال ہو گیا ہے۔ غلام عباس کے لیے یہ صدمہ بھی بہت جانکاہ تھا۔ راشد سے اس کا رشتہ روز اوّل سے غیر معمولی تھا۔ وہ بھائی نہیں تھا لیکن بھائی جیسا ضرور تھا۔ اس نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر غلام عباس کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ تنہائی اور خاموشی نے اس کے وجود میں مزید ڈیرے جما لیے۔ یہ نقصان ہی ناقابل تلافی تھا۔ رسالہ 'نیا دور' کے ن م راشد نمبر میں اس نے بھیگی آنکھوں سے 'راشد چند یادیں' نامی مضمون لکھا جس کے آخر میں اپنی خط و کتابت کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"راشد خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں بڑے مستعد تھے۔ ہماری دوستی کی اس طویل مدت کے دوران انہوں نے بے شمار خط لکھے جو محبت' یگانگت اور خلوص سے بھرے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے ان کی بے باک طرز نگارش اور اعلیٰ انشا پردازی کا رنگ بھی بخوبی جھلکتا تھا۔"

اگلے برس اس کے بچپن کا ایک اور دوست عبدالرحمٰن چغتائی بھی داغ مفارقت دے گیا۔ یہ زخم بھی بہت کاری تھا۔ افسردگی مزید دبیز ہونے لگی۔ اس زمانہ میں رسالہ 'نیا دور' میں افسانہ 'رینگنے والے' اور 'اوتار' شائع ہوئے۔ 'رینگنے والے' رسالہ 'جریدہ پشاور' میں بھی چھپ گیا۔ اس وقت یہ افواہیں گردش میں تھیں کہ غلام عباس ایک اور مجموعہ ترتیب دینے میں مگن ہے لیکن وہ اولاد کی ذمے داریاں نبھانے میں منہمک تھا۔ 1977 میں علی سجاد نے ڈاکٹر بننے کے بعد ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی۔ بیٹیوں مریم اور تسنیم کے فرائض سے بھی اسی سال سبکدوشی نصیب ہوگئی۔ وجود میں پنپنے والی اداسی اور احساس زیاں ابھی کم بھی نہ ہونے پائے تھے کہ یکم جولائی 1978 کو اس کے دیرینہ ساتھی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بھی داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ غلام عباس کے دل و دماغ شدید انتشار میں مبتلا ہونے لگے۔ ایک ایک کر کے سبھی دوستوں نے عدم آباد کی راہ لے کر اسے تنہا کر دیا تھا۔ صوفی کے انتقال کا کرب سبھی سے سوا تھا۔ غلام عباس نے قلم تھاما اور اپنی تمام تر محبت و عقیدت صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے لکھنے لگا:

"یہ مضمون نہ تو صوفی کے فکر و فن پر کوئی محاکمہ ہے نہ ان کی زندگی کے کوائف' ان کی دانشوری یا ان کی اعلیٰ علمی استعداد کا تذکرہ۔ اس میں تو فقط ایک زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت' ایک دردمند اور غمگسار دوست کی چند یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔ صوفی صاحب کی ذات میں اللہ نے بہت سی خوبیاں بھر دی تھیں مگر میری رائے میں ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی محبوبیت ہے چنانچہ ان کی وفات پر میں نے ٹیلی ویژن کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں دل میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مجھے ابھی موت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی تو صوفی صاحب زندہ ہیں۔ افسوس کہ ان کی اچانک وفات سے میری زندگی کا یہ سہارا ٹوٹ گیا۔"

غلام عباس نے اب کہیں نہ کہیں خود کو سفر آخرت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا، قلمی سفر محدود تر ہو گیا۔ 1978 کے بعد اس نے صرف ایک اور افسانہ 'بندر والا' لکھا جو 1981 میں رسالہ 'افکار' میں شامل ہوا۔ 1979 میں رسالہ 'اردو بک ڈائجسٹ' نے 'دھنک' شائع کر دیا۔ اس زمانے میں نہ صرف غلام عباس کے بے شمار انٹرویو شائع ہوئے بلکہ اس پر کئی مضامین بھی لکھے گئے۔ خود غلام عباس نے ان دنوں 'خوان نعیما' نامی مجموعہ شائع کرانے کی تیاریوں کا آغاز کر رکھا تھا۔ اس مجموعہ میں شامل کرنے کے لیے جب کترا' زہریلی مکھی' آپ بیتی' چند خطوط' ناول نویس' عید کا تحفہ' جوہر کال' موت کا درخت' کثافت صحافت' مقبرہ' ترکی (غالباً یہ افسانہ ترکی ٹوپی تھا) منتخب کیے گئے۔ ایک افسانہ کے اندراج کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کا انتخاب ابھی غیر حتمی ہی تھا۔

اکتوبر 1982 میں وہ ایک بار پھر لاہور عازم سفر ہو گیا۔ بچپن اور نوجوانی کے سبھی دوستوں کی یکے بعد دیگرے رحلت کے بعد اس شہر کی دید میں درد و کرب کا تناسب بڑھ گیا تھا تاہم فیض اور ڈاکٹر نذیر کا اصرار اسے وہاں کھینچ لے جاتا۔ اس بار ذہن میں کچھ خاص اہداف بھی تھے۔ 'گوندنی والا تکیہ' اور 'کلیات' شائع کروانے کے لیے چند اشاعت خانوں سے رابطہ کرنا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق میں ایک اور افسانہ پڑھا۔ نہر کے کنارے بکھرے کنکروں کو ٹھوکریں مارتے' کبھی ہاتھوں سے پانی میں اچھال کر لہروں کا جال بنتے دیکھتا رہا۔ اسے چشم تصور سے اس نہر میں صرف ایک شلوار میں ملبوس تیراکی کرتا غلام عباس دکھائی دینے لگا۔ دوسرے ہی لمحہ اس منظر پر دوستوں کے ساتھ شرط لگا کر پل

سے سب سے گہری اور دور تر چھلانگ لگاتا غلام عباس غالب آجاتا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو وہ قبرستان میں اپنی پہلوٹھی کی اولاد رضیہ کی قبر پر چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے نمی کی چمک جدا ہی نہ ہو رہی تھی۔ دوست احباب کو بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اردگرد سب مناظر کو الوداعی نظروں سے نہار رہا ہے۔ لاہور میں یادگار وقت گزارنے کے بعد وہ کراچی لوٹ گیا۔

☆.....☆

وہ یکم نومبر 1982 کی رات تھی۔ اس روز زینب معمول سے زیادہ مصروف اور منہمک دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیگم؟ آج آرام کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟'' اس نے گھڑی کی جانب دیکھا جہاں نو بج رہے تھے۔

''کچھ رپورٹس تیار کرنی ہیں۔ انہیں جمع کروانے کی کل آخری تاریخ ہے۔ مجھے کچھ وقت لگ جائے گا۔'' زینب نے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا۔ اسے علم تھا کہ شوہر کو اسے سارا دن کی روداد سنائے بنا نیند ہی کہاں آتی تھی۔ غلام عباس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

''اچھا! کوئی بات نہیں۔ میں اتنی دیر کتاب پڑھ لیتا ہوں۔'' اس نے خوابگاہ کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ پونے بارہ بجے زینب نے آخری رپورٹ مکمل کی اور خوابگاہ میں چلی گئی۔

''آئی ایم سوری! مجھے زیادہ ہی دیر ہوگئی۔'' اس نے محبت سے کہا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ عباس اپنا وقت کسی بھی اور چیز کو دیئے جانے پر ہمیشہ شوہرانہ حسد میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ آجاؤ! باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تاہم آج یہ مسکراہٹ کچھ پژمردہ سی تھی۔ اس نے زینب کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ سانس لینے میں خرخراہٹ کی آواز غالب آرہی تھی۔ اس کا تنفس واضح طور پر غیر متوازن ہونے لگا تھا۔

''کیا ہوا عباس؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' زینب گھبرا گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ خرخراہٹ بلند تر ہوتی گئی۔ زینب نے فوراً بستر سے اتر کر کمرے میں لائٹ جلائی۔ غلام عباس کا چہرہ عجیب ہو رہا تھا۔ زینب نے فوراً شوہر کا منہ کھولا اور مصنوعی تنفس فراہم کرنے لگی۔ وہ مدد کے لیے پکارتے ہوئے اسے ہر ممکن طبی امداد مہیا کر رہی تھی لیکن موت اپنا شکار کھیل چکی تھی۔ اس نے بدن کے قفس سے روح دبوچ لی تھی اور اب استہزائیہ نظروں سے زینب کی کوششیں دیکھ رہی تھی۔ زینب نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ اسے اب بھی یہی اُمید تھی کہ بہترین علاج سے شوہر کی طبیعت سنبھل جائے گی۔

''آئی ایم سوری۔ ہی از نو مور۔'' ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا اور دوسرے ہاتھ سے غلام عباس کی آنکھیں بند کر کے چادر سے چہرہ بھی ڈھانپ دیا۔ زینب پھٹی پھٹی نظروں سے گھڑی کی جانب دیکھنے لگی جہاں تاریخ 'دو نومبر' اور وقت پر '12:30' کے ہندسے جگمگا رہے تھے۔ صرف پینتالیس منٹ میں ہی اس کی دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ اس روز کراچی میں ہونے والے نکاح کی تیسویں سالگرہ تھی۔ کرس سے زینب عباس بننے کے سفر میں وہ ہمراہی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ زینب بمشکل مریم کو فون پر اطلاع دے سکی۔ مریم نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باقی معاملات سنبھالے اور ذاکرہ، تسنیم، طاہرہ کو بھی مطلع کر دیا۔

اس سر سے پلٹ چکی یہ آفت بالخیر
اور کٹ چکی زندگی کی زحمت بالخیر
اس قصے کے انجام نے بخشا آرام
افسانہ آسودگی تمت بالخیر

☆.....☆

دل کے دورہ سے جانبر نہ ہونے والے غلام عباس کی موت اس روز کے اخبارات کی نمایاں خبر تھی۔ اہل خانہ، عزیز و اقارب، ساتھیوں اور قدر دانوں کا صدمہ و نقصان ناقابل تلافی تھا۔ اردو ادب کی نوائے برگ و آدمیت ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔ نماز جنازہ مسجد سلیمانیہ میں ادا کر کے گھر کے قریب واقع قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

رفیقو اٹھا وہ صاحب فن
جو مہر رخشندہ وطن ہے
چلو در شہر فن پر لکھ دیں
غلام عباس جان فن ہے

ماخذات:

غلام عباس، سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ۔ از سویا مانے یاسر

You Never Can Tell از زینب عباس

سرورِ ادب

عائشہ انور

اردو ادب کے ماتھے کا جھومر بننے والے اس شاعرِ رومان نے قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کے لیے بنگال کی حسین فضا کو منتخب کیا۔ ایسی سرزمین پر اردو کی خدمت شروع کی جہاں بنگلہ زبان رائج تھی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کیا۔ بزمِ سخن میں ضیا پاشیاں ایسی کہ ندیوں کی سرزمین پر اردو ادب مصدرِ بہار نوا بائے سرمدی بن گیا اور تب فلمی دنیا نے اسے آواز دی، ایک اچھا شاعر شہرِ نگاراں میں گم ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کے ایک نامور شاعر کا مختصر سا تذکرہ

آج سے کوئی 55 سال پہلے ڈھاکا کے کرزن ہال میں یوم اقبال کے سلسلے میں ایک عظیم الشان انڈو پاک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں مغربی پاکستان کے کئی بڑے شاعروں کے علاوہ ہندوستان سے بھی چند نامور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا اور مصرعہ طرح اقبال ہی کا یہ مصرعہ تھا:

تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

اس مشاعرے کی صدارت فیروز خاں نون نے کی تھی جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے۔

اس مشاعرے میں بھارت سے آنے والے شاعروں میں ہری چند اختر، روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد اور جگر مراد آبادی قابلِ ذکر تھے۔ جگر صاحب اپنے ساتھ ایک نوجوان اور خوبرو شاعر کو بھی لائے تھے۔ جب مہمان شاعروں کا دور شروع ہوا تو اسی خوبرو اور جواں سال شاعر سے آغاز کروایا گیا۔ اس نے مائیک سنبھال کر اپنی غزل شروع کی تو پورے ہال پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک تو اس کی خوبروئی، دوسرے اس کی نغمگی میں ڈوبی ہوئی آواز، تیسرے اس کی حسن و شباب میں نہائی ہوئی غزل۔ ان ساری باتوں نے سامعین کو گویا اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ انہوں نے دل کھول کر داد دی۔ نوجوان شاعر نے غزل ختم کر کے لوٹنا چاہا تو پورا ہال چیخ اٹھا۔ ''ایک غزل اور ..... ایک غزل اور۔'' سامعین کو بدقت تمام یہ کہہ کر قابو کیا گیا کہ وقفے کے بعد آپ کی فرمائش پوری کی جائے گی۔

یہ خوش فکر، خوش گلو اور خوش نظر شاعر سرور بارہ بنکوی تھے۔ یہ 1951ء کی بات ہے جب سرور نے پاکستانی سامعین کو پہلی بار اپنی شاعری سے متعارف کیا تھا۔ چند دنوں کے بعد بشمول جگر مراد آبادی تمام مہمان شعرا واپس چلے گئے مگر سرور بارہ بنکوی ڈھاکا کے ہی میں ٹھہر گئے۔ شاید اس لیے کہ اس جادوگر کو یہ جادو نگری کچھ زیادہ ہی بھلی لگی تھی۔ دو تین مہینوں تک وہ مقامی ادبی شخصیتوں میں اور ادبی محفلوں میں گھرے رہے اور ان کے ساتھ مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں کی سیر کرتے رہے پھر انہیں گھر کی یاد آئی اور وہ بارہ بنکی لوٹ گئے مگر بنگال کے جادو نے انہیں وہاں سکون سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ایک دن جب خاندان کے تمام افراد موجود تھے انہوں نے یہ کہہ کر ایک دھماکا کر دیا:

''میں پاکستان جا رہا ہوں۔''

بڑے بوڑھوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی نہ جاؤ، ابھی تم نوعمر ہو، پھر چلے جانا مگر وہ نہ مانے۔ بزرگوں نے ان کی ضد کے آگے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پاکستان جانا اچھا سمجھا جاتا تھا۔ سرور ڈھاکا آ گئے۔ یہ 1953ء کا زمانہ تھا۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی شریکِ حیات عارفہ سرور بھی تھیں۔

سرور ڈھاکا پہنچ کر کچھ دنوں تک وہاں کے سحر میں کھوئے رہے پھر جب ذرا نشہ اترا تو تلاشِ معاش کی فکر ہوئی اور چاہنے والوں کی کوششوں سے جلد ہی انہیں ایک ملازمت مل گئی۔ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے وہ آفس سیکریٹری مقرر ہو گئے۔

انجمن ترقی اردو کا ابتدائی دفتر نواب پور روڈ پر نشاط سینما سے ذرا پہلے واقع تھا۔ یہ بہت چھوٹی سی ملازمت تھی اس لیے تنخواہ بھی بہت چھوٹی تھی۔ ڈھائی سو پر ان کا تقرر ہوا تھا

جو بڑھتے بڑھتے ساڑھے تین سو تک پہنچی تھی۔ اگرچہ وہ آج کے مقابلے میں خاصہ سستا دور تھا، اس کے باوجود اس تنخواہ میں گزر بسر بڑی مشکلوں سے ہوتی تھی مگر سرور اس میں مسرور تھے۔ ان کی ساری دلچسپیاں شعر و نغمے سے وابستہ تھیں۔ ملازمت بھی ادبی نوعیت کی تھی اس لیے لکھنا پڑھنا اور ادبی حلقوں میں اٹھنا بیٹھنا ان کا روز کا معمول بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ادبی محفلوں کی جان بن گئے۔ چونکہ اچھا کہتے اور بہت اچھا پڑھتے تھے اس لیے مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ جلد ہی ان کی شہرت ڈھاکا کی حدود سے نکل کر پورے مشرقی پاکستان پر محیط ہوگئی۔

سرور صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں دوستوں کا بہت اچھا حلقہ نصیب ہوا۔ ڈھاکے میں بھی ادیبوں اور شاعروں کے دو نمایاں گروپ تھے۔ ایک سینئر اور بزرگ شاعروں اور ادیبوں کا اور دوسرا نوجوانوں کا۔ سرور دوسرے گروپ میں شامل ہوگئے۔ افسر ماہ پوری، نظیر صدیقی، عطاء الرحمن جمیل، صلاح الدین محمد، ارشد کاکوی، اختر پیامی، مسعود کلیم اور نوشاد نوری اس گروپ سے تعلق رکھتے تھے مگر یہ دلچسپ بات تھی کہ سرور بزرگ اور سینئر ادیبوں اور شاعروں میں بھی ہر دلعزیز تھے۔ دراصل وہ بزرگوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ سب سے جھک کر ملتے، سب کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

ان کی آمدنی محدود تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں میں اضافہ ہوتا گیا مگر انہوں نے اپنی آمدنی میں اضافے کی طرف توجہ نہیں دی۔ صابر و شاکر بیوی چپ چپ رہنے کی عادی تھی، پھر بھی کبھار دبی زبان سے شکایت کرتی کہ گھر کی طرف بھی توجہ دو۔ کچھ اور ہاتھ پیر بھی مارو مگر وہ اور کیا کرتے، کسی بہتر ملازمت کے خانے میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ اچھے لوگوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اس لیے اپنی خوش پوشی پر بھی توجہ دیتے تھے۔ نتیجتاً گھریلو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ انہی دنوں کی بات ہے ان کا چھوٹا بھائی حفیظ الرحمن بھی بارہ بنکی سے ڈھاکے آگیا۔ اسے شعر و شاعری سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ سرور صاحب کی سفارش پر اسے ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس نے اپنی انتھک محنت سے جلد ترقی کر کے ایک نئی انشورنس کمپنی کی منیجری حاصل کرلی اور بھائی بھاوج کے گھر کو بہت سہارا دیا۔

سرور صاحب کی شاعری جو پہلے محض عشق و محبت کی شاعری تھی، اب اس میں زندگی کے دوسرے رنگ روپ بھی نظر آنے لگے۔ ڈھاکے میں انہیں ادیبوں اور شاعروں

کا جو حلقہ ملا تھا ان کی سوچ اور فکر کے دھارے کو اس نے ایک نیا موڑ دیا۔ صلاح الدین محمد، اختر پیامی، نوشاد نوری، اظہر قادری اور حنیف فوق کے ترقی پسندانہ رجحانات نے ان پر خوشگوار اثر ڈالا اور ان کی شاعری حسن و عشق کے رنگین اور حسین حصار سے نکل کر زندگی کے تپتے ہوئے ریگزاروں پر چل پڑی۔ جیسے جیسے سرور بارہ بنکوی کے افکار و اظہار میں پختگی آتی گئی، ویسے ویسے ان کی شہرت اور مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مغربی پاکستان میں بھی انہیں بلایا جانے لگا۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد میں کوئی بھی مشاعرہ ہوتا تو سرور بارہ بنکوی اور اقبال عظیم کو ضرور مدعو کیا جاتا پھر بھارت سے بھی ان کے نام دعوت نامے آنے لگے۔ ایک بار کلکتے میں اردو پاک نوعیت کا ایک بڑا مشاعرہ ہوا جس میں مشرقی پاکستان سے انہیں بلایا گیا۔ انہوں نے اس مشاعرے میں جب اپنی مسحور کن آواز میں یہ غزل سنائی:

جب تلک روشنی فکر و نظر باقی ہے
تیرگی لاکھ ہو امکانِ سحر باقی ہے

تو سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شعراء نے ان کی زبردست پذیرائی کی اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ایک دن ان کے صحافی اور شاعر دوست صلاح الدین محمد نے ان سے کہا۔ ''فلم کے لیے کہانی لکھو گے؟''

''بنگالی فلم کے لیے؟''

''نہیں، اردو فلم کے لیے۔''

ان دنوں ڈھاکے میں صرف بنگلہ فلمیں بنتی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں کبھی اردو فلمیں بھی بنائی جائیں گی۔ صلاح الدین نے انہیں بتایا۔ ''بے بی اسلام یہاں ایک اردو فلم بنانا چاہتا ہے۔''

بے بی اسلام کلکتے کی فلم انڈسٹری کا نامور عکاس تھا جو کلکتے سے ہجرت کر کے ڈھاکے آ گیا تھا اور اب یہاں ایک اردو فلم بنانا چاہتا تھا کہ اسے ملک گیر پیمانے پر بزنس کرنے کا موقع ملے۔

سرور نے صلاح الدین محمد سے کہا۔ ''یار! فلم کے لیے لکھنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ بے بی اسلام تمہیں بتا دے گا تمہیں کس طرح لکھنا ہوگا۔''

بے بی اسلام نے کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک بنگالی ناول کو یونس احمر سے اسکرپٹ کی شکل میں اردو میں منتقل کروایا تھا جو بے بی اسلام کو پسند نہیں آیا تھا۔

سرور صاحب بے بی اسلام سے ملے تو اس نے انہیں وہ اسکرپٹ دے کر کہا۔ ''اسے اچھی طرح پڑھ لیجیے۔''

جب وہ اسے پڑھ چکے تو بے بی اسلام نے کہا۔ ''آپ کو کہانی کا تو اندازہ ہو گیا ہے۔ آپ اسے از سر نو مکالموں کا روپ دیں۔''

بے بی نے انہیں مکالموں کے سلسلے میں بنیادی باتیں بتا دیں کہ کن باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے اس طرح سرور بارہ بنکوی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ''تنہا'' ان کی پہلی فلم ہی نہیں تھی، مشرقی پاکستان کی بھی پہلی اردو فلم تھی۔ سرور صاحب نے انجمن ترقی اردو کی ملازمت چھوڑی نہیں، اسے بھی چلاتے رہے اور ''تنہا'' کے اسکرپٹ پر بھی کام کرتے رہے۔ اس کی تکمیل میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ گیا۔ غالباً بے بی اسلام کو اس کی جلدی نہیں تھی۔ بہرحال جب یہ کام مکمل ہو گیا تو ان کی چھٹی نہیں ہوئی۔ بے بی اسلام نے ان سے کہا۔ ''آپ کو اس فلم کی تکمیل تک میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

اور سرور صاحب نے فلم کی تکمیل تک ہر مرحلے میں بے بی اسلام کا ساتھ دیا۔

''تنہا'' کے بارے میں کسی کو اُمید نہیں تھی کہ یہ بنے گی مگر جب یہ فلم آدھی سے زیادہ بن گئی تو کچھ لوگوں کو جیسے دھچکا لگا.... ارے یہ کیا ہو گیا! اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشانی احتشام اور ان کے بھائی مستفیض کو ہوئی۔ ان کا لیو فلمز کے نام سے ذاتی فلمساز ادارہ تھا جس کے بینر تلے دونوں بھائی بنگالی فلمیں بنا چکے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر بے بی اسلام یہاں اردو فلم بنا سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں بنا سکتے؟ ہم تو ریگولر پروڈیوسر ہیں، ہماری ایک سیٹنگ ہے، ہمارے وسائل وسیع ہیں۔ دونوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم بھی ایک اردو فلم بنائیں گے۔

انہوں نے اس سلسلے میں سرور بارہ بنکوی ہی کو بلایا کہ اس وقت وہاں وہی دستیاب تھے۔ ان کے پاس ایک کہانی تھی جس کا اسکرپٹ اور کچھ گانے انہوں نے سرور صاحب سے لکھوائے۔ بے بی اسلام کے مقابلے میں یہاں پر کام تیز رفتاری سے ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''چندا'' سیٹ کی زینت بن گئی۔ ''چندا'' ابھی آدھی ہی بنی تھی کہ احتشام کو اطلاع ملی کہ ''تنہا'' مکمل ہو گئی ہے۔ انہوں نے یہ سازش کی کہ جب ''تنہا'' سنسر بورڈ میں گئی تو اس پر غیر ضروری اعتراضات کروا کے اسے رکوا دیا۔ سنسر بورڈ کے کئی اراکین دونوں

بھائیوں کے دوست تھے اور انہی کے ذریعہ ''تنہا'' کی نمائش رکوائی گئی تھی۔ اس طرح ''چندا'' مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم کی حیثیت سے ریلیز کی گئی جس نے فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ ''چندا'' کی ملک گیر کامیابی سے متاثر ہوکر مستفیض نے ''تلاش'' کے نام سے اردو فلم بنائی جو ''چندا'' سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ اس کے لیے بھی سرور صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ''چندا'' اور ''تلاش'' کی زبردست کامیابیوں کے بعد ڈھاکے میں اردو فلموں کا جیسے سیلاب آگیا۔ تمام بنگالی فلمسازوں نے اردو فلمیں شروع کردیں اور سرور صاحب فلمسازوں کے لیے گویا ہاٹ کیک بن گئے۔

فلموں میں آنے کے بعد سرور صاحب کے دن بھی پھر گئے۔ خوش حالی اور فارغ البالی نے گھر کا راستہ دیکھا تو گھر کی حالت بدلنے لگی۔ گھر والی بھی خوش رہنے لگی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جانے لگی پھر وہ وقت بھی آیا جب گھر بھی بدل گیا۔ نارتھ بروک ہال روڈ کے دو تین کمروں کے مکان سے نیو اسکٹن روڈ کے نئے مکان میں جا بسے۔ نیو اسکٹن پوش علاقہ تھا، یہاں کی رہائش کا یہ مطلب تھا کہ یہاں صاحب حیثیت لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔

اردو فلموں کی بہتات سے ڈھاکے کی فلمی صنعت کی گہما گہمی میں اضافہ ہی نہیں ہوا، ان فلموں سے وابستہ افراد کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہوگیا اور سرور صاحب تو مصروف ہوگئے کہ دم لینے کی مہلت نہیں رہی۔ مکالمہ نویسی اور نغمہ نگاری کے میدان میں اپنی فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑنے کے بعد انہیں فلم سازی اور ہدایت کاری کا شوق چرایا۔ کچھ غیر فلمی دوستوں نے بھی اس سلسلے میں ورغلایا کہ اب اپنی فلم بناؤ۔ سرور صاحب بھی شاید یہی سمجھتے تھے کہ فلم بنانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بس سرمایہ دستیاب ہوجائے تو فلم بننے میں دیر نہیں لگتی مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ سرمایہ کہاں سے آئے؟ انہوں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی تو انہیں ان کے دوست محمود الحسن نظر آئے جو چاٹگام کے ممتاز تاجر تھے اور ان سے بے حد پیار کرتے تھے۔ سرور صاحب نے ان سے کہا تو وہ بلا تامل راضی ہوگئے۔ ان کے لیے دو ڈھائی لاکھ کی کیا حقیقت تھی۔

اب سرور صاحب نے اپنے فلمساز ادارہ ساگوریکا پکچرز کی بنیاد ڈالی اور اس بینر تلے اپنی پہلی فلم کا کام شروع کردیا۔ اس کی کہانی انہوں نے نامور افسانہ نگار ہاجرہ

جمع بین الصلاتین

دو وقتوں کی نماز ملا کر ایک وقت میں پڑھنا۔ مثلاً ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت ہی میں پڑھ لی جائے۔ حج کے دوران میں حاجی لوگ عرفات میں 9 ذوالحجہ کے وقت ہی میں ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھ لیتے ہیں اور پھر مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک جمع بین الصلاتین حج کے علاوہ بھی ہر سفر میں جائز ہے اس کی ایک شکل جمع صوری بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کو موخر کر کے اس وقت پڑھا جائے جب اس کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور دوسرے وقت کی نماز کو وقت شروع ہوتے ہی پڑھ لیا جائے۔ اس طرح بظاہر تو یہ معلوم ہوگا کہ دونوں نمازیں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھی گئی ہیں لیکن حقیقت میں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئیں۔ فقہائے احناف کے نزدیک سفر حج کے علاوہ دوسرے سفروں میں صرف صوری ہی جائز ہے۔

مرسلہ: عفان احمد ثوری۔ چنیوٹ

سرور سے لکھوائی اور اس کہانی کا اسکرپٹ خود لکھا۔ فلم کا نام ''آخری اسٹیشن'' رکھا۔ اس کی آؤٹ ڈور شوٹنگ دو ہزاری اسٹیشن اور ان ڈور عکس بندی حبیب انصاری کے بنگلے میں کی۔ دو ہزاری کا یہ اسٹیشن چاٹگام سے کچھ فاصلے پر واقع ہے جہاں سے ریل گاڑیاں آگے نہیں جاتی تھیں۔ حبیب انصاری جو جوٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے انجمن ترقی اردو کے آنریری سیکریٹری تھے اور سرور صاحب کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے ڈھاکے کے پوش علاقے گلشن میں بہت بڑے قطعہ اراضی پر لکھنؤ کے نوابوں جیسی ایک حویلی بنائی ہوئی تھی۔

''آخری اسٹیشن'' سرور صاحب کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے مقررہ وقت سے کچھ زیادہ مدت میں مکمل ہوئی۔ نمائش کے بعد اپنی اچھی اور مقصدی کہانی کی وجہ سے پسند کی گئی مگر باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

فلم انڈسٹری میں یہ سرور صاحب کے عروج کا دور تھا۔ اس وقت ڈھاکے میں زیادہ تر اردو فلمیں بن رہی تھیں اور سرور

صاحب مصنفوں اور نغمہ نگاروں میں سرفہرست تھے مگر ان کی ذاتی فلم بنانے پر ان کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ اپنی فلم کے سلسلے میں ان کی مصروفیات کی وجہ سے فلم سازوں کو دوسروں کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح کچھ نئے اور کچھ پرانے مصنفوں اور نغمہ نگاروں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا جو آگے چل کر سرور صاحب کے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔

فلمی مصروفیات کے زمانے میں بھی سرور صاحب کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور پہلے کی طرح محفل پر چھا جاتے تھے۔

''آخری اسٹیشن'' کمرشل طور پر جس طرح فلاپ ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ دوبارہ پروڈکشن کی طرف نہیں آتے۔ اپنی اصل پروجیکٹ پر ازسرنو سرگرم ہو جاتے۔ فلموں کے لیے لکھنا شروع کر دیتے مگر اب بھی ان کے سر سے فلم سازی کا بھوت نہیں اترا تھا۔ انہوں نے جلد ہی اپنی دوسری فلم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوسری فلم ''تم میرے ہو'' کرشن چندر کے ایک ناول کی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ جس کے بارے میں انہیں علم نہیں تھا کہ بمبئی میں اس کہانی پر ایک فلم بن چکی ہے۔ ''تم میرے ہو'' تکنیکی طور پر ''آخری اسٹیشن'' سے بہتر تھی مگر اس کی کہانی نے تماشائیوں کو متاثر نہیں کیا۔ ''آخری اسٹیشن'' میں تو پیسا نہ سہی واہ واتو ملی تھی مگر اس فلم میں تو واہ وا بھی نہیں ملی۔ اس فلم کی ناکامی نے سرور صاحب کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے اس فلم پر بڑی محنت کی تھی اور اس کے کمرشل پہلو کا بھی خیال رکھا تھا۔ اس فلم کے سلسلے میں ان کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے مگر اب بھی انہوں نے فلمسازی کا خیال دل سے نہیں نکالا۔ فلم سازی کی دو بازیاں ہارنے کے باوجود انہوں نے اگلی فلم کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس بار انہیں زیادہ تلخ تجربوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دو فلمیں فلاپ کروانے والے کے لیے کون سرمایہ کاری کرتا؟ مگر انہیں ضد تھی کہ فلم ضرور بناؤں گا۔ جب کسی طرف سے کوئی اُمید نہ رہی تو یہی فیصلہ کیا کہ خود سرمایہ فراہم کریں گے۔

بڑی تگ و دو کے بعد انہیں ایک ایسا بندہ ملا جو فلم میں ہیرو بننے کے عوض معمولی نوعیت کی سرمایہ کاری کے لیے تیار ہوا۔ یہ ایک گجراتی نوجوان تھا مگر اس نے پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ رقم فراہم نہیں کی۔ اس زمانے میں آج کی طرح کروڑوں میں فلمیں نہیں بنتی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں تو ڈیڑھ دو لاکھ میں بن جاتی تھیں۔ اس حساب سے بھی پچاس ساٹھ ہزار کی کوئی حیثیت نہیں تھی پھر بھی سرور صاحب نے یہ سوچ کر اس پیسے سے فلم شروع کر دی کہ تھوڑی بہت پبلسٹی کے بعد اگر اس کی ڈسٹری بیوشن کا معاملہ طے ہو گیا تو باقی اخراجات آسانی سے پورے کر لیے جائیں گے۔ محدود سرمائے سے فلم بنانے کے لیے انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ کاسٹ میں کسی معروف آرٹسٹ کو شامل نہیں کیا۔

نئی منصوبہ بندی کے بعد سرور صاحب یونٹ کے چند لوگوں کو ساتھ لے کر لاہور پہنچ گئے اور ہیروئن کے لیے سنبل کو کاسٹ کر لیا۔ کئی مرحلوں میں فلم بندی کا کام تکمیل کو پہنچا۔ درمیان میں طویل طویل وقفے آئے۔ اگلی شوٹنگ مسئلہ بنی رہی۔ پیسوں کا بندوبست کرنے میں دانتوں تلے پسینا آ گیا۔ بہرحال فلم مکمل ہو گئی اور پھر اس کی نمائش کا مرحلہ بھی آ گیا۔ یہ معرکۃ الآرا فلاپ فلم ''آشنا'' تھی جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلم بینوں کا ننانوے فیصد طبقہ اس فلم سے ناآشنا ہے۔ ناکامیوں کی اس ہیٹ ٹرک کے بعد سرور صاحب چپکے بیٹھ رہے کیونکہ اب ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی کی کشتی جلا کر انہوں نے فلمسازی کا دریا پار کرنا چاہا تھا مگر جب نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم تو چپکے بیٹھنے کے علاوہ اور کیا کرتے؟ اب ان کے حصے میں کبھی کبھار ہی کوئی فلم آتی تھی۔

ان کے اچھے دور کی طرح ان کے اس برے دور میں بھی ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ مشاعروں اور ثقافتی تقاریب میں شرکت کرتے رہے۔ اپنا ایک ذاتی ادبی جریدہ ''آب و گل'' نکالا اور پاکستان رائٹرز گلڈ ڈھاکے کے مجلہ ''قلم کار'' کی ادارت میں بھی معاونت کی۔ ''آب و گل'' کے چند شمارے اور ''قلم کار'' کا ایک ہی ضخیم شمارہ نکالا۔ ان کا اپنا پہلا مجموعۂ کلام ''سنگ آفتاب'' اپنی زندگی میں کراچی میں طبع کروایا۔ یہ 1975ء کی بات ہے۔ دوسرا شعری مجموعہ ''سوز و گیتی'' کے نام سے ان کے انتقال کے بعد ستمبر ۱۹۸۰ء میں کراچی ہی میں شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تزئین کا بہت سا کام وہ اپنی زندگی ہی میں انجام دے چکے تھے مگر موت نے یہ کام تکمیل تک پہنچانے کی مہلت نہیں دی۔ لہٰذا سرور صاحب کے عزیز ترین دوستوں حمایت علی شاعر اور محمود حسن نے ازسرنو ترتیب و تزئین اور اشاعت کا کام مکمل کیا۔

سرور صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے مگر انہوں نے اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی تغزل کا رچاؤ نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں ''فن''، ''دعا''،

''بیاکل رُت''، ''یوم انا الحق''، ''دیوار''، ''خواب دیکھتا ہوں''، ''بلیک آؤٹ''، ''شکست سے پہلے''، ''سائیکلون''، ''افسانہ''، ''کرفیو''، ''امن کی بشارت'' اور ''احتساب'' خاص طور پر متاثر کرنے والی نظمیں ہیں۔

کراچی کے دس سالہ دوران قیام میں سرور صاحب نے بظاہر کچھ نہیں کیا، مگر کچھ نہ کچھ کرتے بھی رہے۔ کراچی اور لاہور کی چند ایک فلموں کے لیے گیت لکھا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کچھ پروگراموں میں شرکت کی۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کے بارے میں ایک فلمی کہانی لکھی 'کیمپ نمبر ۹۹''۔ فرصت کے لمحات میسر تھے، اس لیے اس کا منظر نامہ اور مکالمے بھی لکھ ڈالے۔ اس کی فلم بندی کے لیے اجازت حاصل کرنا ایک مرحلہ تھا۔ بہت دنوں تک اسلام آباد کے چکر لگانے کے بعد نیف ڈیک سے وابستہ دوستوں کو اس کہانی اور اس کے اسکرپٹ کے بارے میں اطلاع ملی تو انہوں نے کہا۔

''یہ جس نوعیت کی کہانی ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے نیف ڈیک جیسا ادارہ فلمائے۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے کہ یہ کہانی بہتر سے بہتر طریقے پر فلمائی جائے۔ اگر مجھ سے زیادہ بہتر طریقے پر یہ کام نیف ڈیک کرسکتا ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔''

انہی دوستوں کے توسط سے نیف ڈیک کے حکام تک بات پہنچی۔ انہوں نے تھوڑی بہت رد و قد کے بعد اس اسکرپٹ کو خرید لیا اور فوری طور پر انہیں ایک معقول رقم ادا کردی مگر ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اس پر فلم بندی شروع نہیں کی۔ آخر کار یہ خبر پھیلی کہ فوجی حکام نے اسے فلمانے کی اجازت نہیں دی۔ سرور صاحب کو بڑا افسوس ہوا کہ انہوں نے نیف ڈیک کے ہاتھوں اسے بیچ کر بڑی بھول کی۔

جب بنگلہ دیش کی فضا کچھ پُرسکون ہوئی اور پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات کچھ بحال ہوئے تو سرور صاحب کو بنگلہ دیش کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کی سوجھی۔ اپنے خوابوں کی سرزمین کو وہ بھولے نہیں تھے مگر اب وہ دیار غیر تھا۔ بہرحال وہ اگلی ہی فرصت میں ڈھاکے پہنچ گئے اور اپنے پرانے فلمی دوستوں سے ملے اور اپنے خیال سے انہیں آگاہ کیا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مابین فلم سازی کا آئیڈیا اچھوتا تھا۔ انہیں پسند آیا۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیشی فلمساز سے کو پروڈکشن کا معاملہ طے ہوا اس کا نام فضل شہاب الدین تھا۔ یہ فضل شہاب الدین وہی تھا جو کبھی فلم جرنلسٹ ہوا کرتا تھا۔ اداکار ہارون کا بہت اچھا دوست تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ہارون اور اس کی فیملی کو گرفتار کر کے بنگلہ دیشی حکومت نے ان کے سارے کاروبار کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا تو انہوں نے بڑی تگ و دو کے بعد نہ صرف ہارون اور اس کی فیملی کو رہا کروایا بلکہ ان کی تمام جایداد اور کاروبار کو بھی بحال کروایا۔

سرور صاحب نے جلد ہی اس فلم کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس فلم کے لیے ایسی کہانی لکھی جس کے کردار دونوں ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں جگہ اس کی فلم بندی ہونی تھی، جب کہ کہانی کا ایک حصہ کراچی سے چاٹگام کے درمیان سمندری سفر کے دوران فلمایا جانا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک بحری جہاز کرائے پر حاصل کرنے والے تھے۔

اس سلسلے میں سرور صاحب کو کئی بار ڈھاکے کا سفر کرنا پڑا۔ اس بار انہیں اپنی کامیابی کا کچھ زیادہ ہی یقین تھا۔ کئی بار کے سفر کے بعد انہوں نے شوٹنگ سے پہلے کی تقریباً ساری تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ اب صرف ایک سفر باقی رہ گیا تھا جس میں وہ ان تمام تیاریوں کو فائنل شکل دیتے اور اس کے بعد شوٹنگ کا آغاز کردیتے اور پھر وہ فائنل ٹچ دینے کے لیے ڈھاکے پہنچ گئے۔

اس بار ڈھاکے پہنچے تو حسب سابق جلد ہی ان کی آمد کی خبر تمام ادبی اور ثقافتی حلقوں میں پھیل گئی اور دوست احباب ان سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ سلامت علی خاں آئے تو انہیں دیکھتے ہی سرور صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ اس بار موصوف انہیں بخشیں گے نہیں۔ سلامت علی خاں، سرور صاحب ان کو بے پناہ چاہتے تھے۔ ادیب یا شاعر نہیں تھے مگر ان سے محبت کرنے والے تھے۔ سرور صاحب کا فلم کے سلسلے میں ڈھاکا آنا جانا ہوا تو سلامت علی خان بھی ان سے ملنے آئے اور پہلی ملاقات سے ہی ضد کرنے لگے کہ ہوٹل چھوڑو اور میرے گھر چلو مگر سرور صاحب حیلے بہانے کر کے انہیں ٹالتے رہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی وہ ڈھاکے جاتے خاں صاحب انہیں اپنے ساتھ لے جانے کو آجاتے۔ پچھلی ملاقات میں سرور صاحب نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اگلی بار آؤں گا تو انشاء اللہ آپ کی میزبانی کا شرف ضرور حاصل کروں گا اس بار بھی انہوں نے بچنے کی بڑی کوشش کی مگر سلامت صاحب کسی حال میں نہ مانے لہٰذا تھوڑی دیر بعد

سرور صاحب کو ان کے ساتھ نرائن گنج جانا پڑا جو ڈھاکے سے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ خان صاحب نے سرور صاحب کی مہمانی خوب دل کھول کر کی۔ وہ سرور صاحب کو صبح اپنی گاڑی میں ڈھاکے چھوڑ جاتے تھے۔ شام کو ان کا ڈرائیور انہیں اپنے ساتھ نرائن گنج لے آتا تھا۔ ان کی میزبانی کا سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ 2 اپریل 1980ء کی رات کو سرور صاحب، سلامت صاحب کے ساتھ کھا پی کر اور گپ شپ لگا کر اٹھے تھے اور اپنے کمرے میں آتے ہی انہیں نیند آگئی تھی۔ سلامت صاحب نماز کے لیے بیدار ہوئے تو انہیں مہمان کے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

''سرور صاحب! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟''

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی، جیسے وہ اسی دستک کے منتظر تھے۔ سرور صاحب پر نظر پڑتے ہی خان صاحب کا چہرہ فق ہوگیا۔

''خیریت تو ہے، آپ کو کیا ہوگیا ہے؟''

''یہاں بہت شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ سیدھے ہاتھ سے دل کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے، چہرہ پسینے سے شرابور تھا، بال الجھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ خان صاحب معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی موٹر کار میں انہیں ساتھ لے کر ڈھاکے کی طرف روانہ ہوگئے۔

''یہ درد کب سے ہو رہا ہے؟''

''کوئی دو بجے سے۔''

''آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟''

پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''آپ کو ڈسٹرب کرنے کو دل نہیں چاہا۔''

خان صاحب نے اپنے سینے پر دو ہتھڑ مارا، ''ہائے ہائے یہ کیا غضب کیا آپ نے۔ آپ کو پتا ہے کتنی دیر ہوگئی ہے؟''

خان صاحب اڑ کر ڈھاکا میڈیکل کالج پہنچ جانا چاہتے تھے مگر یہ ان کے بس سے باہر تھا۔ کار اپنی رفتار سے کہیں زیادہ تیز بھاگی جا رہی تھی مگر دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ ڈھاکا میڈیکل کالج ابھی بہت دور تھا جب کہ موت ہر لمحہ ان سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی ''سنگِ آفتاب'' نہیں آیا تھا مگر سرور اندر ہی اندر کرچی کرچی ہو کر بکھرے جا رہے تھے۔ نرائن گنج بہت پیچھے رہ گیا تھا اور ڈھاکا میڈیکل کالج قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ سلامت صاحب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور سرور صاحب کی نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ زبان چپ تھی مگر آنکھیں بول رہی تھیں۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے کہا، بہت دیر کی مہرباں آتے آتے، آنے والا تو پہلے ہی جا چکا ہے۔ سلامت علی خاں پتھر بن گئے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا وہ کہیں، 'یہ کیا حرکت ہے بھئی، ہم تو اسپتال جا رہے تھے تم اُدھر کیوں چلے گئے؟' مگر وہ تو پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ بس دھندلائی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا جو رات بھر کے جاگے ابھی تک سو گئے تھے۔ سرور ادب کو موت آگئی تھی۔

سرور بارہ بنکوی 1927ء میں پیارے پور (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام سعید الرحمٰن تھا۔ ان کے والد سید محمد ادریس زمین دار تھے۔ ان کی والدہ آمنہ خاتون بڑی دین دار تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں سید سعید الرحمٰن، سید حفیظ الرحمٰن، سید معز الرحمٰن اور نسیم عائشہ و پروین عائشہ کی ابتدائی مذہبی تعلیم مکتب میں دلوائی جب کہ ان کی اسکول اور کالج کی تعلیم پر بھی اپنے شوہر سے زیادہ توجہ دی۔ 30 نومبر 1948ء کو سرور صاحب کے چار بیٹوں عارف خالد، آصف، طارق اور تین بیٹیوں ایمن، سارہ اور ہما کو کبھی یہ سوچنے نہیں دیا کہ باپ کی کمی ہے یا انہوں نے ان کی پرورش و پرداخت میں اپنی ذمے داریاں احسن طریقے پر ادا نہیں کی ہیں۔ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر سرور صاحب کی ادبی حیثیت کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں۔ بچوں پر بھی انہوں نے باپ کی شخصیت کا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ سرور صاحب کی زندگی ہی میں نہیں، ان کی موت کے بعد بھی انہوں نے ان کے بچوں کی بڑی اچھی پرورش اور نگہداشت کی۔ سرور صاحب کے بعد وہ بڑی تیزی سے اندر ہی اندر ٹوٹتی پھوٹتی جا رہی تھیں اور آخر کار 1991ء میں صبر و استقامت کی یہ دیوار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمیں بوس ہوگئی۔

سلامت علی خاں جنہیں زندگی بھر یہ قلق رہا کہ ہائے سرور، تم نے میری نیند خراب نہیں کی مگر اپنی زندگی ختم کر لی۔ وہ اپنے ساتھ ہی مرنے والے کی میت ڈھاکے سے کراچی لائے تھے۔ 4 اپریل 1980ء کو جب ان کے محبوب کو اس کی آخری آرام گاہ میں لٹایا جا رہا تھا تو ان کی حالت ناگفتنی تھی۔ آنسوؤں کی برسات میں تو سارے ہی چاہنے والے نہا رہے تھے مگر سلامت علی کو سلامت رکھنے کے لیے کئی لوگ انہیں سنبھالنے کی انتھک کوشش کر رہے تھے۔

++

نغماتِ اقبال

ابصار احمد

صدیوں سے وطن پرست اپنے وطن کے عوام کی رگوں میں جوش بھر دینے کے لیے اشعار کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ پاکستان میں وطن دوست شاعروں کی کمی نہیں مگر علامہ اقبال نے قیامِ پاکستان سے بہت قبل ایسے اشعار کہے جو آج بھی تازہ ہیں، وطن پرستی کی تصویر ہیں۔ چند اشعار کا تذکرہ اس سے قبل کی تحریر میں کیا گیا، باقی کے اشعار نذر قارئین ہیں۔

باذوق قارئین کے لیے مختصر مگر دلچسپ تحریر

14 اور 15 اگست کی درمیانی شب جب عالم اسلام کی سب سے بڑی اور نظریاتی ریاست مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی تو ریڈیو سے اعلان کے بعد منور سلطانہ اور دلشاد بیگم نے قومی نغمات پیش کیے اس کے بعد سنتو خان کی آواز میں ایک قوالی کے انداز میں ملی نغمہ پیش ہوا۔

"ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کہسار
زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے"

واقعی ملت اسلامیہ کا کارواں موسم گل میں خیمہ زن ہو چکا تھا' زمانے کے انداز و اطوار بھی بدلے جا چکے تھے اور ملت اسلامیہ ہند اس نئی مملکت کے لیے دل سے قوت حیدر کرارؓ اور سوز صدیق اکبرؓ کی متمنی تھی۔ یہ آواز "طلوع صبح آزادی" کی نشریات میں گونج رہی تھی جس وقت آج صبح آزادی کی فضاؤں میں روزہ افطار ہونے والا تھا۔ یہ شب قدر کی بابرکت رات بھی تھی اسی لیے ہر مسلمان کا دل اس آواز کو بغور سن رہا تھا۔ اس

کلام کا شاعر وہ ہستی تھی جنہوں نے 17 برس پہلے اس وطن کا خواب دیکھا تھا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد میں سالانہ جلسے کے خطبۂ صدارت میں یہ خیال پیش کیا کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک مسلم ریاست وجود میں آنے والی ہے۔ یہ شاعر صرف شاعر نہیں بلکہ درد ملت رکھنے اور مسلمانان ہند کو ان کی عظمت رفتہ یاد دلانے والے علامہ محمد اقبالؒ کی شخصیت ہے جنہیں ہم مصور پاکستان اور حکیم الامت کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل ہی اقبالؒ کی ملی شاعری نے مسلمانوں کو بیدار کیا، انہیں ان کا ماضی یاد دلایا تو قوم کا ہر فرد اور بالخصوص نوجوان طبقہ بیدار ہوا جسے وہ ''شاہین'' کہتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کی خصوصی نشریات ''طلوع صبح آزادی'' سے یہ نغمہ بار بار آزادی کا احساس دلا رہا تھا۔ سحری کا وقت ہو چکا تھا، لوگ سحری میں بھی مصروف تھے تو کان ریڈیو پر بھی لگے تھے جہاں سے بار بار سنتو خان اور ہمنوا گردان کر رہے تھے ''زمانے کے انداز بدلے، نیا راگ ہے ساز بدلے گئے'' یہ گردان دراصل ایک پیغام تھا کہ ''اے لوگو! زمانے کے انداز دیکھو اور اب نئی مملکت میں اپنا چلن بدلو کیونکہ اب پاکستان کا مستقبل تم ہی سے وابستہ ہے''۔

اقبالؒ کا کلام دریائے سخن میں صرف اشعار کے بہتے دھارے نہیں تھے بلکہ وہ ملی پیغامات تھے جن کی بانگ درا نے قافلۂ ملت کو سفر منزل کی طرف گامزن کیا جس کی پہلی منزل یہ مملکت خداداد پاکستان تھی۔

اقبالؒ کے اشعار کو موسیقی کے قالب میں ڈھال کر نغمات سازی کا کام تو ان کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا جن میں عارفانہ اور ملی دونوں کلام شامل تھے لیکن اقبالؒ کے عارفانہ بلکہ تغزلیہ اور حمدیہ کلام میں بھی ملی رنگ واضح ہے اسی لیے وہ کسی نہ کسی طرح ملی نغمات میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہاں ان کے صرف ملی کلام کا ذکر کریں گے جس کے باعث یہ ملک بنا اور اس کے ملی نغمات بننا شروع ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل ان کی زیادہ تر عارفانہ نظمیں اور غزلیں ہی گراموفون کمپنی ہز ماسٹرز وائس نے اپنے گراموفون ریکارڈ پر جاری کی تھیں جو آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتیں جن میں رفیق غزنوی کی آواز و موسیقی میں ''کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں'' بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک گائیک محمد قاسم نے تحریک پاکستان کے زمانے میں ان کی دو ملی نظمیں ''یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے'' اور ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا..... مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا'' ریکارڈ کروائی تھیں جو قدیم طرز اور پکی آواز میں تھی۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد جب استاد مبارک علی، استاد فتح علی خان اور سنتو خان وغیرہ نے کلام اقبالؒ پیش کرنا شروع کیا تو ڈائریکٹر جنرل ذوالفقار علی بخاری اور حمید نسیم صاحب کی ایماء پر کلام اقبالؒ کو الگ جہت سے نوازا گیا اور اس کے لیے علیحدہ وقت مختص ہوتا یا پھر یہ ملی نغمات کے ضمن میں ہی نشر ہوتا کیونکہ اقبالؒ کا کلام ملی پیغام ہے تو بلاشبہ یہ حقیقی ملی نغمات ہی ہیں۔ یہ الگ جہت کیونکر نہ ہوتی کہ اس عظیم سخنور نے اس ملک پاک کا خاکہ تیار کیا تھا بلکہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ایک بار فرمایا تھا ''اگر مجھے مجوزہ پاکستان اور اقبالؒ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوا تو میرا انتخاب اقبالؒ کی شخصیت ہوگی۔'' اس سے اچھا اور بہتر تبصرہ شاید ہی اقبالؒ جیسی شخصیت کے لیے ہو کہ ایک مملکت کا بانی ان کی خدمات اور پیغام کے باعث یہ کہے۔

قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے ملی نغمات کے ساتھ ساتھ کلام اقبالؒ بھی جزو لاینفک تھے اسی لیے ابتدائی قومی نغمات میں بے شمار کلام اقبالؒ کی شکل میں ملی نغمات کا سراغ ملتا ہے لیکن اس وقت چونکہ ریڈیو پاکستان کے پاس ریکارڈنگ کی سہولیات نہیں تھیں اسی لیے فنکار اس واحد نشری ادارے میں اپنا کلام براہ راست ہی نذر سامعین کر کے چلے جاتے اور عوام کافی دنوں تک ترنم اور پیغام میں گم رہتے، اسی انداز نے قوم کو پیغام اقبالؒ پہنچانے میں بھی مدد کی کیونکہ موسیقی اور ترنم کے ساتھ پیغام کی گہرائی سمجھ آئے یا نہ آئے کم از کم اثر ضرور ہو جاتی ہے اور پھر کبھی ان کے معنوں اور مفاہیم پر انسان غور کر ہی لیتا ہے۔

چنانچہ ریڈیو پاکستان کی جانب سے زیڈ اے بخاری نے 17 اگست 1947ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا کہ ریڈیو پاکستان کے تینوں اسٹیشن یعنی لاہور، پشاور اور ڈھاکا سے خصوصی طور پر کلام اقبالؒ نشر کیے جائیں۔

15 اگست 1947ء کو دوپہر کے وقت منور سلطانہ نے لاہور ریڈیو سے بال جبریل کی ۵۴ ویں غزل۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

براہ راست پڑھی جو یقیناً نئی مملکت کے تناظر میں تھی۔ یہی وہ منزل عشق تھی جس کے لیے عشروں کی غلامی کا شکار عاشقان آزادی نے طوق غلامی توڑا تھا۔ آج یہ کلام جو بھی سن رہا تھا اس کا مفہوم خود ہی سمجھ رہا تھا۔ ابھی کلام جاری ہی تھا کہ منور سلطانہ نے اقبالؒ کا یہ شعر پڑھا:

"اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

یہ سنتے ہی اسٹوڈیو میں بیٹھے پروڈیوسر عبدالشکور بیدل نے اس شعر کو بار بار پڑھنے کے لیے اشارہ کیا کیونکہ ابھی دو منٹ اضافی تھے۔ منور سلطانہ جو دُر فریدی کی موسیقی میں یہ نغمہ براہ راست گا رہی تھیں انہوں نے بھی لہک لہک کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ منور سلطانہ کی آواز میں اس شعر نے پورے ریڈیو اسٹیشن اور سامعین کے دلوں میں ایک سماں باندھ دیا۔ یہ شعر مستقبل کی فکر کی طرف ایک اہم اشارہ تھا کہ اے فضا میں اڑنے والے پرندے یعنی آزاد مسلمان! اس رزق سے موت اچھی ہے جو رزق تجھے ملے مگر اس کے بدلے تیری قوت اور شان و شوکت چھن جائے۔ افسوس کہ اقبالؒ کے اس پیغام کو حکمرانوں نے سنجیدہ نہیں لیا اور ہم بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے جانے لگے اور آج ہم دنیا میں اپنی مضبوط آواز کے باوجود اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ اپنے مسائل اور خصوصاً مسئلہ کشمیر پر دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکیں جس کی وجہ قرضے ہیں۔ پاکستان کا مستقبل اسی وقت صحیح معنوں میں روشن ہوگا جب ہم لاہوتی طائر ایسے رزق کو ٹھکرا کر اپنی پرواز میں محو ہوں گے۔

ریڈیو پاکستان لاہور سے کلام اقبال کا سلسلہ جاری تھا تو 15 اگست ہی کو استاد فتح علی خان اور مبارک علی خان بھی لاہور آگئے۔ یہ استاد فتح علی خان دنیائے موسیقی کے عظیم قوال استاد نصرت فتح علی خان کے والد تھے، انہوں نے قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان کے زمانے ہی میں اپنے بھائی مبارک علی خان کے ساتھ مل کر حضرت علامہ کا پیغام ہند بھر میں سنانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ امرتسر سے لے کر دہلی تک پیغام اقبال قوالی کے انداز میں سناتے آرہے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حکیم الامت سے عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار فتح علی خان نے لاہور ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ "اقبالؒ دور حاضر کے صوفی ہیں وہ ایسے صوفی ہیں جو انسان اور قوم کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اسی لیے ہم جہاں قدیم صوفیوں کا کلام پڑھتے تھے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے دور کے اس صوفی قلندر کا کلام ہی سناؤں۔ مجھے اقبالؒ سے عقیدت ان کا شعر "دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر" سن کر ہوئی تھی اور اسی دن میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کو قوالی کے انداز میں سناؤں گا پھر علامہ صاحب کے اشعار پڑھے تو مجھے ان میں ایک سچا اور کھرا مسلمان نظر آیا اور بس میں نے اپنا کام شروع کر دیا اور سب سے پہلے علامہ کی نظم "دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر" ہی کمپوز کی اور اسے لاہور کی ایک محفل سماع میں سنایا۔ اس کے بعد تو عام مسلمان بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ افراد بھی بلانے لگے اور ہم یہ کلام جگہ جگہ سنانے لگے۔"

(بحوالہ خصوصی انٹرویو، لاہور ریڈیو، 7 نومبر 1961ء)

استاد فتح علی خان و مبارک علی خان کی پارٹی نے 15 اگست کی شب خبروں کے بعد اقبال کا بھی کلام نذر عوام کیا جس نے جشن آزادی کی مسرتوں میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس دن تقریباً چالیس منٹ تک دونوں بھائیوں نے اقبالؒ کی نظم "جاوید سے" سنائی تو ریڈیو پاکستان پر بار بار فرمائشیں آنے لگیں جس کی وجہ سے اگلے ہفتے ان دونوں کو لگاتار تین دن بجنگ ملیں ملا

ارشد محمود بنیادی طور پر موسیقی کے آدمی ہیں اور بقول ان کے انہیں موسیقی سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ فیض احمد فیض کے کلام کو موسیقی کے ذریعے عوام الناس تک پہنچانے کا کام تندہی سے کر رہے ہیں۔ ارشد محمود نے 1972ء میں لاہور ٹیلی ویژن سے اس وقت کے مشہور پروگرام "آکڑ بکڑ" سے اداکاری کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور ٹیلی ویژن کے مشہور پروگراموں سچ گپ، بال بتول میں بھی کام کیا۔ 1976ء میں ارشد محمود کراچی آگئے۔ مشہور ریکارڈنگ کمپنی ای ایم آئی سے بھی کافی عرصہ وابستہ رہے، اس عرصے میں کراچی ٹیلی ویژن سے مشہور پروگراموں آنگن ٹیڑھا، ففٹی ففٹی اور دھوپ کنارے میں بھی کام کیا۔ 1978ء میں طاہرہ سے شادی ہوگئی۔ ارشد محمود نے موسیقی کے شعبے میں رہتے ہوئے مشہور ڈراما سیریز تنہائیاں، دستک، احساس، خلیج، تپش، نجات، دھوپ کنارے کی پس پردہ موسیقی مرتب کی۔ کراچی ٹیلی ویژن سینٹر سے خاتون پروڈیوسر سلطانہ صدیقی کے ساتھ پہلی بار عید شو میں ایک گانا کمپوز کیا، اس کے بعد بچوں کے پروگرام "رنگ برنگ" کی تقریباً ڈھائی سال تک موسیقی ترتیب دی۔ 1973ء میں پہلی بار فیض احمد فیض کے کلام پر مشتمل پہلا آڈیو کیسٹ تیار کیا جس کو نیرہ نور نے گایا تھا۔ 1999ء میں اس کا دوسرا البم تیار کیا۔

اقتباس: چاند چہرے از قیصر مسعود جعفری
مرسلہ: بشریٰ الحسن۔ اقراء سٹی، کراچی

اگلے ہفتے دونوں بھائیوں نے مل کر اقبالؒ کی ایک اور نظم ''ٹیپو سلطانؒ کی وصیت'' بھی پہلی بار عوام کے گوش گذار کی جس کا پیغام یہی تھا کہ پاکستان بنانے کے بعد اب ہمیں تھک کر نہیں بیٹھنا اور نہ ابھی دم لینا ہے کیونکہ اس نظم میں اقبالؒ کا یہی پیغام ہے۔

''تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطاء ہو تو ساحل نہ کر قبول''

اس کے بعد انہوں نے قوالیہ انداز میں اقبالؒ کے دیگر اشعار بھی شعری ترتیب کے ساتھ جوڑ دیے اور جب وہ واپس نظم پر آئے اقبالؒ کے ایک شعر نے سننے والوں کے دلوں میں اور جوش جگا دیا جو یہ تھا:

''صبح ازل مجھ سے کہا جبریلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول''

اس شعر کو استاد نے ایسا پڑھا کہ واقعی محسوس ہوتا کہ روح الامین مملکت پاک کے باشندوں سے کچھ کہہ رہے ہوں.....!

استاد فتح علی خان جنھیں کلام اقبالؒ کو پڑھنے میں ملکہ حاصل تھا انہوں نے کلام اقبالؒ ہی میں خاص وصف حاصل کیا اور اپنی پہچان بنائی۔ 1964ء میں جب استاد فتح علی خان کا انتقال ہو گیا تو ان کے نوعمر بیٹے نصرت فتح علی خان نے پارٹی کی قیادت سنبھالی اور پھر اپنے والد ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے مرتب کردہ کلام اقبالؒ کو جدید موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے سنایا تو عوام سے اپنے والد کی طرح داد وصول کی۔

نصرت فتح علی خان مرحوم نے بھی سب سے پہلے اقبالؒ کی نظم ''دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر'' گا کر کلام اقبالؒ کی ابتداء کی اور پھر بیش بہا کلام اقبالؒ بھی ریکارڈ کروائے جن میں ان کی اپنی کمپوزیشن میں ''شکوہ جواب شکوہ'' بھی شامل تھا جس میں قوالیہ رنگ کی بجائے نغمیہ انداز تھا۔ یہ کلام نصرت فتح علی خان نے پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر مارچ 1997ء کو ریکارڈ کروایا تھا۔ اس سے قبل انہوں نے اقبالؒ کی یہ شہرۂ آفاق نظم اپنے والد کی طرز میں قوالیہ انداز میں بھی پڑھی تھی جسے پاکستان ٹیلی ویژن لاہور مرکز نے بھی پیش کیا تھا۔ نیز نصرت فتح علی خان مرحوم نے یہ کلام اقبالؒ بھی نذر سامعین کیے۔

☆ خودی کا سرنہاں لا الہ الا اللہ
☆ کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
☆ لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی

پاکستان کے اس قومی فنکار کا قومی ورثہ آئندہ نسلوں میں بھی منتقل ہوتا رہا اور اب ان کے پوتے راحت فتح علی خان بھی کلام اقبالؒ پڑھ کر اقبالؒ کا پیغام زمانے کو سنا رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے دادا اور چچا کی طرح سب سے پہلے ''دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر'' ہی پڑھ کر کلام اقبالؒ میں قدم رکھا.....!

یہ نظم علامہ محمد اقبالؒ نے لندن میں اس وقت لکھی جب لاہور سے ان کے بیٹے جاوید اقبالؒ کا خط موصول ہوا جس میں جاوید نے انگلستانی گراموفون کی فرمائش کی تھی۔ اقبالؒ اپنے صاحبزادے کو بلند پرواز دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے یہ نظم لکھ بھیجی اور پیغام دیا کہ

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے کس خوبصورتی کے ساتھ انگریزوں کی مکاری اور عیاری کو شیشہ گران فرنگ کہہ کر مخاطب کیا..... شیشہ اس لیے استعمال کیا کہ وہ بظاہر ایک چمکتی ہوئی شے معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں پائیداری نہیں ہوتی، اسی طرح مغرب اور انگریزوں کے نظریات اور افکار بھی پائیدار نہیں بلکہ صرف دکھاوا ہیں، اسی لیے ان سے بچو اور سفال ہند یعنی اپنی مٹی سے مینا و جام یعنی اپنی تہذیب اپناؤ.....

جب پاکستان بن گیا تو زیڈ اے بخاری کے حکم پر ''سفال ہند'' کو ''سفال پاک'' میں بدل دیا گیا جس کا مشورہ شاگرد اقبالؒ پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے دیا تھا چنانچہ استاد فتح علی خان سے لے کر جتنے بھی پاکستانی فنکاروں نے اس کلام کو پڑھا اس میں سفال پاک ہی استعمال ہوا۔

25 دسمبر 1947ء کو قائداعظم کی بطور بانی پاکستان پہلی سالگرہ کے موقع پر منور سلطانہ نے قادر فریدی کی موسیقی میں اقبالؒ کا کلام

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

بطور خراج تحسین پیش کیا۔ جس کی وجہ بال جبریل کی اس غزل کا یہ شعر بھی تھا۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

یہ زیڈ اے بخاری صاحب کے مشورے ہی پر منتخب کیا گیا تھا۔ اور آج جب بھی یہ کلام اقبالؒ کسی بھی گلوکار کی آواز میں دکھایا جاتا ہے تو اس شعر پر قائداعظمؒ ہی کی تصویر آتی ہے۔

❖ ❖ ❖

جنگل میں ہلچل

سید احتشام

شکار کھیلنا ایک دلچسپ مگر خطرناک مشغلہ ہے۔ لوگ خود کو خطرے میں ڈال کر شوق کی خاطر آدم خور شیروں کی کچھار میں گھس جاتے ہیں۔ برصغیر کے مختلف مقامات پر شیروں کا شکار کھیلنے کے لیے سات سمندر پار سے لوگ آتے تھے۔ وہ بھی... انگلینڈ سے آیا تھا، اس مہم جوئی میں اس نے کیا کھویا کیا پایا؟

شکاریات کے شوقینوں کی مدارات

ایک وقت تھا کہ انگلینڈ سے انڈیا وارد ہونے والے انگریزوں کو یہ توقع ہوتی تھی کہ انہیں ان کے باغات میں کوئی ٹائیگر نظر آجائے گا اور ان کے جوتوں کے اندر کوئی سانپ چھپا ہوا ہوگا لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ یہ باتیں صرف نامی گرامی اینگلو انڈین شکاریوں کی کہانیوں میں پڑھنے کو ملتی تھیں لیکن جب میں نومبر 1859ء میں حیدرآباد دکن کے ملٹری کنٹونمنٹ میں پہنچا تو غور کیا کہ وہ علاقہ ایک عجیب وحشت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ جب میں پہلی بار ٹہلنے کے لیے ایک ساتھی کے ہمراہ نکلا تو دیکھا کہ وہاں سے ایک برساتی نالہ گزرتا تھا جو ہرے بھرے پتوں سے کلی طور پر

ڈھک گیا تھا لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے تھے کہ وہاں پچاس ساٹھ میل کے نصف قطر میں نہ تو کوئی جنگل تھا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ جہاں ٹائیگر بود و باش اختیار کرتا۔ ہاں پرانے قبرستان میں ایک قبر واقع تھی جو ریکارڈ کے مطابق ایک فوجی آفیسر کی تھی۔ وہ فوجی آفیسر لگ بھگ ستر سال پہلے وہاں سے دس میل دور کسی جنگلی جانور کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا۔

ٹائیگر کو اِدھر اُدھر گشت کرنے کے لیے ایک بہت وسیع جنگل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ شکار کر کے اپنا پیٹ بھر سکے لیکن اب وہاں بیشتر زمیں زیرِ کاشت آ چکی تھیں۔ صرف کہیں کہیں اگی ہوئی جھاڑیاں اور بنجر پہاڑیاں تھیں لیکن ہم لوگ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ایک ٹائیگر بھٹکتا ہوا یہاں آ چکا ہے۔

مجھے اس بات کا علم بہت بعد میں ہوا۔ میرے ایک پرانے مقامی دوست نے مجھے بتایا کہ وہ ایک تالاب کے کنارے شکار کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک وہاں ایک خوفناک ٹائیگر نمودار ہوا۔ وہ تیندوؤں سے تو مانوس تھا جو وہاں سے بیس میل دور اس ضلع میں بہ کثرت پائے جاتے تھے لیکن یہ قد و قامت میں تیندوے سے کافی بڑا تھا اس نے اتنا بڑا اور اتنا خوفناک درندہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں کہ اس ٹائیگر پر نظر پڑتے ہی اس کا دل پانی ہو گیا۔

☆......☆

اس وسیع کمپاؤنڈ سے ملحق جہاں میرا گھر واقع تھا، چند ایکڑ پر مشتمل ایک باغ تھا وہاں ایک بنگلا خالی پڑا ہوا تھا۔ یہ بنگلا ایک مشنری والے کا مسکن تھا جو برسہا برس تک وہاں مقیم رہا تھا اور آس پاس کے علاقوں میں اپنی خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ یہاں اس کی عدم موجودگی میں ایک مالی اس بنگلے کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ اس دوران میں چھٹی پر انگلینڈ چلا گیا اور وہاں سے واپس آیا تو ایک دن مالی میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اسے خالی بنگلے کے برآمدے میں ایک تیندوا بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ یہ لوگ بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں اور ہر بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی بڑی جنگلی بلی ہو گی جسے وہ تیندوا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہے۔ تاہم میں اپنے چند مسلح ساتھیوں اور سپاہیوں کی معیت میں وہاں پہنچا اور دیکھا تو برآمدے میں کوئی نہیں تھا لیکن مالی بضد تھا کہ اس نے تیندوے کو دیکھا تھا لہٰذا ہم نے پورے احاطے کو اچھی طرح کھنگالنے کا فیصلہ کیا جہاں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر تیندوا ہو گا تو یہیں اونچی اونچی گھاس میں چھپا بیٹھا ہو گا۔

اب دونوں سپاہیوں نے گھاس کے قطعہ سے کچھ فاصلے پر بندوقیں تان کر اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں جب کہ دوسرے لوگ اس قطعہ کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک ایک خوفناک دھاڑ سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک ٹائیگر گھاس میں سے نمودار ہوا۔ اس سے قبل کہ میں اس پر فائر کرتا وہ پلک جھپکتے اچھلا اور غائب ہو گیا لیکن اس نے جاتے جاتے ایک سپاہی پر پنجہ مار کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس غریب کی پیٹھ اور کندھے پر گہرے زخم آئے۔ اسے فوری اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں وہ کئی ہفتے زیرِ علاج رہا۔

ہم نے اس ٹائیگر کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ہم نے کچھ اور مسلح لوگوں کو طلب کر لیا۔ ان کے ساتھ ہمارا ایل ٹیریئر بھی تھا۔ اس احاطے کے ایک طرف ایک نالہ تھا اور گھنی جھاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ کتے کے زور زور سے بھونکنے پر ٹائیگر ان جھاڑیوں سے نمودار ہوا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور کتے نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ بجلی کی طرح زقند لگا کر آگے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

اب دھندلکا چھا چکا تھا۔ ٹائیگر نے بہت گہری اور گھنی جھاڑیوں میں پناہ لے لی تھی۔ ہم نے اسے وہاں سے نکالنے کی ناکام سعی کی جہاں وہ کسی کو بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی چھا گئی۔ ہم نے لالٹینیں منگوا لیں اور ان کی روشنی کی مدد سے اسے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ہم جھاڑیوں کے قریب پہنچ گئے تھے اور پہلے جھانک کر دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی، خاص طور سے ایسے میں کہ جب وہ زخمی تھا اور غصے میں بھی تھا چنانچہ ہم نے لوٹ جانے اور صبح میں اسے پھر تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆

اگلی صبح ہم نے اس کی تلاش کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں پچھلی رات ترک کیا تھا۔ ہمیں ایک کچے راستے پر اس کے پیروں کے نشان نظر آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہاں خون کے چند قطرے بھی نظر آئے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ ٹائیگر تاریکی چھانے کے فوراً بعد ان جھاڑیوں میں سے نکل کر اس کچے راستے پر چل پڑا تھا ہم کھرا تلاشتے ہوئے آگے بڑھنے لگے وہاں سے ایک میل دور چھاؤنی کے کنارے واقع نالے کے پاس ایک

جگہ رک کر اس نے اپنی پیاس بھی بجھائی تھی۔ وہاں سے وہ پہاڑیوں کی طرف چلا گیا تھا جہاں کی ناہموار، سنگلاخ زمین پر اس کے پیروں کا کوئی نشان نہیں مل سکتا تھا۔ پھر بھی ہم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا مسلسل کئی دنوں تک اسے آس پاس کے علاقوں میں ڈھونڈتے رہے۔ میں ہر روز اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس راستے پر کئی میل تک اسے ڈھونڈنے نکل جاتا جس طرف وہ گیا تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

بالآخر پانچ دنوں کے بعد ہمیں اس کا پتا چل گیا۔ اس نے وہاں سے چھ میل دور ایک گاؤں کے پاس واقع کھیت میں ایک شخص پر حملہ کیا تھا۔ اس شخص کو مہلک زخم آئے تھے۔ اس کی انتڑیاں تقریباً باہر نکل آئی تھیں پھر بھی وہ کچھ بتانے کے قابل تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے جو کچھ کہا اس کے مطابق وہ جوار کے کھیت میں پرندوں کو بھگا رہا تھا کہ اسے غراہٹ سنائی دی۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے اس طرف بڑھا کہ یہ کیسی آواز تھی۔ جب وہ اس جگہ پہنچا تو اسے ایک ٹائیگر نظر آیا۔ ٹائیگر نے اسے دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیا تھا۔

یہ خبر ملتے ہی ہم فوراً وقوعہ پر پہنچ گئے۔ وہاں کھیت میں چھ، سات فٹ بلند جوار اُگا ہوا تھا۔ ہمیں اس غریب کی لاش ایک جگہ مل گئی۔ پاس ہی اس کے کپڑے پڑے تھے اور خون کا ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا۔ ہم کھیت میں سے ہو کر آگے تک چلے گئے لیکن ایک بار پھر اس کے قدموں کے نشان سخت پتھریلی زمین پر غائب ہو گئے تھے۔ ہمارا کتا بھی اس کی بو سونگھنے سے قاصر نظر آ رہا تھا۔

ہم نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور اگلے دن اس علاقے کے تمام نالوں کو کھنگال ڈالا لیکن ہماری کوششیں رائیگاں گئیں۔ ٹائیگر کا کوئی پتا نہیں تھا لیکن ہمیں اس درندے کو ہر حال میں ہلاک کرنا تھا۔ پورے علاقے میں دہشت پھیل گئی تھی۔ لوگ ڈر کے مارے کھیتوں میں کام کرنے نہیں جا رہے تھے۔ ہمیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں مزید انسانی جانوں کا ضیاع نہ ہو جائے کیونکہ جہاں تک ہم سمجھتے تھے اس ٹائیگر نے کسی بھی جانور کا شکار نہیں کیا تھا اور وہ یقیناً بھوکا اور پریشان ہو گا۔ شیر ایسے ہی حالات میں آدم خور بن جاتا ہے۔ وہ علاقہ جہاں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا تھا، پہاڑی اور ناہموار تھا۔ وہاں پانی بھی برائے نام دستیاب تھا۔ یہ بات عیاں تھی کہ اسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی کی تلاش ہو گی۔ شیروں کو عام حالات میں بھی بہت پیاس لگتی ہے اور جب وہ زخمی ہو تو اس کی پیاس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم پہاڑیوں کو عبور کر کے ایک یا دو میل آگے گئے ہوں گے کہ ہمیں ایک نالے کے پاس اس کے پیروں کے تازہ نشان نظر آئے اور ہمیں ایک جوہڑ بھی مل گیا جہاں اس نے رک کر اپنی پیاس بجھائی تھی۔ اب یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ وہ ملحقہ جنگل میں آرام کر رہا ہے۔

ہم نے اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں جب کہ بل ٹریٹر اور کچھ لوگ جھاڑیوں میں داخل ہو کر ہانکا کرنے لگے۔ اگلے چند لمحوں میں ٹائیگر جھاڑیوں میں سے برآمد ہوا اور کھلے کی ایک پٹی کو بہت تیزی سے عبور کرنے لگا۔ کتا بھونکتا ہوا اس کے تعاقب میں تھا۔ ٹائیگر آن کی آن میں گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ ہمارا بل ٹریٹر بھی ان گھنی جھاڑیوں میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ جھاڑیوں میں سے کتے کے زور زور سے بھونکنے اور شیر کے گرجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر کتے کی دردناک آوازیں آئیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بل ٹریٹر جھاڑیوں میں سے برآمد ہوا۔ وہ زخموں سے چُور اور لہولہان تھا۔ اس کے سینے پر بہت گہرے زخم آئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک بار پھر اپنے دشمن کے پیچھے جانے کو تیار تھا لیکن ہم نے اسے روک دیا۔ اب ہم نے جھاڑیوں میں پتھروں کی بارش کر دی۔ ساتھ ہی کئی فائر بھی کیے لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن ہم اپنی تلاش کو دوسرے دن پر نہیں ٹال سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ہمیں تلاش از سرِ نو شروع کرنی پڑتی اور اس دوران مزید انسانی جانوں کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔

ہم تین افراد جن میں ایک انڈین آفیسر بھی تھا، رینگتے ہوئے جھاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ کئی گھنٹے کی تلاش کے بعد ہم نے اچانک اپنے آپ کو اس ٹائیگر کے روبرو پایا۔ وہ ہماری طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلکے میں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں اور وہ ہم پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہوتا ہم نے یکے بعد دیگر کئی گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ہمارا کتا بے چارہ بھاری بھر کم تھا، اس وجہ سے زیادہ پھرتیلا نہیں تھا ورنہ وہ ان زخموں کو جھیل جاتا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ٹائیگر نے اپنے نوکیلے پنجوں سے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ پندرہ دن تک زندہ رہا اور پھر مر گیا جب کہ اس کے زخم مندمل ہو چلے تھے۔ وہ ٹائیگر ایک نر تھا۔ غالباً چار یا پانچ

سال کا ہوگا۔ اس کی پچھلی ٹانگ میں اوپر کی طرف ایک زخم تھا اور گوشت ہڈی سے الگ ہو گیا تھا۔ زخم اگرچہ بھرنے لگا تھا لیکن اس کے سبب وہ یقیناً انتہائی تکلیف اور اذیت میں ہوگا۔ اس کے پہلو میں بھی ایک گولی کا زخم تھا۔ یہ غالباً ہمارے کسی نشانچی کی اس گولی کا نتیجہ تھا جو ٹائیگر کو پہلے موقع پر لگی تھی جب وہ کیاؤنڈ کی گھنی جھاڑیوں میں سے نکل کر فرار ہو رہا تھا۔ آخری گولیاں سینے اور پیشانی کے بیچ میں لگی تھیں۔ ہم اس کی لاش اٹھا کر چھاؤنی لے گئے جہاں ہزاروں لوگ اس دلیر درندے کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے جس نے ہمیں اتنا پریشان کیا تھا۔

☆.....☆

ایک زمانہ تھا کہ ببر شیر پورے ہندوستان میں دندناتے پھرتے تھے۔ سنسکرت کی قدیم داستانوں میں ببر شیروں کا ذکر کثرت سے کیا گیا ہے لیکن ٹائیگر کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ٹائیگر نو وارد ہے۔ اس کا اصلی گھر منچوریا تھا۔ وہ منچوریا سے نقل مکانی کر کے یہاں وارد ہوئے تھے۔ آتے ہی وہ ببر شیروں سے الجھ گئے۔ ببر شیر انہیں اپنے علاقے میں برداشت نہیں کر رہے تھے اور ٹائیگر انہیں علاقہ بدر کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس جنگ میں ٹائیگر کا پلا بھاری رہا۔ انہوں نے پہلے بنگال اور پھر شمالی و جنوبی ہندوستان سے ببر شیر کو مکمل طور پر بے دخل کر دیا۔ جب انگریز ہندوستان آئے تب بھی ببر شیر مدھیہ پردیش، گجرات اور کاٹھیاواڑ میں اس طرح گھس بیٹھے کے خلاف ڈٹے ہوئے تھے لیکن افسوس کہ انگریزوں نے ببر شیر کی شکست کو مکمل کر دیا۔ انہیں ان دونوں صوبوں سے بے دخل کر دیا اور اب ان کی واحد پناہ گاہ کاٹھیاواڑ کی ایک ریاست جوناگڑھ رہ گئی ہے جہاں کوئی ٹائیگر نہیں ہے اور ہز ہائی نیس نواب آف جوناگڑھ نے ببر شیروں کو انگریز شکاریوں سے تحفظ فراہم کر دیا ہے۔

مجھے جوناگڑھ میں واقع گیر کے جنگلات دیکھتے ہوئے بیس سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اس لیے میں اس کی موجودہ حدود سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان جنگلات کے اچھے خاصے حصے کو کاٹ دیا گیا ہے لیکن پچیس سال پہلے یہ ایک بے حد وسیع جنگل ہوا کرتا تھا۔ یہ ورول کی بندرگاہ سے بیس میل دور واقع ہے اور جوناگڑھ سے صرف چند میل کے فاصلے پر شمال کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سانبھر، چیتل اور تیندوے کی بھرمار ہے اور یہ تقریباً ایک سو پچاس شیروں کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔ چونکہ وہاں شیر کے شکار کے لیے ناکافی جانور تھے جن سے وہ اپنا پیٹ بھرتے، لہٰذا وہ کاشت کاروں کے مویشی، بکریوں اور بعض اوقات خود کاشت کاروں کو ہلاک کر کے اپنی غذا حاصل کرتے تھے۔ انہیں انسانوں کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا کیونکہ وہ روزانہ ہی جنگلات کے محافظوں کو اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کوئی بھی ان کا شکار نہیں کرتا تھا۔ گویا وہ انسانوں سے بہت مانوس تھے۔ وہ وہاں آزادی سے گھومتے پھرتے شکار کرتے اور اپنے بچوں کو پالتے تھے۔ وہاں انہیں تنگ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ جب ہز ہائی نیس کسی وائسرائے یا بمبئی کے گورنر کو خوش کرنے کے لیے انہیں ان شیروں کا شکار کرنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا یا پھر کرنے کے بعد انہیں انسان کے گوشت کا چسکا لگ جاتا تھا اور وہ آدم خور ہو جاتے تھے۔ عام طور سے وہ چالیس سال اور بعض ستر سال تک جیتے تھے۔ ان کی عمر چونکہ غیر معمولی طور پر طویل ہوتی تھی، وہ کثرت سے بچے پیدا کرتے تھے۔

اگر کوئی شیر جوناگڑھ کی حدود سے نکل کر اِدھر اُدھر بھٹک جاتا تھا تو وہ کسی سردار یا صاحب کے رحم و کرم پر ہوتا تھا جسے اس بات کی خبر ہو جاتی تھی۔ جنگل کا طواف کرنے والے کچھ لوگوں کو جب شیر کے بچے اپنے ماں باپ کے بغیر اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے ہوئے نظر آجاتے تو وہ ان پر کلہاڑیوں سے حملہ کر کے انہیں مار ڈالتے۔ بالآخر جوناگڑھ کی ریاست کو اپنے نہایت عمدہ چڑیا گھروں کے لیے شیر کے نوعمر بچوں کی مستقل فراہمی کی ضرورت پڑی۔ شیروں سے میری پہلی ملاقات انہی میں سے ایک چڑیا گھر میں ہوئی۔ میرے ساتھ دوسرے انگریز ملاقاتی بھی تھے۔ وہاں ایک اسکوائر میں انہیں پنجروں میں رکھا گیا تھا۔ ان شیروں کے کھانے کا وقت ہوا چاہتا تھا اور وہ سب مل کر اس قدر دھاڑ رہے تھے کہ پوری فضا ان کی دھاڑ سے تھرا رہی تھی۔ اس چڑیا گھر کے بیشتر شیر ملنسار تھے۔ ان کے رکھوالوں نے انہیں مختلف کرتب سکھائے تھے اور وہ ان کی مشق کرتے رہتے تھے لیکن وہاں دو نر شیر ایسے تھے جن کے درمیان کبھی ختم نہ ہونے والی دشمنی چل رہی تھی جس کے سبب انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے ساتھ ہی پرورش پائی تھی اور وہ ایک ہی پنجرے میں رکھے گئے تھے۔ ان کی دشمنی کیسے ہوئی تھی اس بارے میں ان کی خدمت پر مامور شخص نے بتایا وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ان میں سے

ایک شیر اپنے ساتھی کے سامنے چہل قدمی کر رہا تھا وہ ایک خاص انداز سے دم اٹھا کر بار بار اپنے ساتھی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ آرام کی خاطر لیٹے شیر کو ساتھی کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ وہ اس کے قریب گیا اور اس نے دانتوں سے اس کی دم کاٹ کر الگ کر دی۔ یہ منظر خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دم پنجرے کے فرش پر کٹی ہوئی پڑی تھی اور اس کے گرد ان دونوں میں ایک خوفناک ترین جنگ شروع ہو گئی تھی۔ انہیں بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے الگ کیا گیا اور زبردستی الگ پنجروں میں رکھا گیا لیکن ایک دوسرے سے ان کی نفرت اور عداوت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ جب بھی ایک دوسرے کو دیکھتے ایک دوسرے پر دھاڑنے اور گرجنے لگتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک برقرار رہتا۔

ایک دوسرے شیر کے ساتھ ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک دن اپنے پنجرے سے فرار ہو گیا۔ اب اسے اپنی زندگی کا ایک سبق سیکھنا تھا۔ جب وہ جنگل سے پکڑ کر چڑیا خانے میں لایا گیا تھا تو بہت چھوٹا تھا۔ اس کی ماں نے اسے گھات لگانا اور شکار کر کے اپنی غذا حاصل کرنا نہیں سکھایا تھا۔ اس کی عمر ہی ایسی تھی کہ وہ یہ سب نہیں سیکھ سکتا تھا۔ جب وہ جوناگڑھ کے چڑیا گھر سے فرار ہوا تو جبلی طور پر اس نے وہی سڑک چنی جو گیر کے جنگل کی طرف جاتی تھی لیکن جنگل میں داخل ہونے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ کھانے کا وقت گزر گیا تھا اور کوئی مہربان رکھوالا اس کے لیے کھانا لے کر نہیں آیا تو اس نے ایک سانبھر کا پیچھا کر کے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے بے ڈھنگے پن نے سانبھر کو مشتعل کر دیا اور شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک بکری کو دبوچنے کی کوشش کی لیکن گڈریوں نے پتھر مار مار کر اسے وہاں سے بھگا دیا۔ تب تک اس کے پیروں کا برا حال ہو چکا تھا۔ اس کے گدے دار تلوے جو پنجرے کے چکنے فرش پر چلنے کے عادی تھے، پتھریلی سڑک پر میلوں چلنے اور خاردار جھاڑیوں کے سبب بری طرح کٹ پھٹ گئے تھے۔ وہ جلد ہی بھوک سے مر جاتا۔

خوش قسمتی سے چڑیا گھر کا رکھوالا بہت تجربہ کار تھا اور اسے بھگوڑے شیروں کو واپس لانے کا خوب تجربہ تھا۔ اس نے ایک بیل گاڑی پر ایک پنجرہ رکھا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ جنگل میں داخل ہوا تو اسے معلوم تھا کہ بھگوڑا شیر آس پاس کہیں موجود ہو گا۔ وہ اسے اپنی مخصوص آواز میں پکارنے لگا۔ شیر بھوک اور تھکن سے بے حد نڈھال تھا۔ زندہ رہنے کی اس کی ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ جب اپنے رکھوالے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ اپنی رہی سہی قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور بھاگتا ہوا رکھوالے کے پاس آ گیا۔ پنجرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں گوشت رکھا ہوا تھا۔ وہ خوشی کے اظہار کے طور پر زور سے غرّایا اور جلدی سے کھلے پنجرے میں گھس کر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ رکھوالے نے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا اور بیل گاڑی واپس جوناگڑھ روانہ ہو گئی۔ یہ سال دو سال پہلے کی بات تھی۔ جب میں نے اس شیر کو دیکھا تو وہ مجھے اپنے رکھوالے سے بے حد مانوس نظر آیا جس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی۔ اب وہ کبھی وہاں سے بھاگنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆.....☆

کسی جنگلی شیر سے میری پہلی مڈبھیڑ 1902ء میں اس وقت ہوئی تھی جب میں ورول میں موسم گرما گزار رہا تھا۔ اس دوران مجھے ہز ہائی نیس نواب آف جوناگڑھ کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا کہ مجھے ایک تیندوے کو ہلاک کرنے کے لیے گیر جانا تھا۔ وہ تیندوا تلالا میں دیکھا گیا تھا۔ ان دنوں میں جوناگڑھ کی چھوٹی سی لیکن بے حد خوب صورت بندرگاہ کے ساحل سمندر پر خیمہ زن تھا چنانچہ میں نے اپنے خیمے تلالا بھیج دیئے جو دریائے ہرن کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ جگہ اپنی خوب صورتی میں بے مثال ہے۔ دریائے ہرن کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ موسم گرما کے دوران پانی سے بھرا رہتا تھا۔ اس کا ایک سبب تو ورول کا ڈیم تھا۔ دوسرا سبب قدرت کا ایک عجیب و غریب کرشمہ تھا۔ ہر مون سون کے ختم ہونے پر سمندر ورول سے تین میل دور دریائے ہرن کے دہانے پر ریت جمع کر دیتا تھا جس سے اس کا دہانہ بند ہو جاتا تھا۔ اس بنا پر سال کے آٹھ مہینے کے دوران سمندر کے کنارے ایک جھیل بن گئی تھی اور دریائے ہرن پورے موسم گرما میں پانی سے لبریز رہتا تھا۔

میں جس دن تلالا پہنچا، اسی دن ایک کھوجی کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا اور ایک درخت پر چڑھ کر اندھیرا چھانے تک تیندوے کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن سوائے مایوسی کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ میں نے اپنے کھوجی سے کہا کہ مزید انتظار کرنا بے سود ہو گا۔ لہٰذا ہم درخت سے نیچے اتر آئے اور تلالا روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم کیمپ سے ایک میل دور تھے اور سڑک /

پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک ہمیں کسی خطرے کا احساس ہوا۔ ہم رک کر پلٹے تو دیکھا کہ چھ شیروں کا ایک گروہ ہمارے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اس وقت تک شیروں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی دھن میں چلے آ رہے تھے لیکن جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو وہ بھی رک گئے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور دونوں ہی شش و پنج میں مبتلا تھے۔ یہ کیفیت ان کے چہرے سے بالکل واضح تھی اور یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ نہ تو ان کی سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ ہی ہماری کہ کیا کریں۔ میں انہیں شوٹ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک میری جان پر نہیں بن آئے گی میں کسی بھی حال میں کسی شیر کو ہلاک نہیں کروں گا۔ میرے ہمراہ میرا کھوجی اور دو تین ہانکا کرنے والے تھے۔ شاید شیروں نے یہ سوچا کہ ہماری پارٹی اتنی بڑی تھی کہ وہ ہم پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہم نجانے کتنی دیر تک ساکت کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہم وقت کا سراغ کھو بیٹھے تھے۔ اس دوران ہمیں لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی کئی ٹارچ کی روشنیاں ہماری طرف بڑھتی نظر آئیں۔ شیروں کو یہ نئی صورتِ حال ناگوار گزری۔ ان کے تیور بدل گئے۔ میں نے سوچا کہ اب وہ ہم پر حملہ کر دیں گے لہٰذا میں اپنے دفاع میں انہیں گولی مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ شاید وہ بھی خطرے کو بھانپ گئے اور آہستہ آہستہ سڑک سے ہٹ کر جنگل کی طرف چلے گئے۔ گاؤں والے چیختے چلاتے، روشن ٹارچ تھامے ہوئے ہمارے پاس آ گئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ سب سڑک سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے اور ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزر گئے۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ ہم ان شیروں سے بازی لے گئے تھے۔ اگر گاؤں والے ہمت سے کام لے کر بروقت وہاں نہ پہنچ گئے ہوتے تو ہمیں ان شیروں سے لڑنا پڑ جاتا اور یہ لڑائی ہماری شکست پر منتج ہو سکتی تھی۔

شیر اس نتیجے سے مطمئن نہیں ہوئے تھے کیونکہ دو ہی دن کے بعد ایک رات وہی گروہ میرے خیمے کے پاس آ گیا اور سب مل کر بہت ہی غضب ناک طریقے سے دہاڑنے اور گرجنے لگے۔ میرے پاس ایک ٹٹو تھا۔ اس پر ان کی نظر تھی۔ وہ اسے ڈرا کر جنگل کی طرف بھاگنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اگر ٹٹو ان سے ڈر کر بھاگ جاتا تو وہ اسے دبوچ لیتے اور کھا جاتے لیکن وہ عربی نسل کا ایک بہت ہی نیک اور وفادار جانور تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے سہلاتا اور تھپتھپاتا رہا۔ اس کی ڈھارس بندھاتا رہا کہ میں اس کی حفاظت کے لیے موجود ہوں۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ میں رات کے تین بجے تک وہیں بیٹھا رہا۔ تب تک شیروں کا گروہ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گیا تھا۔ نیند سے میرا برا حال ہو رہا تھا لہٰذا میں جا کر سو گیا۔

☆.....☆

گورنر کے نمائندے اور میرے پرانے دوست کرنل کینیڈی کے ساتھ ایک عجیب تجربہ ہوا۔ میرے گیر جانے کے کچھ ہی عرصے کے بعد وہ ایک بکری کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کسی تیندوے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی دوران ایک ببر شیر اچانک کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ چارے کے پاس پہنچا اور اسے اپنے مضبوط جبڑوں میں دبوچ کر لے جانے لگا۔ اس طرح جیسے کوئی شکاری کتا اپنے شکار کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کرنل شیر پر چیخے اور اس پر پتھر پھینکے۔ شیر رک کر غصے سے ان پر غرایا اور کرنل کی بکری کو لے کر چلتا بنا۔

اس واقعے کے تین سال کے بعد 1905ء میں بمبئی کے گورنر لارڈ لیمنگٹن، سرکاری دورے پر راجکوٹ تشریف لائے اور اس کے بعد جوناگڑھ کے نواب کی دعوت پر شیر کا شکار کرنے گیر پہنچے اور گیر کے عین قلب میں خیمہ زن ہوئے۔ یہ جگہ شاشان کہلاتی تھی۔ گورنر اور ان کے اسٹاف کے کچھ لوگ ایک طرف اور ان کا پرائیویٹ سیکریٹری مسٹر ڈی، ایک جوان سپاہی اور میجر کارنیگی ان کے سیاسی آفیسر دوسری طرف چلے گئے۔ میں کارنیگی کو الوداع کہنے کے لیے ان کے اڈے پر گیا تھا اور جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس صرف ایک ہلکی سی شکاری رائفل ہے تو مجھے تشویش لاحق ہو گئی لیکن اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کسی شیر کو ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ اب وہ کیوں کسی شیر پر گولی چلانے پر مجبور ہوا تھا، یہ میں نہیں جانتا۔ غالباً اسے ایک اور گن کی ضرورت تھی۔ بہرحال وہ پرائیویٹ سیکریٹری کی پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

چارے فراہم کر دیئے گئے تھے۔ مسٹر ڈی نے ایک شیر کو اس وقت زخمی کر دیا جب وہ ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ تمام شکاریوں کے لیے جنگل کا یہ دستور ہے کہ اگر کوئی

شیر زخمی ہو گیا ہو تو اسے کسی حال میں بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اس کا تعاقب کر کے اسے ہلاک کر دینا چاہیے ورنہ وہ گاؤں والوں کا شکار کرنے لگے گا۔ ان تینوں انگریزوں نے اس زخمی شیر کا تعاقب کیا اور اسے جا لیا لیکن اس نے پلٹ کر حملہ کر دیا اور کارنیگی کو گرا کر اس کی کھوپڑی چبا ڈالی۔ مسٹر ڈی نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ کارنیگی پہلے ہی مر چکا تھا۔

یہ ایک بہت ہی الم ناک سانحہ تھا۔ اس سانحے کے تقریباً ایک ماہ کے بعد میں جوناگڑھ کے نواب سے ملنے گیا اور اٹھنے سے پہلے میں نے ان سے گیر کے جنگل میں شیر کا شکار کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے میری خوشی کی خاطر اجازت دے دی۔ میں اور میری بیوی کاٹھیاواڑ کو الوداع کہنے سے پہلے گرمی کا موسم گزارنے کے لیے ورول گئے اور ایسٹر کے موقع پر اپنے خیمے تلالا لے گئے۔ اس وقت ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ گیر میں ایک شیر آدم خور ہو گیا ہے۔ ہمیں یہ بات بتائی گئی اور مجھ سے خاص طور سے کہا گیا کہ اگر میں اسے ہلاک کر سکتا ہوں تو کر دوں۔

گیر کے محافظوں کا کسی شیر کو نشان زد کرنے کا طریقہ ریکارڈ کرنے کے قابل ہے۔ عام طور سے وہ جنگل کے اپنے علاقے کے تمام شیروں سے اور ان کی عادتوں سے واقف ہوتے ہیں۔ جب انہیں کسی شیر کو نشان زد کرنا ہوتا ہے تو وہ دن رات اس کی نگرانی کرتے ہیں اور اسے کچھ کھانے اور شکار کرنے سے روکتے ہیں۔ صبح میں جب وہ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو کر دن بھر سونے کے لیے کسی جھاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں، تب محافظ اس جگہ سے پون میل دور کسی درخت پر مچان باندھ دیتے ہیں۔ اس درخت سے لے کر ان گھنی جنگلی جھاڑیوں تک کے علاقے کو تین طرف سے گھیر لیا جاتا ہے اور شیر کے نکلنے کے لیے صرف ایک راستہ کھلا چھوڑا جاتا ہے اور کسی شکاری کو بلا لیا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مچان پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے تب ہانکا کر کے شیر کو ان گھنی جھاڑیوں سے نکالا جاتا ہے پھر اسے اس درخت کے نیچے سے گزارا جاتا ہے۔ مچان باندھنے کا مقصد شکاری کو شیر کی نظروں سے چھپانا نہیں بلکہ اسے قریبی جنگل کا واضح منظر پیش کرنا اور شیر کے راستے سے دور رکھنا ہوتا ہے۔ شیر دوسرے درندوں کی طرح اوپر نہیں دیکھتا بلکہ صرف اپنے شکار کو دیکھتا ہے تاوقتیکہ وہ زخمی نہیں ہو جائے۔ اگر شکاری اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے تو وہ یقیناً اس پر حملہ کر دے گا لیکن اگر شکاری درخت پر بیٹھا ہو تو وہ اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دیتا۔

میں نے تلالا پہنچ کر اپنا اجازت نامہ جنگلات کے ہیڈ محافظ کو دکھایا اور وہ فوراً میرے لیے کسی شیر کا بندوبست کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ آدم خور اس وقت کہاں ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ دو جوان شیر ہمارے کیمپ کے نزدیک ہی موجود ہیں۔ وہ رات بھر ان کی نگرانی کرتا رہا لیکن اگلی صبح تک ہمیں اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں پہنچی، لہٰذا ہمیں تشویش لاحق ہو گئی کہ آج ہمیں کوئی شکار نہیں مل سکے گا لیکن اس وقت ہماری مایوسی خوشی میں ڈھل گئی جب ایک شخص نے آ کر بتایا کہ ان شیروں کا پتا چل گیا ہے۔ وہ تلالا سے دو میل کے فاصلے پر دیکھے گئے تھے اور ہمیں دن کے دو بجے سے تھوڑا پہلے روانہ ہونا تھا۔ میری بیوی بھی میرے ہمراہ جانے پر بضد ہو گئی۔ لہٰذا ہم دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے گائیڈ کے ساتھ پونے دو بجے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک انتہائی خوب صورت جنگل تھا۔ اپنے کیمپ سے کوئی پون میل کے فاصلے پر جنگل کا محافظ ہم سے ملا اور اس نے ہم سے کہا کہ ہم گھوڑوں سے اتر کر پیدل اس کے ساتھ چلیں چنانچہ ہم نے ویسا ہی کیا اور جنگل سے گزر کر اس درخت تک پہنچے جہاں مچان باندھا گیا تھا۔ میں، میری بیوی اور محافظ تینوں اس مچان پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور ایک شخص کو ہانکا کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد کچھ فاصلے سے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر ہم سمجھ گئے کہ ہانکا شروع ہو گیا ہے۔ وہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے کوئی تیس گز کے فاصلے پر واقع گھنی جنگلی جھاڑیوں میں کسی کے تیزی سے گزرنے کی ایک جھلک نظر آئی۔ میری بیوی نے بھی دیکھا اور آہستہ سے میرے بازو کو چھوا۔ دوسرے ہی لمحے ایک شاندار شیرنی جنگل سے نمودار ہوئی۔ وہ بے حد غضب ناک نظر آ رہی تھی۔ میں نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دم کسی سلاخ کی طرح بالکل سیدھی کھڑی تھی اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ وہ درخت کی طرف بڑھنے لگی لیکن میں نے یہ سوچ کر اس پر فائر نہیں کیا کہ اگر میں نے صرف اسے زخمی کر دیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گی اور پنجہ مار کر ہمیں نیچے گرا دے گی اس لیے جب وہ گزر گئی تو میں نے عقب سے اس پر فائر کر دیا۔ انتہائی طاقت ور گولی اس کے شانے سے ذرا نیچے کی طرف لگی۔ وہ گر گئی اور کسی لٹو کی طرح گھوم کر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی

ہوگئی۔ میں نے دوبارہ اس کی پیٹھ پر فائر کر کے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو نشانہ بنایا۔ گولی اپنے نشانے پر لگی۔ وہ قلابازی کھا کر قریبی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔ اسی وقت ہانکا کرنے والے آگئے۔ نر شیر وہاں سے فرار ہوگیا۔ وہ لوگ یہ سمجھے کہ میں نے اس پر فائر کیا تھا۔ ابھی انہوں نے زخمی شیرنی کو نہیں دیکھا اور نر شیر کے بچ کر نکل جانے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ تب میں نے چیخ کر گجراتی زبان میں انہیں بتایا کہ ایک زخمی شیرنی ان کے پاس ہی پڑی ہے۔ اب وہ ادھر متوجہ ہوئے اور دیکھا تو وہ مر چکی تھی۔

کیمپ لوٹ کر میں نے ہز ہائی نس نواب کو ایک خط روانہ کیا کہ میں نے ایک شیرنی کو شوٹ کر دیا ہے اور یہ کہ میری بیوی بھی اس شکار پر میرے ہمراہ ہے۔ اگلی صبح ان کا ٹیلی گرام موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ ''شیرنی میم صاحب کو دے دو۔ اپنے لیے نر شیر حاصل کر لو۔'' میں نے وہ ٹیلی گرام ہیڈ محافظ کو دکھایا تو وہ فوراً میرے لیے کسی نر شیر کا بندوبست کرنے نکل گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اس آدم خور شیر کو ڈھونڈ نکالا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے کم سے کم اٹھائیس گڈریوں اور کسانوں کو ہلاک کر کے اپنا لقمہ بنایا ہے۔ ہیڈ محافظ رات بھر اس آدم خور کی نگرانی کرتا رہا اور اگلے دن دوپہر میں اس نے ہمیں یہ اطلاع بھیجی کہ وہ آدم خور ہمارے کیمپ سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر نظر آیا ہے، میں نے فوراً تیاری کر لی اور بیوی کو ساتھ لے کر سڑک کے ذریعے روانہ ہوگیا۔ یہ ایک شاندار سڑک تھی جو جنگل سے ہو کر گزرتی تھی۔ ہم کار کے ذریعے آرام سے وہاں پہنچ گئے۔ ہیڈ محافظ پہلے کی طرح جگہ ہمارا منتظر تھا۔ ہم کار سے اتر کر پیدل ہی اس کے ساتھ چل پڑے کیونکہ آگے راستہ دشوار گزار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس درخت کے پاس پہنچ گئے جہاں مچان باندھا جا چکا تھا اور ہانکا کرنے والے ہمارے منتظر تھے۔ ہم مچان پر جا بیٹھے تو ہانکا شروع ہوگیا۔ جب ہانکا کرنے والے ہم سے قریب آنے لگے تو اچانک دو نوعمر شیر اپنے کچھار سے نمودار ہوئے اور ہمارے درخت کے نیچے ہی آپس میں کھیلنے لگے۔ یہ ایک نرالا منظر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے پر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ ہمارے محافظ نے ہمیں صبر کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ نوعمر شیر ہر فکر سے آزاد کھیل میں مشغول تھے۔ وہ کچھ دیر تک کھیلتے رہے اور پھر اچھلتے کودتے ہوئے واپس جنگل میں چلے گئے۔ تب آخری لمحات میں وہ آدم خور نمودار ہوا اور ہانکا کرنے والوں کی آوازیں سن کر تیزی سے ایک کھلی جگہ کو عبور کرنے لگا۔ میں نے قدرے عجلت میں اس بھاگتے ہوئے آدم خور کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ہم درخت سے اتر گئے اور قریب جا کر اس کا معائنہ کیا۔ وہ ایک بڑی جسامت کا خوفناک درندہ تھا۔ معائنے کے دوران ہم پر واضح ہوا کہ اس کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور وہ بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے وہ انسانوں کو اپنا نوالہ بنانے لگا تھا۔

☆......☆

تیس سال پہلے جب میں پہلی بار کاٹھیاواڑ گیا تھا تو وہاں تیندوؤں کی بھرمار تھی۔ تقریباً ہر پہاڑی پر اور ہر جنگل میں اس کا راج تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم کالا ہرن کے شکار کے لیے جاتے تھے اور واپسی میں ہماری بیل گاڑی میں دو کالا ہرن اور ایک تیندوا ہوتا تھا۔ تیندوؤں کی اس بہتات کا سبب ریاست کی بدنظمی تھی۔ صرف چند سال پہلے جب وہاں میری پوسٹنگ تھی، اس علاقے میں ڈاکوؤں کا راج تھا۔ بدقسمتی سے کوئی ایسا چھوٹا زمیندار ان کا سرغنہ بن جاتا تھا جسے کسی جابر اور طاقت ور زمیندار نے اس کی زمین سے بے دخل کر دیا ہو اگر وہ عرصے تک پکڑا نہ جا سکے تو وہ اپنی زمین واپس لینے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور اگر اس کی گرفتاری فوری عمل میں آجاتی تو اسے فوراً گولی مار دی جاتی تھی۔ بہت چھوٹے زمیندار جنہیں اپنی زمین چھن جانے کا فوری خطرہ لاحق ہوتا تھا، ایسے ڈاکوؤں کی خفیہ طریقے سے مالی مدد کرتے تھے۔ ڈاکوؤں کا یہ گروہ پورے صوبے میں ہر جگہ لوٹ مار کرتا تھا۔ یہ لوگ کسی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ دکانداروں اور کاروباری افراد سے لے کر کاشت کاروں کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ ان کی لوٹ مار اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کے ظلم و ستم کے باعث گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ ان کی زمینوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ جب پورا علاقہ ویرانے میں تبدیل ہوگیا تو وہاں تیندوے آبسے اور اجڑے ہوئے کھیتوں، کھلیانوں، پہاڑ کی چوٹیوں اور وادیوں میں ان کا راج ہوگیا۔

وہاں کسی تیندوے سے میری پہلی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ نہ صرف میرا پہلا تیندوا تھا بلکہ اس نے مجھے دیگر تیندوؤں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تنگ کیا تھا۔ میں نے جو تاڑ ھ

کے ارباب اختیار سے گیر کے جنگل میں تیندوے کے شکار کا اجازت نامہ لے لیا تھا اور خوشی خوشی گیر روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے تلالا میں تیندوے کا شکار کرنے کی کوشش کی جو میری پسندیدہ جگہ تھی لیکن وہاں کوئی تیندوا نظر نہیں آیا۔ تب جونا گڑھ کے حکام نے مجھے گیر کے دوسرے حصے میں واقع ایک گاؤں گورکھ وادی جانے کا مشورہ دیا۔ جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو وہاں مجھے بہت سے خیمے نظر آئے جہاں میرے آرام و آسائش کا سامان فراہم کیا گیا تھا۔ میرے ملازم بہت پُرجوش تھے کیونکہ انہوں نے تلالا سے وہاں آتے ہوئے راستے میں شیروں کو گزرتے دیکھا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ کیا حال ہی میں ہلاکت کا کوئی واقعہ پیش آیا، ایک طویل قامت شکاری جو قدرے حقارت سے ملازموں کی باتیں سن رہا تھا، آگے بڑھا اور گویا ہوا۔

''آج ہی صبح ایک تیندوے نے ایک کسان کی بکری کو مار ڈالا ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر گویا ہوا۔ ''شاید وہ آج سہ پہر میں اپنے شکار کو کھانے کے لیے واپس آئے۔'' پھر اس نے بڑے اشتیاق سے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا صاحب اس گارے پر اس کی واپسی کا انتظار کریں گے؟''

''بالکل۔'' میں نے بھی اتنے ہی شوق اور اشتیاق سے جواب دیا۔

''صاحب۔'' وہ بولا۔ ''تیندوے کا شکار خرگوش کے شکار سے مختلف ہوتا ہے۔''

''خرگوش کے شکار کے بارے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو گے کیونکہ میں تو صرف شیروں کا شکار کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور رائفل سے ایک ہدف کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی نے ہدف کو اڑا دیا۔ وہ شرمندہ نظر آنے لگا اور پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ چار بجے آ کر مجھے اس بکری کے پاس لے جائے گا جسے تیندوے نے ہلاک کیا تھا۔

وہ اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک چار بجے آ گیا۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ تقریباً دو میل تک سفر کرنے کے بعد ایک جگہ اترے۔ یہ چھوٹے سے جنگل میں گھرا ہوا ایک گاؤں تھا۔ ہم چند سو گز پیدل چل کر ایک مچان تک پہنچے جو اس بدنصیب بکری کی باقیات کے پاس ہی بنایا گیا تھا۔ یہ ایک طرح کا اسٹینڈ تھا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شکاری نے مجھے ٹہوکا دے کر بتایا کہ تیندوا آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ اس نے ضرور اس

تصویری تحریریں

فراعنہ کے زمانے میں آج کی طرح الفاظ و حروف سے تحریر کا کام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے تصویروں کی مدد لیتے تھے۔

اس تصویری طریقہ تحریر کے کئی نمونے اہرام کی دیواروں اور شکی الواح پر لکھے ہوئے ملے ہیں۔ اس تصویری زبان کو سمجھنا بہت دشوار تھا حتیٰ کہ 1798ء میں سکندریہ کے قریب ایک ساحلی قصبے ''رشید'' سے نپولین کی فوج کو ایک پتھر ملا جس سے اس تحریر کو پڑھنے میں مدد ملی۔ یہ ڈیڑھ فٹ چوڑا اور سوا دو فٹ لمبا اور قریباً دو انچ موٹا سیاہ چمکیلا پتھر تھا جس پر ہیروغلافی، مصری اور یونانی زبان میں ایک تحریر لکھی ہے۔ اسے ''حجر رشید'' کہتے ہیں۔ یہ آج کل برٹش میوزیم میں پڑا ہے۔ اس پتھر کی مدد سے مصر کا ماضی بولنے چھپانے اور گنگنانے لگا۔ مورخین اسے ''علم کی کنجی'' کے نام سے لکھتے ہیں۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

تیندوے کی جھلک دیکھ لی ہو گی کیونکہ چند ہی منٹ کے بعد ایک مادہ تیندوا گھنی گھاس میں سے برآمد ہوئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ میرے شکاری نے مجھے ذرا رکنے کو کہا لیکن مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ دوبارہ جنگل میں غائب ہو گئی تو ہماری محنت پر پانی پھر جائے گا جب کہ میرا شکاری چاہتا تھا کہ میں اسے مزید قریب آنے کا موقع دوں۔ میں نے رائفل سے تیندوے کا نشانہ لیا حالانکہ میری پوزیشن اتنی بے ڈھنگی تھی کہ صحیح نشانہ لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی پھر بھی میں نے فائر کر دیا اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ گولی اس کے سینے میں گھسنے کی بجائے پچھلی ٹانگ میں لگی۔ وہ کسی لٹو کی طرح دو مرتبہ گھومی اور جنگل میں غائب ہو گئی۔

ہماری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی لیکن اس زخمی تیندوے کو چھوڑ دینا گاؤں والوں کے لیے انتہائی خطرناک ہو سکتا تھا۔

میں مایوسی کے عالم میں مچان سے نیچے اتر آیا اور پیدل اس زخمی تیندوے کے تعاقب میں چل پڑا۔ میں بار بار اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ مجھے اپنی نہیں بلکہ گاؤں والوں کی فکر تھی۔ وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مسلح ہو کر نکل آئے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ ایک شخص تیندوے کا سراغ لگانے چل پڑا اور پھر چیخا۔ "وہ ادھر سے آیا ہے۔" اور پھر پوری رفتار سے ادھر بھاگنے لگا۔ بدقسمتی سے گاؤں والا صحیح راہ پر لگ گیا تھا۔ میں اسے خبردار کرنے کے لیے سرپٹ اس کی طرف بھاگا لیکن وہ اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں مادہ تیندوا زخمی حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہوئی اور اسے زمین پر گرا کر اس کا نرخرہ دبوچنے کی کوشش کی۔ اس جوان راجپوت نے اسے ایسا کرنے سے اس وقت تک روکے رکھا جب تک اس نے اپنی تلوار نہیں کھینچ لی اور پھر اس نے تلوار سے تیندوے کے سر پر ایک شدید ضرب لگائی۔ مادہ تیندوا کا سر پھٹ گیا اور وہ اپنے شکار کو چھوڑ کر قریبی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ میں تب تک وہاں پہنچ گیا تھا۔ ہمیں اسے ڈھونڈنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ قریب ہی جھاڑیوں میں زخمی حالت میں لیٹی ہوئی تھی اور غصے سے اپنی دم لہرا رہی تھی۔ میں نے اس کی گردن کے پچھلے حصے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اپنے نشانے پر لگی۔ اس کی دم کا ہلنا بند ہو گیا اور وہ ختم ہو گئی لیکن میری خوشی اس جذباتی شخص کی حماقت کے باعث اس کے زخمی ہونے سے زائل ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ گہرے زخم نہیں آئے تھے۔ میں نے اسے قریب ترین اسپتال بھجوا دیا اور وہ چند دنوں میں صحت یاب ہو گیا۔ اب اسے عقل آ گئی تھی کہ کسی زخمی درندے کے پیچھے بے تحاشا بھاگنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

☆.....☆

اس کے چند سال بعد گیر کے جنگل میں میرا سامنا ایک نہایت نڈر تیندوے سے ہوا۔ میں اور میری بیوی ورول میں سمندر کے کنارے خیمہ زن تھے کہ جنگل کا محافظ میرے پاس آیا۔ اس نے شکایت کی کہ ایک خطرناک تیندوا اس علاقے میں دندناتا پھر رہا ہے۔ کیا آپ اسے ہلاک کریں گے؟ اس وقت ہم جنگل میں شیروں کے شکار پر جا رہے تھے لہٰذا اس وقت تو کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جلد ہی مجھے اس خطرناک تیندوے کی سرکوبی کا موقع مل گیا۔ میں اور میری بیوی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک شکاری کی رہنمائی میں اس طرف روانہ ہو گئے گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد اس مقام پر پہنچے۔ یہ ایک بے حد گھنا جنگل تھا۔ ہم پیدل اسے عبور کر کے وہاں پہنچے جہاں مچان بنایا گیا تھا۔ ہم مچان پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ہانکا کرنے والوں نے گاڑے کے طور پر ایک بکری باندھ دی تھی۔ بکری انہیں جاتا ہوا دیکھ کر پکارنے لگی پھر جیسے ہی آخری شخص ایک چٹان کے پیچھے اوجھل ہوا، دوسری چٹان کے عقب سے ایک تیندوے کا سر نمودار ہوا۔ یہ درندہ آدمیوں سے ذرا نہیں ڈرتا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ وہ کئی مرتبہ ان کی موجودگی میں ان کے مویشی کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

ہمارے درمیان کچھ زیادہ ہی فاصلہ تھا اس لیے میں نے اس پر گولی چلانا مناسب نہیں سمجھا اور انتظار کرنے لگا۔ بکری بدستور گلا پھاڑ کر ممیا رہی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر تیندوے پر پڑی وہ دہشت زدہ ہو گئی اور اس کی آواز بند ہو گئی۔ تیندوا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ بکری اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا تیندوے نے اسے سحر زدہ کر دیا ہو۔ تیندوا اس کے قریب پہنچ کر آرام سے بیٹھ گیا اور بکری کی کیفیت سے گویا لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ بھوکا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر میرا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے مزید انتظار کیا تو میرا ہاتھ کانپنے لگے گا اور میں اس کا صحیح نشانہ نہیں لے سکوں گا، لہٰذا میں نے رائفل سیدھی کر کے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ گھوم گیا اور بے بسی سے غرّانے لگا۔ میں نے دوسری گولی چلائی جو اس کے جسم میں داخل ہو گئی اور وہ ساکت ہو گیا۔ گاؤں والے فائر کی آواز سن کر بھاگے بھاگے آئے۔ وہ حیران تھے کہ اتنی جلدی تیندوے کا کام تمام ہو گیا تھا۔ ہم مچان سے نیچے اتر آئے اور مردہ تیندوے کا معائنہ کرنے لگے ہم نے دیکھا کہ گولی اس کے سینے میں نہیں لگی تھی جیسا کہ میں سمجھا تھا بلکہ اس سے اوپر بالکل سیدھی اس کی آنکھوں کے درمیان داخل ہو گئی تھی۔ بکری کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور واپسی کے سفر کے دوران وہ مارے خوشی کے اس طرح اچھل رہی تھی گویا اس نے تنہا یہ جنگ جیتی ہو۔

☆.....☆

جب میں مہابلیشور میں تھا تو ایک اور نہایت نڈر تیندوا میرے خیمے میں گھس آیا تھا۔ دراصل میری کتیا بل ٹیریئر نے کئی بچوں کو جنم دیا تھا اور وہ اسی لالچ میں وہاں آ گیا تھا لیکن کتیا اسے دیکھ کر اتنے زور زور سے غرّانے اور بھونکنے لگی کہ

میرے ملازمین اس کی آواز سن کر بھاگے بھاگے وہاں پہنچ گئے اور اس سے قبل کہ تیندوا اس کے کسی بچے کو اٹھا لے جاتا، انہوں نے اسے بھگا دیا، اسی دن مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہی تیندوا بلیو ویلی روڈ پر نظر آیا تھا۔ وہ جگہ قریب ہی تھی۔ ایک مقامی شکاری کے مشورے پر میں اسی دن شام میں روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے راستے ہی میں وہ مجھے نظر آ گیا۔ سڑک کے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں میں مجھے صرف اس کی ایک جھلک نظر آئی، ایسے میں اس پر گولی نہیں چلائی جا سکتی تھی۔ ہم نے سڑک کے بالکل سامنے پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی بکری ایک جگہ باندھ کر انتظار کرنے لگے لیکن تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اتنی تاریکی چھا گئی کہ مزید انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے بکری کو وہیں چھوڑ کر لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی صبح شکاری نے رپورٹ دی کہ تیندوے نے بکری کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں سہ پہر میں وہاں جا کر تیندوے کے انتظار میں بیٹھوں۔ میری بیوی نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی اور شام کے پانچ بجے ہم وہاں جا کر مچان پر بیٹھ گئے۔ ہمارا انتظار طویل ہوتا گیا کیونکہ سڑک پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اسی دوران کونسل کا ایک ممبر اپنی بیوی کے ہمراہ ادھر سے گزرتے ہوئے بکری کو دیکھ کر وہاں رک گیا اور اپنی بیوی کے ساتھ بکری کے پاس جا کر تفصیل سے بیوی کو بتانے لگا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں یہاں شکار ہونے والا ہے۔ وہ کئی منٹ تک اپنے علم کا خزانہ لٹاتا رہا اور ہمارا خون کھولتا رہا۔ بالآخر جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ شاید تیندوا بھی ان کی موجودگی کی وجہ سے وہاں آنے سے گریز کر رہا تھا اور ان کی بکواس سن کر ہماری طرح بور ہو رہا تھا کیونکہ ان کے رخصت ہونے کے چند ہی منٹ بعد وہ چھلانگیں مارتا ہوا سڑک پر آ گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی گاڑی تو نہیں آ رہی ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ چلتا ہوا، اپنے شکار کے باقیات تک پہنچا۔ اس وقت میں نے اس پر گولی چلا دی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کے شانوں کے بیچ میں لگی تھی۔

مہابلیشور ہی میں ایک اور موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس پر میرے دوستوں کو سن کر یقین نہیں آتا تھا۔ مجھے ڈاکوؤں کے غار سے تقریباً تین میل کی دوری پر کسی تیندوے کے ہاتھوں ایک جانور کے ہلاک کیے جانے کی اطلاع ملی تھی۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر شام کے تقریباً ساڑھے چار بجے اس مقام پر پہنچ گیا کیونکہ اُمید تھی کہ تیندوا جلد ہی اپنے بچے کھچے شکار کو کھانے کے لیے لوٹے گا۔ جب میں وہاں پہنچا تو کچھ لوگ تیندوا کے کھائے ہوئے شکار کو دیکھ رہے تھے اور خاصے پُرجوش نظر آتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تیندوا وہاں پہنچا تھا لیکن وہ لوگ بڑی مشکل سے اس کا پیچھا کر کے اسے واپس جنگل میں بھگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کی زبانی یہ سننے کے بعد تیندوا کے لوٹنے کی رہی سہی آس بھی ختم ہو گئی لیکن وہ ایک گھنا جنگل تھا اور وہ تیندوا آدمیوں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ میں اسی اُمید پر اپنے شکاری کے ساتھ مچان پر آرام سے بیٹھ گیا۔ ابھی میں نے ٹیک لگائی ہی تھی کہ شکاری نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں نے ادھر دیکھا جدھر وہ اشارہ کر رہا تھا۔ مجھے بے حد گھنے گھاس پات میں ایک تیندوا کسی بلی کی طرح بیٹھا دم ہلاتا ہوا نظر آیا لیکن وہ منظر واضح نہیں تھا اور اس پر گولی نہیں چلائی جا سکتی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے حرکت کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک وہ غائب ہو گیا اور میں حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ آخر گیا کہاں۔ میں نے اس کے کھائے ہوئے شکار کی طرف دیکھا لیکن وہ ادھر نہیں گیا تھا۔

میں نے پلٹ کر اپنے شکاری کی طرف دیکھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ''وہ ہم پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے کہیں کوئی درندہ تو کیا کوئی جانور بھی نظر نہیں آیا۔ میں حیرت سے سوچنے لگا کہ کون درندہ کب حملہ کرے گا۔ کچھ لمحے تک اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ بالآخر اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی انگلی اٹھا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ہمارے برابر والے درخت کی ایک شاخ ہمارے درخت کے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور وہ تیندوا ہمارے سر کے اوپر اسی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس درخت پر چڑھ کر وہاں جا بیٹھا تھا اور بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہماری موجودگی سے لاعلم تھا کیونکہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اپنے شکار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ شاید اسے بھوک نہیں لگی تھی اور وہ بھوک کے چمک اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں شروع میں اس پر گولی چلانے سے ہچکچایا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ گولی کھا کر سیدھے ہمارے سر پر آ گرے گا۔ شکاری اسے درخت پر چڑھتا ہوا دیکھ کر ڈر گیا تھا اور سمجھا تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرنے کے لیے آ رہا تھا لیکن

ایسی بات نہیں تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر اس پر گولی چلائی گئی تو وہ ہم سے کچھ فاصلے پر گرے گا، لہٰذا میں نے نشانہ باندھ کر گولی چلادی۔ گولی نشانے پر لگی اور اس کا نیچے کا سفر شروع ہوگیا۔ وہ ہم سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر گر رہا تھا۔ ابھی وہ فضا ہی میں تھا کہ میں نے اس پر دوسری گولی چلائی اور وہ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی ٹھنڈا ہوگیا۔

☆—☆

یہ 1860ء کا ذکر ہے۔ مارچ کا مہینا تھا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ حیدرآباد (دکن) سے 572 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں مکہ پور شکار کرنے کے ارادے سے گیا تھا۔ وہاں خیمہ زن ہونے پر گاؤں کا سردار پنیل جو ایک باریش بوڑھا مسلمان تھا، ہم سے ملنے آیا۔ وہ ایک مہمان نواز، منکسر المزاج اور مہربان شخص تھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے ہمارے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اس نے ہمارے گھوڑوں کے لیے بھی وافر چارے کا انتظام کردیا۔ واضح رہے کہ گاؤں والوں سے ہماری گفتگو ہمیشہ اردو میں ہوتی تھی کیونکہ ظاہر ہے، وہ انگریزی سے قطعی نابلد تھے۔ ہم ان کی صحبت میں رہ کر اچھی خاصی اردو بولنا اور سمجھنا سیکھ گئے تھے اور ہمیں اس میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

''لگتا ہے، یہ ٹائیگر کے شکار کی بہترین جگہ ہے۔'' میرا دوست ولیم بولا۔ پھر وہ اردو میں سردار پنیل سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں بڑے میاں، یہاں تو بہت شکار ملے گا، تم کیا کہتے ہو؟''

''ہاں صاحب۔'' پنیل نے جواب دیا۔ ''ان جنگلوں میں بہت شکار ہے۔ ٹائیگر، ہرن، بھالو، تیندوا، سانبر، نیل گائے۔ چیتل..... اگر صاحب لوگ شکار کرنا چاہتے ہیں تو میں دو آدمی لے کر آؤں گا۔ وہ دونوں بہت اچھے شکاری ہیں۔ آپ کے بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ اچھا، صاحب، اب میں چلتا ہوں۔'' اور وہ چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ دو آدمیوں کے ساتھ لوٹا۔ میرا ہیڈ شکاری چیا بھی ان کے ہمراہ تھا۔ چیا میرا معتمد خاص، نہایت وفادار اور بلا کا کھوجی تھا۔ وہ ایک ٹھنڈے مزاج کا، مضبوط قویٰ کا تھا اور بڑے سے بڑے جنگلی جانوروں کے شکار کے موقع پر خطرات میں بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی تھی۔ اس میں بس ایک ہی کمزوری تھی۔ وہ دیسی شراب ''راکی'' کا زبردست رسیا تھا جو تاڑ کھجور اور ناریل کے رس سے تیار کی جاتی تھی۔ ان دو دیہاتی شکاریوں کے ساتھ جنہیں پنیل اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا، لوگوں کا ایک پورا جتھا تھا۔ ان کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھی، سر پر چمڑے کی ٹوپی، پیروں میں بنڈل اور ہاتھوں میں بندوق، بائیس کی بنی ہوئی برچھیاں اور کمر سے اڑسی ہوئی درانتی تھی جس کی مدد سے وہ بڑی مہارت سے گھاس پات کو کاٹتے ہوئے جنگل میں بڑھتے چلے جاتے تھے۔ دو آدمی اپنی پیٹھ پر کلہاڑیاں اور پانی کی لیدر بوتل اٹھائے ہوئے تھے۔

''اچھا تو چیا۔'' میں مخاطب ہوا۔ ''تمہیں شکار کی کوئی خبر ہے؟''

''خبر ہے صاحب۔'' وہ بولا۔ ''یہاں سب لوگ بتاتے ہیں کہ یہاں سے دو کوس دور ایک گاؤں باٹا سنگارام کے قریب ایک بہت بڑا باگھ (شیر) ہے جو بہت سے لوگوں کو مار کر کھا گیا ہے، صاحب۔ یہاں قاسم کھڑا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ کل ہی اس باگھ نے ایک بڑھیا کو مار ڈالا۔ وہ بہت شیطان ہے، صاحب۔ یہاں کے سارے شکاری اور گاؤں والے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ جب سب لوگ تھک کر لوٹ آتے ہیں تو وہ کسی آدمی کو مار ڈالتا ہے۔ یہ دھوبی دیر پا بہت اچھا شکاری ہے۔'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا جسے پنیل اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ ''یہ پورے علاقے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ برسوں سے اس جنگل میں شکار کرتا آرہا ہے۔ اس نے ایک چیتے کا بھی شکار کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب سب لوگ خیمے میں جاؤ اور یعقوب خان، سب کو ایک ایک گلاس راکی پلاؤ۔'' میں نے اپنے ہیڈ خانساماں سے کہا۔ ''اس کے بعد تم سب باٹا سنگارام جاؤ اور اس ٹائیگر کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں، حاصل کرو۔ گاؤں والوں سے یہ وعدہ کر کے آؤ کہ اگر وہ ہمارا ساتھ دیں گے تو ہم ان کو بہت بخشش دیں گے۔ میں ناشتا کر کے قاسم کے ساتھ آؤں گا۔ چیا اس بات کا دھیان رہے کہ کسی ہرن یا کسی اور جانور پر کوئی گولی نہیں چلے گی۔ سڑک پر اِدھر اُدھر آوارہ گردی مت کرنا کیونکہ میں تمہارے پیچھے پیچھے نہیں رہوں گا اور ٹائیگر کے پیروں کے نشان کو غور سے ڈھونڈنا۔'' اتنا کہہ کر میں اپنے دوستوں سے مخاطب ہوا۔ ''اچھا تو دوستو تم لوگوں

نے یہ خبر سن لی ہے۔ اب اس آدم خور کے شکار پر میرے ساتھ کون چل رہا ہے؟ میں ناشتے کے فوراً بعد اس گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤں گا جس کے آس پاس وہ ٹائیگر منڈلاتا رہتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں کیا قدم اٹھاؤں گا، اس کا انحصار وہاں حاصل ہونے والی معلومات پر ہوگا۔"

"اوہ، ہم سب چلیں گے۔" ولیم نے کہا۔ "سوائے ڈاکٹر کے۔ یہ یہاں رہ کر ہمارے کیمپ کی دیکھ بھال کرے گا کیونکہ اسے گولی چلانی تو آتی نہیں ہے۔ کیا خیال ہے بڑے میاں۔ تم یہاں ہمارے لیے کھانے وغیرہ کا انتظام کرنا اور معاملات کو سنبھالنا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اپنا خیال رکھنا اور ٹائیگر کو ہلاک کر کے آنا، کہیں ٹائیگر ہمارے کسی آدمی کو نہ ہلاک کر دے۔"

ہم ناشتے کے فوراً بعد اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر باٹا سنگھ رام روانہ ہو گئے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک گھوڑے کا رکھوالا بندوق، رائفل یا برچھی اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ قاسم ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے خیال میں ہمیں کس طرح کے پلان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس نے نہایت دانش مندی سے جواب دیا کہ اس وقت وہ کوئی مشورہ نہیں دے سکتا کیونکہ یہ کوئی عام ٹائیگر نہیں ہے ورنہ ہم آسانی سے یہ معاملہ خود ہی نمٹا دیتے۔ آدم خور اس قدر چالاک ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے کسی بیل کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ آدم خور اکثر ریوڑ کی رکھوالی کرنے والے کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور مویشی کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ یہ اتنا شاطر ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو نظر آتا ہے۔ وہ جب بھی کسی کو اٹھا کر لے جاتا ہے تو میں میلوں اس کا تعاقب کرتا ہوں لیکن آج تک اس کے کچھار کا کچھ پتا نہیں چل سکا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی ایک مقام پر دو راتوں سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس نے پچھلے چھ ماہ میں چالیس سے زیادہ آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ میں خود بھی جانتا ہوں کہ اس عرصے میں سولہ ڈاکیے لاپتا ہو گئے ہیں اور آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ڈاکیوں کو وہی اٹھا کر لے گیا ہے۔ اب ڈاکیے اکیلے ڈاک لے کر نہیں جاتے۔ وہ پانچ یا چھ کے گروپ میں مسلح ہو کر چلتے ہیں پھر بھی اس درندے کے خوف سے ادھر سے نہیں گزرتے جہاں اس سے مڈبھیڑ ہونے کا اندیشہ ہو۔ جو بھی اسے ہلاک کرے گا، بڑا ہی خوش نصیب ہوگا۔ میں کئی کئی دن اس کے تعاقب میں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ وہ مجھے پانی پیتا ہوا نظر آیا تھا لیکن جب میں اس کا نشانہ لینے کے لیے اس کے قریب گیا تو وہ میری موجودگی بھانپ گیا اور جنگل میں جا گھسا۔"

"قاسم، میری بات سنو۔" میں نے کہا۔ "گاؤں پہنچ کر میں تھانے دار سے کہوں گا کہ وہ جتنے بھی ہانکا کرنے والوں کو اکٹھا کر سکتا ہے کر لے تاکہ ہم کل علی الصباح اپنی کارروائی شروع کر دیں اور ہانکا کر کے اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں۔ آج ہم اس کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے اور ان جگہوں پر جائیں گے جہاں وہ حال ہی میں نظر آیا تھا۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو اس سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔"

"صاحب! آپ کا منصوبہ تو بہت اچھا ہے۔ میں اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا۔ مجھے کامیابی کی زیادہ امید نہیں ہے لیکن ہم انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔" وہ بولا۔

جب گاؤں کا منظر ابھرنے لگا تو میں نے قاسم سے کہا کہ وہ جا کر تھانے دار کو ہماری آمد سے مطلع کر دے۔ ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو تھانے دار نے باہر آ کر ہمارا استقبال کیا۔ ہم گھوڑوں سے اتر کر تھانے کے باہر ایک بڑے سے املی کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور وہ ہمیں بتانے لگا کہ اس آدم خور نے آس پاس کے تمام گاؤں میں کیسی تباہی پھیلا رکھی تھی۔ اس نے پیشکش کی کہ اس غارت گر کو ٹھکانے لگانے کے لیے جتنے بھی آدمیوں کی ضرورت ہوگی وہ فراہم کرے گا۔

اڑوس پڑوس کے سارے گاؤں سے آدمی اکٹھا کر کے یہ ہدایت کرنے کے بعد کہ وہ سب اگلے دن سحر طلوع ہونے سے پہلے تیار رہیں، ہم گاؤں والوں کے ساتھ گاؤں سے کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر واقع اس کنویں پر پہنچے جہاں سے ایک دن پہلے ٹائیگر ایک عورت کو شام کے جھٹپٹے میں اس وقت اٹھا کر لے گیا تھا جب وہ پانی بھر رہی تھی۔ میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا۔ اگرچہ ٹائیگر کے پیروں کے نشان وہاں سے گزرنے والے ایک ریوڑ کے پاؤں کے نشانات سے مٹ گئے تھے تاہم وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایک املی کے درخت کے پاس خاصے نمایاں تھے۔ نہ صرف پیروں کے نشان بلکہ وہاں خون بھی پڑا ہوا تھا اور لمبے لمبے بال جڑوں سے الجھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک جھاڑی

کے عقب میں گھاس پات دبے ہوئے تھے اور مٹی میں پیروں کے نشان تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ درندہ اپنے شکار کو وہاں رکھ کر کچھ دیر ستانے کے لیے رکا تھا اور پھر دوبارہ شکار کو دبوچ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ میں نے غور کیا کہ درندہ ادھر واپس نہیں گیا تھا جدھر سے آیا تھا۔ لگتا تھا کہ پہلے اس نے گاؤں کے دو تین چکر لگائے تھے اور پھر اپنے شکار کو جا دبوچا تھا۔ میں اس کے پیروں کے نشان کا تعاقب کرتا ہوا جنگل کو عبور کر کے ایک آبی گزرگاہ کے خشک ریتیلے مقام پر پہنچا۔ وہاں اس کا سراغ بالکل واضح تھا۔ اگرچہ وہاں خون کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا تاہم یہ بالکل واضح تھا کہ وہ اب بھی اپنے شکار کو اٹھائے ہوئے تھا کیونکہ اس کے اگلے پیروں کے نشان اضافی بوجھ کی وجہ سے پچھلے پیروں کی بہ نسبت ریت پر گہرے اور واضح تھے۔

اس سے کچھ آگے خشک خون کا ایک بڑا سا دھبا تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور ریت میں اس کے پیروں کے نشان سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے اپنے شکار کو پھر وہاں رکھا تھا تاکہ اسے اور اچھی طرح اپنی گرفت میں لے سکے۔ میں نے یہ منظر ولیم کو دکھاتے ہوئے غور کیا کہ عورت نے اس وقت تک پوری طرح دم نہیں توڑا تھا بلکہ جاں کنی کے عالم میں تھی۔ ہم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، ایک میل دور چلے گئے جہاں ایک جوہڑ تھا۔ یہاں ٹیلے بلند اور عمودی تھے۔ جھاڑیاں بلند ہو کر خاردار جنگل میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اس مقام پر ٹائیگر کے پیروں کے نشان دیگر جنگلی جانوروں کے پیروں کے نشان میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ جوہڑ کے دوسری طرف اس بات کا سراغ ملتا تھا کہ ٹائیگر ایک بار پھر اپنے شکار کو وہاں رکھ کر پانی پینے کے لیے رکا تھا۔ حالانکہ خون کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی چیز نے انہیں اس طرف متوجہ کیا تھا۔ ٹائیگر کے پیروں کے نشان سے واضح ہوتا تھا کہ وہ پانی پی کر اپنے شکار کے پاس لوٹا تھا۔

ہم نالے کے ساتھ ساتھ مزید دو میل آگے گئے۔ ایک مقام پر نالا اونچی اونچی گھاس میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تقریباً سو گز کے بعد آپس میں مل کر اس نے ایک جزیرہ تشکیل دے دیا تھا جو اونچی اونچی خشک گھاس، بیلوں اور خودرو جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ وہاں آدم خور کے سراغ کو ایک شیرنی اور اس کے دو نوجوان بچوں کا سراغ کراس کر رہا تھا۔ ہم مزید ڈیڑھ میل آگے چلے گئے جہاں پیروں کے نشان نالے پر ختم ہو کر گھنے خاردار جنگل میں ہماری رہنمائی کرنے لگے۔ ہم ایک قطار میں جنگل میں داخل ہوئے۔ یہاں کپڑے کے چھوٹے ٹکڑے اور لمبے بال ایک خاردار جھاڑی میں پھنسے ہوئے تھے اور اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ٹائیگر اپنے شکار کو یہاں لے کر آیا تھا۔

"دوستو!" میں نے کہا۔ "اب چونکہ ہمیں بو آنے لگی ہے، اپنی بندوقوں کو چیک کرو اور بالکل تیار رہو۔ ہو سکتا ہے ہم اسے بے خبری میں جا لیں۔ ولیم میں چاہتا ہوں کہ تم قطار کے پیچھے رہ کر لوگوں کو تتر بتر ہونے سے روکو۔ چنیا، تم میری دوسری گن کے ساتھ میرے پاس رہو۔ رام سوامی تم کوئی آواز پیدا کیے بغیر آگے جاؤ۔ ہو سکتا ہے وہ آدم خور پیٹ بھر کھانے کے بعد یہیں کہیں گھنی گھاس میں سو رہا ہو، لہٰذا تم بالکل چوکس رہ کر خاموشی سے آگے بڑھتے رہو۔"

میں سب سے آگے بڑی مشکل سے اس گھنے جنگل میں راستہ بناتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا۔ ہمارے سروں پر گھنے پتوں کی وجہ سے تاریکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے لیکن اس دوران کبھی کسی کے کوئی کانٹا چبھ جاتا اور بے ساختہ اس کے منہ سے کراہ نکل جاتی۔ وقفے وقفے سے جانوروں کی بھانت بھانت کی بولیاں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ کبھی کوئی مور زور زور سے چیخ کر ہمیں کسی انجانے خطرے سے آگاہ کرنے لگتا۔ اچانک مجھے ایک ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے سب کو رکنے اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر خود بھی زمین سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ہمیں واضح طور پر غراتے اور ہڈیوں کے چبائے جانے کی آواز سنائی دی۔ چنیا بھی زمین سے کان لگا کر سن رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ایک نئے جوش و خروش سے چمکنے لگی تھیں۔ میں نے اپنی رائفل کا جائزہ لیا، چنیا اور میک کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوسرے لوگوں کو بالکل خاموش رہنے کی تاکید کی کہ جب تک وہ گولی چلنے کی آواز نہ سن لیں اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بڑی مشکل سے تقریباً سو گز طے کرنے کے بعد وہ آوازیں پہلے کی بہ نسبت واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک کھلی جگہ پہنچ گئے۔ ہمارے ایک طرف ایک سیاہ چٹان تھی جو جنگل میں گھری ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر بڑی احتیاط سے ارد گرد کا جائزہ لینے پر ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ وہاں کوئی آدم خور

نہیں تھا بلکہ دو لکڑ بھگے کسی انسان کی آدھی کھائی ہوئی لاش کی ہڈیوں اور گوشت کو چبا رہے تھے۔ انہیں ہماری آمد کی خبر ہو گئی اور وہ غراتے ہوئے فوراً جھاڑیوں میں غائب ہو گئے یہ دیکھ کر کہ جس آدم خور کی تلاش تھی وہ وہاں نہیں تھا، ہمیں بے حد مایوسی ہوئی۔ میں نے سیٹی بجائی اور باقی سب لوگ وہاں آ گئے۔

وہ جگہ واضح طور پر اس آدم خور کی قربان گاہ تھی۔ وہاں انسانوں کی آدھی کھائی ہوئی لاشیں اور کھوپڑیاں پڑی تھیں۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ میں نے گنا یہ تعداد میں نیس تھیں۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ وہاں ان عورتوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، کپڑے اور سونے اور چاندی کے زیورات نیز لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے چاندی کے دو بھاری کنگن اٹھائے، یہ اس عورت کے تھے جسے گزشتہ روز آدم خور نے ہلاک کیا تھا۔ ہمیں سونے کے دو ٹیکے اور ہار بھی ملے جو کسی شادی شدہ عورت کے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چاقو بھی تھا جس کے بارے میں ویر پا دھوبی نے بتایا کہ وہ چاقو ایک ڈاکیے کا تھا جو تقریباً ایک ماہ پہلے ہلاک ہوا تھا۔

سڑی گلی لاشوں سے اٹھتا ہوا تعفن ہمارے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ ہم وہاں سے کھلی جگہ نکل آئے تاکہ تازہ ہوا میں سانس لے سکیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ جب تک گاؤں کے بااختیار لوگ آ کر ان لاشوں کو دیکھ نہ لیں، انہیں دفن نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے لوگ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو شناخت کر کے انہیں اپنے مذہبی رسم و رواج کے مطابق دفن کرنا چاہیں۔

''کیسا تعفن تھا، مجھے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔'' میک نے کہا۔ ''اور کیسا دلخراش منظر تھا۔ میں شاید ہفتوں اس منظر کو بھول نہ پاؤں۔''

''بے چاری عورت۔'' جیک بولا۔ ''یہ دیکھو اس کی کھوپڑی سے منسلک کچھ بال میرے جوتے سے چپک گئے ہیں۔ میں ان بالوں کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔''

''جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس عیار آدم خور کو ہلاک کر کے اس کی کھوپڑی نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور جب تک اس درندے کو ہلاک نہیں کر لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میرا گروپ آج رات باٹا سنگارام میں سوئے گا تاکہ پو پھٹے کام کرنے کو تیار ہو جائے۔ ہمیں رضا کاروں کی ضرورت ہو گی اور سب سے پھرتیلے نوجوانوں کی مسلح ٹیم ہانکا کرنے والوں کے ساتھ ہو گی تاکہ ان کا دفاع کر سکے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ کسی بھی جانور پر ایک بھی گولی نہیں چلائی جائے گی تاوقتیکہ ہمارا اصلی ہدف حاصل نہیں ہو جاتا یا ہماری تلاش اختتام کو نہیں پہنچ جاتی۔''

''ہاں، تمہاری بات بالکل درست ہے۔'' ولیم بولا۔ ''کسی بھی ہرن یا سانبھر پر کوئی گولی نہیں چلے گی۔ اس درندے کو اس کے انجام تک پہنچانے کا یہی واحد حل ہے ورنہ ہم یہ موقع ضائع کر دیں گے۔ اب جب کہ اندھیرا پھیلنے لگا ہے، ہمیں گاؤں واپس چلنا چاہیے۔ وہاں پولیس حکام کی مدد سے ہمیں ہانکا کرنے والوں کو اکٹھا کرنا ہو گا۔

گاؤں پہنچ کر ہم نے مکھیا سے ہانکا کرنے والوں کا انتظام کرنے کی بات کی۔ اس نے گاؤں کے لوگوں سے آس پاس کی تمام بستیوں سے زیادہ سے زیادہ ہانکا کرنے والوں کو اکٹھا کرنے کی ہدایت کی۔ ادھر سے فراغت پا کر ہم اپنے کیمپ لوٹ گئے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ لہٰذا ہم نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ شاید دنیا بھر میں انڈیا جیسی نہانے کی عیاشی کہیں نہیں ہے۔ علی الصباح واک کر کے لوٹیں اور نہالیں۔ کھیتوں میں کام کر کے دوپہر میں تھکے ہارے لوٹیں اور کھانا کھانے سے پہلے نہالیں۔ دن بھر کی گرمی کے ستائے ہوئے ہیں تو شام میں نہالیں، پھر رات میں سونے سے پہلے نہالیں اور تازہ دم ہو جائیں۔ دن بھر کی تھکن غائب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے نہانا نہایت فرحت بخش ہے۔

اگلی صبح سب لوگ میرے خیمے میں جمع ہو گئے۔ ابھی پو پھٹنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ ہماری تیاریاں مکمل تھیں۔ ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر مشعل بردار ٹیم کے ہمراہ باٹا سنگارام روانہ ہو گئے۔ جب ہم وہاں کے تھانے پہنچے تو آس پاس کی تمام بستیوں کے سردار اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ سب کے سب بندوقوں، تلواروں، برچھیوں، بھالوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے گویا جس کے ہاتھ جو لگا وہ ہتھیار اس نے اٹھا لیا تھا۔ ہانکا کرنے والوں کی ٹیم الگ تھی جو باجے، تاشے، ڈھول، ڈفلی، بگل وغیرہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس

منصوبے کے مطابق ہمیں دریا کو مرکز بنا کر چار میل کے قطر میں نیم دائرے کی شکل میں ہر تھوڑے فاصلے پر ایک مسلح فرد کو کھڑا کرنا تھا جو دریا پر نظر رکھے اور اگر ٹائیگر دریا کو عبور کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سب مل کر اسے روکنے کی کوشش کرتے۔ میں نے اپنے لیے وہ حصہ منتخب کیا تھا جو نالے کے پاس سے ہو کر ٹائیگر کے کچھار کی طرف جاتا تھا۔ ہم جنگل میں ہانکا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اتنا گھنا تھا کہ یہ ممکن نہیں تھا۔

تمام انتظام کے مکمل ہونے میں خاصا وقت لگ گیا۔ اب دن نکل آیا تھا چنانچہ میں نے ہانکا شروع کرنے کا سگنل دے دیا۔ ہانکا کرنے والے زور زور سے ڈھول پیٹتے، بگل بجاتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے بڑھنے لگے۔ ان سب آوازوں نے مل کر شور شرابے کا ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ ڈھول، تاشے اور بگل کی سمع خراش آوازوں سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ ہر شخص گلا پھاڑ کر چیخنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اس شور شرابے سے گھبرا کر ہرن، چیتل، سانبھر اور جنگلی سور وغیرہ غول کے غول ہمارے سامنے سے بھاگ رہے تھے۔ کبھی موروں کا جھنڈ ہمارے سروں پر سے اڑتا ہوا گزر جاتا یا درختوں کی بلند شاخوں پر بیٹھے ہوئے بندر چیخ چیخ کر ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگیں لگانے لگتے۔ اس ہلا گلا میں ہماری پیش قدمی جاری تھی کہ ہمیں اچانک دائیں طرف سے پے در پے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں جہاں میں نے ولیم کو تعینات کیا تھا۔ فوراً ہی ایک ہانکا کرنے والا بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر تین ٹائیگر موجود تھے اور ولیم نے ایک کو بری طرح زخمی کر دیا تھا لیکن وہ اس اونچی اونچی گھاس میں جا چھپا تھا جسے ہم نے گزشتہ کل عبور کیا تھا۔ میں نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا اور تین افراد کو ساتھ لے کر بھاگتا ہوا، ولیم کے پاس پہنچا جو اپنی گن کو ری لوڈ کر چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے تین ٹائیگر دیکھے تھے جن میں سے ایک کو اس نے پانچ فائر کر کے زخمی کر دیا جب وہ تینوں اونچی اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔

میں نے ان کے پیروں کے نشان کا معائنہ کیا۔ یہ وہی نشان تھے جو پچھلے دن آدم خور کے پیروں کے نشان کو کراس کر رہے تھے جس نے ہمیں چکرا دیا تھا اور جن کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ یہ ایک شیرنی اور اس کے دو بچوں کے نشان تھے۔ یہ ایک ایسا کنارہ تھا جو آبی گزرگاہ سے تین فٹ اونچا تقریباً اتنی گز طویل، تیس فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچی گھاس اور نرسلوں سے کلی طور پر ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں خودرو جھاڑیاں اتنی گھنی اور ایک دوسرے سے اس طرح الجھی ہوئی تھیں کہ ہانکا کرنے والوں کے لیے اس میں داخل ہونا اور آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ میں نے سب کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں تاکہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ جب یہ ہو گیا تو میں نے چیتا کو حکم دیا کہ وہ گھاس کو آگ لگا دے۔ چیتا نے ویسا ہی کیا۔ خشک گھاس اور جھاڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ شعلے بلند ہونے لگے اور جھاڑیاں چٹخنے لگیں۔

میں نے ساحل کے قریب ایک گڑھے میں پوزیشن سنبھال لی جہاں ٹائیگر کے پیروں کے حالیہ نشان نظر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ٹائیگر کے وہیں سے نکل کر بھاگنے کا امکان تھا۔ ہم سب اپنے اسلحے کے ساتھ بالکل تیار تھے اور بے چینی سے ٹائیگروں کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی اور تقریباً آدھی پٹی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ پھر بھی ان شیروں کی موجودگی کے آثار نمودار نہیں ہو رہے تھے اور نہ ہی گھاس میں کوئی حرکت ہو رہی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہانکا کرنے والوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ آدم خور نے وہاں پناہ لے رکھی ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک پوری فضا ایک خوفناک دھاڑ سے لرز اٹھی، ساتھ ہی ایک نہایت شاندار شیرنی اور ایک نوجوان شیر اچھل کر آبی گزرگاہ کے ریتیلے ساحل پر آ گئے۔ یہ جگہ وہاں سے قریب تھی جہاں آگ پھیل چکی تھی اور سیاہ دھوئیں کے مرغولے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ اس دھوئیں میں تابڑ توڑ چھ فائر کی آوازیں سنائی دیں۔ اسی کی گونج میں شیرنی نے دوسری چھلانگ لگائی، ساتھ ہی کسی کی بے حد دردناک چیخ سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دیکھا کہ غضب ناک شیرنی نے ولیم کے گھوڑوں کے غریب رکھوالے کی ران پر سے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا نوچ لیا تھا، وہ زمین پر ساکت پڑا ہوا تھا۔ شیرنی جو بظاہر زخمی لگ رہی تھی، اپنے شکار پر آدھی جھکی ہوئی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور مجھ پر چھلانگ لگانے کا انداز اختیار کر لیا۔ میں نے آہستہ سے اپنی گن اٹھائی اور اس خیال سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ غریب میری گولی کا نشانہ نہ بن جائے، نشانہ

باندھ کر فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس کے دماغ میں جا گھسی اور وہ پہلو کے بل گر کر ساکت ہو گئی۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

وہ غریب سائیس مردہ نہیں لگ رہا تھا لیکن میں اس پر ایک نظر ڈال کر سمجھ گیا کہ اس کے زندہ رہنے کی کوئی اُمید نہیں تھی کیونکہ شیرنی نے پنجہ مار کر اس کے سر کے پچھلے حصہ کو نوچ لیا تھا۔ ساتھ ہی گردن کے پیچھے، دونوں شانوں کے بیچ کا حصہ اس طرح پھاڑ ڈالا تھا کہ وہاں گوشت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ یہ ایک نہایت دلخراش منظر تھا۔ اس بے چارے کے دونوں ہاتھوں میں تھرتھراہٹ ہو رہی تھی اور وہ انہیں بار بار زمین پر پٹخ رہا تھا پھر اس کا پورا جسم دو یا تین مرتبہ تھرتھرایا اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے اپنے قلیوں سے کہا کہ وہ اس کی لاش دفن کرنے کے لیے گاؤں لے جائیں۔

شیرنی کے دو میں سے ایک بچے کو ایک شکاری نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا جب کہ دوسرا آگ سے جھلس کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ولیم نے اسے اس بری طرح زخمی کر دیا تھا کہ وہ شعلوں سے بچ کر بھاگنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شیرنی اس وقت تک اپنے بچوں کے پاس موجود تھی جب تک آگ کے شعلے اس تک نہیں پہنچ گئے تھے کیونکہ اس کی کھال جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی۔

☆.....☆

ولیم اپنے گھوڑے کے رکھوالے کے اس دردناک انجام سے بہت ملول اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ولیم کی خدمت کرتا آ رہا تھا اور بے حد وفادار تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور وہ معرکہ جاری رہا کیونکہ ہمیں جس آدم خور کی تلاش تھی اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اب ہم دریا کے ساتھ ساتھ دور پھیلے ہوئے وسیع و عریض جنگل میں ہانکا کرنے لگے جس کے ایک طرف کھلے میدان کا ایک خاصا بڑا قطعہ تھا۔ یہاں ہم نے درختوں اور چٹانوں کے عقب میں مناسب ترین جگہ منتخب کر کے پوزیشن سنبھال لی اور میں نے ہانکا کرنے والوں کو ہانکا کرنے کا سگنل دے دیا اور وہ زور و شور سے ہانکا کرتے ہوئے، ہماری طرف بڑھنے لگے۔ اس ہانکے کی وجہ سے بے شمار جانور جنگل سے نکل کر میدان کا رخ کرنے لگے لیکن جب ہمیں دیکھا تو سہم کر وہیں رک گئے۔ انہیں میدان کو عبور کرتے ہوئے خطرے کا احساس ہوا اور ان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھاتے اور پھر چار قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں اتنے سارے لوگ کیوں اکٹھا ہو گئے تھے۔

اچانک کوئی چیخا۔ ''باگھ..... باگھ.....!''

اسی وقت میری نظر ایک نہایت شاندار ٹائیگر پر پڑی جو جنگل کے ایک چھدرے حصے سے چوری چھپے گزر رہا تھا اور سیدھے میری طرف بڑھ رہا تھا لیکن میں نے اس ڈر سے فوراً اس پر گولی نہیں چلائی کیونکہ اس کے عقب میں ہمارے لوگوں کا ایک گروپ صف آرا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی مہلت دی اور جب وہ مزید قریب آ گیا تو میں نے اپنی گن شانے سے لگا لی اور اسے بالکل صحیح نشانے پر لے لیا پھر اس نے چلتے ہوئے جونہی اپنا اگلا پیر آگے بڑھایا، میں نے فائر کر دیا۔ جب دھواں صاف ہوا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ آدم خور اپنے پہلو کے بل زمین پر ساکت پھیلا ہوا تھا۔ اس کی موت فوری واقع ہوئی تھی کیونکہ میری گولی اس کے دل کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ ایک نہایت عمدہ اور بھرپور جوان ٹائیگر تھا۔ ہم نے اس کی پیمائش کی تو وہ ناک سے دم تک گیارہ فٹ چار انچ لمبا تھا۔

واپسی میں ہم دریا کے پاس رک گئے۔ سب لوگ دل کھول کر نہائے اور دن بھر کی تھکن دور کی۔ اسی دوران ہانکا کرنے والوں نے درختوں سے موٹی موٹی شاخیں توڑ کر ہلاک شدہ شیر، شیرنی اور ان کے بچوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے لے جانے کے انتظامات کیے اور چند ہرنوں اور چیتلوں کو زندہ پکڑ لیا اور پھر باجے، تاشے اور ڈھول کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں گاؤں لوٹے تو آس پاس کی تمام بستیوں کے مرد و زن اور بچوں نے نہایت گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم پر پھول کی پتیاں نچھاور کی گئیں، پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور گلدستے پیش کیے گئے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے لیے وہ ایک تاریخی دن تھا کیونکہ انہیں اس آدم خور سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی تھی جو ان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا اور جس نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ دن ان کے لیے گویا عید کا دن تھا۔ ہر سو جشن کا سماں تھا۔ وہ ڈھول اور باجے کی تال پر رقص کر رہے تھے۔ اسی دوران انہوں نے ہرنوں اور چیتلوں کو اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق ذبح کیا۔ ہمارے لیے بھی وہ ایک یادگار دن تھا۔ ہم نے ان کے اس جشن میں ان کا بھرپور ساتھ دیا اور حلال گوشت کی دعوت اڑائی۔

فلم نگری

معمار

انور فرھاد

فلم نگری کی تعمیر میں ایسے بہت سے ہنرمندوں کی محنت شامل ہے جنھوں نے دن رات کی انتھک محنت سے پاکستان کی فلمی صنعت کو اوج پر پہنچایا، کیسے کیسے نابغہ روزگار لوگ تھے۔ کس طرح کام کو عبادت سمجھ کر اپنا حصہ ڈالتے تھے۔

پاکستان کا فخر کہے جانے والے ہنرمندوں کا تذکرہ

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میرے پڑھنے والے میری تحریریں پسند بھی کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنی پسند کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ کرم فرماؤں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں موسیقی کے شعبے سے وابستہ افراد، موسیقاروں، نغمہ نگاروں، گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے بارے میں تو بہت لکھتا ہوں۔ اداکاروں اور اداکاراؤں سے متعلق بھی لکھتا ہوں لیکن فلم کا اصل اور بنیادی کردار ادا کرنے والے ہدایت کاروں کے بارے میں نہیں لکھتا۔ ہدایت کار فلم کا

کپتان ہوتا ہے مگر آپ اسی بے چارے کو لفٹ نہیں کراتے۔

دوستو! مجھے ہدایت کاروں سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے ان کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی علم ہے اور میں نے ان کے بارے میں لکھا بھی ہے اور سرگزشت کے صفحات اس کا ثبوت بھی ہیں۔ ہدایت کار نذر الاسلام، ہدایت کار سید نور، ہدایت کار اسلم ڈار ہدایت کار شیخ حسن، ہدایت کار سید کمال، ہدایت کار جاوید شیخ، ہدایت کار دلجیت مرزا، ہدایت کار رنگیلا، ہدایت کارہ شمیم آراء کے علاوہ انڈین ہدایت کار ستیہ جیت رائے، ہدایت کار سہراب مودی، ہدایت کار راجکپور، ہدایت کار کمال امروہوی اور ہدایت کار کے آصف کے بارے میں تفصیلی مضامین لکھ چکا ہوں۔ ہاں اس بات کا مجرم ضرور ہوں کہ اتنا زیادہ نہیں لکھا جتنا موسیقاروں، نغمہ نگاروں اور گلوکاروں کے متعلق لکھا ہے۔ ناراض نہ ہوں۔ آج ایک بار پھر ہدایت کاروں پر لکھ کر آپ لوگوں کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کروں گا اور وعدہ رہا کہ آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔

☆.....☆

اللہ کے فضل سے آج کے پہلے ہدایت کار نجم نقوی ہیں جنہیں پاکستان میں کچھ لوگ نجم نقوی شمیم آرا فیم کے نام سے بھی جانتے پہچانتے ہیں کیونکہ پاکستان میں انہوں نے شمیم آرا کو پہلی بار ''کنواری بیوہ'' کی حیثیت سے عوام میں متعارف کرایا تھا۔ جی ہاں اسی نام کی فلم شمیم آرا کی پہلی فلم تھی۔ کہتے ہیں کہ بہترین سیلفس کو ڈھونڈ نکالنے کا ہنر نجم نقوی کو حاصل تھا۔ انہوں نے انڈیا (غیر منقسم ہندوستان) میں بھی اپنے ہدایت کارانہ دور میں بہت سے نئے چہروں کو متعارف کرایا جو بعد میں بہت مشہور ہوئے اور انہوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ نجم نقوی بہت پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور پھر ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ایک وقت تھا جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے والے لوگوں کی پورے ہندوستان میں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔

نجم نقوی کا مکمل نام سید نجم الحسن نقوی تھا۔ وہ 1910ء میں امروہہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام سید فیض الحسن نقوی تھا جو ایک درویش صفت انسان تھے۔ نجم نقوی نے آٹھویں جماعت تک تعلیم امروہہ ہی میں والد کی زیر نگرانی حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اپنے ماموں کے گھر کرنال چلے گئے اور وہاں کے اسکول سے نہ صرف امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا بلکہ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ ان کے ماموں ابوالحسن نقوی نے نجم نقوی کے میٹرک پاس کرنے اور وظیفہ حاصل کرنے کی خوش خبری اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کو پہنچائی۔ ہونہار بروا کی مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انتخاب کیا گیا۔ میٹرک میں ان کے بہترین نتائج کی بنا پر انہیں داخلہ مل گیا جہاں سے انہوں نے بی اے (گریجویشن) کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ انہوں نے یہ امتحان 34-1933ء میں پاس کیا اور اسی موقع پر بھی وظیفہ حاصل کیا۔ بعد ازاں انہوں نے اس تعلیمی ادارے (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے اردو ادبیات میں ایم اے کیا۔ دوران تعلیم ان کی ملاقات خواجہ الطاف حسین حالی کے پوتے پروفیسر خواجہ غلام السیدین سے ہوئی جن سے انہیں خاصی رہنمائی اور تعاون حاصل ہوا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے پیشے کے طور پر فلم انڈسٹری سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ شوق سے فلمیں دیکھا کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ سائنس کی اس نئی ایجاد (فلم) سے بڑے وسیع پیمانے پر معاشرے کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ جو بات مدتوں سمجھانے کے باوجود لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوتی وہی بات فلم کے ذریعے بڑی جلدی اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ اور ایسی ہی مثبت باتیں تھیں جو فلم انڈسٹری جوائن کرنے کا سبب بنیں۔

انہوں نے اس دور کے ایک جید فلم میکر رائے بہادر ہمنسو رائے کو ایک درخواست بھجوائی۔ ہمنسو رائے فلم ساز ادارہ بمبئی ٹاکیز کے مالک تھے۔ انہوں نے 1935ء میں مضبوط بنیادوں پر بمبئی ٹاکیز کی بنیاد رکھی تھی اور اس کی ترقی و ترویج اور استقامت کے لیے انہوں نے اس ادارے میں نامور مصنفوں اور فنکاروں کو رکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب نجم نقوی نے ان کے نام اپنی شمولیت کی درخواست بھجوائی اور اپنے خاندانی اور تعلیمی کوائف سے آگاہ کیا تو رائے بہادر ہمنسو رائے نے انہیں بلا کر ان سے ملاقات کی اور پوچھا۔

''نوجوان! آپ فلم سازی کے کون سے شعبے سے وابستہ ہونا پسند کریں گے؟''

''سر جی! میں نے اردو ادبیات میں ماسٹر کیا ہے۔ لکھنا پڑھنا میرا شوق رہا ہے۔ فلمیں دیکھتا رہا ہوں لیکن فلم سازی کے کسی شعبے کا مجھے کچھ علم نہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ

کیجیے کہ مجھ جیسے کے لیے کون سا شعبہ مناسب رہے گا۔"

"تمہارا تعلیم یافتہ ہونا تمہاری خوبی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جسے علم کی رہنمائی حاصل ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ تم فی الحال میرے اسکرپٹ رائٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہو جاؤ اور فلم کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے کی تربیت حاصل کرو۔ ہمارے ہاں تجربہ کار مصنف اور رائٹر موجود ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم جلد ہی اس شعبے میں اپنی کارکردگی کا بہترین ثبوت پیش کر سکو گے۔"

سید نجم الحسن نے رائے صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "انشاء اللہ تعالیٰ، آپ اور آپ کے ادارے کی سرپرستی میں مجھے بہترین تربیت کا موقع ملے گا۔"

بمبئی ٹاکیز جو ایک مضبوط اور مستحکم فلم ساز ادارہ تھا اور اسے استحکام بخشنے والوں میں دلیپ کمار، کشور ساہو، شاہد لطیف، عصمت چغتائی، پنالال گھوش، پردیپ کمار، ایس مکرجی، شاہ نواز، لیلیٰ چٹس، اشوک کمار، سعادت حسن منٹو، نریندر شرما، بھگوتی چرن ورما جیسی شخصیتوں کی خدمات حاصل تھیں۔ نجم نقوی بھی اس ٹیم میں بطور مصنف شامل ہو گئے۔

ان دنوں نامور ہدایت کار فرانز آسٹن بمبئی ٹاکیز کے لیے فلم "اچھوت کنیا" بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ فرانز آسٹن اس سے پہلے فلم "جوانی کی ہوا" بنا چکے تھے جس نے خاصی کامیابی حاصل کی تھی جس میں دیویکا رانی، نجم الحسن، چندر پربھا، آزاری اور مکرجی نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کی موسیقی سرسوتی دیوی نے ترتیب دی تھی۔ نجم نقوی فرانز آسٹن کی زیرِ ہدایت بننے والی اس فلم سے کافی متاثر تھے۔ جب وہ خود اس ادارے سے منسلک ہوئے تو فرانز آسٹن نے ان کی تعلیم اور ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے فلم کا اہم ترین شعبہ (کہانی نویسی) ان کے سپرد کر دیا۔ یوں انہوں نے اس ادارے کے لیے سب سے پہلے "اچھوت کنیا" کی کہانی تحریر کی۔ ان کی لکھی ہوئی یہ فلم باکس آفس پر بہت کامیاب ثابت ہوئی اور انہیں اچھی کہانی لکھنے والوں کی صف میں شامل کر لیا گیا۔

"اچھوت کنیا" کی کاسٹ میں اشوک کمار، دیویکا رانی، کانتا پرشاد، چندر پربھا، ممتاز علی اور نجم نقوی شامل تھے۔ جی ہاں اس فلم میں نجم نقوی نے بھی ایک ثانوی کردار ادا کیا تھا۔ یہ اشوک کمار کی پہلی فلم تھی جب کہ ان کی ہیروئن کا کردار دیویکا رانی نے نبھایا تھا۔ دیویکا رانی ہمنسو رائے کی بیوی تھیں۔

دوستو! اشوک کمار جیسے مہان اداکار کی اس پہلی فلم کی پہلی شوٹنگ کے دوران بڑا دلچسپ واقعہ ظہور پذیر ہوا جو سننے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر کیے بغیر کچھ کہنا سننا مناسب نہیں ہوگا۔

اشوک کمار بنیادی طور پر بنگالی تھے۔ ان کا اصل نام مکند لال گنگولی تھا۔ وہ بمبئی ٹاکیز میں لیبارٹری میں لیب بوائے کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے۔ "اچھوت کنیا" میں ان کا انتخاب ہیرو کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس سے آگے کی کہانی نجم نقوی کی زبانی سنیے۔

"اشوک کمار انتہائی شرمیلے نوجوان تھے۔ جب میں نے اس فلم کی کہانی مکمل کر لی تو کسی نے رائے بہادر صاحب کو مشورہ دیا۔ "آپ کے لیب میں جو بنگالی نوجوان مکند لال گنگولی کام کرتا ہے وہ اس فلم کے ہیرو کے لیے بہت مناسب رہے گا۔"

ہمنسو رائے نے فلم کے ڈائریکٹر فرانز آسٹن سے مشورہ کیا۔ آسٹن نے ذرا غور کیا۔ پھر کہا۔ "جی ہاں، یہ لڑکا تو بڑا اینڈسم ہے مگر ذرا شرمیلا ہے۔ اس پر تھوڑی محنت کرنی

نجم نقوی کی فلمیں / بطور کہانی نویس

اچھوت کنیا (انڈین) 1935ء
کنگن (انڈین) 1939ء
پائل کی جھنکار (پاکستانی) 1966ء

☆☆☆

بطور ہدایت کار انڈین فلمیں

پونرملن 1940ء، راجا رانی 1942ء، نیا ترانہ 1943ء، تصویر 1943ء، پتا 1944ء، پرتھوی راج نجو کتا 1946ء، کمرا نمبر 9 (نامکمل ہدایت کاری) 1946ء، نتیجہ 1947ء، ایکٹریس 1948ء، پرائی آگ 1948ء، نردوش 1950ء، رنگیلی 1952ء، سمراٹ 1954ء۔

☆☆☆

کنواری بیوہ 1956ء، نغمۂ دل 1959ء، دل ناداں 1960ء، قیدی 1962ء، ایک منزل دو راہیں 1962ء، اک تیرا سہارا 1963ء، پائل کی جھنکار 1966ء۔

پڑے گی۔''

''بطور ہیرو وہ کیسا رہے گا؟''

''اگر اس نے اچھی اداکاری کر لی تو بہت اچھا رہے گا۔''

''تو پھر ڈن! اچھوت کنیا کا ہیرو وہی ہوگا۔''

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ رائے بہادر ہمنسو رائے نے لیب جا کر یہ خوش خبری خود اس شرمیلے نوجوان کو سنائی۔

''ارے بھائی گنگولی صاحب! مبارک ہو۔''

''جی..... کیسی..... کس بات کی مبارک باد؟''

''تم ہماری نئی فلم ''اچھوت کنیا'' کے ہیرو بننے جا رہے ہو۔''

بجائے خوش ہونے کے وہ بہت گھبرا گئے۔ شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔ رائے بہادر ہمنسو رائے تو خوش خبری سنا کر چل دیئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے بہنوئی مکرجی سے ملے اور کہا۔ ''یہ کیا مصیبت ہے۔''

''کیسی مصیبت؟''

اب انہوں نے باس کی بات دہرائی اور کہا۔ ''میں ایکٹنگ نہیں کر سکتا۔''

مکرجی نے پہلے تو انہیں مبارک باد دی پھر بڑے پیار سے سمجھایا۔ ''ہیرو بننے کے شوق میں پورے ہندوستان سے لڑکے آتے ہیں۔ تمہیں گھر بیٹھے یہ چانس مل رہا ہے تو کیوں انکار کر رہے ہو؟ ارے یار! ہیرو بن کر تمہاری تو دنیا بدل جائے گی۔ اس لیب کی نوکری میں تمہیں کیا ملتا ہے؟''

غرض کہ بہت سمجھانے بجھانے پر گنگولی صاحب راضی ہوئے۔ ان کا روایتی طور پر ٹیسٹ وغیرہ لیا گیا۔ بہ مشکل تمام انہوں نے کیمرے کا سامنا کیا پھر انہیں اسکرین ٹیسٹ میں بھی کامیاب قرار دے دیا گیا۔ رائے بہادر ہمنسو رائے نے کہا۔

میرے خیال میں تو ان کا فلمی نام کچھ اور ہونا چاہیے، پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ''اشوک کمار کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا۔'' کئی آوازیں ابھریں۔

اس کہانی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے جب ان کی شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ سیٹ پر ان کے مدمقابل ان کی ہیروئن دیویکا رانی تھیں جو ان کے باس کی خوب صورت بیوی تھیں۔ اس وقت اس شرمیلے نوجوان کی حالت دیدنی تھی۔

سیٹ پر اس وقت ہمنسو رائے بھی موجود تھے۔ یہ سین جو فلمبند کیا جانے والا تھا بڑا رومانی تھا۔ ہیروئن کو گلے سے لگا کر جذباتی مکالمے بولنے کا تھا۔

ڈائریکٹر نے ہیرو ہیروئن دونوں کو اچھی طرح سمجھایا کہ انہیں کس طرح پرفارم کرنا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس بات کا اظہار کیا کہ وہ سمجھ گئے ہیں۔ ویسا ہی کریں گے جیسا انہیں سمجھایا گیا ہے مگر جب شاٹ اسٹارٹ ہوا تو اچھوت کنیا کو گلے سے لگا کر، سینے سے چمٹا کر مکالمے بولنا ہیرو کے لیے عذاب بن گیا۔ مکالموں کی ادائیگی تو دور کی بات دیویکا رانی کے قریب جاتے جاتے ہی ان کی گھگھی بندھ گئی۔ پسینے سے شرابور ہو گئے۔ ڈائریکٹر نے ''کٹ کٹ'' کی آواز لگائی۔ یونٹ کے متعلقہ لوگ ان کے قریب پہنچ گئے۔ کسی نے پسینہ خشک کیا۔ کسی نے میک اپ درست کیا۔ کسی نے بالوں پر کنگھی پھیری۔ کسی نے پانی کا گلاس پیش کیا۔ چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے تسلی دی۔ سمجھایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ پہلے پہل کیمرے کے سامنے آنے پر تھوڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ آپ تو بہادر نوجوان ہیں۔ آپ کے سامنے یہ کیمرا کیا چیز ہے۔''

غرض کہ دوبارہ شاٹ لیا گیا مگر..... نئے نویلے ہیرو کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہی گھبراہٹ، وہی پسینا، وہ ہونقوں جیسی حالت۔ تھوڑی دیر بعد انہیں پھر سمجھا بجھا کر شاٹ لینے کی کوشش کی گئی مگر بے سود وہ فلمی سچویشن ان کے لیے خاصی عجیب اور حیران کن تھی۔

''اچھوت کنیا'' کے سیٹ پر جب فلم کے ہیرو حد سے زیادہ نروس ہو گئے اور کسی بھی طرح اپنی ہیروئن دیویکا رانی کو گلے لگا کر جذباتی اور رومانی سین کی فلمبندی نہ کروا سکے تو سبھی پریشان ہو گئے۔ اس موقع پر ان کے بہنوئی ایس مکرجی انہیں سیٹ سے باہر لے گئے اور ان سے پوچھا۔ ''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تمہاری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے؟''

اب انہوں نے بڑی بے چارگی سے مکرجی کو بتایا۔ ''دادا! دیویکا رانی جی، میرے مالک کی بیوی ہیں۔ میں کیسے ان کی موجودگی میں ان کی بیوی کو لپٹا چمٹا کر جذباتی مکالمے بولوں۔''

''اورے بوکا مانوش!'' مکرجی نے سر پیٹ کر کہا۔ ''ارے بے وقوف آدمی! فلم کے سیٹ پر پرفارم کرنے والے آرٹسٹ اپنی ذات اور شخصیت سے بالاتر ہو کر اس کردار کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جو کہانی کار ان

کے لیے تخلیق کرتا ہے سیٹ پر تم، تم نہیں ہو، دیویکا رانی، دیویکا رانی نہیں ہوتے ہو۔ بس کہانی کے دو کردار ہوتے ہو۔ اپنے آپ کو بھول کر۔ اپنی ذات کو بھول کر کاغذ پر لکھے بے جان کرداروں کو چلتے پھرتے کرداروں کے روپ میں پیش کرنے کو ہی فنکاری کہا جاتا ہے۔ دیویکا رانی رائے بہادر کی بیوی ہیں۔ یہ ان کو بھی معلوم ہے مگر سیٹ پر جانے کے بعد وہ ان کی بیوی نہیں رہتیں اچھوت کنیا بن جاتی ہیں۔ جاؤ تم بھی اپنے کردار میں ڈھل کر ایسی اداکاری کروگے۔۔۔"

اشوک کمار قدرے مطمئن ہو کر سیٹ پر آئے تو۔ دوسروں کے سامنے بھی انہیں سمجھایا اور جب نئے سرے سے ٹیک کا وقت آیا تو مکرجی نے کہا۔ "اس وقت تم، تم نہیں ہو۔ صرف اور صرف اس فلم کے ہیرو ہو اور وہ دیویکا رانی نہیں ہیں بلکہ اس فلم کی ہیروئن ہیں صرف اور صرف تمہاری محبوبہ ہیں۔ تم انہیں اپنی محبوبہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگاؤ اور اپنے جذبات کا اظہار کرو۔"

اس کے بعد جو شاٹ لیا گیا وہ او کے ہو گیا۔ سب نے مبارک باد دی۔ رائے بہادر ہمنسو رائے نے بھی آگے بڑھ کر نئے اور شرمیلے ہیرو کو گلے سے لگا کر شاباش دی۔ تعریف کی۔ اس کے بعد شرمیلے بنگالی نوجوان کی ذہانت اور صلاحیت نے ان کی رہنمائی کی اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے بہترین اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور اس فلم کے لیے اس دور کی روایت کے مطابق اپنے اوپر پکچرائز ہونے والا یہ گیت بھی گایا۔ "میں بن کے چڑیا بولوں رے" اس فلم کی موسیقی سرسوتی دیوی نے ترتیب دی تھی۔

نجم نقوی جو "اچھوت کنیا" کے کہانی کار تھے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے اس شعبے میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ پڑھے لکھے اور ذہین و متین انسان تھے لہٰذا انہوں نے فلم سازی کے دیگر شعبوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ایڈیٹنگ، عکاسی اور لیبارٹری ورک میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ انہوں نے اس بات کی بھی طرح ڈالی کہ ایک عکسبندی کے بعد ہر کردار کے لباس، کاسٹیوم، حالت اور ماحول کو نوٹ کر کے رکھنا شروع کر دیا۔ جب شوٹنگ دو چار دن یا بیس پچیس دن بعد ہو تو شوٹنگ کن حالات میں ہو رہی تھی، ماحول کیا تھا۔ دن تھا یا رات۔ کس اداکار یا اداکارہ پر شوٹ ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک چیز اپنے پاس لکھ کر رکھ لیا کرتے تھے تاکہ اس منظر کا اگلا سین عکسبند ہو تو کرداروں کی حالت اور ماحول ویسا ہی رکھا جائے۔ وہ انتہائی ذمے داری سے اپنا یہ سارا کام سرانجام دیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ روایت عام ہو گئی اور کنٹی نیوٹی کا ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر اس کام پر متعین کیا جانے لگا۔

نجم نقوی نے بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے بننے والی دوسری فلموں میں بھی اپنے استاد فرانز آسٹن کا بھرپور انداز میں ساتھ دیا۔ انہوں نے جن فلموں میں اپنے استاد کے زیر ہدایت کام کیا، ان میں جنم بھومی، جیون نیا، ممتا اور میاں بیوی۔ جیون پربھات، پریم کہانی، ساوتری، بھابی، نرملا، وچن، درگا، جیون اور کنگن قابل ذکر ہیں۔ ان تمام فلموں کی موسیقی سرسوتی دیوی نے ترتیب دی تھی۔ جب کہ فلم "کنگن" کی کہانی نجم نقوی کی تحریر کردہ تھی۔ وہ اس فلم کے معاون ہدایت کار بھی تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں لیلیٰ چٹنس، اشوک کمار، مبارک، وی ایچ ڈیسائی، پتھ والا، ناناپلسیکر، ارون کمار، سراج بورکر اور اما چکرورتی شامل تھے۔ لیلیٰ چٹنس اس فلم کی ہیروئن اور اشوک کمار ہیرو تھے۔ وی ایچ ڈیسائی کامیڈین اور مبارک نے فلم کے ولن کا کردار ادا کیا تھا۔ "کنگن" مجموعی طور پر بہترین فلم ثابت ہوئی تھی۔ اس کی موسیقی سرسوتی دیوی اور رام چندر پال نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں اُما چکرورتی نے بھی ایک رول ادا کیا تھا۔ دوستو! یہ وہی اُما چکرورتی تھے جنہوں نے دلیپ کمار کو پہلی بار بطور اداکار اپنی فلم "جوار بھاٹا" میں پیش کیا تھا۔ وہ اس فلم کے ہدایت کار تھے۔

جن دنوں فلم "کنگن" اور فلم "نوجیون" زیر تکمیل تھیں، وہ جنگ عظیم دوئم کا زمانہ تھا۔ یہ جنگ جرمن کے خلاف اتحادی لڑ رہے تھے اس لیے ہندوستان کی حکومت نے جرمن باشندوں کے لیے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں موجود تمام جرمن باشندے فوری طور پر ہندوستان چھوڑ دیں۔ اس حکومتی اعلان کے بعد ہدایت کار فرانز آسٹن کے پاس ہندوستان میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا کیونکہ وہ جرمن تھے، مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہندوستانی زبان اردو سے بھی ناواقف تھے۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی کہ ہندوستانی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے بنائی جانے والی کئی فلموں کے ہدایت کار تھے۔ انہوں نے اردو زبان میں بنائی جانے والی فلموں میں ہدایت کاری دی۔ ان کی اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رائے بہادر ہمنسو رائے نے ان کی سہولت کے لیے انتہائی کوالیفائیڈ اور پڑھے لکھے نوجوان بطور اسسٹنٹ پرووائیڈ کیے تھے جو

آرٹسٹوں کو مکالمے یاد کروانے کے علاوہ انہیں سین سمجھانے اور مکالموں کے مطابق پرفارم کرنے اور ان کی جذبات نگاری پر بھی نظر رکھتے تھے۔

ہندوستانی حکومت کے اعلان کے بعد ہندوستان سے جرمن باشندوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ لہٰذا ہدایت کار فرانز آسٹن کو بھی ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ جرمنی جانے سے پہلے فرانز آسٹن نے اپنے ہونہار شاگرد نجم نقوی کو بلا کر اپنی عدم موجودگی میں ان فلموں کو مکمل کرانے کی ہدایت کی۔ نجم نقوی نے اپنے استاد کے حکم پر ان کی عدم موجودگی میں ان فلموں کو ایسا مکمل کیا کہ سب نے اس کی تعریف کی۔ فلم ''کنگن'' اور فلم ''نوجیون'' دونوں مکمل ہو کر ریلیز ہوئیں۔ احترام استاد میں انہوں نے ان دونوں فلموں کے ٹائٹل پر ہدایت کار فرانز آسٹن کا نام دیا۔ ''کنگن'' اور ''نوجیون'' دونوں فلمیں 1939ء میں ریلیز ہوئی تھیں۔ دونوں ہی بے حد کامیاب رہیں۔ ان فلموں کی کامیابی کے بعد بمبئی ٹاکیز میں ہدایت کار نجم نقوی کی پوزیشن بطور ہدایت کار مستحکم ہو گئی۔ یوں بمبئی ٹاکیز نے ہدایت کار نجم نقوی کو اپنی ایک نئی فلم ''پونرملن'' کی ہدایت کاری کی ذمے داری سونپ دی۔ اس فلم کی کہانی سریندر منیر جی نے لکھی تھی جب کہ اس کے مکالمے شاہد لطیف اور جے ایس کشپ نے تحریر کیے تھے۔ اس فلم میں سنہا پر بھا پردھان نے ہیروئن کا کردار بڑے احسن طریقے پر ادا کیا تھا جب کہ ہیرو کا رول کشور ساہو نے بہترین انداز میں نبھایا تھا۔ ''پونرملن'' کی دیگر کاسٹ میں انجلی دیوی، پتھ والا، شاہ نواز، ممتاز علی، ممتاز بیگم، سنالی دیوی اور ایس بابو راؤ شامل تھے۔ 1940ء میں نمائش پذیر ہونے والی اس کامیاب فلم کی موسیقی چندر پال نے ترتیب دی تھی۔ نغمات پنڈت نریندر شرما کے تحریر کردہ تھے جب کہ اس کامیاب فلم کا کامیاب اسکرین پلے چکرورتی اور جی مکر جی نے لکھا تھا۔ پونرملن کی ہیروئن سنہا پر بھا پردھان اس فلم کی شوٹنگ کے دوران فلم کے ہیرو کشور ساہو پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئیں اور اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی کشور ساہو سے شادی رچا لی لیکن اس عشق کا بھوت محترمہ کے سر سے جلد ہی اتر گیا اور انہوں نے ایک دن بعد ہی اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یوں یہ شادی شوبز کی سب سے مختصر شادی ثابت ہوئی۔ دوستو! اتفاق ہے کہ پاکستان میں شمیم آراء نے بھی ایسی ہی ایک دن کی مختصر ترین شادی اور طلاق کا ریکارڈ قائم کیا۔ یہ شادی انہوں نے ہدایت کار فرید احمد سے کی تھی۔

''پونرملن'' نجم نقوی کی آزادانہ طور پر بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی جو بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم کے عکاس آر ڈی بارنیجا تھے۔ فلم کے ہیرو کشور ساہو نے بعد ازاں بطور کہانی نویس اور بطور ہدایت کار فلمی دنیا میں بڑی ناموری حاصل کی۔ ''پونرملن'' کا یہ گیت ''ناچو ناچو پیارے من کے مور'' بہت مشہور ہوا۔

''پونرملن'' کے بعد بطور ہدایت کار نجم نقوی کی دوسری فلم ''راجا رانی'' تھی مگر یہ فلم بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے نہیں بنی تھی۔ یہ فلم عطرے پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ دراصل ''پونرملن'' کی کامیابی کے بعد نجم نقوی دوسرے اداروں کی فلمیں بھی ڈائریکٹ کرنے لگے تھے۔ ''راجا رانی'' کے ہیرو ترلوک کپور تھے جب کہ ان کے مدمقابل ونمالا نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں مایا دیوی، مظہر خان، سنالی دیوی، ڈیوڈ، نوین پاگنک اور بل گویند شامل تھے۔ نجم نقوی کی یہ فلم بھی عمدہ، خوب صورت، معیاری اور کامیاب فلم تھی۔ اس فلم کے فلم ساز پرنسپل پی کے عطرے تھے جب کہ موسیقی خان مستانہ نے ترتیب دی تھی۔ 1942ء میں ریلیز ہونے والی اس کامیاب فلم کے نغمہ نگار تنویر نقوی تھے۔

1943ء میں نجم نقوی کی زیر ہدایت بننے والی تیسری فلم ''نیا ترانہ'' ریلیز ہوئی۔ ''نیا ترانہ'' نوگیچرا پٹ کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس فلم کی کہانی خواجہ احمد عباس نے تحریر کی تھی جب کہ اس کے مکالمے ولی صاحب نے لکھے تھے۔ نامور موسیقار امیر علی نے اس کی خوب صورت موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں جے راج نے ہیرو کا، سنہا پر بھا پردھان نے ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔ دیگر کاسٹ میں ڈیوڈ، ڈار کشمیری، مسرا، گردھاری، پرتما دیوی، چندریکا، شاردا اور راجا پرانجے شامل تھے۔ اس فلم نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔

عطرے پکچرز کے بینر تلے بننے والی فلم ''تصویر'' ہدایت کار نجم نقوی کی بطور ہدایت کار چوتھی فلم تھی۔ ''تصویر'' اپنی عمدہ کہانی، بہترین ڈائریکشن اور لاجواب اداکاری کی بدولت ہر خاص و عام میں پسند کی گئی اور بے حد کامیاب رہی۔ اس فلم میں موتی لال نے ہیرو کا رول بڑے احسن طریقے سے ادا کیا تھا جب کہ ہیروئن کا کردار سورن لتا نے بڑے خوب صورت انداز میں نبھایا تھا۔ یہ سورن لتا کی بطور

ہیروئن پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ ثانوی کرداروں میں پیش کی جاتی تھیں۔ اس فلم کے موسیقار رام چندر پال اور نغمہ نگار آرزو لکھنوی تھے۔ جن کے گیتوں نے اس وقت دھوم مچادی تھی۔ چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ کس سے کہوں اچھی ہے اک تصویر
☆ کوئی بتلائے کہ پریت کروں کیسے
☆ کھوٹ مٹادے من کے

اس فلم کی دیگر کاسٹ میں درگا کھوٹے، ڈیوڈ، آزوری، نوین یاگنک، دیواسکر اور نانا پلیکر شامل تھے۔ عطرے پکچرز کی یہ فلم بھی 1943ء ہی میں ریلیز ہوئی تھی۔

اور اب ذکر ہدایت کار نجم نقوی کی اس معرکتہ الآرا فلم کا جس نے نجم نقوی کے نام کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ فلم تھی ''پنا'' جس نے پورے برصغیر میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھ دیئے تھے۔ اس شاہکار فلم کی کہانی ولی صاحب کی تحریر کردہ تھی۔ اس کی موسیقی امیر علی نے ترتیب دی تھی جب کہ موسیقار رشید عطرے نے اس فلم کی پس پردہ موسیقی مرتب کی تھی۔ ''پنا'' کے ہیرو جے راج تھے۔ گیتا نظامی ان کی ہیروئن تھیں۔ بقیہ ستاروں میں سم دیش پانڈے، ڈیوڈ، بلراج سہنہ، راجا پرانجے اور مورے شامل تھے۔ نو یگ چترا پٹ لمیٹڈ کے بینر تلے بننے والی اس فلم میں گیتا نظامی نے پنا کا ٹائٹل رول بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ وہ اس فلم میں ایک طوائف کے کردار میں پیش کی گئی تھیں۔ جس کو بعد ازاں ایک قتل کے سلسلے میں کالا پانی کی سزا دی جاتی ہے۔ ''پنا'' کے گیت بھی ولی صاحب نے تحریر کیے تھے جو مقبول بھی ہوئے تھے۔ ان میں چند یہ تھے۔

☆ کالی گھٹا چھائی ہو راجا، کالی گھٹا چھائی (آواز۔ گلوکارہ راج کماری)
☆ جو ہم پہ گزرتی ہے کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے (آواز۔ گلوکارہ راج کماری)
☆ ہر چیز یہاں کی فانی ہے (آواز۔ راج کماری)

1944ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم کے تمام گیت راج کماری نے گائے تھے۔

فلم ''پنا'' کی فقید المثال کامیابی کے بعد نجم نقوی نے ایک تاریخی فلم ''پرتھوی راج سنجوگتا'' کی ڈائریکشن دی۔ یہ فلم شالیمار پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس تاریخی فلم کی کہانی اور اسکرین پلے ڈبلیو زیڈ احمد کے تحریر کردہ تھے۔ فلم ساز ادارہ شالیمار پکچرز بھی ڈبلیو زیڈ احمد کا تھا۔ اس تاریخی فلم کی ہیروئن نینا تھیں جنہیں ڈبلیو زیڈ احمد کی بیگم ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ بعد ازاں وہ ''پراسرار نینا'' کے نام سے مشہور ہوگئیں جب ہدایت کار شوکت ہاشمی نے اپنا ایک ناول اسی نام سے لکھا جس کا مرکزی کردار نینا ہی تھیں۔ پرتھوی راج اس فلم میں نینا کے ہیرو کے روپ میں پیش ہوئے تھے۔ اس تاریخی فلم کے مکالمے اختر الایمان نے تحریر کیے تھے جب کہ اس کے نغمات جوش ملیح آبادی اور اختر الایمان نے لکھے تھے۔ موسیقی ایس کے پال کی ترتیب کردہ تھی۔ اس فلم کے چند گیت بہت مقبول ہوئے۔

☆ بگڑی میری بنادو (آواز۔ ستارہ آف کانپور)
☆ کون بنائے کون سنوارے (آواز۔ ستارہ آف کانپور)

یہ دونوں گیت فلم کی ہیروئن نینا پر عکس بند ہوئے تھے۔ دیگر کاسٹ میں تیواڑی، نیلم، شیاما، بسم اللہ، ایس کے پریم، رام اوتار اور بھرت ویاس شامل تھے۔ بھرت ویاس نے اس فلم میں بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر بھرت ویاس ایک نامور نغمہ نگار تھے جنہوں نے بے شمار فلموں کے لاتعداد خوب صورت نغمات تحریر کیے تھے۔

نجم نقوی کی زیر ہدایت بننے والی یہ ایک عمدہ تاریخی فلم تھی لیکن حسب توقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یہ فلم 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

نجم نقوی کی اگلی فلم ''کرانبر 9'' تھی۔ یہ نو یگ چترا پٹ لمیٹڈ کے بینر تلے بنائی جارہی تھی۔ ''کرانبر 9'' ابھی آدھی سے زیادہ بن چکی تھی کہ کسی بات پر نجم نقوی کا فلم کے پروڈیوسر سے بری طرح جھگڑا ہوگیا جس کے بعد نجم نقوی نے یہ فلم ادھوری ہی چھوڑ دی۔ جسے بعد میں ان ہی کے ایک شاگرد وید ی نے مکمل کیا۔ لہٰذا اس فلم میں ہدایت کاری کے شعبے سے نجم نقوی کا نام کٹ کر دیا گیا اور وید ی کا نام دے دیا گیا۔ اس فلم میں ہیرو کا کردار شیام جب کہ گیتا نظامی نے ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ دیگر کاسٹ میں کے این سنگھ، رندھیر اور سروج بور کر شامل تھے۔ ''کرانبر 9'' کے موسیقار رشید عطرے اور نغمہ نگار نخشب جارچوی تھے۔ یہ فلم 1946ء میں ریلیز ہوئی اور ناکام ثابت ہوئی۔

اگلے برس 1947ء میں نجم نقوی کی فلم ''نتیجہ'' منظر عام پر آئی۔ یہ ایک کامیاب مسلم سوشل فلم تھی جو بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں اداکار یعقوب اور اداکارہ شمیم بانو کی اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ شمیم

بانو نے اس فلم میں ینگ ٹو اولڈ کردار اس خوب صورتی سے ادا کیا تھا جس کی نظیر نہیں ملتی جب کہ اداکار یعقوب نے ایک آوارہ، بدچلن، اوباش اور برے انسان کے روپ میں کامیاب اداکاری کی تھی۔ اس فلم میں وہ شمیم بانو کے شوہر بنے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے اکثر جھگڑا کرتے ہیں۔ یہ روز روز کی تو تو میں میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ایک دن وہ اپنی بیوی اور اپنے کمسن بچے کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں چونکہ اوباش طبیعت کے آدمی تھے اس لیے طوائف کے کوٹھے تک جا پہنچے۔ وقت گزرتا رہا مگر یعقوب اپنی بیوی بچے کے پاس نہیں آئے۔ دوسری طرف ان کی بیوی شمیم بانو مصائب میں گھرے رہنے کے باوجود اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جاتا ہے۔ جب بیٹا جوان ہو جاتا ہے تب اس کا اوباش باپ یعقوب گھر واپس آجاتا ہے اور بیٹے کو بھی برائی کے راستے کا مسافر بنا دیتا ہے جس کا اس کی ماں کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

اس فلم میں شمیم بانو کی کردار نگاری دیدنی تھی۔ اداکارہ ریحانہ نے بھی اس فلم میں طوائف کا کردار احسن طریقے پر ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں مجید، مایا دیوی، سردار محمد، خلیل، رندھیر، رادھیکا اور جلو بائی کی اداکاری بھی اچھی تھی۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی۔ اس کے موسیقار رشید عطرے اور نغمہ نگار تخشب جارچوی تھے۔ اس فلم کے چند گیت بہت مقبول ہوئے۔

☆ بگڑی میری بنا دو اے شاہِ مدینہ (آواز، پاول گھوش۔ فلم بند، شمیم بانو)

☆ انہیں بھی راز الفت کی نہ ہونے دی خبر میں نے (آواز، زہرہ بائی۔ عکسبند، ریحانہ)

☆ چوری چوری بلموا نین ملا میں آ کوئی دیکھے نا (آواز، پارول گھوش۔ فلمبند، ریحانہ)

☆ دعا دے رہے ہیں سزا پانے والے (آواز، پارل گھوش۔ پکچرائزیشن، شمیم بانو)

1947ء میں برصغیر دو آزاد ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ بھارت اور پاکستان دو نئی مملکتیں دنیا کے نقشے میں ابھریں۔ یہ سال پُرآشوب تھا۔ ہر قسم کے کاروبار کے لیے بہت سخت تھا۔ اس دور میں فلم انڈسٹری بھی متاثر ہوئی۔ ہر طرف ایک سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دیگر کاروبار کی طرح فلموں کا کاروبار بھی اچھا نہیں تھا۔ بمبئی میں چونکہ شروع ہی سے فلم انڈسٹری مضبوط بنیادوں پر قائم تھی لہٰذا ایک سال بعد کساد بازاری کا یہ دور ختم ہو گیا اور بمبئی میں بڑی تعداد میں فلمیں بننی شروع ہو گئیں۔ جو فلمیں رکی ہوئی تھیں وہ بھی دوبارہ شروع ہو گئیں۔ نگار خانوں میں ایک بار پھر گہما گہمی شروع ہو گئی۔ اس طرح فلمی کاروبار بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

نجم نقوی تقسیم ہند کے بعد بھی بھارت ہی میں رہے۔ 1947ء میں ریلیز ہونے والی ان کی فلم ''نتیجہ'' جو ایک مسلم سوشل فلم تھی، کافی کامیاب رہی۔ 1948ء میں ان کی زیر ہدایت بننے والی فلم ''ایکٹریس'' تھی۔ یہ فلمستان لمیٹڈ کے بینر تلے بنی تھی۔ اس فلم کی کاسٹ میں مینا شوری، مسرا، پریم ادیب، قیصری، زیدی، عباس ڈیوڈ، جمال امروہوی اور ریحانہ شامل تھیں۔ اداکارہ ریحانہ نے اس فلم کا ٹائٹل رول ادا کیا تھا۔ یہ کردار انہوں نے بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا اور اسے شائقین فلم سے ڈھیروں داد ملی تھی۔ اس فلم کی مسحور کن موسیقی شیام سندر جب کہ تین نغمہ نگاروں راجا مہدی علی خان، تخشب جارچوی اور پی ایل سنتوش نے گیت لکھے تھے۔ اس کے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ ہم اپنے دل کا افسانہ انہیں سنا نہ سکے (آواز، محمد رفیع)

☆ آنکھوں آنکھوں میں وہ دل سے دل کی باتیں کہہ گئے (آواز، شمشاد بیگم)

یہ ہدایت کار نجم نقوی کی ایک کامیاب فلم تھی جس کی موسیقی نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ اس کے گانے بھی ہٹ ہوئے۔

''ایکسپریس'' جیسی کامیاب فلم کے بعد ان کی اگلی فلم ''پرائی آگ'' تھی جو 1948ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی۔ اس فلم کے گیتوں نے بڑی دھوم مچائی خاص کر اس گیت نے ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' جسے نجم نقوی ہی نے لکھا تھا بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس گیت کو ''پرائی آگ'' کے لیے گلوکارہ حمیدہ بانو نے گایا تھا۔ یہی گیت تنویر نقوی نے پاکستان میں بننے والی فلم ''عذرا'' کے لیے دوبارہ لکھا جسے ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا اور امر کر دیا۔ ''عذرا'' میں یہ گیت اداکارہ نیلو پر فلمایا گیا تھا۔ ''عذرا'' کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور ''پرائی آگ'' کے موسیقار ماسٹر غلام محمد تھے۔ واضح رہے کہ پرائی آگ کے نغمہ نگاروں میں تنویر نقوی اور اختر الایمان شامل تھے۔ تذکرہ گیت کو بعد ازاں نامور فلم ساز و ہدایت کار راج کھوسلہ نے اپنی کامیاب فلم ''پریم

کہانی'' میں بھی شامل کیا جسے اداکارہ ممتاز اور سپر اسٹار راجیش کھنہ پر پکچرائز کیا گیا۔ ''پرانی آگ'' کا یہ گیت بھی کافی پسند کیا گیا۔

''من گیت سہانے گائے۔ کیوں سمجھ میں کچھ نہ آئے۔''

یہ گیت زہرہ بائی کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔ نجم نقوی کی یہ سوشل فلم بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم میں اداکار الماس نے ہیرو کا اور منور سلطانہ نے ہیروئن کے طور پر کام کیا تھا مگر اس فلم میں مدھو بالا کی اداکاری بھی قابلِ دید تھی۔ دیگر کاسٹ میں جلو بائی، ڈبلیو ایم خان، اے شاہ شکار پوری اور خلیل شامل تھے۔ 1948ء میں ریلیز ہونے والی یہ نجم نقوی کی ایک معیاری اور کامیاب فلم تھی۔

نجم نقوی نے فلمی دنیا میں ایک طویل عرصہ گزارا۔ انہوں نے فلم سازی کی تیکنیک سیکھی اور اس میں طاق ہونے کے بعد ہدایت کاری شروع کی۔ فلمی ماحول میں رہنے کے باوجود انہوں نے کبھی کوئی غیر اخلاقی کام نہیں کیا۔ ان کا کوئی اسکینڈل کبھی سامنے نہیں آیا ان کا گھرانا دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ کوئی امریکا میں ہے کوئی بھارت میں کوئی پاکستان میں لیکن ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے کیونکہ نجم نقوی یہ حدیث مبارکہ پڑھتے رہتے تھے۔

''لوگوں سے رشتہ جوڑ کے رکھنے والا، ان کی توقیر کرنے والا جنت میں نبیؐ کے ساتھ ساتھ ہوگا۔''

شاید یہی حدیث وہ اپنے اہل خانہ کو بھی بتاتے رہے ہوں گے۔ جبھی دور دور رہنے کے باوجود ان کے اہلِ خانہ ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بہانے جڑے رہے ہیں۔

1949ء میں نجم نقوی کی کوئی فلم نہیں آئی۔

1950ء میں ان کی فلم ''نردوش'' سنیماؤں کی زینت بنی۔ یہ فلستان کے بینر تلے بنی تھی۔ اس کی موسیقی شیام سندر نے ترتیب دی تھی اس کی کاسٹ میں شیام، ریحانہ، کلدیپ کور، مسرا، کے این سنگھ، مقری، ایس ایل پوری، ایس ایم عباس اور اوم پرکاش شامل تھے۔ یہ فلم اوسط درجے کا بزنس کر سکی تھی۔

نجم نقوی محض ایک فلمی مصنف اور ہدایت کار ہی نہیں تھے بلکہ وہ فلم انڈسٹری کے حوالے سے سماج سدھارک کا کردار بھی احسن طریقے پر ادا کرتے تھے۔ وہ ایسی عہد ساز شخصیت تھے جنہوں نے فلموں کے لیے بامقصد کہانیاں لکھ کر اور فلمیں بنا کر یہ ثابت کیا کہ فلموں کے ذریعے بھی قوم کی تعمیر کا کام کیا جا سکتا ہے۔ بقول ان کے فلم ان کا عشق ہی نہیں عبادت بھی تھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا منفرد کیا۔

1951ء میں بھی ان کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔

1952ء میں انہوں نے دو کہانی نویسوں کی لکھی کہانی سے متاثر ہو کر فلم ''شرمیلی'' بنائی۔ یہ کہانی نویس وشرام بھٹ کر اور ایندر راج آنند تھے جب کہ مکالمے اختر الایمان نے لکھے تھے۔ ''شرمیلی'' کے ہیرو راج کمار اور ہیروئن ریحانہ تھیں۔ دیگر کاسٹ میں لیلیٰ، یعقوب، مسرا، ایس نذیر، بالم، بے بی شیلا، سریندر، چندا بائی، ککو اور ای تارا پور شامل تھے۔ گیت راجا مہدی علی خان نے لکھے تھے۔ موسیقی چک چاکلیٹ نامی موسیقار نے ترتیب دی تھی۔ نجم نقوی کی ہدایات میں بننے والی یہ فلم ''شرمیلی'' بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ یہ 1952ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اگلا سال 1953ء نجم نقوی کی فلموں سے محروم رہا۔ 1954ء میں ان کی ایک فلم ''سمراٹ'' عام نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ یہ فلستان کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اجیت اور ریحانہ نے ہیرو اور ہیروئن کے کردار کیے تھے۔ دیگر کاسٹ میں رام سنگھ، سپرو، ممتاز علی، رندھیر، ایس ایل پوری۔ کملیش کماری اور اشوک کمار شامل تھے۔ یہ ایک ملبوساتی (کاسٹیوم) فلم تھی۔ ہمنیت کمار نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ یہ ایک عمدہ اور اچھی فلم تھی۔ اس فلم نے درمیانے درجے کا بزنس کیا تھا۔ یہی فلم (سمراٹ) انڈیا میں نجم نقوی کی آخری فلم تھی۔

1954-55ء میں انڈین سنسر بورڈ ہندوانہ تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کا شکار ہوئی تو مسلمان فنکاروں اور ہنرمندوں کے لیے وہاں کی فضا مسموم ہوگئی اور بہت سے مسلمان جو بمبئی فلم انڈسٹری سے منسلک تھے دل برداشتہ ہو کر پاکستان آ گئے۔ ان میں ہدایت کار نجم نقوی بھی تھے۔ پاکستان آ کر انہوں نے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ نجم نقوی کا نام اور کام پاکستان میں بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ کراچی کے اسٹیرن اسٹوڈیو کے مالک اور فلم ساز سعید اے ہارون نے انہیں اپنے ادارے کے لیے فلم بنانے کی دعوت دی۔ جسے قبول کرنے کے بعد ''کنواری بیوہ'' کے نام سے فلم شروع کر دی۔

''کنواری بیوہ'' نجم نقوی کی پاکستان میں پہلی اور شمیم آراء کے کیریئر کی پہلی فلم تھی۔ فلم کی کہانی کی مطابقت کے لحاظ سے ہیروئن کی تلاش شروع ہوئی تو کراچی کی فلمی اداکاراؤں میں کوئی کہانی کے کردار پر پوری نہیں اتری۔

تلاش بسیار کے بعد ایک لڑکی چکی بائی انہیں ملی جسے اس فلم کی ہیروئن کے طور پر پیش کر کے انہوں نے اسے شمیم آراء کا نام دیا۔ ان کے مقابل اس فلم کے ہیرو ایاز (سینئر) تھے۔ اس فلم کے موسیقار قادر فریدی اور فتح علی خان تھے جب کہ نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری اور فیاض ہاشمی تھے۔ اس کے چند گیت یہ تھے۔

☆ موری بگیا میں لاگے انار ہو راجا (آواز: عنایت حسین بھٹی۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ ہر رات پوچھتے ہیں یہ چاند یہ ستارے (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ میں بھی جوان ہوں دل بھی جوان ہے (آواز: نظیر بیگم۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ کوئی صورت نہیں اے دل کہ غم کی رات (آوازیں: مہدی حسن، کوثر پروین۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ تم ملے زندگی مسکرانے لگی (آوازیں: کوثر پروین، مہدی حسن۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ گوری گھونگھٹ کی اوٹ مسکائے (آوازیں: احمد رشدی، مدھو الماس۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ اے دل ذرا بتا اشک بہاؤں کہ نہیں (آوازیں: زبیدہ خانم۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ آنکھوں میں چلے آؤ ہم دل میں چھپا لیں گے (آوازیں: کوثر پروین، مہدی حسن۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

''کنواری بیوہ'' سندھ سرکٹ میں بمشکل دو ہفتے چلی جب کہ پنجاب سرکٹ میں ریلیز ہی نہ ہو سکی۔ اس بری طرح ناکامی کی بنیادی وجہ نئی کاسٹ، نئی ہیروئن اور نئے موسیقار قرار دی گئی۔ اس فلم کی تاریخ نمائش 1956ء تھی۔

نجم نقوی کو کراچی کی فلم انڈسٹری راس نہ آئی تو وہ لاہور شفٹ ہو گئے۔ لاہور گئے تو ایورنیو اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل نے انہیں اپنی فلم بنانے کی دعوت دی، لاہور پہنچ کر نجم نقوی نے پہلی فلم ''نغمہ دل'' کی ہدایات دیں۔ سنتوش کمار اس فلم کے ہیرو اور صبیحہ خانم ہیروئن تھیں۔ موسیقی بابا جی اے چشتی اور نغمات طفیل ہوشیار پوری نے تحریر کیے تھے۔ نغمہ دل میں الیاس کاشمیری اور آشا پوسلے نے بھی اہم کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم 1959ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کا ایک نغمہ احمد راہی نے بھی تحریر کیا تھا جو یہ ہے۔

☆ خوا آجا میرے دل کا ہے خالی مکان

باقی گیت طفیل ہوشیار پوری کے تھے۔

☆ ان کے کرم کا فسانہ سنانے آئے ہیں (آواز: سلیم رضا)

☆ تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے (آوازیں: زبیدہ خانم، منیر حسین)

☆ اس دل کو دل میں رکھنا۔ دل لے کے جانے والے (آواز: منیر حسین)

☆ شہر کے لالہ وگی جانِ من جانِ من (آوازیں: زبیدہ خانم اور ساتھی)

☆ جاگ سوز عشق جاگ موسم بہار ہے (آواز: منیر حسین)

☆ تمہاری قسم تم پہ دل آ گیا (آوازیں: سلیم رضا، اقبال بانو)

☆ اس کا نام قسمت ہے ہزاروں غم اکیلے (آواز: اقبال بانو)

1960ء میں ہدایت کار نجم نقوی کی نئی فلم ''دل نادان'' ریلیز ہوئی جو ایم آر پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے فلم ساز رحمان میاں تھے۔ موسیقی جی اے چشتی کی تھی۔ کمال ہیرو اور مسرت نذیر ہیروئن تھیں جب کہ شاہنواز اور الیاس گل بھی کاسٹ میں شامل تھے۔ گیت طفیل ہوشیار پوری اور احمد راہی نے لکھے تھے۔ اس فلم نے درمیانے درجے کا بزنس کیا تھا۔ اس کے چند گیت

☆ دولت کے گن گانے والو۔ دل جو نہیں تو کچھ بھی نہیں (آواز: سلیم رضا۔ بول: احمد راہی)

☆ کیسا ہے جہاں ملتے ہیں یہاں۔ خوشیوں کے بدلے غم (آواز: ناہید نیازی۔ بول: احمد راہی)

☆ جی چاہتا ہے دل میں کسی کو بسا لیں ہم (آوازیں: ناہید نیازی، منیر حسین۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

نجم نقوی کی 1962ء میں دو فلمیں منظر عام پر آئیں۔ پہلی فلم ''قیدی'' اور دوسری ''ایک منزل دو راہیں'' تھی۔ ''قیدی'' ایورنیو پکچرز کے بینر تلے بنی تھی۔ آغا جی اے گل اس کے پروڈیوسر تھے۔ اس کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی تھی۔ درپن ہیرو اور شمیم آراء ہیروئن تھیں۔ ''قیدی'' 15 جون 1962ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ یہ ایک

کامیاب فلم تھی۔ اس کے گیت تنویر نقوی، احمد راہی، حبیب جالب، قتیل شفائی، فیض احمد فیض، مظفر وارثی اور نخشب جار چوی نے لکھے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ فلم برصغیر پاک و ہند کے مشہور فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار کی شہرۂ آفاق کامیاب فلم ''باغبان'' کاری میک تھی۔ اس فلم میں فیض احمد فیض کی مشہور زمانہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کو شامل کیا گیا تھا۔ اسے نور جہاں نے گا کر امر کر دیا تھا۔ دیگر نغمات میں سے چند یہ تھے۔

☆ کسی کی محبت میں ہم کھو گئے ہیں (آواز: نور جہاں۔ بول: مظفر وارثی)

☆ میرے دل کی انجمن میں تیرے دم سے روشنی ہے (آواز: سلیم رضا۔ بول: حبیب جالب)

☆ آ سامنے کہ طالب دیدار آ گئے (آواز: سلیم رضا۔ بول: تنویر نقوی)

☆ یاد کر کے ساری ساری رات (آواز: نور جہاں۔ بول: احمد راہی)

☆ سن سانولی صورت والے۔ اک پیار بھرا افسانہ (آواز: نسیم بیگم۔ بول: نخشب جار چوی)

☆ ایک دیوانے کا اس دل نے کہا مان لیا (آوازیں: نور جہاں، مہدی حسن۔ بول: قتیل شفائی)

اس سال نجم نقوی کی ریلیز ہونے والی دوسری فلم ''ایک منزل دو راہیں'' تھی۔ اس کی کاسٹ میں مسرت نذیر، اسلم پرویز، پنا، حسنہ اور ساقی شامل تھے۔ موسیقی رشید عطرے کی تھی۔ اس فلم کے نغمہ نگاروں میں قتیل شفائی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور جلیل مانک پوری شامل تھے۔ اس کے گیت

☆ محبت کی سزا پائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے در سے ٹھکرائے ہوئے ہیں (آواز: نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ آہوں کے نغمے اشکوں کے تارے (آواز: نسیم بیگم۔ بول: صوفی تبسم)

☆ پی کے ہم تم جو چلے جھومتے مے خانے سے (آواز: اقبال بانو۔ بول: جلیل مانک پوری)

☆ کبھو جی نگاہیں چرا تو نہ لو گے۔ تم اپنی محبت گھٹا تو نہ دو گے (آواز: نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

اس فلم میں ڈانسر پنا (زرین سلیمان) نے بھی کام کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ نجم نقوی میرے گرو تھے۔ وہ بڑی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے ساتھ چند فلموں میں کام کیا ہے۔ ہدایت کاری کرتے وقت وہ بڑے رعب دار ہدایت کار کا رول ادا کیا کرتے تھے۔ ڈانٹتے بھی تھے اور جھڑکتے بھی تھے۔ وہ کہتے تھے ڈانس کے ساتھ چہرے کے تاثرات بھی ہونے چاہئیں۔ ان کی ڈانٹ اور جھڑکیوں نے ہمیں کچھ بنا دیا۔ آج ہم جو بھی ہیں ان کی محبت سے ہیں۔ ایک منزل دو راہیں 1962ء میں ریلیز ہوئی مگر کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

1963ء میں نجم نقوی کی ایک کامیاب فلم ''اک تیرا سہارا'' سینماؤں کی زینت بنی۔ ان کی اس فلم کے فلم ساز آغا جی اے گل تھے۔ اس کے ہیرو درپن اور ہیروئن شمیم آراء تھیں۔ یہ شمیم آراء کی نجم نقوی کے ساتھ تیسری فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ ''کنواری بیوہ'' اور ''قیدی'' میں کام کر چکی تھیں۔ اس فلم کے گیت قتیل شفائی اور حمایت علی شاعر نے لکھے تھے۔ موسیقی ماسٹر عنایت حسین نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم اپنی مدھر موسیقی اور لاجواب اداکاری کے سبب کافی پسند کی گئی تھی۔ اس فلم کا ایک ڈوئیٹ سانگ بہت مقبول ہوا تھا۔ ''بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند کیوں'' جسے قتیل شفائی نے تحریر کیا تھا۔ اسے بھارتی فلم ساز و ہدایت کار مہیش بھٹ نے اپنی فلم ''پھر تیری کہانی یاد آئی'' میں شامل کیا تھا۔ آغا جی اے گل کی اس فلم میں درپن اور شمیم آراء کے علاوہ رانی، اسد جعفری اور سلطان راہی نے بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ اے دل کسی کی یاد میں۔ ہوتا ہے بے قرار کیوں (آواز: سلیم رضا۔ بول: قتیل شفائی)

☆ بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند کیوں (آواز نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ گھنگھور گھٹا پھر چھائی ہے۔ پھر یاد کسی کی آئی ہے (آواز: نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ اپنے پرچم تلے ہم سپاہی چلے (آوازیں: مالا، آئرن پروین، سلیم رضا اور ساتھی۔ بول: حمایت علی شاعر)

☆ آنکھوں میں آنسوؤں کی روانی لیے ہوئے (آواز: سلیم رضا۔ بول: قتیل شفائی)

☆ سنبھالا ہے میں نے بہت اپنے دل کو (آوازیں: سلیم رضا، نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ تقدیر کے طوفان سے تجھے (آوازیں: مالا، آئرن پروین، سلیم رضا۔ بول: قتیل شفائی)

اب ذکر ہدایت کار نجم نقوی کی آخری فلم ''پائل کی جھنکار'' کا۔ اس فلم کی کہانی بھی نجم نقوی نے خود ہی لکھی تھی۔ دراصل یہ ان کی انڈیا میں بنائی گئی فلم ''ایکسپریس'' کا ری میک تھی۔ ''پائل کی جھنکار'' کے فلم ساز آغا جی اے گل تھے جو بھارتی فلموں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ نجم نقوی نے ان کو ''ایکسپریس'' کی کہانی سنائی تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے نجم نقوی سے اس فلم کو دوبارہ بنانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اس کہانی پر مبنی فلم ''پائل کی جھنکار'' وجود میں آئی۔ جب یہ فلم مکمل ہوگئی تو سنسر بورڈ نے اس فلم کو نمائش کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ اس پر چربہ سازی اور فحش رقص فلمانے کا الزام لگایا۔ سنسر بورڈ کا موقف تھا کہ یہ بھارتی فلم کا چربہ ہے۔ ''پائل کی جھنکار'' پہلی فلم تھی جس کو سنسر بورڈ نے بھارتی فلم کا چربہ ہونے کی وجہ سے نمائش کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اگرچہ نجم نقوی نے بتایا کہ یہ فلم میری اپنی ہی فلم ''ایکسپریس'' کی کہانی پر میں نے دوبارہ بنائی ہے۔ بہرحال کافی لے دے کر سنسر بورڈ نے اس فلم کو نمائش کی اجازت دی اور اسے ''جھنکار'' کے نام سے ریلیز کیا گیا۔ یہ فلم مکمل طور پر میوزیکل تھی۔ اس کے تقریباً تمام ہی گانے ہٹ ہوئے۔

نیلو اس فلم کی ہیروئن اور درپن ہیرو تھے۔ بقیہ اداکاروں میں اسلم پرویز، فریدہ، اسد جعفری، دیبا، نذر، فضل حق، شیخ اقبال اور طالش شامل تھے۔ رشید عطرے اس فلم کے موسیقار اور فیاض شفائی نغمہ نگار تھے۔ نبی احمد نے بڑی خوب صورت عکاسی کی تھی۔ اس فلم نے متوقع طور پر کامیابی حاصل کی تھی۔ 1966ء میں یہ فلم سینماؤں کی زینت بنی تھی۔ اس کے کچھ سپرہٹ نغمات یہ تھے۔

☆ حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں۔ ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں (آواز: سلیم رضا)

☆ میرے دل کے مسافر خانے میں مہمان کبھی تو (آوازیں: مالا، نسیم بیگم)

☆ ہم نے تو تمہیں دل دے ہی دیا (آوازیں: سلیم رضا، نسیم بیگم)

☆ میرے دل کے تار بجے بار بار (آوازیں: مہدی حسن، نسیم بیگم)

☆ میں تو لٹ گئی اناڑی کے ہاتھ رے (آواز: نسیم بیگم)

برصغیر ہندو پاکستان کے یہ نامور فلمی مصنف اور ہدایت کار اپنی زندگی کا کامیاب سفر طے کرتے ہوئے جب عمر عزیز کے 72 ویں سال میں پہنچے تو ان کا سفر زیست تمام ہوگیا۔ چند روز کی علالت کے بعد 23 جنوری 1982ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اس موقع پر پاکستانی فلمی صنعت و تجارت سے وابستہ افراد نے بھرپور انداز میں ٹریبوٹ پیش کیا تھا مگر یہ بات بڑی دلچسپ اور عجیب ہے کہ 2015ء میں ان کے بچھڑنے کے 33 برس بعد ان کی یاد میں عظیم الشان تقریب پذیرائی 29 اگست 2015ء میں لاہور کے الحمرا ہال میں سجائی گئی جس کی صدارت پنجاب آرٹس کونسل کے بورڈ آف گورننگ کے چیئرمین اور نامور ڈراما رائٹر عطاء الحق قاسمی صاحب نے کی۔ اس تقریب میں نہ صرف فلم انڈسٹری کی نمایاں شخصیتوں، موسیقار وجاہت عطرے، مصنف فلم ساز و ہدایت کار پرویز کلیم، اداکارہ و رقاصہ پنا بیگم (زرین سلیمان)، گلوکار انور رفیع، اداکار اختر شاد اور سرور بھٹی نے شرکت کی بلکہ اعلیٰ سرکاری عہدیداروں آرٹس کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیپٹن عطا محمد خان، ڈپٹی ڈائریکٹر ذوالفقار علی زلفی، بریگیڈیئر عمران رضا، ڈائریکٹر شہلا نقوی کے علاوہ نامور مذہبی اسکالر سید بلال قطب نے بھی شریک ہوکر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ دیگر شرکاء میں ریکارڈ کلیکٹر اور ''پاکستانی اردو فلمی گیتوں کا سفر'' کے مصنف جناب فیاض احمد اشعر، ماہنامہ ایکسٹرا کور شارٹ کے چیف ایڈیٹر مقصود احمد خان، نجم نقوی کے فرزند مسرت حسنین نقوی قابل ذکر ہیں۔ اس تقریب کی کمپیئرنگ معروف فلم جرنلسٹ شکیل زاہد نے کی تھی۔

آج سے چار سال پہلے اس تقریب کے انعقاد کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ نجم نقوی ہم تمہیں اب تک نہیں بھولے ہیں اور نہ ہی آنے والے دنوں میں بھولیں گے۔

☆......☆

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستانی فلمی صنعت کو ایسے فنکار اور تخلیق کار ملے جنہوں نے اسے پروان چڑھانے میں کلیدی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اداکار و ہدایت کار نذیر بھی تھے جن کی کوششوں اور کاوشوں سے پاکستان کی نوزائیدہ فلمی صنعت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ آج کی نئی نسل نذیر صاحب کے بارے میں بہت کم جانتی ہے جو لوگ ان کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں وہ ان کی پاکستانی فلمیں، پھیرے، لارے، ماشہری بابو کے

حوالے ہی سے جانتے ہیں کہ وہ ان فلموں کے تخلیق کار ہیں۔ آج جب کہ میں لی جنڈ ہدایت کاروں کے بارے میں معلومات دے رہا ہوں تو نذیر صاحب کے متعلق بھی آپ کو بہت سی بھولی بسری باتیں بتاؤں گا۔

نذیر صاحب بھی نجم نقوی کی طرح پاکستان آنے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں تھے جہاں انہوں نے اپنی اداکارانہ اور ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے اپنی شہرت اور مقبولیت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ 1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور وہ بمبئی میں اپنا بھریا میلہ چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ جان بچا کر وہ اپنی شریکِ حیات سورن لتا کے ساتھ یوں بھاگے تھے کہ ان کے پاس صرف تن کے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے پاس یہاں پاکستان میں صرف ایک قطعہ زمین تھی جو انہوں نے قیام پاکستان سے بہت پہلے خریدی تھی مگر یہ جگہ لاہور کے اس مقام پر تھی جہاں اس زمانے میں چاروں طرف کھیت کھلیان تھے اور یہ آبادی سے بہت دور تھی۔ اس موقع پر ان کے بھانجے باری ملک نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ یہ باری ملک وہی تھے جنہوں نے بعد میں باری اسٹوڈیو بنایا اور کئی کامیاب فلمیں پروڈیوس کیں۔

جب حالات بہتر ہوئے اور بمبئی میں امن و امان قائم ہوا تو سورن لتا بمبئی گئیں اور فلم سازوں سے اپنے بقایا جات وصول کیے۔ یاد رہے کہ جب سورن لتا بمبئی سے ہجرت کر کے پاکستان آئی تھیں اس دور میں وہ بمبئی فلم انڈسٹری کی صفِ اوّل کی فنکارہ تھیں۔ وہاں کے فلم سازوں سے انہوں نے جو بقایا جات وصول کیے وہ کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب تھے۔ اس زمانے میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم بہت بڑی ہوا کرتی تھی۔ اس رقم سے دونوں میاں بیوی نے نئے سرے سے لاہور میں زندگی کا آغاز کیا۔ گھر کا ساز و سامان خریدا اور فلم سازی کا آغاز کیا۔ ایور نیو اسٹوڈیو کرائے پر حاصل کیا اور پہلا کیمرا یونٹ منگوایا اور فلم سازی شروع کر دی۔ سب سے پہلے پنجاب کی مشہور رومانی داستان ہیر رانجھا کو ''عشقِ پنجاب'' کے نام سے فلمایا۔ یہ فلم انہوں نے اپنے بھانجے باری ملک کے اشتراک سے بنائی مگر کاروباری تنازعہ کی وجہ سے مکمل ہونے کے باوجود یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی، پھر 1949ء میں فلم ''سچائی'' بنائی جو بہت کامیاب ہوئی۔ اس کی ڈائریکشن نذیر صاحب نے خود دی تھی اور سورن لتا کے ساتھ مرکزی کردار بھی ادا کیا تھا۔

☆.....☆

دوستو! لاہور، جس کے بارے میں آپ نے بارہا سنا ہو گا۔ ''لاہور..... لاہور ہے۔'' یعنی بے شمار خوبیوں کا شہر ہے۔ اسی لاہور کا ایک محلہ بھاٹی گیٹ اس لحاظ سے منفرد مقام کی حیثیت کا حامل ہے کہ یہاں سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان میں فلموں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی شامل تھے جن میں سب سے اہم نام برصغیر کے نامور فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار کا تھا۔ اس کے بعد ہدایت کار ایم صادق، گلوکار محمد رفیع، کیریکٹر ایکٹر ایم اے اسماعیل کا نام آتا ہے جنہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ اداکار فلم ساز و ہدایت کار نذیر کا بھی تعلق اسی محلے سے تھا۔ نذیر اسی محلے میں 1913ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان ککے زئی برادری سے تعلق رکھتا ہے۔

نذیر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کپڑے فروخت کرنے کے کاروبار سے کیا تھا مگر ان کے دل میں اداکار بننے کی آرزو تھی۔ یاد رہے کہ یہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ ایم اسماعیل اور میاں کاردار نذیر کے پڑوسی تھے۔ ان کی معاونت سے انہوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ نذیر کو قدرت نے دلکش خدوخال، مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ خوب صورت قد کاٹھ بھی دیا تھا۔ سب سے بڑھ کر ان کے چہرے پر تلوار کٹ مونچھیں بڑی غضب کی تھیں۔ جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں مکالموں کی ادائیگی کا منفرد اسٹائل بھی قدرت نے انہیں عطا کیا تھا۔ ان سب باتوں نے ان کو ایک کامیاب اداکار بنا دیا تھا۔

اے آر کاردار نے جب 1929ء میں لاہور میں یونائیٹڈ پلیئرز کارپوریشن کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا اور اپنی پہلی فلم ''حسن کا ڈاکو'' بنائی تو لاہور شہر میں فلمی دنیا کی بنیاد پڑ گئی۔ کاردار نے جب اگلے سال 1930ء میں اپنی اگلی فلم ''سرفروش'' بنائی جس کا انگریزی نام ''بریو ہارٹ'' رکھا تھا۔ اس فلم میں بطور ایک ثانوی اداکار کے نذیر کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ یہ نذیر کی پہلی فلم تھی جو کافی پسند کی گئی تھی۔ یہ خاموش فلم تھی۔ ان دونوں فلموں کے بعد کاردار نے جو تیسری فلم بنائی اس کا نام ''مسٹریس بینڈٹ'' تھا۔ کاردار نے اپنی اس فلم میں نذیر کو بطور ہیرو چانس دیا تھا جب کہ اس فلم میں ان کی ہیروئن گلزار بیگم تھی مگر

چند وجوہ کی بنا پر یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہو سکی اور یوں نذیر صاحب کی بدقسمتی کہ ہیرو بننے کے ارمان ان کے دل ہی میں رہ گئے۔ اس فلم کے بعد اے آر کاردار نے اپنا فلم ساز ادارہ بھی بند کر دیا۔ اب بولتی فلموں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ 1931ء میں بمبئی میں سب سے پہلے بولتی فلم ''عالم آرا'' بنی جس کی کامیابی نے تہلکہ مچا دیا۔ تصویروں کا بولنا لوگوں کو بڑا عجیب لگا۔ ''عالم آرا'' کی فقید المثال کامیابی سے متاثر ہو کر اے آر کاردار نے لاہور میں ایک بار پھر نئے سرے سے فلم سازی کا آغاز کر دیا اور لاہور میں سب سے پہلے بولتی فلم ''ہیر رانجھا'' شروع کی جس میں رفیق غزنوی اور انوری بیگم کو مرکزی کرداروں میں پیش کیا۔ واضح رہے کہ یہ دونوں آج کے دور کی مشہور گلوکارہ سلمٰی آغا کے نانا نانی تھے۔ اس فلم میں نذیر نے بھی ایک مختصر کردار کیا تھا لیکن یہ فلم کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی تھی۔

1932ء میں نذیر بمبئی چلے گئے کیونکہ بمبئی شروع ہی سے فلموں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بمبئی پہنچنے کے بعد نذیر پیرا ماؤنٹ پکچر کی ایک خاموش فلم ''راجپوتانہ کا شہر'' میں بطور اداکار کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر صد افسوس کہ ان کی یہ فلم کامیابی حاصل نہ کر سکی مگر وہ مایوس نہیں ہوئے بعد ازاں انہوں نے مزید تین چار خاموش فلموں میں کام کیا۔ اب زمانہ بدل رہا تھا۔ خاموش فلموں کی جگہ بولتی فلموں نے لے لی تھیں۔

1933ء میں نذیر بمبئی سے کلکتے چلے گئے۔ کلکتہ میں بمبئی کے بعد سب سے زیادہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔ یہ اچھا خاصہ فلمی مرکز تھا۔ میاں کاردار بھی لاہور سے کلکتہ چلے آئے تھے اور انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کمپنی کی ایک فلم ''آب حیات'' میں انہوں نے نذیر کو بطور ہیرو کاسٹ کیا جب کہ کاردار نے خود ولن کا کردار ادا کیا تھا جو بڑا پسند کیا گیا۔ بعد ازاں کاردار کی زیر ہدایت بننے والی چند اور فلموں میں نذیر نے کیریکٹر رول ادا کیے پھر یوں ہوا کہ 1934ء میں نذیر بمبئی واپس چلے گئے۔ اب یہاں ان کے لیے حالات کافی بدل چکے تھے۔ فلموں میں کام کرنے کا انہیں کافی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے فلمی دنیا میں اپنی ساکھ بنانے کے لیے اچھے اور مستند فلم سازوں کی فلموں میں ہی کام کرنے کا فیصلہ کیا اس کوشش میں ان کی پہلی فلم ہدایت کار چودھری محمد رفیع کی زیر ہدایت بننے والی فلم کا نام بھی اتفاق سے ''حسن کا ڈاکو'' تھا۔ نذیر کی لاہور

زندگی نامہ

نام: نذیر

ولادت: بھاٹی گیٹ، لاہور

پہلی فلم: سرفروش 1930ء۔ یہ خاموش فلم تھی۔

پہلی فلم بطور ہیرو: مسٹریس بینڈیٹ۔ یہ بھی لاہور میں کاردار کی زیر ہدایت بنی تھی۔

بمبئی کا سفر 1932ء میں بمبئی کی خاموش فلم ''راجپوتانہ کا شہر'' میں کام کیا۔

کلکتے کا سفر 1933ء میں بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔

بمبئی واپسی 1934ء میں بمبئی واپس آ گئے اور ''حسن کا ڈاکو'' میں ہیرو کا کردار کیا۔

ذاتی فلمیں: 1942ء میں دو ذاتی فلمیں بنائیں۔ دونوں فلموں کے ہیرو اور ہدایت کار وہ خود تھے۔

شادی: تین شادیاں کیں۔ پہلی برادری میں سکینہ رانا نامی لڑکی سے کی۔ دوسری اداکارہ ستارہ سے کی۔ تیسری اداکارہ سورن لتا سے۔

اولاد: پہلی بیوی سے ایک بیٹی شرما اور ایک بیٹا افضل نذیر۔

عروج کا دور: بمبئی میں بطور ہیرو بطور فلم ساز و ہدایت کار زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔

آخری فلم: ''عظمت اسلام'' بطور ہدائیت کار نذیر صاحب کی آخری فلم تھی۔

اداکاری، ہدایت کاری 1930ء سے 1955ء تک بطور ہیرو کامیاب اداکاری کی۔ بمبئی اور لاہور میں متعدد کامیاب فلموں کی ہدایت کاری کی۔

اعزاز: انہیں پاکستانی فلموں کے اوّلین معماروں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے الیاس کشمیری، شاد، نعیم ہاشمی اور موسیقار صفدر حسین کو فلمی صنعت سے متعارف کرایا۔

انتقال: دمے کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر 26 اگست 1983ء میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر 69 سال تھی۔

میں بننے والی کاروار کی پہلی فلم کا نام بھی ''حسن کا ڈاکو'' تھا۔ چودھری محمد رفیع کی فلم ''حسن کا ڈاکو'' میں نذیر ہیرو کے کردار میں پیش کیے گئے تھے۔ ان کی ہیروئن زہرہ بائی تھی۔ یہ فلم 1935ء میں ریلیز ہوئی تھی اور کاروباری طور پر اوسط درجے کی ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم کی نمائش کے بعد نذیر کو ایک مستند ہیرو تسلیم کرلیا گیا تھا۔

نذیر صاحب کی اس وقت کی اس جدوجہد سے میرے نوجوان پڑھنے والوں کو یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے بڑی تگ و دو کی ضرورت پڑتی ہے۔ چھپر پھاڑ کر بہت کم لوگوں کو عزت، شہرت اور دولت ملتی ہے۔ نذیر صاحب برے سے برے وقت میں بھی ہمت نہیں ہارے۔ محنت سے جان نہیں چرائی۔ اپنی کوشش جاری رکھی۔ بعض اوقات اللہ رب العزت اپنے بندوں کا امتحان بھی لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کی لگن کتنی سچی ہے؟ جو آزمائش کے دور میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔ کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔

1942ء میں نذیر صاحب نے دو ذاتی فلمیں بنائیں۔ دونوں فلموں کے ہیرو نذیر خود تھے۔ ان کی ہیروئن ستارہ تھی۔ دونوں فلموں کی ہدایات بھی انہوں نے خود دی تھیں۔ رفیق غزنوی دونوں فلموں کے موسیقار تھے۔ دونوں فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور ان کے مالی حالات اچھے ہو گئے۔ اس سے اگلے برس انہوں نے تین فلمیں پروڈیوس کیں۔ 1943ء میں بنائی جانے والی ان کی فلمیں ''آبرو، سلمیٰ اور چھیڑ چھاڑ'' تھیں۔ ''چھیڑ چھاڑ'' کی ہدایت کے امرناتھ نے دی تھی۔ ان فلموں کے ہیرو ایشور لال اور ہیروئن ستارہ تھی۔ دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی دوران انہوں نے اپنی فلموں کی ہیروئن ستارہ کو اپنی لائف ہیروئن بنا لیا۔ اس سے شادی رچالی۔ یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ وہ پہلے ہی سے شادی شدہ تھے۔ ان کی پہلی شادی ان کی ہی برادری میں سکینہ رانا نامی خاتون سے ہوئی تھی جن سے ان کی ایک بیٹی ثریا اور ایک بیٹا افضل نذیر تھا۔ ثریا کی شادی دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان سے ہوئی تھی جو پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' کے ہیرو تھے۔ بعد ازاں ثریا اور ناصر خان میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں دونوں کی علیحدگی طلاق پر ختم ہوئی۔ ثریا نے بعد میں باری ملک سے شادی کرلی تھی۔ افضل نذیر نے دو پاکستانی فلموں ''وحشی'' اور ''فرشتہ'' میں اداکاری کی تھی۔ ''وحشی'' ہدایت کار منور ایچ قاسم کی اور ''فرشتہ'' لقمان کی ہدایات میں بننے والی فلم تھی۔ افضل نذیر ٹریفک کے ایک حادثے کا شکار ہو کر ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا تھا پھر کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

نذیر صاحب کی یہ دوسری بیوی نیپالی نژاد تھی۔ یہ اداکارہ اپنے دور میں رقص کی ملکہ تصور کی جاتی تھی۔ اس نے متعدد فلموں میں نذیر کے ساتھ ان کی ہیروئن کے طور پر کام کیا پھر یوں ہوا کہ نذیر صاحب کے حقیقی بھانجے اور مغل اعظم کے ہدایت کار کے آصف نے جو بے حد عاشق مزاج تھے اپنے سگے ماموں کے گھر میں ہی ڈاکا ڈال دیا اور اپنی ممانی ستارہ کو لے اڑے جس کے بعد نذیر صاحب نے ستارہ کو طلاق دے دی۔ ستارہ اور کے آصف نے شادی کرلی اور ستارہ نے اپنا نام بدل کر اللہ رکھی رکھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد کے آصف نے اسے چھوڑ کر نگار سلطانہ سے شادی رچالی پھر کے آصف نے نگار سلطانہ کو بھی چھوڑ کر دلیپ کمار کی ہمشیرہ سے شادی کرلی۔ ان باتوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ عشق بازی کے آصف کا مشغلہ تھا۔ نذیر صاحب نے ستارہ کے بعد اپنی تیسری شادی اس عہد کی معروف اداکارہ جو الیہ اداکاری میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی اور وہ کوئی اور نہیں سورن لتا تھی، سے کرلی۔ اسے اپنی شریک حیات بنا لیا۔ سورن لتا کا تعلق سکھ مذہب سے تھا مگر نذیر صاحب سے شادی کرنے سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کر کے اپنا نام سعیدہ رکھا مگر فلموں میں پرانے نام سے ہی کام کرتی رہیں۔ نذیر صاحب کی یہ چاہت لازوال رہی۔ سورن لتا کو نذیر صاحب نے ٹوٹ کر چاہا اور زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔

1945ء کا سال ان کے لیے بڑی خوشیاں لے کر آیا کیونکہ اس سال انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا فلم ''لیلیٰ مجنوں'' بنا کر بڑا نام کمایا۔ بمبئی میں بننے والی اس فلم نے جو رومانی کرداروں پر مشتمل تھی۔ اس کی زبردست کامیابی نے اس کے فلم ساز و ہدایت کار اور اداکار نذیر اور ان کی بیوی اداکارہ سورن لتا کی شہرت کو مزید چار چاند لگا دیئے اور ان کے نام کا پورے برصغیر میں ڈنکا بجنے لگا۔ لیلیٰ مجنوں کی رومانوی داستان کو اس دور میں کئی بار فلم کے روپ میں پیش کیا گیا لیکن نذیر اور سورن لتا کی کردار نگاری نے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ان تک کوئی اور نہ پہنچ سکا۔ البتہ 1957ء میں پھر اس داستان کو دوبارہ دو ہدایت کاروں

نے پردۂ سیمیں کی زینت بنایا۔ ''عشق لیلیٰ'' کے فلم ساز جے کی آنند اور ہدایت کار رشی دل تھے۔ اس میں صبیحہ سنتوش نے لیلیٰ مجنوں کے کردار ادا کیے تھے۔ دوسری فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کے فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا تھے۔ اس میں بہار اور اسلم پرویز نے لیلیٰ مجنوں کے کردار ادا کیے تھے۔ یہ دونوں فلمیں 16 اپریل 1957ء کو ایک ساتھ ریلیز ہوئی تھیں۔ انور کمال پاشا کی لیلیٰ مجنوں بری طرح فلاپ ہوگئی جب کہ صبیحہ اور سنتوش کی خوب صورت پرفارمنس نے ''عشق لیلیٰ'' کو سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار کیا۔

نذیر اور سورن لتا ایک مدت سے فلموں میں کام کر رہے تھے لیکن ان کی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کی خوبی یہ تھی کہ جن لوگوں نے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی اور فلم دیکھنا جو گناہ سمجھتے تھے وہ بھی اس فلم کی تعریفیں سن کر اسے دیکھنے گئے۔ لیلیٰ مجنوں کی داستان پر بننے والی تمام فلموں میں یہ فلم ہر لحاظ سے ایک لاجواب فلم تھی۔ سورن لتا کی فطری المیہ اداکاری نے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔

اسی سال نذیر نے ہدایت کار کے امرناتھ کی زیر ہدایات بننے والی فلم ''گاؤں کی گوری'' میں کام کیا جس نے سپرہٹ کامیابی حاصل کی۔ اس کی ہیروئن میڈم نور جہاں تھیں۔ اس فلم کے مقبول گیتوں نے پورے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔ ان گیتوں کی دھنیں موسیقار شیام سندر نے بنائی تھیں جب کہ نغمہ نگار ولی صاحب تھے۔ ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''گاؤں کی گوری'' نذیر کے فلمی کیریئر کی لازوال فلمیں شمار ہوتی ہیں۔

1946ء میں نذیر نے ''وامق عذرا'' اور ''ماں باپ کی لاج'' نامی فلمیں بنائیں۔ دونوں فلموں کی ہیروئن سورن لتا تھیں۔ ''وامق عذرا'' کے ہدایت کار نانو بھائی بھٹ تھے۔ ''ماں باپ کی لاج'' کی ڈائریکشن نذیر نے خود دی تھی۔ دونوں فلموں کی موسیقی اے آر قریشی نے مرتب کی تھی۔ دونوں فلمیں اپنے عمدہ ٹریٹمنٹ کی وجہ سے پسند کی گئیں۔

1947ء بڑا پُرآشوب سال تھا۔ اس کے باوجود نذیر صاحب نے اس برس بھی اپنی چار فلمیں پروڈیوس کیں۔ یہ فلمیں ملکہ، عابدہ، گھربار اور یادگار تھیں۔ ''ملکہ'' میں مرکزی کردار شوبھنا سمرتھ اور الیاس کاشمیری نے ادا کیے تھے۔ یہ الیاس کاشمیری کی پہلی فلم تھی۔ ''عابدہ'' میں بھی الیاس کاشمیری ہیرو تھے جب کہ اس فلم میں سورن لتا ان کی ہیروئن تھیں۔ ''یادگار'' میں نذیر نے جیوتی نامی اداکارہ کے مقابل ہیرو کا کردار خود ادا کیا تھا۔ جب کہ ''گھربار'' میں دونوں میاں بیوی ہیرو ہیروئن تھے۔ ''عابدہ'' تقسیم ہند کے موقع پر ہندو مسلم فسادات کی نذر ہوگئی۔ کہیں ریلیز ہوسکی اور کہیں نہیں ہوسکی۔ ''گھربار'' کا بھی تقریباً یہی حال ہوا۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تو دونوں میاں بیوی پاکستان آگئے۔

سال بھر کے بعد جب بمبئی میں مکمل طور پر امن وامان قائم ہوگیا تو سورن لتا نے بمبئی جا کر وہاں کے فلم سازوں سے اپنے بقایا جاتا وصول کیے اور انہیں لے کر واپس آئیں تو انہوں نے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔ گھربار بنائے اور فلم سازی شروع کی۔

نذیر صاحب جب پاکستان آئے اس وقت ان کی عمر 34 برس ہو چکی تھی۔ یہ عمر اب ان کے ہیرو بننے کی نہیں تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں بھی آگئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس دور میں محض چند فلموں میں ہیرو کا کردار ادا کیا اور اپنی زیادہ تر توجہ ہدایت کاری کی طرف مبذول کردی اور جب کبھی اداکاری کی بھی تو کیریکٹر رول ہی کیے اور کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے سورن لتا کو دوسرے ہیروؤں کے ساتھ کاسٹ کیا۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ بطور اداکار نذیر صاحب نے ہر رول میں عوامی پذیرائی حاصل کی۔ بمبئی اور لاہور میں ان کی بننے والی تقریباً دو درجن فلمیں ایسی ہیں جن سے ان کی ساکھ میں شاندار اضافہ ہوا۔

پاکستان میں جب انہوں نے نئے سرے سے اپنی فلمی کارگزاری کا آغاز کیا تو اس دور میں پاکستان کی فلم انڈسٹری کو بھی نئے سرے سے زندگی دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔ نذیر صاحب بھی اس تعمیر نو کی جدوجہد میں شریک ہوگئے۔ انہوں نے لاہور نیو اسٹوڈیو کرائے پر لیا۔ نیا کیمرا ایونٹ منگوایا اور فلم سازی شروع کردی۔ ابتدا فلم ''عشق پنجاب'' سے کی پھر 1949ء میں فلم ''سچائی'' بنائی۔ 1950ء میں ''پھیرے'' کے نام سے پنجابی فلم بنائی جو ان کی کامیاب انڈین فلم ''گاؤں کی گوری'' کا ری میک تھی۔ یہ پاکستان کی پہلی سلور جوبلی فلم ثابت ہوئی۔ ''پھیرے'' کی سپرہٹ کامیابی کے بعد نذیر صاحب نے ایک اور پنجابی فلم ''لارے'' بنائی۔ اس کی کہانی بھی ان کی ہندوستانی فلم ''چھیڑ چھاڑ'' کی کہانی پر تھی۔ ''لارے'' ایک نغمہ بار فلم تھی جو اچھی اور کامیاب ثابت ہوئی۔ اسی سال

1950ء میں ان کی ایک اور فلم ''انوکھی داستان'' بھی ریلیز ہوئی اور کامیاب ثابت ہوئی۔

دو سال بعد 1952ء میں نذیر صاحب کی دو فلمیں ''بھیگی پلکیں'' اور ''شہری بابو'' نمائش پذیر ہوئیں۔ ''بھیگی پلکیں'' کامیابی حاصل نہ کر سکی البتہ ''شہری بابو'' بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ ''شہری بابو'' میں سنتوش کمار اور سورن لتا نے ہیرو اور ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا جو موسیقار رشید عطرے کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس فلم کی ڈائریکشن قدیر غوری نے دی تھی۔ ''بھیگی پلکیں'' میں ہیرو الیاس کاشمیری اور ہیروئن سورن لتا تھیں۔ اس فلم کی ہدایات شریف نیر کی تھیں۔ 1955ء کا سال اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس سال نذیر صاحب کی فلم ''ہیر'' ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار خود نذیر صاحب تھے۔ عنایت حسین بھٹی نے اس فلم میں سورن لتا کے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے تمام گیت ہٹ ہوئے تھے اور یہ فلم بھی بہت کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے موسیقار صفدر حسین اور نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری اور بابا عالم سیاہ پوش تھے۔ نذیر صاحب کی زیر ہدایت بننے والی ''شہری بابو'' کے بعد ''ہیر'' دوسری فلم تھی جس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اسی برس (1955ء) میں ان کی فلم ''خاتون'' بھی ریلیز ہوئی تھی جو باکس آفس کے لحاظ سے نرم رہی۔ ''خاتون'' کی ہیروئن سورن لتا اور ہیرو ایک نیا اداکار شاد تھا۔

اسی سال سورن لتا اور نذیر صاحب کی بطور کیریکٹر ایکٹر ایک فلم ''نوکر'' ریلیز ہوئی جس میں دونوں میاں بیوی اولڈ کریکٹرز میں پہلی بار نمودار ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بوڑھے میاں بیوی کی حیثیت سے بھی انہیں شائقین فلم نے پسند کیا۔ یہ ان کی ذاتی فلم نہیں تھی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار عطاء اللہ شاہ ہاشمی تھے اور یہ انڈین فلم ''اولاد'' کا چربہ تھی۔ اس فلم کی مشہور لوری ''راج دلارے میری اکھیوں کے تارے..... میں تو واری واری جاؤں.....''

اس لوری کی دھن بھی انڈین فلم ''اولاد'' کی لوری کا چربہ تھی۔ ''نوکر'' کی یہ لوری گلوکارہ کوثر پروین نے گائی تھی۔ یہ لوری زبردست مقبول ہوئی تھی اور اس نے ''نوکر'' کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کو پاکستان کی پہلی گولڈن جوبلی اردو فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

1956ء میں نذیر صاحب نے فلم ''صابرہ'' بنائی تھی جس میں سورن لتا کے مقابلے میں الیاس کاشمیری ہیرو تھے۔ موسیقار صفدر حسین کی ترتیب دی ہوئی دھنوں میں اس فلم کے کئی گیت مشہور ہوئے تھے۔ اس فلم نے بھی کامیابی حاصل کی تھی۔

اسی سال ریلیز ہونے والی ہدایت کار منشی دل کی فلم ''حمیدہ'' میں نذیر صاحب نے کیریکٹر رول کر کے لوگوں کو چونکا دیا تھا۔ انہوں نے اس فلم میں صبیحہ خانم کے بوڑھے باپ کا کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔

1957ء میں نذیر صاحب نے فلم ''نور اسلام'' بنا کر ایک دھماکا کر دیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے درپن کو سورن لتا کے مقابلے میں بطور ہیرو پیش کیا تھا۔ نذیر صاحب اس کے ہدایت کار تھے۔ اس کے موسیقار حسن لطیف تھے۔ ان کی موسیقی میں تنویر نقوی کی تحریر کردہ نعت ''شاہ مدینہ یثرب کے والی.....'' بے حد مقبول ہوئی تھی جو اب تک روز اوّل کی طرح تر و تازہ ہے۔ ''نور اسلام'' بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

نذیر صاحب کی اگلی فلم ''شمع'' تھی جس کے ہدایت کار وہ خود تھے۔ درپن نے اس فلم میں ایک شاعر بسمل کا کردار ادا کیا تھا جب کہ سورن لتا کے ساتھ نیلو اور نذیر شامل تھے۔ یہ ایک اچھی فلم ہونے کے باوجود کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

طویل وقفے کے بعد یعنی 1965ء میں نذیر صاحب کی نئی فلم ''عظمت اسلام'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم ناگزیر وجوہ کی بنا پر رکی ہوئی تھی۔ اس فلم میں حبیب اور سورن لتا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم کی ناکامی کی وجہ تاخیر سے نمائش کے علاوہ اس دور میں سورن لتا اپنی عمر کے اس حصے میں تھیں جس میں وہ صرف کریکٹر رول کر رہی تھیں۔ ایسے وقت میں اس فلم کا لگنا بے سود ثابت ہوا۔ انجام کار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ فلم اس دور میں ریلیز ہوئی تھی جب نذیر صاحب فلم انڈسٹری سے اپنی اداکارہ بیوی کے ساتھ کنارہ کش ہو گئے تھے اس لیے ''عظمت اسلام'' کو نذیر صاحب کی بطور فلم ساز و ہدایت کار آخری فلم قرار دیا جا سکتا ہے مگر بطور اداکار و اداکارہ دونوں میاں بیوی نے 1966ء میں ہدایت کار حسن طارق کی فلم ''سوال'' میں اہم اور جاندار کردار نگاری کی تھی۔

حسن طارق نے جب ان سے اس فلم میں کریکٹر رول کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا۔ ''ارے

بھائی! اب تو ہم میاں بیوی ریٹائرمنٹ لے کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے۔ بس میری اس فلم میں کام کرلیں۔''

''کسی اور سے کروالو بھائی۔''

''یہ کردار آپ دونوں سے بہتر کوئی اور نہیں کرسکتا۔''

غرض کہ ہدایت کار حسن طارق کے مجبور کرنے پر ان دونوں نے اس فلم میں آخری اداکاری کی اور پھر منظر سے اس طرح پس منظر میں چلے گئے کہ دوبارہ نمودار نہیں ہوئے۔

مگر انہوں نے کئی فنکاروں اور ہنرمندوں کو متعارف کرایا جن میں اداکار الیاس کشمیری، اداکار شاد اور اداکار نعیم ہاشمی کے علاوہ موسیقار صفدر حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اپنی متعدد خوبیوں کی وجہ سے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

عمر کے آخری حصے میں نذیر صاحب کو دمے کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے اور اس موذی مرض میں مبتلا رہ کر 69 سال کی عمر میں 26 اگست 1983ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

دوستو! جو اس دنیا میں آیا ہے اسے بہرحال ایک دن یہاں سے جانا بھی ہے۔ اپنے وقت کی نامور اداکارہ اور نذیر صاحب کی شریک حیات سورن لتا بھی ایک دن ابدی نیند سو گئیں۔ 1924ء میں راولپنڈی کے ایک ممتاز سکھ گھرانے میں جنم لینے والی سورن لتا فروری 2008ء میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئیں۔

☆.....☆

ہدایت کار لقمان کو قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں بنائی جانے والی دوسری فلم ''شاہدہ'' کا تخلیق کار کا اعزاز حاصل ہے۔ پہلی فلم ''تیری یاد'' کا تو بہت بڑا حصہ قیام پاکستان سے پہلے مکمل کرلیا گیا تھا۔ 1947ء میں جو فسادات ہوئے اور جس میں ہندو فسادیوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اس میں عام لوگوں کے جان و مال ہی کا نقصان نہیں ہوا۔ لاہور کی فلم انڈسٹری بھی تباہ و برباد ہوگئی۔ بٹوارے کے بعد جب امن و امان قائم ہوا اور فلمی صنعت کو کچھ لوگوں نے نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی ان میں ہدایت کار لقمان بھی تھے۔ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں فلم بنانا، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام ہے کہ کس قدر دشوار ہوگا۔ بہرحال اللہ نے ان نامساعد حالات میں فلم بنانے والوں کی مدد کی، ان کے عزم اور حوصلے کے صلے میں ان کی فلم مکمل کی۔ یہ ہدایت کار لقمان اور ان کی ٹیم کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس تحریر کے لیے میں نے ان کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ وہ بھی پاکستانی فلم انڈسٹری کے اوّلین معماروں میں شامل ہیں۔

فلم ''شاہدہ'' ایک گھریلو اصلاحی فلم تھی۔ اس فلم کی کہانی حکیم احمد شجاع پاشا کی تحریر کردہ تھی جو اس دور کے مقبول ناول نگار تھے اور ان کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ''شاہدہ'' کی کہانی کے علاوہ انہوں نے

زندگی نامہ

پورا نام: لقمان احمد
فلمی نام: لقمان
پیدائش: 1924ء
بمقام: دہلی
فلمی تربیت: سہراب مودی کے یونٹ میں شریک ہوکر فلم سازی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر سید شوکت حسین رضوی کی زیر شفقت ایڈیٹنگ، کیمرا ورک اور ہدایت کاری سیکھی۔
پہلی فلم: ہمجولی، جو انڈیا میں 1946ء میں بنائی گئی تھی۔ اس کی ہدایت کاری کی مگر آدھی فلم کی کیونکہ پروڈیوسر عبداللہ سے اختلاف کی وجہ سے اس فلم سے علیحدہ ہوگئے تھے۔
پاکستان میں پہلی فلم: ''شاہدہ'' پاکستان میں بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی جسے پاکستان میں بننے والی دوسری فلم کا اعزاز حاصل ہوا۔
فلموں کی تعداد: مجموعی طور پر انہوں نے ساڑھے سولہ فلمیں ڈائریکٹ کیں۔
آخری فلم: ''وفا'' تھی جو 1981ء میں ریلیز ہوئی اور بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔
کامیاب فلمیں: آدمی، محل، پتن، اک پردیسی، اک مٹیار، وہٹی، فرشتہ، افسانہ، پاکیزہ۔
پنجابی فلمیں: پنجابی زبان سے ناواقفیت کے باوجود تین پنجابی فلمیں پتن، اک پردیسی اک مٹیار اور وہٹی بنائی تینوں کامیاب ثابت ہوئیں۔

اس فلم کے تمام گیت بھی لکھے تھے۔ فلم ساز ایم اکبر شاہ اور موسیقار غلام حیدر اور بابا جی اے چشتی تھے۔ دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان جوان دنوں لاہور ہی میں تھے۔ اس فلم کے ہیرو تھے جب کہ ہیروئن کا کردار شمیم نے ادا کیا تھا۔ شمیم اس سے پہلے بمبئی کی فلموں میں اپنی لاجواب اداکاری کے جوہر دکھا چکی تھیں۔ ان کے علاوہ شاکر اور ہمالیہ والا نے بھی اس فلم میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ ہمالیہ والا جن کا اصل نام افضال الدین تھا اور جو دہرہ دون کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا مشہور فارماسوٹیکل ادارہ ہمالیہ ڈرگس کے نام سے مشہور تھا۔ اسی خاندان کے فرزندِ ارجمند افضال الدین فلمی اداکار بننے کے شوق میں بمبئی گئے اور ہمالیہ والا کے نام سے فلموں میں کام کرنے لگے۔ قیام پاکستان کے بعد بمبئی سے آنے والوں میں وہ بھی شریک تھے۔

بات ہو رہی تھی فلم ''شاہدہ'' کی۔ یہ فلم اپنی موثر اور جاندار کہانی، حسین و برجستہ مکالموں اور انتہائی معیاری اداکاری کے باوجود کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ تکنیکی اعتبار سے اس کا معیار بہتر نہیں ہو گا کیونکہ اس وقت بے سروسامانی کا عالم تھا اور فلم سازی کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔

ہدایت کار لقمان کا کہنا ہے کہ ''شاہدہ'' کے چار گیتوں کی دھنیں ماسٹر غلام حیدر نے بنائی تھیں جب کہ باقی چار گیتوں کی دھنیں بابا جی اے چشتی نے ترتیب دی تھیں لیکن گراموفون ریکارڈنگ کمپنی H M V کے جاری کردہ ریکارڈوں پر صرف بابا جی اے چشتی کا نام لکھا ہوا ہے۔ متذکرہ گیت یہ ہیں۔

☆ یہ کمبخت دو دل بھی ملنے نہ پائے (آواز: منور سلطانہ۔ موسیقی: غلام حیدر)

☆ دربدر پھرتے ہیں ہم کو پوچھتا کوئی نہیں (آواز: منور سلطانہ۔ موسیقی: غلام حیدر)

☆ دنیا سے جو مٹا ہے ہمارا نشاں نہ ہو (آواز: منور سلطانہ۔ موسیقی: غلام حیدر)

☆ الوداع الوداع پیارے وطن الوداع (آوازیں: منور سلطانہ اور ساتھی۔ موسیقی: غلام حیدر)

☆ پردے پردے میں اس ظالم نے رسوا کر دیا (آوازیں: عبدالشکور، منور سلطانہ۔ موسیقی: جی اے چشتی)

☆ کبھی تم خواب میں صورت دکھا جاتے تو کیا ہوتا (آواز: عبدالشکور۔ موسیقی: جی اے چشتی)

☆ یہ بھی کوئی انصاف ہے اے صاحب انصاف (آواز: منور سلطانہ۔ موسیقی: جی اے چشتی)

☆ کب تک نہ سنی جائے گی فریاد ہماری (آواز: منور سلطانہ۔ موسیقی: جی اے چشتی)

اس وقت جو بے سروسامانی کی حالت تھی اس میں اتنی اچھی اور عمدہ فلم کا بن جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اسٹوڈیو ٹوٹے ہوئے تھے۔ نہ آج کی طرح ٹیکنیشنز تھے نہ فنکار، پھر بھی لقمان صاحب نے حوصلے اور ہمت کے ساتھ یہ فلم بنا ڈالی۔

اس فلم ''شاہدہ'' سے میری بھی ایک یادوابستہ ہے جو اس موقع پر میں آپ کے لیے شیئر کروں گا۔ یہ فلم جن دنوں ڈھاکے میں ریلیز ہوئی تھی اس وقت میں کوئی آٹھ نو سال کا تھا۔ کلکتہ سے ڈھاکا آنے کے بعد کچھ دنوں تک میں بیمار رہا اس لیے اسکول میں بھی داخل نہیں کیا گیا تھا۔ میں مکمل طور پر گھر ہی میں رہتا تھا۔ اسی دوران عید آ گئی۔ عید کے دن دوپہر کو پہلی بار میں گھر سے باہر نکلا۔ ہمارا گھر ٹیکا ٹولی نامی محلے میں تھا جو گورنر ہاؤس کے پچھواڑے میں تھا۔ میں آہستہ آہستہ اجنبی راستوں پر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک بھرے پرے شاہراہ پر آ گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا یہ ایک سنیما گھر ہے (بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نشاط سنیما تھا) یہاں ایک فلم ''شاہدہ'' کی نمائش ہو رہی تھی۔ جیب میں عیدی موجود تھی۔ جھٹ ایک ٹکٹ خرید کر اندر جا بیٹھا۔ یہ میری زندگی کی پہلی فلم تھی جو میں تن تنہا دیکھنے آیا تھا۔ اس سے پہلے کلکتہ میں، میں نے گھر والوں کے ساتھ ایک دو فلمیں دیکھی تھیں۔ جن میں ایک فلم ''چندر لیکھا'' بھی تھی۔ فلم شروع ہوئی تو فلم پر میری توجہ کم تھی اور رہ رہ کر مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں گھر سے بغیر کہے نکلا ہوں۔ وہ لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے کہ بابو کہاں چلا گیا۔ بھائی بہنوں میں چونکہ سب سے چھوٹا تھا اس لیے پیار سے سب مجھے بابو کہتے تھے۔ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں گھر والے مجھے ڈھونڈنے نہ نکل گئے ہوں۔ اسی سوچ بچار میں انٹرول ہو گیا اور میں دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر نکلا تو ایک دم گھر جا کر رکا۔ گھر میں مہمانوں کا رش تھا۔ بڑے بھیا نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ''فلم دیکھنے.....''

انہوں نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر حیرت سے کہا۔ اتنی مختصر فلم! کون سی فلم تھی؟''

''فلم کا نام ''شاہدہ'' تھا۔ میں انٹرول کے بعد واپس آ گیا۔''

بھیا زور سے ہنسے۔ ''ارے بے وقوف! پوری فلم دیکھ کر آتے۔ آدھی فلم کیوں دیکھی؟ کیا اچھی نہیں تھی؟''

''پتا نہیں کیسی تھی۔ میں تو اس ڈر سے بھاگ آیا کہ آپ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے کہ کہاں چلا گیا۔''

یہ ہے فلم ''شاہدہ'' سے میری ایک یادِ جواب تک میں بھولا نہیں ہوں۔ میری زندگی کی پہلی فلم جو میں نے خود سنیما گھر جا کر دیکھی مگر آدھی۔

خیر ذکر ہو رہا تھا لقمان کا تو اسی جانب لوٹ چلتے ہیں۔

ہدایت کار لقمان کا پورا نام لقمان احمد تھا۔ وہ 1924ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ بے حد سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور موقع محل کے مطابق بڑے برجستہ اور پہلو دار جملے بھی کہہ جاتے تھے۔ فلم سازی کے شوق میں وہ دہلی سے بمبئی گئے اور اپنی فلمی زندگی کا آغاز بی جنڈ فنکار و ہدایت کار سہراب مودی کے یونٹ میں شمولیت سے کیا جس کے بعد وہ فلم ساز و ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی کے اسسٹنٹ بنے۔ ان کی خوش قسمتی کہ ان کو شروع ہی میں ایک ذہین اور تجربہ کار ہدایت کار کی سرپرستی حاصل ہوئی جس سے انہوں نے وہ سب کچھ سیکھا جو ایک ڈائریکٹر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس استاد سے تدوین کاری اور ہدایت کاری کے اسرار و رموز سیکھے اور انہی کی کوششوں سے لقمان کو ایک فلم کی آزادانہ ہدایت کاری کا موقع ملا۔ اس فلم کا نام ''ہمجولی'' تھا۔

''ہمجولی'' تقسیم ہند سے پہلے بنی تھی۔ عبداللہ پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی اس فلم کی کاسٹ میں نور جہاں اور جے راج ہیروئن اور ہیرو تھے۔ دیگر اداکاروں میں غلام محمد، زینت بیگم، مسرا اور جلو بائی قابل ذکر تھے۔ یہ زینت بیگم کی پہلی فلم تھی۔ موسیقار حفیظ خان تھے۔ ان کی خوب صورت موسیقی میں اس فلم کے چند گانے بہت مشہور ہوئے تھے۔

☆ راز کھلتا نظر نہیں آتا
کون ہوں کیا نظر نہیں آتا

☆ دکھ درد سے جگ میں کوئی آزاد نہیں
☆ پھولوں میں نظر یہ کون آیا کون آیا
☆ بھگوان اُو بھگوان کب تک تیری دنیا میں یہ اندھیر رہے گا

سارے گیت انجم پیلی بھیتی نے تحریر کیے تھے جب کہ سارے ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ ان تمام گیتوں کے علاوہ نور جہاں نے ایک ترانہ بھی گایا تھا جس کے بول تھے۔

یہ دیس ہمارا ہندوستان
سارے جہاں سے نیارا
ہندوستان

فلم ساز عبداللہ کی یہ فلم 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی اور ایک خوب صورت اور اچھی فلم تھی پھر بھی جانے کیوں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس فلم میں مقری اور آغا جیسے کامیڈین نے بھی اپنی سدا بہار اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

مملکتِ خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد متعدد مسلمان فنکاروں اور ہنرمندوں کے ساتھ لقمان بھی بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ پاکستان آنے کے بعد لقمان کے ابتدائی ایام انتہائی کسمپرسی اور کٹھن مراحل سے گزرے۔ ان دنوں پاکستانی فلمی صنعت بھی ابتدائی مرحلے میں تھی۔ ایسے حالات میں کوئی سرمایہ کار فلموں میں سرمایہ لگانے پر آمادہ نہیں تھا۔ لقمان کی طرح دیگر آرٹسٹوں اور ہنرمندوں کے پاس بھی کوئی کام نہ تھا۔ ایسے کڑے اور صبر آزما وقت میں لقمان نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کوشش جاری رکھی۔ جس کے نتیجے میں انہیں شجاع نور پکچرز کے بینر تلے بننے والی فلم ''شاہدہ'' کی ہدایت کاری کا پہلی بار پاکستان میں موقع ملا۔ ہدایت کار لقمان نے انتہائی بے سروسامانی اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود ایک اچھی اور عمدہ گھریلو فلم بنائی تھی لیکن صد افسوس کہ ان کی ساری محنت رائیگاں گئی اور ''شاہدہ'' کو فلم بینوں کی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

''شاہدہ'' کی باکس آفس پر ناکامی کے نتیجے میں ہدایت کار لقمان کو چار سال تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا پڑا۔ فلمی دنیا کی ایک پرانی ریت ہے کہ اگر کسی کی کوئی فلم کسی بھی وجہ سے ناکام ہو جائے تو اس پر ناکام اداکار یا ہدایت کار کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور اس پر سارے

دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی مضبوط اعصاب کے مالک لقمان نے بے کاری کے یہ دن گزارے۔ بالآخر چار سال بعد انہیں ٹرپل ایس پروڈکشنز کے بینر تلے بننے والی فلم ''محبوبہ'' کی ہدایت کاری کا موقع ملا۔ اس فلم کے پروڈیوسر شریف ملک تھے۔ ٹمی بطور ہیرو کن اور سنتوش کمار بطور ہیرو کاسٹ کیے گئے۔ آشا پوسلے، ایم اسماعیل، ہمالیہ والا اور عشرت (درپن) بھی کاسٹ میں شامل کیے گئے۔ ''محبوبہ'' کی کہانی احسان بی اے نے تحریر کی تھی۔ موسیقی ماسٹر عنایت حسین نے ترتیب دی تھی۔ عکاسی ریاض بخاری نے کی تھی۔ یہ ایک بہت بڑے بجٹ کی کاسٹیوم فلم تھی۔ اس فلم کا یہ گانا بہت مشہور ہوا۔

''کسی کا نام شامل ہو گیا میری کہانی میں''

یہ گیت ٹمی اور سنتوش کمار پر پکچرائز کیا گیا تھا۔ اس گیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گیت دراصل فلم ''آغوش'' کا ہے۔ یہ بات غلط بھی نہیں، اس لیے کہ یہ گیت ابتدا میں فلم آغوش ہی کے لیے ریکارڈ ہوا تھا کیونکہ پہلے اس فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین ہی تھے۔ بعد میں آغوش کے پروڈیوسر اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تو اس فلم کی موسیقی اصغر علی، محمد حسین نامی موسیقار نے ترتیب دی۔ ماسٹر عنایت حسین نے اپنا یہ گیت بعد میں فلم ''محبوبہ'' میں شامل کیا۔ اس گیت کا جو ریکارڈ تیار ہوا اس میں فلم آغوش ہی درج ہے۔ اس ڈوئٹ کو گلوکار فضل حسین اور گلوکارہ منور سلطانہ نے گایا تھا۔ عید قرباں پر ریلیز ہونے والی اس فلم کے گیت تنویر نقوی، قتیل شفائی اور سیف الدین سیف نے لکھے تھے، جو یہ ہیں۔

☆ ڈال پہ پنچھی جب بولے (آوازیں: پکھراج پپو، عنایت حسین بھٹی۔ بول: سیف الدین سیف)

☆ شام ڈھلے تارے کھلے لگن تلے (آواز: پکھراج پپو۔ بول: تنویر نقوی)

☆ محبت مسکرائی جھوم اٹھی ہر شے جوانی میں (آوازیں: فضل حسین، منور سلطانہ۔ بول: قتیل شفائی)

☆ اک پل نا ہے کل پڑے کوئی سوگ ہے فضا میں (آوازیں: پکھراج پپو، عنایت حسین بھٹی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ کہتی ہے دنیا ڈھلکے نہ آنچل (بول: تنویر نقوی)

☆ رت ہے گلابی دل ہے شرابی (بول: تنویر نقوی)

☆ برس رہی دو نینوں سے۔ دل سے تیری یادوں کو (آوازیں: پکھراج پپو، عنایت حسین بھٹی۔ بول: قتیل شفائی)

یہ فلم ''محبوبہ'' 1953ء میں نمائش پذیر ہوئی اور اس نے باکس آفس پر کامیاب ہو کر ہدایت کار لقمان کو بھی کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

لقمان نے پاکستان میں زیادہ فلمیں نہیں بنائیں لیکن ان کی کچھ فلمیں ایسی بھی ہیں جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ دہلی کی پیداوار تھے اس لیے خالص اردو اسپیکنگ تھے اس کے باوجود انہوں نے خالص پنجابی زبان کی تین فلمیں بنائیں جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔

ان کی پہلی پنجابی فلم ''پتن'' تھی جو سدا بہار عظیم رومانوی اور نغماتی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز ایس ایم لطیف تھے اور کیپٹیل فلم ایکسچینج کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار بابا جی اے چشتی تھے۔ انہوں نے اس فلم کے لیے بڑی عمدہ اور سریلی دھنیں ترتیب دی تھیں جب کہ اس کے کچھ گیت بھی انہوں نے لکھے تھے۔ ''پتن'' کے دیگر نغمہ نگاروں میں طفیل ہوشیار پوری، مشیر کاظمی، حزیں قادری، ایف ڈی شریف اور اداکار علاؤ الدین شامل تھے۔ جو یہ ہیں۔

☆ رس گیا ماہی ساڈا رب ساتھیوں رسیا (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: مشیر کاظمی)

☆ ساڈا جگرا پیار کہے بار بار (آوازیں: زبیدہ خانم، عنایت حسین بھٹی۔ بول: حزیں قادری)

☆ چھڈ جاویں نہ چناہا نہ پھڑ کے (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ مینوں لگیاں میں تیریاں اڈیکاں وے (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: شیر کاظمی)

☆ میرے کنڈلاں والے وال (آواز: کوثر پروین۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ وے بھیڑ بوتھا لے جانظر تاں درد (آوازیں: عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم۔ بول: حزیں قادری)

☆ بیڑی رتی کھیل ہوئے مستاں وے (آوازیں: زبیدہ خانم، عنایت حسین بھٹی۔ بول: جی اے چشتی)

☆ دنیا ہیرا پھیری بابا نہ تیری نہ میری (آوازیں: عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم۔ بول: ایف ڈی شریف)

☆ جتی قصوری پیریں نہ پوری (بول: علاؤ الدین)

☆ رنگ رنگیلی ڈولی میری بابل آج نہ توڑ دے (آوازیں: پکھراج پپو، عنایت حسین بھٹی۔ بول: قتیل شفائی)

(آوازیں: زبیدہ خانم اور ساتھی۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ رونے والے کیوں روتا ہے (بول: مشیر کاظمی)

لقمان صاحب کی یہ پہلی پنجابی فلم توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔ اگرچہ فلم انڈسٹری کے کچھ لوگ بہت متفکر تھے کہ ایک شخص جس کی مادری زبان اردو ہے، وہ کوئی پنجابی فلم کیسے بنائے گا؟ اس سلسلے میں کہانی نویس اور نغمہ نگار بابا عالم سیاہ پوش نے لقمان صاحب کی بڑی مدد کی تھی جو اس فلم کے مکالمہ نگار تھے۔ بابا عالم سیاہ پوش نے ''پتن'' کے مکالمے بڑے حسین اور برجستہ لکھے تھے۔ مسرت نذیر نے پہلی بار اس فلم میں باقاعدہ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ ہیرو سنتوش کمار تھے۔ غلام محمد، آشا پوسلے، شیخ اقبال، نذر، سلطان کھوسٹ، فضل حق، علاؤ الدین اور ایم اسماعیل کاسٹ میں شامل تھے۔ ''پتن'' کی کامیابی میں سب سے نمایاں حصہ بابا چشتی کا تھا۔ جن کی کمپوز کی ہوئی دھنیں گلی گلی کوچے کوچے میں گونجیں۔ اس فلم کے شریک مکالمہ نگار معروف مصنف و نغمہ نگار احمد راہی تھے۔ ''پتن'' عیدالفطر کے مبارک موقع پر بروز منگل بتاریخ 24 مئی 1955ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی نے ہدایت کار لقمان کی شہرت میں مزید چار چاند لگا دیئے۔ ''پتن'' کا شمار آج بھی ماضی کی کامیاب فلموں میں ہوتا ہے۔

ہدایت کار لقمان کی اگلی فلم ''لختِ جگر'' تھی۔ یہ ایک عمدہ اور معیاری فلم تھی مگر اس کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اسی کہانی پر ایک اور فلم ''حمیدہ'' بنائی گئی اور اس سے چند روز پہلے ریلیز کر دی گئی جو کامیاب رہی اور لقمان صاحب کی فلم ''لختِ جگر'' ناکام ہوگئی۔ ایک ہی کہانی پر بننے کی وجہ یہ تھی کہ متحدہ ہندوستان کی فلم ''وچن'' کا ہو بہو چربہ تھیں۔ ایک ہی فلم کی کہانی پر جب بیک وقت دو فلمیں بنیں گی تو ان کا حشر یہی ہوگا جو پہلے ریلیز ہو جائے گی وہ میدان مار لے گی۔ ''لختِ جگر'' ہر لحاظ سے ایک معیاری فلم تھی مگر ''حمیدہ'' کے مقابل ریلیز ہونے کی وجہ سے باکس آفس پر مار کھا گئی۔ یاد رہے کہ یہ وہی فلم تھی جس میں حبیب شوٹنگ دیکھنے آئے تھے اور اداکار بن گئے۔ آغا جی اے گل اس کے فلم ساز اور جی اے چشتی اس کے موسیقار تھے۔ موسیقی کے اعتبار سے یہ ایک لاجواب میوزیکل فلم تھی۔ اس کے گیت یہ تھے۔

☆ چندا رے چندا میرے دامن کو تھام لے (آواز: نور جہاں۔ بول: سیف الدین سیف)

اعزازات: نعمان صاحب کو ان کی فلم ''آدمی'' پر پانچ نگار ایوارڈز ملے۔ جن میں ایک بہترین فلم ساز اور ایک بہترین ہدایت کار کے ایوارڈز ان کے لیے تھے جب کہ بہترین کہانی نویس کا ایوارڈ ایوب سرور اور بہترین اداکار حبیب اور بہترین معاون اداکار کا ایوارڈ علاؤ الدین کو ملے اس کے علاوہ ان کی بہترین فلمی خدمات پر سرکاری سطح پر پرائیڈ آف پرفارمنس کا اعزاز بھی انہیں ملا۔ انہیں اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک روسی اور ایک انگریزی شہرۂ آفاق ناولوں کو فلم کا روپ دیا۔ یہ فلمیں ''فرشتہ'' اور ''محل'' تھیں۔

باقیات: لقمان صاحب کی باقیات میں لوگ ان کے ایک بیٹے مبشر لقمان ہی کو عام طور پر جانتے ہیں جو ایک معروف ٹی وی اینکر ہیں جب کہ ان کا ایک اور بیٹا فیصل لقمان گمنام ہی رہا جس نے ان کی آخری فلم ''وفا'' میں بابرہ شریف کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا تھا مگر اس فلم کی سپر ناکامی کے بعد وہ بھی گوشہ گمنامی میں گم ہو گیا۔

آخری عمر: لقمان صاحب کے آخری ایام بہت تکلیف دہ گزرے۔ انہوں نے زندہ رہنے کے لیے ٹی اسٹال اور ٹیلرنگ کا کام بھی کیا۔

انتقال: مختصر عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد 23 جنوری 1994ء کو انتقال کر گئے۔

☆ وہ خواب سہانا ٹوٹ گیا۔ اُمید گئی ارمان گئے (آواز: نور جہاں۔ بول: سیف الدین سیف)

☆ آ حال دیکھ لے میرا کہ دل میں پیار بسا کر تیرا۔ میں برباد ہوئی (آواز: نور جہاں۔ بول: حزیں قادری)

☆ ہاتھ بڑھائے چاند کو آہیں تڑپ رہی ہیں (آواز: نور جہاں۔ بول: سیف الدین سیف)

☆ آنکھ سے آنکھ ملا لے موقع اچھا ہے (آواز: منور سلطانہ۔ بول: ناظم پانی پتی)

☆ آج ہم بے آسروں کا آسرا کوئی نہیں (آواز: نور جہاں۔ بول: طفیل ہوشیار پوری)

☆ رکھ سدا انجام پر غافل نظر (آواز: سلیم رضا۔ بول: سیف الدین سیف)

☆ چندا کی نگری سے آجا ری نندیا (آواز: نور

جہاں۔ بول: ناظم پانی پتی)

یہ فلم ملکہ ترنم نور جہاں کی خوب صورت آواز اور بابا جی اے چشتی کی مدھر موسیقی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے انور کمال پاشا نے تحریر کیے تھے جنہوں نے ہدایت کاری کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ نور جہاں اور سنتوش کمار نے اس فلم میں مرکزی رومانوی کردار ادا کیے تھے۔ ''لختِ جگر'' 17 فروری 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

اب لقمان صاحب کی اس خاص فلم کا ذکر جس نے انہیں بام عروج پر پہنچا دیا اور یہ وہی فلم تھی جس پر انہیں پاکستان کا ممتاز ترین ایوارڈ، نگار ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ فلم تھی ''آدمی''۔ اس فلم کی پس پردہ کہانی یہ ہے کہ دلیپ کمار کے بڑے بھائی ایوب سرور کی کہانی ''کالا آدمی'' پر بنائی گئی تھی۔ جن دنوں لقمان صاحب بھارت میں سید شوکت حسین رضوی کے ساتھ کام کر رہے تھے ان دنوں ان کے تعلقات لی جنڈ دلیپ کمار صاحب سے بہت استوار ہو چکے تھے۔ یوں سمجھیے گھریلو مراسم ہو گئے تھے۔ ان ہی دنوں کی بات ہے دلیپ صاحب کے بڑے بھائی ایوب سرور نے اپنی لکھی ہوئی ایک کہانی ان کو (لقمان صاحب کو) سنائی تھی اور اس کا نام ''کالا آدمی'' بتایا تھا کیونکہ کوئلے کے کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی کہانی تھی۔ لقمان صاحب نے اسی کہانی پر پاکستان میں ''آدمی'' کے نام سے فلم بنائی۔ اداکار حبیب نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا اور اپنی لاجواب اداکاری پر خوب داد حاصل کی تھی۔ نیر سلطانہ، علاؤ الدین، یاسمین اور طالش اس فلم کے دیگر اداکاروں میں شامل تھے۔ لقمان اس فلم کے فلم ساز بھی تھے۔ موسیقی دو موسیقاروں مصلح الدین اور عاشق حسین نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے تمام تر گیت تنویر نقوی نے تحریر کیے تھے۔ اس فلم کی حیثیت ایک ایسی آرٹ فلم کی تھی جو کوئلے کے کان میں کام کرنے والے مزدوروں کے موضوع پر بنائی گئی تھی۔ یہ لقمان صاحب کی ایک اعلیٰ درجے کی خوب صورت فلم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فلم کو مجموعی طور پر پانچ نگار ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا تھا جن میں بہترین فلم ساز لقمان، بہترین ہدایت کار لقمان، بہترین کہانی نویس ایوب سرور، بہترین اداکار حبیب اور بہترین معاون اداکار علاؤ الدین ہیں۔

اس کے گیت کچھ یوں ہیں۔

☆ جاگ تقدیر کو جگا لوں گی
سارے دکھ درد بھول جاؤں گی
تجھ کو سینے سے جب لگا لوں گی
(آواز: ناہید نیازی۔ موسیقی: عاشق حسین)

☆ زمیں پر قدم ہے فلک پر نظر ہے (آواز: سلیم رضا۔ موسیقی: عاشق حسین)

☆ میرا کہا بھی مان لو (آواز: ناہید نیازی۔ موسیقی مصلح الدین)

☆ اس جہاں سے دل لگا کر دیکھ لے (آوازیں: سلیم رضا، ناہید نیازی۔ موسیقی: مصلح الدین)

☆ ایک دو تین چار (آوازیں: باتش اور ساتھی۔ موسیقی: مصلح الدین)

☆ میری محبت نے آرزو کے دیے جلائے (آواز: ناہید نیازی۔ موسیقی: مصلح الدین)

☆ زمانہ پیار کا اتنا ہی کم ہے (آواز: ناہید نیازی۔ موسیقی: مصلح الدین)

فلم ''آدمی'' 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی اور معیار اور کاروبار کے لحاظ سے سپر ہٹ شمار کی گئی تھی۔

فلم ساز و ہدایت کار لقمان کی اگلی فلم ''ایاز'' تھی جو ان کی ہدایات میں پاکستان میں بننے والی ان کی چھٹی فلم تھی۔ یہ ایک تاریخی فلم تھی جو سلطان حکمران محمود غزنوی کے محبوب غلام ایاز کی تاریخی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں محمود غزنوی کا کردار شاہنواز سینئر اور ایاز کا کردار حبیب نے ادا کیا تھا۔ فردوس فلمز کے بینر پر بننے والی یہ فلم پاکستان کی اچھی فلموں میں شمار ہوتی ہے جس نے ایک حد تک باکس آفس پر کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ بیگم شریف ملک ''ایاز'' کی فلم ساز اور خواجہ خورشید انور موسیقار تھے۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ اس فلم میں خواجہ صاحب کی موسیقی کافی مدھم رہی۔ وہ اس فلم میں کوئی خاص رنگ نہ جما سکے۔ ''ایاز'' کے گیت قتیل شفائی اور تنویر نقوی نے تحریر کیے تھے۔ جو درج ذیل ہیں۔

☆ مل گیا دل کو قرار جھوم اٹھا میرا پیار (آواز: ناہید نیازی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ ناچ ناچ پروانے جب تک شمع جلے (آواز: کوثر پروین۔ بول: قتیل شفائی)

☆ جو نہ ہوتا تیرا جمال صلو علیہ و آلہ (آواز: زبیدہ خانم کورس۔ بول: تنویر نقوی)

☆ یہ کون آیا یہ کون آیا چھڑ گئے تار دلوں کے (آواز:

زبیدہ خانم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ اے پیار بھرے دل کیا کہے (آواز: ناہید نیازی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ آئے گا شاہِ خوباں۔ رقص میں ہے سارا جہاں (آواز: ناہید نیازی۔ بول: تنویر نقوی)

☆ شب مہتاب ہے تنہائی ہے۔ ایسے میں تیری یاد آئی ہے (آواز: اقبال بانو۔ بول: قتیل شفائی)

☆ بچا لے آبرو میری ستم ڈھانے لگا صیاد بھی (آواز: ناہید نیازی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ میں دل ہی دل میں ناچوں (آواز: ناہید نیازی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ اے ماہِ لقا اے جانِ وفا (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: قتیل شفائی)

دوستو! فلم ''ایاز'' کی ایک نعت شریف آج بھی ہماری میلاد کی محفلوں میں بڑے ذوق وشوق اور عقیدت و احترام کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور یہ نعت ہے

جو نہ ہوتا تیرا جمالہ صلوعلیہ وآلہ

''ایاز'' ہدایت کار لقمان کی ایک پُراثر تاریخی فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں صبیحہ خانم، کمال، نیر سلطانہ، حبیب اور شاہنواز سینئر شامل تھے۔ یہ بات خصوصی طور پر یاد رکھنے والی ہے کہ ''ایاز'' کی کہانی اردو ادب کے نامور ادیب مرزا ادیب نے تحریر کی تھی جو شہرۂ آفاق جریدہ ادب لطیف کے مدیر اعلیٰ بھی تھے۔ لقمان صاحب نے مرزا ادیب کی تحریر کردہ کہانی کو بڑے اچھوتے انداز میں فلم کے روپ میں ڈھالا تھا۔ اس فلم کی پسندیدگی سے ان کی ساکھ میں مزید استحکام آیا تھا۔ یہ فلم 29 اپریل 1960ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

فلم ساز و ہدایت کار لقمان نامور ہدایت کار ضیاء سرحدی کی فلم سازی سے بہت متاثر تھے۔ ضیاء سرحدی کو حقیقت پسندانہ فلم بنا کر جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی لقمان بھی اسی راہ پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔ لقمان لڑکپن ہی سے فلم کے ماحول میں رہے تھے۔ ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کو ایک جدت اور زمانے کے تقاضوں کے طور پر اپنانے کے خواہش مند تھے جب کہ ضیاء سرحدی ہمیشہ سے ترقی پسند تھے۔ جب لقمان نے فلم ''آدمی'' بنائی تو انہیں روشن خیال اور تعلیم یافتہ لوگوں نے بہت سراہا۔ فلم ''آدمی'' میں یہ دکھایا گیا تھا کہ دولت کے لالچ میں آکر بعض اوقات لوگ غلط کام بھی کر بیٹھتے ہیں اور عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتتے رہتے ہیں۔ فلم ''آدمی'' کا اس دور میں اخبارات میں بھی بہت چرچا ہوا اور لقمان صاحب کو ایک ترقی پسند فلم ساز و ہدایت کار قرار دیا گیا۔ اس عزت اور مقام کے بعد انہیں یہ خواہش ہوئی کہ وہ آیندہ بھی ایسی ہی فلم بنائیں جس میں وہ نام بھی کمائیں اور دولت کے ساتھ ساتھ عزت اور عوامی پسندیدگی بھی حاصل کریں۔ اس خواہش کے زیر اثر وہ کسی ایسی ہی کہانی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ اس موقع پر انہیں نامور صحافی اور فلم ساز و ہدایت کار علی سفیان آفاقی نے مشورہ دیا۔ ''لقمان صاحب! اچھی، معیاری اور پُراثر کہانی کے لیے اپنے حلقہ اثر سے باہر نکل کر بھی اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کریں۔''

''آفاقی صاحب! اس ضمن میں آپ ہی میری کچھ رہنمائی کریں۔ آپ کی نگاہ میں ایسی کوئی کہانی ہے؟''

''عالمی سطح پر اگر جستجو کی جائے تو بہت سی ایسی کہانیاں موجود ہیں۔''

''ایسی کسی کہانی کا اتا پتا مجھے بھی بتائیں۔''

''اس کا اتا پتا یہ ہے کہ یہ ایک روسی مصنف کی کہانی ہے اور پتا یہ ہے کہ اس کہانی یا اس کے ناول کا نام CRIME AND PUNISHMENT ہے۔ اس بھرپور کہانی پر ایک بھرپور اور کامیاب فلم بنائی جاسکتی ہے۔''

لقمان صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی نظر آئی۔ ''کیا ہے اس ناول کی کہانی میں؟'' انہوں نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔

تب آفاقی صاحب نے ''کرائم اینڈ پنش منٹ'' کی کہانی کا خلاصہ انہیں زبانی سنا دیا جسے سن کر لقمان صاحب اچھل پڑے اور پھر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بولے۔ ''تو پھر میرے بھائی! یہ کام آپ ہی کر دو نا میرے لیے۔''

''کون سا کام؟'' آفاقی صاحب نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ آفاقی صاحب باہر سے جتنے سنجیدہ نظر آتے تھے اندر سے اتنے ہی شریر تھے۔

''آفاقی صاحب! میرا مطلب ہے اس فلم کا اسکرپٹ آپ ہی لکھ دو نا۔''

اس طرح روسی مصنف دوستوفسکی کے ناول ''کرائم

اینڈ پنشن منٹ'' کو سامنے رکھ کر آپ کے ہمارے اور سب کے محبوب رائٹر علی سفیان آفاقی صاحب نے لقمان صاحب کے لیے فلم ''فرشتہ'' کا اسکرپٹ لکھ کر انہیں تھما دیا۔ لقمان صاحب اس فلم کے لیے کسی نئی ہیروئن کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے جو انہیں پورا وقت دے سکے۔ معروف ہیرو یا ہیروئن کے پاس وقت کم ہوتا ہے اور فلم مکمل کرنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ نئی ہیروئن کا تجربہ وہ اپنی فلم ''پتن'' میں مسرت نذیر کو لے کر کر چکے تھے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ لقمان صاحب کو کسی نے بتایا کہ ایک لڑکی راولپنڈی سے ایکٹریس بننے کی خواہش میں لاہور آئی ہوئی ہے۔ لقمان صاحب اس سے ملنے پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا یہ لڑکی خاصی قد آور اور صحت مند تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' انہوں نے لڑکی سے پوچھا۔

''صابرہ۔''

لقمان صاحب کو وہ اچھی لگی۔ وہ انتہائی سادہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اس سے انہوں نے جو بات چیت کی اس سے اندازہ لگایا کہ یہ صاف گو اور کھری لڑکی ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''کچھ پڑھی لکھی ہو؟''

''جی ہاں! میں میٹرک پاس کر چکی ہوں۔''

''تم فلموں میں کیوں کام کرنا چاہتی ہو؟''

''پہلی بات تو یہ کہ مجھے ایکٹریس بننے کا شوق ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے حالات اچھے نہیں، مجھے کچھ کام دھندا کرنا ضروری ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ میں فلموں میں اداکاری کروں تاکہ میری خواہش بھی پوری ہو اور ضرورت بھی۔''

''تمہارے گھر میں کوئی اور نہیں ہے جو تم لوگوں کے حالات کی بہتری کے لیے کام کرے؟''

''میرے چاچو ہیں۔''

''تو کیا تمہارے والد نہیں ہیں؟''

وہ مسکرائی پھر بولی۔ ''وہ جی..... میں والد کو ہی چاچو کہہ کر پکارتی ہوں۔''

''تو کیا تمہارے ''چاچو'' کوئی کام کاج نہیں کرتے؟''

''کرتے ہیں مگر آمدنی بہت کم ہے۔ ماں کی بیماری اور ان کے علاج پر ساری جمع پونجی ختم ہو گئی اس لیے گھر سنسار کی گاڑی چلانے کے لیے مجھے گھر سے نکلنا پڑا۔''

''کیا تم اپنے والد کو بتا کر آئی ہو کہ تم فلموں میں کام کرنا چاہتی ہو؟''

''میں بڑی صاف گو ہوں اس لیے ان سے کوئی بات چھپائی نہیں۔''

''تو انہوں نے اداکارہ بننے کی اجازت دے دی؟''

''اجازت ہی نہیں، دعا بھی دی ہے کہ اللہ تمہیں نیک مقصد میں کامیاب کرے۔''

لقمان صاحب کو یہ منہ پھٹ لڑکی اپنی فلم کے لیے پسند آئی اور انہوں نے اسے اپنی فلم ''فرشتہ'' کے لیے منتخب کر لیا اور اسے بطور ایڈوانس کچھ رقم بھی دی کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کرے۔ انہوں نے اس کا فلمی نام کافرہ رکھا۔ فلم کے تناظر میں اس کا سراپا تو بہت اچھا تھا لیکن اس کا لب و لہجہ بڑا کھردرا اور پہاڑی قسم کا تھا۔ تلفظ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ لقمان صاحب کو اپنی فلم ''فرشتہ'' کے لیے جس قسم کی معصوم، مظلوم اور سادہ سی لڑکی درکار تھی۔ وہ اس معیار پر پوری نہیں اتر پا رہی تھی۔

لقمان صاحب کی الجھن اور پریشانی کا کچھ اندازہ کافرہ نے بھی لگا لیا تھا جس کے بعد وہ ان سے بولی۔ ''سر جی! میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ایکٹریس بن سکتی ہوں یا نہیں؟''

''کیوں نہیں بن سکتی۔'' لقمان صاحب حوصلہ افزا لہجے میں بولے۔ ''بس تمہاری بول چال ٹھیک ہو جائے تو تم بالکل فٹ ہو گی۔''

''آپ بالکل بھی فکر نہ کیجیے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اب میں لاہور آ گئی ہوں تو اب سب سے اردو ہی میں بات کروں گی اور بہت جلدی آپ کی طرح بولنا سیکھ لوں گی۔''

لقمان صاحب نے علی سفیان آفاقی سے مشاورت کی اور ان سے کہا۔ ''مجھے تو یہ لڑکی کافرہ ''فرشتہ'' کی ہیروئن کے لیے اچھی لگی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟''

''اچھی تو مجھے بھی لگی ہے لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''اس فلم میں ہیروئن کا جو کیریکٹر ہے اسے اس کے لحاظ سے سوفٹ ہونا پڑے گا۔ اپنے آپ کو پہاڑی انداز کی بجائے ایک نرم و نازک سادہ لوح اور دیہی طبیعت کی شخصیت میں ڈھالنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تلفظ اور لب و لہجہ کو بھی درست کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر یہ کام آپ ہی کریں نا۔ آپ اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر ہیں، مکالمہ نگار ہیں اس لیے اس فلم کی ہیروئن کو اس فلم کی کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق اس کی تربیت کریں۔ اس لڑکی کو اداکاری کا شوق ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں پورا اتارنے کی پوری کوشش کرے گی۔''

اور آفاقی صاحب، لقمان صاحب کی ہدایت پر کافرہ کے گھر جا کر نہ صرف اس کے تلفظ اور لب و لہجے کی درستگی کرنے لگے بلکہ فلم کے ہدایت کار کی ہدایت پر انہوں نے فلم کی کہانی اسے سنائی اور اس کا جو کردار اسے ادا کرنا ہے اس کے بارے میں بھی اسے خوب اچھی طرح سمجھایا اور اسے بتایا۔

''اس فلم کی ہیروئن ایک تنہا اور بے بس لڑکی ہے۔ ایک باپ کے سوا دنیا میں اس کا کوئی اور نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے وہ شرابی ہے مگر اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ دل کا بہت اچھا ہے لیکن شراب اس کی کمزوری ہے۔ اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ اتنی شراب پیتا ہے کہ بے ہوش ہو کر گلیوں اور نالیوں میں گرتا پڑتا رہتا ہے۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے کسی کام کا نہیں رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے زندہ رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ گھر کی ہر چیز بک چکی ہے۔ یہاں تک کہ جوان لڑکی نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اس چکر میں اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے۔ اس کے باپ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ وہ بہت روتا دھوتا ہے اور خود کو برا بھلا کہتا ہے۔ وہ بیٹی سے معافیاں مانگتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا مگر شام ہوتے ہی شراب کی طلب میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ بیٹی کی اداسی، بدنامی و رسوائی، سب چیزیں شراب کی طلب میں بہہ جاتی ہیں۔ بیٹی عجیب کیفیت میں ہے۔ وہ باپ سے نفرت بھی کرتی ہے اور محبت بھی کیونکہ دنیا میں وہی اس کا سہارا ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس کا باپ ایک مجبور، لاچار اور معذور شخص ہے۔ وہ اس پر ترس بھی کھاتی ہے اور اس پر غصہ بھی کرتی ہے اور زندگی اسی ڈھب سے گزرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس فلم کا ہیرو اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے جو ایک غریب طالب علم ہے۔

علی سفیان آفاقی اپنی فلم کی کہانی اسے سنا رہے تھے اور وہ بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور پھر وہ بے اختیار رونے لگی۔ آفاقی صاحب گھر آ گئے اور اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے آنسو تھمے تو انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یہ کہانی بہت زیادہ پسند آئی ہے؟''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آفاقی صاحب! یہ تو آپ نے میری کہانی لکھ دی میری کہانی بھی اسی قسم کی ہے۔''

آفاقی صاحب نے یہ ساری روداد لقمان صاحب کو سنائی تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے۔ ''اس لڑکی سے ہمیں کچھ ہمدردی ہو گئی تھی۔'' آفاقی صاحب کا کہنا ہے۔ ''ہماری کوشش تھی مصیبت کی ماری اس لڑکی کی ہم مدد کریں اور اسے ایک کامیاب اداکارہ بنا دیں۔''

لیکن انہیں یہ مشکل درپیش تھی کہ کافرہ کے بولنے کے انداز اور تلفظ میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے چہرے کے تاثرات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔ محض غم و الم کا تاثر مستقل طور پر اس کے چہرے پر موجود رہتا تھا۔ جس سے رفتہ رفتہ لقمان صاحب کو اندازہ ہونے لگا کہ کافرہ میں اداکارہ بننے کے جراثیم بہت ہی مایوس کن ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں کسی ایسی لڑکی کو وہ فلم کی ہیروئن تو نہیں بنا سکتے تھے۔ انہوں نے سوچا اسے فلم کا کوئی اور کردار دیا جا سکتا ہے۔

اسی دوران فلم انڈسٹری میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہدایت کار لقمان اپنی فلم ''فرشتہ'' میں کسی نئی لڑکی کو متعارف کرا رہے ہیں۔ اس خبر کے بعد بھیڑ چال کے شکار کئی اور فلم ساز لقمان صاحب کی منتخب ہیروئن کو سائن کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے اور کئی فلم سازوں نے کافرہ کو اپنی فلموں کے لیے ایڈوانس رقم بھی دے دی۔ انور کمال پاشا نے کافرہ کو اپنی فلم ''گمراہ'' کے لیے سائن بھی کر لیا۔ اس طرح کافرہ کے لیے روزگار کا سامان مہیا ہو گیا۔ فلم ''گمراہ'' بڑی تیزی سے مکمل کی گئی مگر ناکام ہو گئی پھر کیا تھا فلم سے وابستہ سبھی لوگ فلاپ ہو گئے۔ انجام کار کافرہ بھی فلاپ ہیروئن قرار دے دی گئی۔ بے چاری فلم بینوں کو بھی متاثر نہ کر سکی۔

دوسری طرف روسی ناول سے ماخوذ فلم ساز و ہدایت کار لقمان کی فلم ''فرشتہ'' 1961ء میں سینماؤں کی زینت بنی۔ یہ ایک صاف ستھری اور عمدہ فلم تھی جو غربت اور دوستی کے موضوع پر بننے والی اپنی مثال آپ فلم تھی۔ جرم و سزا سے اخذ کی گئی اس فلم کا ٹائٹل رول علاؤالدین نے بڑے احسن طریقے پر ادا کیا تھا۔ اس کی موسیقی رشید عطرے نے کمپوز کی تھی۔ عید کے دن ریلیز ہونے والی فلم ''فرشتہ'' اپنی پُراثر

کہانی کی وجہ سے ایک منفرد فلم تھی مگر بدقسمتی سے متوقع کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اس کی کاسٹ میں شامل اچھے اور قابلِ اعتماد فنکار موجود تھے جن میں یاسمین، اعجاز، حسنہ، ایمی مینوالا، دلجیت مرزا، ریحان ساقی، افضل نذیر، ہمالیہ والا اور علاؤ الدین نے کہانی کی مناسبت سے بڑی جاندار اداکاری کی تھی۔ تکنیکی طور پر بھی اعلیٰ معیار کی تھی۔ اسے نقادوں اور مبصروں نے ایک آرٹ فلم قرار دیا تھا، وہ عام فلم بینوں کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ اس فلم کے نغمہ نگاروں میں تنویر نقوی اور مظفر وارثی شامل تھے جو درج ذیل ہیں۔

☆ دل کی دھڑکن تری آواز ہوئی جاتی ہے
زندگی کتنی حسین ساز ہوئی جاتی ہے (آواز: نور جہاں۔ بول: مظفر وارثی)

☆ وہ زمانہ ضرور آئے گا (آواز: سلیم رضا۔ بول: تنویر نقوی)

☆ زمانہ کسی قدر نامہرباں ہے (آواز: سلیم رضا۔ بول: تنویر نقوی)

☆ سیکھا کہاں سے تو نے انداز بانکپن کا (آواز: سلیم رضا۔ بول: تنویر نقوی)

☆ زمانہ کس قدر نامہرباں ہے
خوشی ہے تو مگر جائے کہاں ہے (آواز: نور جہاں۔ بول: تنویر نقوی)

☆ لو ہم نے کہہ دیا کہ ہمیں تم سے پیار ہے (آوازیں: نور جہاں، منیر حسین اور ساتھی۔ بول: تنویر نقوی)

☆ زمانہ کس قدر نامہرباں ہے (آواز: ناہید نیازی۔ بول: تنویر نقوی)

فلم ''فرشتہ'' کا یہ گیت تین گلوکاروں نے الگ الگ گایا۔ یہ فلم اگر کامیاب ہو جاتی تو ہدایت کار لقمان کی سب سے شاندار فلم شمار کی جاتی۔

ہدایت کار لقمان کی دوسری پنجابی فلم ''اک پردیسی اک مٹیار'' 1964ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلم کیپٹل فلم ایکسچینج کے بینر تلے بنائی گئی تھی جو فلم ساز شیخ لطیف کی فلم تھی یہ ایک ہلکی پھلکی رومانوی کہانی پر بنائی گئی تھی۔

یہ فلم ''فرشتہ'' کی نمائش کے تین سال بعد منظر عام پر آئی تھی اور لقمان صاحب نے دودھ کا جلا چھاج بھی پھونک پھونک کر پیے کے مصداق، ایک تو پنجابی زبان میں بنائی دوسرے اسے عام فلم بینوں کے معیار کے مطابق ہلکی پھلکی لو اسٹوری پر بنائی کہ عام فلم بین اسے انجوائے کرسکیں۔ ملک اور معاشرے سے متعلق کسی مسئلے مسائل پر، فکر انگیز موضوع پر بنائی جانے والی فلم، فلم بینوں کی اکثریت ہضم نہیں کرسکتی۔ اپنی اس کوشش میں لقمان صاحب کامیاب بھی ہوئے۔ ''فرشتہ'' کی طرح انہیں مایوسی نہیں ہوئی مگر پہلی پنجابی فلم ''پتن'' کی طرح کھڑکی توڑ بھی ثابت نہیں ہوئی پھر بھی کافی چلی اور اس فلم نے فلم ساز کو کما کر بھی دیا۔

اس کی کاسٹ میں نغمہ، اسد بخاری، آصف جاہ اور علاؤ الدین نمایاں تھے۔ موسیقار سلیم اقبال نے اس فلم کی دھنیں دلکش اور عمدہ بنائی تھیں۔ گانے درج ذیل ہیں۔

☆ اج نچدی اک مٹیار چنا دے (آوازیں: نسیم بیگم آئرن پروین)

☆ وے گل سن ڈھولیا وے ماہی ہڑ بولیا (آواز: نسیم بیگم)

☆ گلیاں دے لکھاں دانگوں ڈھولا میں (آواز: نسیم بیگم)

☆ مینوں رکھ لے توں اکھیاں دے کول (آواز: نسیم بیگم)

☆ لے لے ساری خدائی (آواز: مالا)

☆ اتھے میرا دل سی کتھے گیا (آوازیں: نسیم بیگم۔ احمد رشدی)

☆ ادھی ادھی راتیں میرا بوہا کھڑکا کے (آوازیں: نسیم بیگم۔ آئرن پروین)

☆ ڈھڈوں پھٹی تے بن گئی ڈیڈی (آوازیں: نسیم بیگم، آئرن پروین)

اس فلم کے سارے گیت احمد راہی نے تحریر کیے تھے جب کہ اس کی کہانی سعید ساحلی نے لکھی تھی۔

ہدایت کار، لقمان کی تیسری اور آخری پنجابی فلم ''دوہتی'' تھی جس کی فلم ساز بیگم اختر ملک اور موسیقار بابا جی اے چشتی تھے جب کہ گانے خواجہ پرویز نے لکھے تھے۔ کہانی مستری غلام محمد نے تحریر کی تھی۔ اس فلم کا ٹائٹل رول اداکارہ نیلو نے ادا کیا تھا۔ یہ ایک معیاری، منفرد اور لاجواب فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں نیلو، محمد علی، لہری، زمرد اور سنتوش کمار شامل تھے۔ اس فلم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ محمد علی کے تمام تر مکالمے اردو کے تھے۔ اس فلم میں ان کا ایک مختصر کردار تھا۔ اس کے نغمات

درج ذیل ہیں۔

☆ دل دھڑکے تے اکھ شرمائے (آواز: مالا)

☆ میری نکی جئی گل نہیں سہارادا (آواز: مالا)

☆ ایس دل دتا میں کرتے پئے چڑھدے (آوازیں: مسعود رانا۔ آئرن پروین)

☆ پیار تینوں کرنا کسے توں نہیں ڈرنا (آواز: مالا)

☆ بڈھیا وے بڈھیا وے دوہنی بن کے (آوازیں: مسعود رانا، آئرن پروین)

☆ جاندیاں وے کے جدائیاں نی (آوازیں: مالا اور ساتھی)

یہ پنجابی فلم 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی اور معیار اور کاروبار کے لحاظ سے اطمینان بخش ثابت ہوئی تھی۔ تینوں پنجابی فلمیں کامیاب ثابت ہوئی تھیں، اس کے باوجود لقمان صاحب نے مزید کوئی پنجابی فلم ڈائریکٹ نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ وہ پنجابی زبان سے ناواقف تھے اور بخوبی بول اور سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس ضمن میں انہیں یقیناً پریشانی ہوتی ہوگی۔

لقمان صاحب کی اگلی فلم ''محل'' تھی جو کریسنٹ فلمز کے بینر تلے بنائی گئی تھی اور اس کے فلم ساز میاں احسان تھے۔ اس فلم کی کہانی ایک شہرۂ آفاق انگریزی ناول ''دی پریزنر آف زینڈا'' سے ماخوذ تھی جو نیم جاسوسی اور رومانوی تھی۔ لقمان صاحب نے اس بھرپور کہانی پر ایک کامیاب اور پُراثر فلم بنائی تھی۔ جتنی جاندار کہانی تھی اس پر اتنی ہی شاندار فلم بنائی گئی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ شاہکار فلم لقمان صاحب کی بنائی ہوئی تمام اردو فلموں میں سب سے زیادہ کامیاب تھی۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی نے لقمان صاحب کی ہدایت کارانہ ساکھ میں نمایاں اضافہ کیا تھا۔ اس دور میں یہ گولڈن جوبلی فلم ثابت ہوئی تھی۔ ''محل'' کے ہیرو محمد علی تھے جنہوں نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ اس کی کاسٹ میں زیبا، غزالہ، زمرد، نیلوفر، لہری، ادیب، اسلم پرویز، ساقی اور شاکر جونیئر دیگر آرٹسٹ شامل تھے۔ اسکرپٹ رائٹر ملک حفیظ تھے۔ جو نامور اداکارہ بہار بیگم کے والد محترم تھے۔ موسیقی رشید عطرے کی تھی گیت نگار فیاض ہاشمی اور تنویر نقوی تھے۔ اس کے نغمے درج ذیل ہیں۔

☆ آواز جب بھی دیں ہم، پہچان جائیے گا (آوازیں: مہدی حسن، بمبئی سیما۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ تری قسم ہے غلط میرا انتخاب نہیں (آواز: مہدی حسن۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ سنا ہے کہ دل دے کے دیتے ہیں دھوکا (آوازیں: احمد رشدی، رونا لیلیٰ۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ جیارا ترسے دیکھن کو (آواز: نور جہاں۔ بول: تنویر نقوی)

☆ بلم ہرجائی بجن ہرجائی۔ موسے جھوٹی پریت جتائی (آوازیں: نسیم بیگم، بمبئی سیما۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ دل والے بھلا کب ڈرتے ہیں (آواز: نسیم بیگم۔ بول: فیاض ہاشمی)

☆ جادوگر بین بجانے والے (آواز: نسیم بیگم۔ بول: فیاض ہاشمی)

''محل'' ایک مکمل تفریحی فلم تھی جس کی کہانی، موسیقی اور اداکاروں کی کردار نگاری سب ہی قابل تعریف تھی۔ واضح رہے کہ فیاض ہاشمی نے نہ صرف اس کے خوب صورت گیت لکھے تھے بلکہ مکالمے اور منظر نامے بھی ان ہی کے تحریر کردہ تھے۔ فلم کے اصل مصنف (انگریزی ناول کے رائٹر) انتھونی ہوپ ہیں جنہوں نے THE PRISONER OF ZEND کے علاوہ بے شمار ناول لکھے ہیں مگر ''محل'' کے ٹائٹل پر کہانی نویس کے طور پر ان کا نام نہیں لکھا گیا۔ بس مترجم ملک حفیظ کا نام دیا گیا ہے۔ ''محل'' 10 مارچ 1968ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی اور اس نے اپنے فلم بینوں کی عید کی خوشیاں دوبالا کردیں۔

ہدایت کار لقمان کی زیر ہدایت بننے والی اگلی فلم ''پاکیزہ'' تھی اس کے فلم ساز عزیز اللہ حسن تھے جب کہ یہ فلم جاوداں پروڈکشنز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ محمد علی نے اس میں ولن کا رول ادا کیا تھا جب کہ زیبا، زیبا، گل رخ، اعجاز، الیاس کاشمیری اور لہری بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ سلیم اقبال کی جوڑی نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ نغمہ نگاروں میں احمد راہی، ناظم پانی پتی اور تنویر نقوی تھے۔ ''پاکیزہ'' کی موسیقی بڑی دلنواز تھی۔ اس فلم کے کئی گیت مقبول ہوئے۔ اس کے گیت درج ذیل ہیں۔

☆ میں دیکھتا چلا گیا میں دیکھتا چلا گیا (آواز: احمد رشدی۔ بول: تنویر نقوی)

☆ تم تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا (آواز:

نور جہاں۔ بول: احمد راہی)

☆ آج کوئی آئے گا ہائے اللہ (آواز: نسیم بیگم۔ بول: تنویر نقوی)

☆ میری بلما کا دل بے ایمان ہو گیا (آوازیں: نسیم بیگم، نذیر بیگم و ساتھی۔ بول: ناظم پانی پتی)

☆ ایک دل تھا ہزاروں غم پائے (آواز: نسیم بیگم۔ بول: احمد راہی)

☆ اب چھوڑ نہ جانا مورے سیاں (آواز: فریدہ خانم۔ بول: تنویر نقوی)

''پاکیزہ'' 1968ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی اور اس نے درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔

ہدایت کار لقمان کی اگلی فلم ''ہمجولی'' تھی۔ آپ چونک کیوں گئے؟ اس لیے تو نہیں کہ لقمان صاحب کی بطور ہدایت کار پہلی فلم بھی ''ہمجولی'' تھی جو انڈیا میں بنائی گئی تھی اور اس کی نمائش 1946ء میں ہوئی تھی جو بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ جانے لقمان صاحب نے اس نام سے 1970ء میں دوبارہ فلم کیوں بنائی۔ اگرچہ اس فلم کی موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی اور اس کے نغمے تنویر نقوی نے تحریر کیے تھے۔ اس کے باوجود اس کا کوئی بھی گانا ہٹ نہ ہو سکا۔ اداکاری کے میدان میں بھی کسی نے بھی فنکارانہ جوہر نہیں دکھائے۔ اگرچہ نیر سلطانہ اور درپن جیسے بڑے فنکار بھی اس فلم میں موجود تھے۔ اس فلم کی کمزور کہانی اور بے ربط اسکرپٹ نے ''ہمجولی'' کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس کے گیت درج ذیل ہیں۔

☆ آنکھ میں غصہ بل ماتھے پر دل میں نیت پیار کی (آواز: احمد رشدی)

☆ کھٹ کھٹ میرے دل کا در کس نے کھٹکھٹایا۔ یہ کون آیا (آواز: آئرن پروین)

☆ بہار آئی بہار آئی۔ ہوئے ہیں باؤرے بھنورے (آوازیں: آئرن پروین، نظیر بیگم اور ساتھی)

☆ سن سن رے ہوا، مجھے سمجھا ہے کیا (آواز: آئرن پروین)

☆ مار ڈالا ہائے نجریا ملائی کے (آواز: نظیر بیگم)

قصہ مختصر یہ کہ لقمان صاحب کی غلط منصوبہ بندی کے نتیجے میں پہلی ''ہمجولی'' کی طرح دوسری ''ہمجولی'' کی جھولی بھی ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھری رہی۔

اسی سال یعنی 1970ء میں لقمان صاحب کی ایک اور فلم ''افسانہ'' ریلیز ہوئی جو غالباً بہتر پلاننگ کے تحت بنائی گئی تھی اس لیے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ خاص طور پر اس کے گیت بہت مقبول ہوئے۔ اس کے موسیقار ناشاد اور نغمہ نگار تسلیم فاضلی اور تنویر نقوی تھے۔ خوب صورت موسیقی اور جاندار گیتوں نے ''افسانہ'' میں خصوصی رنگ آمیزی کی۔ اس کی کہانی اور مکالمے انور سجاد نے بے حد متاثر کن اور جاندار تحریر کیے تھے۔ اچھی موسیقی، جاندار اداکاری اور شاندار ہدایت کاری نے اس فلم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وحید مراد، دیبا، روزینہ، ننھا، شاکر، وحیدہ خان، کمال ایرانی، زینت، نگو اور ادیب اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ عیدالاضحیٰ کے دن 17 فروری 1970ء کو یہ فلم ریلیز ہوئی اور پھر سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے والی فلم بن گئی۔ ''افسانہ'' کے چند مقبول گیت درج ذیل ہیں۔

☆ یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم
اب ہوش میں آنا مشکل ہے (آواز: مجیب عالم۔ بول: تنویر نقوی)

☆ ہم کو تمہارے سر کی قسم
پیار تمہیں کرتے ہیں ہم (آواز: احمد رشدی۔ بول: تنویر نقوی)

☆ سجناں کے ساتھ ساتھ
میں تاروں بھری رات (آواز: نسیم بیگم۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ رسائی ہو گئی ہے رسائی ہو گئی ہے (آواز: احمد رشدی۔ بول: تنویر نقوی)

☆ گلہ تو یہ ہے کہ کیوں ہم نے تجھ سے پیار کیا (آواز: مالا۔ بول: تسلیم فاضلی)

ہدایت کار لقمان کی ہدایات میں بننے والی اگلی فلم ''دنیا نہ مانے'' تھی۔ اس کی پروڈیوسر یاسمین شوکت تھیں۔ لقمان صاحب نے ایک بار پھر ناشاد کو موسیقی کا شعبہ سونپ دیا تھا۔ محمد علی، زیبا، لہری، راگنی، زمرد، سورن لتا، ساقی، الیاس کاشمیری اور مصطفیٰ قریشی نے کہانی کے اہم کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم بھی عیدالاضحیٰ کے دن 7 فروری 1971ء کو سینما گھروں کی زینت بنی تھی۔ اس کے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ سنا ہے چاند پر انساں رہیں گے
مگر ہم تم یہیں یک جاں رہیں گے (آوازیں: احمد

رشدی، مالا۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ الٰہی کوئی ہوا کا جھونکا
اڑا کے آنچل دکھا دے چہرہ (آواز: احمد رشدی۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ مل گیا ہو مجھے مل گیا
اک دلربا جانِ وفا مل گیا (آوازیں: احمد رشدی، مالا۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ جو ہنس کے سب کو رلاتے چلے ہیں (آواز: احمد رشدی۔ بول: تسلیم فاضلی)

☆ جب ٹوٹ جائے آس تو پھر جی کے کیا کریں (آواز: مالا۔ بول: تسلیم فاضلی)

اس فلم نے عید قرباں کے حوالے سے تماشائیوں کی خوشیوں کے گلے پر چھری پھیر دی۔

''پرچھائیں'' فلم ساز و ہدایت کار لقمان کی اگلی فلم ''کاوش'' تھی۔ اس فلم کے لیے بھی ناشاد اور تسلیم فاضلی نے موسیقی اور نغمہ نگاری کی ذمے داری نبھائی تھی۔ محمد علی اور زیبا نے اس فلم میں بھی ہیرو ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔ زیبا نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیے تھے۔ فلم میں ایک زیبا کا نام نجمہ اور دوسری کا شکیلہ تھا۔ دیگر کاسٹ میں ارشاد علی، مینا چودھری، زینت، منور سعید، ساقی، سیما، کمال ایرانی اور افضال احمد شامل تھے۔

اس فلم کے پہلے حصے میں ایک زیبا مر جاتی ہے جب کہ دوسرے حصے میں دوسری زیبا عدالت میں خود کو محمد علی کی بیوی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے لیکن محمد علی عدالت میں یہ بیان دیتا ہے کہ ان کی بیوی مر چکی ہے اور انہوں نے خود اپنے ہاتھوں اسے قبر میں اتارا ہے۔ تجسس اور سسپنس سے بھرپور یہ ایک دلچسپ فلم تھی لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود ''پرچھائیں'' کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ اور تو کوئی سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ لقمان صاحب نے بھارتی فلم ''میرا سایہ'' کا چربہ بناتے وقت اس میں کوئی نئی بات کوئی نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور تماشائیوں نے اسے انڈین فلم کی کاربن کاپی سمجھ کر لفٹ نہیں کرائی۔

اس فلم کے چند گیت

☆ کتنے نادان ہیں آج کل کے حسیں (آواز: احمد رشدی)

☆ میرے دل کو یہ یقین ہے مجھے تم بھلا نہ دو گے (آواز: مالا)

☆ اجنبی کا اعتبار ہو گیا رے یارشہ خوباں (آوازیں: مالا و ساتھی)

☆ شمع نہ بجھنے پائے وقت گزرتا جائے (آواز: مالا)

یہ فلم 8 مارچ 1974ء کو عام نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی جس کے بعد قائدین اور مبصرین کا کہنا تھا کہ اگر لقمان صاحب جیسے تخلیق کار اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائیں گے تو ان کا یہی حشر ہوگا۔ ''آدمی'' اور ''نکل'' جیسی فلمیں بنانے والا اگر چربہ سازی کرے گا تو ترقی کیسے کرے گا!!

لقمان آرٹ کے بینر تلے بننے والی اگلی فلم ''وفا'' فلم ساز و ہدایت کار لقمان کی آخری فلم تھی جو بھارت کے لی جنڈ اداکار دلیپ کمار کی تحریر کردہ کہانی پر بنائی گئی تھی۔ اس کی موسیقی خالد وحید نے ترتیب دی تھی اور اس کے ہیرو ان کے اپنے صاحبزادے فیصل لقمان تھے۔ خالد وحید اس دور کے معروف پاپ سنگر ہونے کے ساتھ ساتھ ملکہ ترنم میڈم نور جہاں کے داماد بھی تھے۔ اس فلم کے تمام گانوں کی دھنیں ملکہ ترنم کے گھر ہی پر تیار کی گئی تھیں۔ بابرہ شریف، فیصل لقمان، آصف رضا میر، ساقی، طالش اور اسلم پرویز ''وفا'' کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس کی کہانی اچھی تھی جس پر ایک اچھی فلم بنائی جا سکتی تھی مگر لقمان صاحب نے حسب روایت اپنی ناقص حکمتِ عملی سے اس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اپنے بیٹے فیصل لقمان کو بابرہ شریف کے مقابلے میں ہیرو بنا کر اور محض ایک پاپ سنگر خالد وحید کو موسیقی جیسے اہم شعبے کی ذمے داری سونپ کر فلم کی ناکامی کے تابوت میں مضبوط کیلیں ٹھونک دیں۔ اس طرح لقمان صاحب کی آخری فلم ''وفا'' بھی ان کے حق میں بے وفا ثابت ہوئی۔ یہ فلم ایسی ہی شاندار ناکامی کی مستحق تھی جو 1981ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی نمائش کے بعد خالد وحید بطور موسیقار پھر کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔ ہاں ان کی کمپوزیشن میں دو گیت مقبول ہوئے۔

☆ نظروں کو اور کوئی نہ جلوہ دکھائی دے (آوازیں: نور جہاں ہمراہ خالد وحید۔ بول: سرور انور)

☆ دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے (آواز: خالد

وحید۔ بکچرائزیشن: آصف رضا میر)

اس فلم کی سپر ناکامی کے بعد فلم والے لقمان صاحب کو کسی آسیب زدہ گھر کی طرح سمجھ کر ان سے دور دور رہنے لگے۔ خوف کھانے لگے۔ کنی کترانے لگے۔ ''نا بابا! ہمارا سرمایہ اتنا فالتو نہیں کہ ہم لقمان صاحب سے فلم بنوا کر راوی میں ڈبوتے رہیں۔''

یوں بھی فلم انڈسٹری اور اس سے وابستہ فلم ساز چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ جو انہیں کما کر دیتا ہے، ان کی تجوریاں بھرتا ہے۔ وہ چاہے رنگیلا کی طرح ہی کیوں نہ ہو، اس پر شوق سے سرمایہ کاری کرتے ہیں مگر وحید مراد جیسے ہیرو کی چند فلمیں ناکام ہو جاتی ہیں تو اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لقمان صاحب کی پے در پے ناکام فلمیں بنانے کے بعد ان کا یہی حشر ہونا تھا۔ انہوں نے ''فلمی دنیا کی ناقدری'' کا رونا بہت رویا۔ اپنے اس دور کے انٹرویوز میں اپنی بے بسی کا بہت واویلا کیا مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش اور وہ بھی بزبان درویش۔ کے مصداق کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی اور مجبوراً انہیں فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی اور اپنے آخری ایام میں کچھ دنوں تک ایک ٹی اسٹال اور کچھ عرصے تک ٹیلرنگ کی دکان بھی کی۔

ان کے اس حال زار پر کچھ فلم کاروں اور صحافیوں نے بڑی اثر انگیز تحریریں فلم بند کیں۔ ایک بڑے ہدایت کار کے ساتھ فلم انڈسٹری کی نامناسب سلوک کا مرثیہ لکھا لیکن حقیقت پسندانہ انداز میں لقمان صاحب کے کیریئر کا تجزیہ نہیں کیا۔

لقمان صاحب نے اپنے پورے فلمی کیریئر میں جو 35 برسوں پر محیط ہے صرف سترہ فلمیں بنائیں۔ جن میں آدھی فلم (ہجولی) بھارت میں اور سولہ پاکستان میں بنائیں انہوں نے قیام پاکستان کے بعد لاہور آکر پاکستان کی دوسری فلم ''شاہدہ'' بنائی اور تباہ حال فلم انڈسٹری کی از سرِ نو تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ بلاشبہ وہ پاکستانی فلمی صنعت کے اوّلین معماروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے پورے فلمی کیریئر میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ پاکستان میں جو 16 فلمیں بنائیں، ان میں نصف کے قریب ناکام ہیں۔ جو فلمیں کامیاب ہوئیں، وہ بھی کھڑکی توڑ اور سپر ڈپر ثابت نہیں ہوئیں۔ بس کسی نے سلور جوبلی کی اور کسی نے گولڈن جوبلی۔ باقی محض کامیاب فلموں میں شمار کی گئیں۔ انہوں نے تین پنجابی فلمیں بنائیں جو کامیاب ہوئیں مگر ان کا سلسلہ جاری نہیں رکھا۔ ان کی فلموں کی ناکامی کی وجہ سے نئی فلم حاصل کرنے میں کئی کئی برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔ ان کے مقابلے میں نذیر صاحب کا پاکستان میں فلم سازی کا دورانیہ محض 17 سال رہا جس میں انہوں نے زیادہ فلمیں بنائیں، کامیاب فلمیں بنائیں، پنجابی اور اردو زبان کی فلمیں بنائیں اور مزے کی بات یہ کہ ہدایت کاری اور فلم سازی کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کی۔ اس کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اچھے اداکار و ہدایت کار ہی نہیں، اچھے منصوبہ ساز بھی تھے۔ کس وقت کیسی فلم بنانی چاہیے، اس کا وہ بہت درست فیصلہ کرتے تھے۔ وہ بھی قیام پاکستان کے فوراً بعد لاہور آگئے تھے اور اس بے سروسامانی کے عالم میں آئے تھے، کوئی سال بھر تک بڑی کسمپرسی کی زندگی گزاری۔ اس وقت جو حالات تھے اس کا انہیں بھی سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے اپنی ہمت نہیں ہاری اور بڑی جوانمردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور حالات معمول پر آتے ہی اس افراتفری میں سرگرم ہو گئے۔

اس تناظر میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ لقمان صاحب کی سوچ، فکر، وژن جو فلم سازی اور ہدایت کاری کے لیے ضروری ہوتی ہے، اس معاملے میں وہ تسلی بخش صلاحیتوں کے مالک نہیں تھے۔ بہرحال انہوں نے جو اچھا کام کیا۔ اس کا انہیں صلہ بھی ملا۔ جو فلمیں اچھی بنائیں انہیں عوامی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ ان کی فلم ''آدمی'' کے لیے 1958ء میں انہیں بہترین ہدایت کار کا نگار ایوارڈ بھی ملا۔ جب کہ سرکاری سطح پر بھی انہیں سراہا گیا ان کی خدمات کے صلے میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس سے بھی نوازا گیا۔ پاکستانی فلمی صنعت کے اوّلین معماروں میں بھی ہمیشہ انہیں یاد رکھا جائے گا۔

انہوں نے اپنی آخری عمر کسمپرسی اور تکلیف میں گزاری۔ کچھ عرصہ علیل رہے اور آخر کار اسی علالت کے دوران 23 جنوری 1994ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین، ثم آمین۔

ملکہ

فرزانہ نگہت

سیر و تفریح ہر انسان کی کمزوری ہے۔ ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ تمام الجھنوں کو بھلا کر کچھ وقت تفریح کے لیے وقف کر سکے۔ وہ ایک شہزادی تھی اور تفریح کے لیے وطن سے دور، افریقا کے جنگل میں وقت گزارنے آئی تھی۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے اس نے درخت کے اوپر، شاخوں کے درمیان بنے ''بت'' کا انتخاب کیا تھا۔ وہ رات گزارنے پیڑ پر چڑھی مگر جب اتری تو دنیا کی قوی ترین ملکہ بن چکی تھی۔

میں شہزادی الزبتھ کے ساتھ کینیا کے دورے پر جانے کے خیال سے ہرگز خوش نہ تھی لیکن میں کیا کرتی؟ بکنگھم محل میں برپا ہونے والی پارٹی میں ملکہ میری، شاہ جارج ششم کی والدہ نے صاف اور واضح الفاظ میں مجھ سے کہا تھا۔ ''تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم شہزادی الزبتھ کے ساتھ لیڈی اِن ویٹنگ کی حیثیت سے جا رہی ہو، اس لیے تم اسے شہزادی الزبتھ یا مادام کہہ کر مخاطب کرنا لِلی بٹ کہہ کر نہیں۔'' یوں میرے لیے کسی حجت کی گنجائش نہ رہی۔

طے یہ کیا گیا تھا کہ چونکہ بادشاہ کی صحت انہیں کسی لمبے سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی کیونکہ حال ہی میں ان کا آپریشن

ہوا تھا اور ان کا رسولی سے متاثر پھیپھڑا نکال دیا گیا تھا، اس لیے ان کی جگہ شہزادی الزبتھ کو دولتِ مشترکہ کے ممالک کے دورے پر جانا چاہیے۔

جنوری 1952ء کی اس انتہائی سرد صبح بادشاہ اور ملکہ ہمیں الوداع کہنے ایئرپورٹ پر پہنچے۔ یہ پہلا موقع تھا جو بادشاہ کو اپنے آپریشن کے بعد پبلک میں دیکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ وہ اس موقع پر کتنے کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ بیٹی کو ہاتھ ہلاتے الوداع کہتے ان کے سفید بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔

سفر کے پہلے مرحلے تک میں ہی تنہا لیڈی ان ویٹنگ تھی۔ مستقل لیڈی ان ویٹنگ ہنریٹ پالمر دوسری ملازماؤں کے ساتھ ہم سے پہلے ہی بذریعہ بحری جہاز لندن سے روانہ ہو چکی تھی۔ انہیں اب ممباسا میں ہماری آمد کا انتظار کرنا تھا۔ وہاں سے ہمیں کینیا کے سفر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں شہزادی کے پرائیویٹ سیکریٹری کرنل مارٹن چارٹرس اور شہزادہ فلپ کے پرائیویٹ سیکریٹری ہنس مکھ آسٹریلین مائیک پارکر کے ساتھ تھی جو شہزادہ اور شہزادی کے نگراں کی حیثیت سے ساتھ تھا۔

میرا کام شہزادی کے لیے آئے ہوئے پیغامات کو اس تک پہنچانا اور وفود سے ملاقاتوں کے وقت اس کے ساتھ رہنا تھا۔ اس سے پہلے میں شاہی موٹر کار کے پیچھے پرائیویٹ سیکریٹری اور شاہی نگراں کے ہمراہ ایک الگ موٹر میں سفر کیا کرتی تھی اور اجتماعات میں اس کے پیچھے چلا کرتی تھی اور بیٹھا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے مداحین سے ملاقات کرتی تھی تو میں اس کا ہینڈ بیگ سنبھالے رکھتی تھی اور اسے پیش کیے جانے والے گلدستے بھی سنبھالتی تھی۔ میں روزانہ کی بنیاد پر آنے والے ان غیر سرکاری خطوط کے جواب بھی دیا کرتی تھی جو بڑی بھاری تعداد میں پہنچا کرتے تھے۔ اگر شہزادی کو شہزادہ فلپ کے بغیر کہیں جانا ہوتا تو اس کے ساتھ میں موٹر میں بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اگر وہ کوئی پارٹی دیتی تو اس کے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے سے پہلے میں ان کا استقبال کیا کرتی تھی۔

جب ہم کینیا پہنچے تو سورج کی تیز دھوپ میں پکی ہوئی مٹی کی مہک اور پھولوں اور پرندوں کے چمکتے دمکتے حسین رنگوں نے مجھے مسحور سا کر دیا۔ نیروبی میں چند دن ہنستے کھیلتے بچوں سے تعارف، فوجی دستوں کے معائنے اسپتالوں اور گرجاؤں کے دوروں، دعوتوں کھانوں اور ملنے ملانے کی مصروفیات میں گزارنے کے بعد ہم ساگانا لاج جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ یہ جانب شمال واقع ایک فشنگ لاج تھی۔ جو کینیا کے عوام کی طرف سے شہزادی اور شہزادے کو شادی کے تحفے کے طور پر دی گئی تھی۔ یہ ایبرڈیئر ماؤنٹینز میں کینیا کی ترائی میں واقع تھی۔ شاہی دستے میں، میں اور مائیک پارکر دو ہی افراد ان کے ہمرکاب تھے۔ میں نے اور شہزادی نے پہلی دو صبحیں گھڑ سواری میں گزاریں جب کہ شہزادہ فلپ اور مائیک پارکر ٹراؤٹوں والی ندی پر مچھلیاں پکڑتے رہے۔

تیسری شام ہم ایک کھلی چھت والی جیپ میں ٹری ٹاپس کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جسے تین سو سال پرانے ایک انجیر کے درخت کی شاخوں کے درمیان بنایا گیا تھا۔ اسے بنانے والا ایرک شریروک واکر تھا۔ اس ہوٹل کے نیچے پانی کی ایک جھیل تھی۔ اس جگہ جانے کے لیے ماؤنٹ کینیا کی طرف جانے والی ہاتھیوں کی ہجرتی گزرگاہ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ یہ راستہ جانوروں کے استعمال میں بھی رہتا تھا۔ شریروک واکر ہمارا گائیڈ تھا۔ اس نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم بالکل خاموش رہتے ہوئے چلتے ہیں۔ اگر کوئی ناگہانی آفت آن پڑے تو سرگوشیوں سے زیادہ اپنی آوازیں بلند نہ کریں۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ چلتے چلتے رک گیا اور ہوٹل کی چھت کی طرف اشارہ کیا جس پر سفید تکیے کا غلاف پھڑ پھڑا رہا تھا۔ یہ کسی خطرے کی علامت تھی۔ اس نے شہزادہ فلپ سے مشورہ کیا جنہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ''نہیں ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔'' قدرے توقف کے بعد شریروک نے صرف شہزادے اور شہزادی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ وہ بعد میں مجھے اور مائیک کو بھی آ کر لے جائے گا۔

شہزادہ اور شہزادی بحفاظت سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ اس وقت ایک ہتھنی اپنے بچوں کے ساتھ کھڑی انہیں دیکھتے ہوئے کان ہلا رہی تھی۔ اس کے اور ہوٹل والے درخت کے درمیان ایک کمزور سی باڑ حائل تھی۔ شہزادی اوپر پہنچتے ہی بڑے پُرجوش انداز میں وہاں آس پاس گھومتے پھرتے قسم قسم کے جانوروں کی تصویریں لینے لگی۔

لکڑی کا وہ ہوٹل بڑا سادہ سا بنا ہوا تھا۔ اس میں چار چھوٹی چھوٹی خواب گاہیں تھیں۔ ایک مختصر سا کمرۂ طعام ایک باورچی خانہ اور ایک بالکونی تھی جو ایک طرف سے نیچے چلی جاتی تھی۔ ہمارے لیے خواب گاہیں بڑی احتیاط اور عجلت سے تیار کی گئی تھیں لیکن یہ اسٹاف کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ ہوٹل کی چھت کے اوپر درخت کی شاخوں پر اچھلتے کودتے

بندروں کے نظارے کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتے جنہوں نے ہماری آمد سے پہلے اسٹور سے ٹوائیلٹ پیپر چرا لیے تھے اور اب انہیں اِدھر اُدھر اڑاتے پھر رہے تھے۔

اس رات ہم زیادہ نیند نہ لے سکے۔ چاند کے چڑھتے ہی وہاں ہمارے دیکھنے کے لیے بے شمار مناظر نمودار ہو گئے۔ یہ بہت دلچسپ اور سنسنی خیز مناظر تھے۔ جھیل پر مختلف النوع جانوروں کے غول کے غول پانی پینے آرہے تھے۔ ان میں ہاتھی بھی تھے جن کے بچے سونڈوں میں پانی بھر بھر کر بندروں پر اچھال رہے تھے جب کہ نوجوان ہاتھی آپس میں مصنوعی جنگ لڑ رہے تھے۔ جب ہم خوف آمیز خاموشی سے پتھرائے ہوئے سے یہ نظارے دیکھ رہے تھے تو اس وقت شاہِ برطانیہ جارج ششم چھپن سال کی عمر میں اپنی حکومت کے سولہ سال مکمل کرنے کے بعد بستر مرگ پر پڑے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اگلی صبح 6 فروری 1952ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور شہزادی الزبتھ جو سیڑھیاں چڑھ کر ٹری ٹاپس گئی تھی اگلے دن ملکہ کی حیثیت سے نیچے اتری۔

خفیہ الفاظ پر مشتمل سگنل فوراً ہی کینیا بھیج دیے گئے لیکن گورنمنٹ ہاؤس نیروبی میں کوئی بھی انہیں جاننے والا نہیں تھا کیونکہ خفیہ الفاظ کی کتاب گورنر، اپنے ساتھ ممباسا لے گیا تھا۔ وہاں اس نے اگلے روز ہمیں الوداع کہنا تھا۔

ٹری ٹاپس میں مختصر سی نیند کے بعد ہم ساگانا لاج پہنچ گئے۔ اس وقت ہم سب بے حد تھکے ہوئے تھے لیکن وہ سحر انگیز رات گزار کر بے حد مسرور و شاداں تھے۔ ہماری وہ صبح بے حد خوشگوار طلوع ہوئی تھی۔ ہم اس سے یکسر لاعلم تھے کہ برطانیہ میں کیا ہو رہا تھا۔ ہم وہ خبر سننے والے شاید دنیا کے آخری لوگ ہو سکتے تھے۔

بادشاہ کا خادمِ خاص جب انہیں جگانے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس نے انہیں بستر پر مردہ پڑے دیکھا تھا۔ بادشاہ کے خاص پرائیویٹ سیکریٹری نے تین بجے لندن میں اپنے معاون کو فون پر "ہائیڈ پارک" کے مرموز الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے وزیراعظم اور ملکہ میری کو اطلاع دینے کی ہدایت کی۔ پونے گیارہ بجے برطانیہ کی خبر رساں ایجنسیوں کو بادشاہ کی موت کی خبر عام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت ہم دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے اور اس وقت تک ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر شہزادہ فلپ اخبار کا مطالعہ کرنے لگے جب کہ شہزادی اپنے والد کو خط لکھنے لگی جس میں وہ انہیں بتانے لگی کہ اس نے وہاں کیا کیا تحیر کن اور عجیب و غریب نظارے دیکھے تھے۔ انہیں موقع ملے تو وہ بھی ضرور وہاں آکر ان سے لطف اندوز ہوں۔

اس دوران مارٹن چارٹرس ٹاٹری کے آؤٹ سپین ہوٹل کی لابی میں اپنے گروپ کے ساتھ ٹری ٹاپس جانے کا منتظر تھا جب ایک مقامی رپورٹر پیلا زرد چہرہ لیے ٹیلی فون بوتھ سے برآمد ہوا۔ اس نے مارٹن کو بتایا کہ اسے ایک اخباری نمائندے نے فون پر اطلاع دی تھی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ مارٹن کو اس خبر نے گنگ سا کر دیا۔ پھر وہ اس خبر کی تصدیق کے لیے بکنگھم محل فون کرنے ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا لیکن وہاں کسی سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ اس پر اس نے اس خبر کی تصدیق کے لیے ہم سے ساگانے لاج میں فون کیا۔ مائیک نے اس کی کال کا جواب دیا کہ ہمیں اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس پر مارٹن نے کہا کہ ہمیں وائرلیس کے ذریعے معلوم کرنا چاہیے۔

وائرلیس سیٹ اس نشست گاہ میں رکھا ہوا تھا جہاں اس وقت شہزادی بیٹھی خط لکھ رہی تھی۔ مائیک چپکے سے کمرے میں داخل ہوا اور شہزادی کے علم میں لائے بغیر وہاں سے وائرلیس سیٹ اٹھا لایا۔ بڑی کوششوں اور گھماؤ پھراؤ کے بعد ہم بالآخر بی بی سی تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اس وقت اس پر بادشاہ کے انتقال کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ مائیک فوراً ہی شہزادہ فلپ کے پاس پہنچا اور اسے یہ خبر سنائی۔ انہوں نے یہ سنتے ہی اخبار سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور انتہائی دل شکستہ سی آواز میں بولے۔ "یہ عظیم المیہ ہے۔" پھر انہوں نے شہزادی کو اپنے ساتھ باغ میں چلنے کو کہا۔ میں اور مائیک انہیں باغ میں ٹہلتے دیکھنے لگے۔ وہ نہایت سست روی سے ٹہل رہے تھے۔ میں جانتی تھی کہ شہزادی اپنے والد سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور وہ بھی اس سے بے حد پیار کرتے تھے۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو میں نے آگے بڑھ کر شہزادی کو لپٹا لیا، پھر ایک دم یہ یاد آتے ہی کہ وہ اب ملکہ ہے، اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بے حد خاموش اور سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہ بے حد افسوس ناک ہے۔ اس کا مطلب ہے ہمیں فوری طور پر وطن لوٹ جانا چاہیے۔"

جب تھوڑی دیر بعد مارٹن وہاں پہنچا تو اس نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہلانا پسند کرے گی؟

"الزبتھ...... یہی میرا نام ہے۔" اس نے کہا۔

یاجوج ماجوج

شکیل صدیقی

انسانوں کی ہزار ہا قسم ہیں۔ ہمارے آس پاس بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی انفرادیت حیران کردیتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل دو بھائی کس طرح لوگوں کو حیران کرتے تھے۔ ملکہ برطانیہ کو بھی انہوں نے حیران کردیا تھا۔ان دونوں بھائیوں کا مفصل تذکرہ پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب ''ابے ڈینہ۔ ابے شینہ'' میں بھی کیا ہے۔

سندھ کی سرزمین کے دو سپوت کا دلچسپ قصہ

سندھ کے دو ماسٹر تھے جو یاجوج ماجوج کہلاتے تھے۔ جوبلی کوارٹر کے ایک سندھی اسکول میں سندھی اور حساب پڑھاتے تھے۔ایک کا نام قاسم تھا اور دوسرے کا نام ذہن سے اتر گیا ہے۔ پڑھائی میں کافی نام پیدا کیا،لیکن اسکول سے باہر پاگل پنے کی حرکتیں کرتے تھے۔ بلیوں سے خاصی دوستی تھی۔ پوری تنخواہ انہیں چھیچھڑے کھلانے میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ بلیوں نے اپنے محسنوں کو پہچان لیا تھا۔گلیوں میں گھومتے تو آگے پیچھے بلیاں میاؤں میاؤں کر

کے چلتیں۔

وہ دونوں دنیا جہان کے ہر مسئلے پر لوگوں کی رہبری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے چنانچہ ہر سمت میں تاروں اور خطوط کی جھڑی لگائے رکھتے۔ 1937ء کے قریب ہٹلر نے جنگ کی شروعات کیں تو تار بھیجا کہ یورپ میں خون بہانے کی بجائے ہندوستان آکر انگریزوں سے جنگ کرو ورنہ شکست کھاؤ گے۔ یہ تار سنسر ہو گیا اور سی آئی ڈی کتنے ہی دنوں تک انہیں کھینچتی پھری۔ آخر انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں پاگل ہیں۔ دماغ خراب ہے، مگر نیت خراب نہیں۔ اللہ نے بلیوں کی دعا سن لی اور ان کی جان چھوٹ گئی۔

ایک پرانے دوست نے ان کے بارے میں قصہ سنایا۔ کہنے لگا۔ ''ایک بار انہوں نے برطانیہ کے شاہی گھرانے سے بھی ناتا جوڑ لیا تھا۔ ایک شہزادی (احتراماً نام نہیں لکھ رہا) کی منگنی کا چرچا ہوا اور اخباروں میں اس کی تصویریں بھی شائع ہوئیں تو بڑے ماسٹر کا دل آ گیا۔ فوراً شہزادی کے والد کو تار بھیجا کہ اپنی دختر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیجئے۔ میری علمی لیاقت یہ ہیں: سیاست میں یہ پوزیشن ہے کہ گاندھی جی بھی میرے مشوروں کے بغیر کام نہیں کرتے۔ ہمارے اس رشتے سے ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور برطانیہ کے سر کا درد ختم ہو جائے گا۔ لندن سے اس تار کی رسید آ گئی۔ محل کے سیکریٹری نے عام دستور کے مطابق چھپے ہوئے کاغذ پر رسید بھیج دی تھی۔ رسید کا مضمون وہی تھا جو ہر مراسلے کے جواب میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی آپ کا مراسلہ پہنچ گیا، اس پر غور کیا جائے گا۔ غالباً کسی کلرک نے تار پڑھے بغیر جواب میں استعمال کیا جانے والا فارم بھر کر بھیج دیا تھا۔

بہر حال رسید ملتے ہی ماسٹر صاحب کو دولھا کی ذمے داریوں کا احساس ہونے لگا۔ کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ مثلاً مذہبی قضیہ کو کیوں کر طے کیا جائے؟ آپ مسلمان اور شہزادی عیسائی، شہزادی کے مشرف بہ اسلام ہونے کی منزل نکاح سے پہلے آئے گی یا بعد میں؟ نکاح لندن میں ہوگا یا کراچی میں؟ جہیز اور آرسی کے سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟

مجھ پر ان کی خاص مہربانی تھی۔ رازداری کی باتیں اکثر مجھ سے ہی آ کر کیا کرتے تھے۔ ایک دن میرے گھر آ پہنچے۔ آگے آگے بڑے ماسٹر صاحب اور پیچھے ان کا چھوٹا بھائی۔ بڑے ماسٹر کے گلے میں پھولوں کا ہار۔ ہنستے مسکراتے نمودار ہوئے۔ چھوٹے بھائی نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ادا سائیں مبارک باد دیجیے۔ برطانیہ کی فلاں شہزادی سے ان کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ کہا اور لندن سے آئی ہوئی تار کی رسید جیب سے نکال کر دکھائی۔

میں نے مشورہ دیا کہ مذہبی معاملات پر شہر کے قاضی صاحب سے مشورہ کریں لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ کمشنر صاحب سے جا کر ملیں۔ یہ مراسلہ کمشنر صاحب کے پاس بھی آیا ہوگا۔ اگر انہوں نے سفارش نہ کی تو معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے چنانچہ پہلے ان سے ملاقات کر کے انہیں اس رشتے کو ائف سے آگاہ کریں اور اپنی طرف مائل کریں تاکہ وہ عمدہ سی رپورٹ تیار کر کے بھیجیں۔ میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ چونکہ برطانیہ کے شاہی خاندان کتوں بلیوں کے شوقین ہوتے ہیں اس لیے ماسٹر صاحب اپنی بلیوں کی تصویریں کھنچوا کر کمشنر صاحب کو دیں تاکہ انہیں بھی خط و کتابت کا حصہ بنایا جائے۔

سندھ کے کمشنر اس زمانے میں گبسن صاحب تھے جو ہنسی مذاق اور کھلنڈرے پن میں خاصے مشہور تھے۔ ماسٹر صاحبان بلیوں کی تصاویر کھنچوا کر ان کے پاس پہنچے۔ کمشنر صاحب کو تار کی رسید دکھا کر کہا کہ رشتے کی سفارش فرمائیں۔ گبسن انہیں پہچانتے تھے۔ ذرا سی دیر میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔

کہنے لگے اچھا کیا جو پہلے میرے ہی پاس چلے آئے۔ یہ خط و کتابت میرے پاس آئی ہوئی ہے اور میں رپورٹ بھیجنے سے پہلے انکوائری کر رہا ہوں۔ غالباً ایک رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ دولھا کی عمر پچاس برس ہے اور دلھن کی مشکل سے بیس برس۔ یہ بیل غالباً منڈھے نہ چڑھے۔

گبسن صاحب نے ماسٹر صاحب کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ اگر شہزادی والا معاملہ عمر کے فرق کے لحاظ سے کامیاب نہ ہو سکے تو اسی گھرانے کی دوسری شہزادی آج کل میرے پاس مہمان ہے۔ وہ آپ کی ہم عمر ہے۔ بلیوں کی شوقین ہے اور خاصی دولت مند ہے۔ اگر آپ قبول کر لیں تو یہ کام فوراً ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر گبسن صاحب نے نہ جانے کہاں سے ایک گوری میم بلوا کر انہیں دکھائی۔ معلوم نہیں ان کی اپنی بیوی تھی یا کیفے گرانڈ کی مالکہ۔ کیفے گرانڈ کی مالکہ ان دنوں ایک معمر عورت تھی جس کا تعلق فرانس سے تھا۔ لوگ اسے میڈم کہہ کر پکارتے تھے۔

ماسٹر صاحبان نے ان سے مہلت مانگی اور مشورہ کرنے کے لیے میرے پاس آگئے۔ میں نے کہا۔ "جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب نوجوان شہزادی مل سکتی ہے تو اس بڑھیا سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟ جلدی کا کام شیطان کا۔ کچھ دن بعد لندن کی شہزادی کی شادی ہوگئی اور ماسٹر صاحب کی امیدیں ماند پڑ گئیں۔

کراچی کے تقریباً سب ہی لوگ انہیں پہچانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب بھی ہندوستان میں کوئی آئینی مسئلہ یا وزارتوں کے بننے یا گرنے کا معاملہ سندھ میں پیدا ہوتا ہے تو ماسٹر صاحبان حسب دستور ہر معاملے میں ٹانگ ضرور اڑاتے ہیں۔ تاریں اور خطوط بھیج کر ہر متعلقہ فریق کو نوازنے لگتے اور ان مراسلات کی نقلیں اپنی جیبوں میں رکھتے۔

وہ ہمیشہ سندھ کے وزیروں سے ملاقات کے متمنی رہتے تھے تاکہ ان کی راہنمائی کر سکیں۔ میں وزیر بنا تو مجھے بھی مفت مشوروں سے نوازنے لگے۔ ایک بار دفتر کے پٹے والے نے ان کا ملاقاتی کارڈ لا کر مجھے دیا۔ چھپے ہوئے کارڈ میں ان کے ناموں کے نیچے تعریف کچھ یوں لکھی تھی:

"میکرز آف پاکستان، میکرز آف بندے علی منسٹری، بریکرز آف اللہ بخش منسٹری، اینی میز آف ہٹلر، آرکی ٹیکٹ آف انڈیا پاکستان فریڈم، ویل وشر آف جمشید مہتا پریزیڈنٹ کراچی میونسپلٹی، کنٹرولر آف سندھ منسٹریز، کلوز ٹو رائل ہاؤس آف برٹش، کنگز آف گاڈز اینڈ گوبلز۔

میں ان کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی جانتا تھا اس لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر جا کر ان کا استقبال کیا، پھر اندر لا کر انہیں اپنے پاس بٹھایا۔ وہ ہمارے وزیر اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار سے بہت ناراض تھے کیونکہ انہوں نے ان کی قدر نہیں کی تھی اور گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا تھا۔ فرمایا۔ "ہم پیرزادہ کو ہٹا کر تمہیں وزیر اعلیٰ بنانے آئے ہیں۔"

"یہ کیسے ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے کہ جب پیر موجود ہے تو نوزدگان کی کیا ضرورت ہے؟ یہ منطق کی رو سے درست ہے۔ منطق پڑھی ہے تم نے؟"

مجھے مذاق سوجھا، میں نے کہا۔ "پیرزادہ کو اسمبلی سے بے دخل کریں تب بات ہے۔"

"اسکیم تیار ہے۔ ہم خود جا کر پیرزادہ کی کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

یہ کہہ کر میرے پاس سے اٹھے اور وزیروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے اندر چلے گئے اور پیرزادہ کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ پیرزادہ صاحب اور میں اسمبلی میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے۔ پیرزادہ شگفتہ مزاج تھے۔ ماسٹر صاحب کو اپنی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مجھ سے پوچھنے لگے۔ "یہ کیا تماشا ہے؟"

"یہ کہتے ہیں کہ میکرز آف پاکستان ہیں، جو چاہیں کر سکتے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "دیر یا بدیر انہی کو آنا ہے۔ سیٹ انہوں نے پیشگی حاصل کر لی۔ ایک طرح سے ہمارے اور آپ کے سر کا درد ختم۔"

پیرزادہ نے بڑھ کر ان سے سیٹ خالی کرانا چاہی لیکن ناکام رہے۔

"ہم میکرز آف پاکستان ہیں۔ ہم نے تمہیں ڈس مس کر دیا ہے اور اب اس سیٹ پر ہم بیٹھیں گے۔ وزارت اعلیٰ ہمارے قبضے میں رہے گی۔" وہ بولے۔ ان کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جیسے وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہوں۔

اسمبلی کی گھنٹی بجنے لگی۔

پیرزادہ نے ان سے کہا کہ وہ شام کو ان کے دفتر آکر ملیں تاکہ مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکے۔ وہ اس پر بھی تیار نہ ہوئے تو سکیورٹی گارڈز کو بلا کر انہیں باہر دھکیل دیا گیا۔ وہ پیرزادہ کی شان میں نازیبا الفاظ بکتے ہوئے باہر چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے دھمکی دی کہ وہ ملکہ برطانیہ کو تار دے کر بتائیں گے کہ پیرزادہ وزارت اعلیٰ کے اہل نہیں ہیں۔

ماسٹر صاحبان کا نام یاجوج ماجوج کیوں تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا گاڑی کھاتے کے محلے میں تھا۔ جب کوئی بلی بیمار ہو جاتی تھی تو وہ اسے مسجد میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا کرتے تھے۔ مسجد کے امام زیادہ تر گھر ہی پر رہتے تھے اور نماز پڑھانے کے دوران ہی مسجد آتے تھے چنانچہ ماسٹروں نے مسجد کو محفوظ مقام سمجھ کر اس میں بلیوں کے رہنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مسجد میں بیمار بلیاں کیوں ٹہلتی پھرتی ہیں؟

"انہیں یاجوج ماجوج یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔" امام صاحب نے جواب دیا۔ اس دن سے ماسٹر صاحبان کا نام یاجوج ماجوج پڑ گیا۔

++

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے نورنتو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی

وہ غزالہ کی تصویر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ''واقعی یار مجھے معلوم نہ ہوتا تو..... بلا جھجک کہہ دیتا کہ یہ غزالہ نہیں کنول ہے۔ آنکھیں، ناک، چہرہ اور بال تک کنول جیسے ہیں۔ قد بھی وہی ہے۔'' ایک ہاتھ میں تصویر اور دوسرے ہاتھ میں جلتا ہوا لائٹر تھامے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ چاند کی روشنی کافی تھی پھر بھی وہ لائٹر کی روشنی ڈال کر اسے دیکھ رہا تھا کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لائٹر کا شعلہ بھڑکا، اس کے ہاتھ سے ٹکرایا اور پھر وہ ہو گیا جس کی اُمید نہیں تھی۔ تصویر والا

ہاتھ جلا تھا کہ نادانستگی میں تصویر ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہوا میں لہرائی اور کھائی میں گرنے لگی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا مگر اس نے غضب کی پھرتی دکھائی۔ تصویر کھائی کے ڈھلان پر اگی جھاڑیوں میں گری اور وہیں پھنسی رہ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی آسانی سے اسے اٹھالیا۔ اگر ڈھلوان پر جھاڑیاں نہ ہوتیں تو تصویر کھائی میں جا گرتی۔

دوبارہ سے تصویر کو اس کے ہاتھ میں دیکھ کر میرے سینے میں اٹکی سانس خارج ہوئی جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹلی ابھی تک بج رہی تھی۔ باڑہ گلی کی ہماری آخری شام کسی سحر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ٹہنیوں اور پتوں کو روندتے ہوئے آہستہ روی سے میس کی جانب بڑھ رہے تھے۔

☆......☆

ہر ایک خاموش اور کھویا کھویا بیٹھا تھا۔ بلب کی مدھم زرد روشنی میں سارے چہرے مزید افسردہ نظر آ رہے تھے۔ آج شام کوئی کسی کو نہیں چھیڑ رہا تھا۔ گلو پہلی بار مائیک سے تمیز کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ شاہ صاحب گہری سوچ میں کہیں گم تھے۔ جیکٹ کی جیب میں رکھی ایک تصویر میرے خون کی حرارت بڑھا رہی تھی۔ ہر بات کو مزاح کی جانب کھینچ لے جانے والا فرید خاموشی سے سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ سائیں کی مونچھیں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ نجانے کیوں سفر کی شام ہمیشہ ایک اداسی لیے اترتی ہے۔

قہوے کے دوران سب خاموش بیٹھے تھے۔ سردی کی وجہ سے شریف اللہ نے میس کا دروازہ بھیڑ رکھا تھا۔ شاہ صاحب نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے خود پہلی بار ٹرپ کا مزہ آیا۔ تم لوگوں نے مجھے طالب علمی کا دور یاد دلا دیا۔ رہا سوال ڈانٹنے کا تو میں تم لوگوں کو صرف اس لیے ڈانٹتا تھا کہ کہیں بے لگام نہ ہو جاؤ۔ مجھے کہیں سے شکایت نہ آئی کہ کسی نے کسی خاتون کو نظریں اٹھا کر دیکھا ہو۔ میں نے کون سا ٹرپ واپس لے کر چلے جانا تھا۔ ایسے ہی میرے کہنے پر تم سب ڈر جایا کرتے تھے۔“ پھر وہ شہزاد سے بولے۔ ”کل صبح دس بجے ہم نے یہاں سے نکل جانا ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہارا گروپ ایبٹ آباد یا براستہ مری واپس جائے گا؟“

ہمارا ارادہ تھا کہ ایبٹ آباد اور وہاں سے سیدھا پنڈی اور پنڈی سے شام کی ٹرین لے کر دریا خان اترتے۔ دو ملازم اور دوسرے گروپ کے چند لڑکے بھی ہمارے ہمراہ ہو گئے۔

کسی نے شاہ صاحب سے کہا۔ ”اگر گستاخی ہو گئی ہو یا کوئی بے ادبی ہو گئی ہو تو معافی چاہتے ہیں۔“

لطیف بھی سر جھکائے کہنے لگا۔ ”مجھ سے تو شرم کے مارے سر نہیں اٹھایا جاتا۔ تاش میں بار بار ہرایا۔ اُمید ہے معاف کر دیں گے۔“

یہ سن کر شاہ صاحب ناراض ہو گئے۔ ”صرف دو بار ہرایا اور اس کا ڈھنڈورا ابھی پیٹ رہے ہو۔ تم لوگوں کی نظر میں استادوں کی عزت یہ ہے۔ شکر ہے ٹرپ ختم ہوا اور میری جان چھوٹی۔“

طارق بولا۔ ”ندیم اور لطیف اشاروں میں ایک دوسرے کو پتے بتا دیتے تھے۔ آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔“

شاہ صاحب اب طارق پر بگڑے۔ ”میں احمق ہوں جو مجھے خبر نہیں ہوتی تھی۔ کھیل کے دوران وہ تین انگلیوں سے گھٹنے پر طبلہ بجا رہا تھا بعد میں اس کے پاس سے تین یکے نکلے تھے اور یہ طیفا، بار بار کان کھجلا رہا تھا، دہلا اس کے پاس سے نکلا۔ میں نے مروت میں چائے کیا پلا دی تو تم لوگ سمجھنے لگے شاہ صاحب بھولا بھالا انسان ہے اور اسے...... بنا لیں گے۔“

اس پر سب نے خوش ہو کر نعرہ بلند کیا۔ ”شاہ صاحب“ جواب سے میس کی دیواریں گونج اٹھیں۔ ”زندہ باد۔“

☆......☆

میں نے اور لطیف نے بیرک سے باہر دیوار کے ساتھ چارپائی بچھائی اور بیٹھ گئے۔ فضا سوگوار تھی...... ہم نیچے گدے بچھائے ہوئے تھے اور رضائیاں لی ہوئی تھیں۔ درخت خاموش کھڑے تھے۔ بادل ہٹ چکے تھے اور چاندنی چھٹک رہی تھی۔ تاروں کی بزم اوپر آراستہ تھی اور نیچے ایک محفل ہم نے لگائی تھی۔ میں نے اپنی کہانی کو وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹی تھی۔

”تم سمجھو گے غزالہ بار بار مجھ کو ستانے کے لیے روٹھتی تھی۔ نہیں یار! وہ مجھ کو لاڈ دکھاتی تھی۔ روٹھتی اس لیے تھی کہ اسے بار بار مناؤں۔ وہ ماننے میں کون سا وقت لیتی تھی؟ ایک مسکراہٹ پر وہ کھنچی چلی آتی۔ وہ خاموش رہنے والی لڑکی تھی مگر مجھ سے ملا تو شوخ ہو گئی۔ پیار کے احساس سے پہلی بار ہم دونوں ایک ساتھ روشناس ہوئے تھے۔ اس

احساس سے وابستہ خوشی سے ہم دونوں سرشار ہو رہے تھے۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ اسے بتاؤں۔ وہ میرے لیے کیا ہے۔ میں پیار کرتا اور وہ جتاتی تھی۔ وہ محبت کی ایسی ندی بن چکی تھی جو کناروں تک لبریز بہہ رہی ہوتی ہے۔ اس کو دل دے کر مجھے پتا چلا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے کسی سوچ میں کھویا دیکھ کر بھی لڑنے لگتی تھی۔ جب غصہ آتا تو صرف یہی کہتی کہ تمہارے ظالم بھائی نے میری مظلوم بہن کو چھوڑ دیا اور تم مجھ سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہو۔ میں اسے کیا سمجھاتا کہ ڈرتا ہوں اس بہانے سے جو اچانک آکر ہمیں کہیں دور نہ کر دے۔ وہ کندن تھی چاندنی تھی۔ وہ شاید ساحر تھی جو آہستگی سے میری روح میں سرائیت کرتی چلی گئی۔ جب بچھڑی تو مجھے مفلوج کر کے رکھ دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم پڑھنے کے لیے کمرے میں جا بیٹھے۔ وہ جب کتاب کاپی لے کر میرے قریب چارپائی پر بیٹھی تو اس کے کندھوں کا لمس مجھے دہکا گیا۔ اس کے کھلے بالوں سے آتی مہک نے مجھے ایکدم سے مدہوش کر دیا۔ سوچیں میری منتشر ہو گئیں۔ کتاب کے ہندسے مضمون پر ناچنے لگے۔ مجھے کپکپی سی ہونے لگی۔ مگر وہ بے پرواہ کتاب کھولے بیٹھی مجھے وہ سوال دکھا رہی تھی جو اس سے حل نہیں ہو سکے تھے۔ اچانک مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ میری ڈوبتی آنکھیں اور سرخ پڑتا چہرہ دیکھا تو بولی۔ ''تمہیں پسینا کیوں آرہا ہے؟ پنکھا تیز کر دوں؟''

''نہیں نہیں ایسے ہی دل گھبرا رہا ہے۔'' میں نے چونک کر کہا۔

یہ سنا تو اچھل پڑی۔ ''ہائے اللہ! دل کیوں گھبرا رہا ہے؟''

باہر کی جانب بھاگتے بھاگتے پھر پلٹ آئی۔ تہمینہ کو چلا کر کہا۔ ''تمی! جلدی آؤ پانی کا گلاس بھی بھر لاؤ۔ اسے کچھ ہو گیا ہے۔'' بازو کھینچ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے بیٹھو مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

''تم چپ رہو، بولو بالکل نہیں۔'' یہ کہہ کر میرے کندھوں پر زور لگائے مجھے چارپائی پر سیدھا لٹانے لگی۔ ''تم لیٹو میں جوتے اتار کر پاؤں ملتی ہوں۔''

میں سخت پریشان ہو گیا کہ کہیں جھلی تو نہیں، گھبرا کر کہا۔ ''پاگل ہو گیا؟ چھوڑ دو میرا جوتا۔ چھوڑ دو۔''

''ڈانٹو نہیں میرا بھی دل گھبرانے لگا ہے۔ تمی جلدی سے پانی لاؤ۔''

اتنے میں بوکھلائی تہمینہ گلاس تھامے تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''کیا ہو گیا ہے؟ دل گھبرا رہا ہے؟ ہائے اللہ ابھی تو ٹھیک ٹھاک بیٹھا تھا۔ لیمن جوس بنا لاتی ہوں۔ غزالہ تم ہاتھ والا پنکھا بھی جھلو۔''

''تمی یہ پانی نہیں پی رہا۔''

تمی بولی۔ ''پھر منہ پر ڈالو۔''

اس نے چلو بھر کر دو چھینٹے میرے منہ پر کھینچ مارے۔ میں واقعی اب گھبرا چکا تھا۔ مجھ پر چھائی ساری کیفیت وہیں بکھر کر رہ گئی۔ وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے والد صاحب کو جب ہارٹ اٹیک ہوا تھا تو انہوں نے یہی کیا تھا۔ ''دل گھبرا رہا ہے۔''

میں نے ان کے سامنے ہاتھ باندھے تو انہیں پھر کہیں جا کر بریکیں لگیں۔ وہ اب میرے سر پر کھڑی تھیں اور میں خوف سے ان کے چہرے دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی دوسرا تماشا کھڑا نہ کر دیں۔

دوبارہ بیٹھے تو میں نے ذرا سا فاصلہ درمیان میں رکھ چھوڑا۔ اب بولی۔ ''دور کیوں بیٹھے ہو؟''

''نزدیک بیٹھنے سے دل گھبرا جاتا ہے۔''

معصومانہ انداز سے پوچھا۔ ''وہ والا دل گھبرایا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو چھوئی موئی بن کر بیٹھ گئی۔ ''پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

میں نے عاشقانہ لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کیا کرتیں؟''

''دور دور بیٹھتی۔''

''قریب کب بیٹھو گی؟'' میں قریب ہوتے ہوئے بولا۔

وہ اور زیادہ شرما کر بولی۔ ''انشاء اللہ شادی کے بعد.....''

میں دوبارہ دور بیٹھ گیا۔

☆.....☆

میں اسے سیریس ہو کر پڑھانے لگا تھا۔ وہ حساب کا مشکل سوال بتاتی۔ اس پر رعب جھاڑنے کے لیے ذہن میں حل کر کے اس کا جواب پہلے ہی بتا دیتا۔ جب مکمل حیران ہو چکی ہوتی تو پھر اس کو حل کرنے کا طریقہ سمجھاتا۔ مجھے شک تھا کہ وہ آسانی سے نہیں سمجھ پائے گی مگر اس نے حیرت زدہ کر دیا، جب ایک سوال سمجھانے پر پوری مشق حل کر دی۔ وہ میرے اندازوں سے کہیں بڑھ کر ذہین تھی۔ میں دو تین گھنٹے

اسے دلجمعی سے پڑھاتا رہا۔ جب پڑھائی کے درمیان کوئی وقفہ لیتے تو وہ وہیں بیٹھے کاپی سے پچھلے صفحوں پر NG, NG لکھ کر سطریں بھر دیتی۔ اپنا اور میرا نام اکٹھے لکھ کر وہ خوش ہوتی۔

مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگی۔ ''آج سے آپ میرے پکے استاد ہیں۔ پڑھائی کے دوران ''آپ'' کہوں گی اور پڑھائی کے بعد ''تو اور تم'' بولا کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر کوئی یہ پوچھ لے کہ NG کا کیا مطلب ہے تو؟''

مسکرا کر بولی۔ ''بتاؤں گی استاد جی نے تعویذ بنا کر دیا ہے۔ ہر صبح اس کاغذ کو گھول کر پینا ہے تاکہ پیار کا سارا سبق یاد ہو جائے۔''

میں بولا۔ ''خدانخواستہ تعویذ الٹا نہ پڑ جائے۔''

''جو جادو تمہارا چڑھ چکا ہے اسے بنگال کا جادو بھی نہیں اتار سکتا۔''

دوسرے ہی دن میں ایک طرح سے ان کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ اس طرح گھل مل گیا جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔ بھول گیا تھا کہ نہ میں اس شہر کا باشندہ ہوں اور نہ اس گھر کا فرد۔ کبھی پڑھتے، کبھی باتیں ہوتیں اور کبھی ریڈیو پر نغمے سنتے۔

ایک دن گیا تو تہمینہ بولی۔ ''ابو کہہ رہے ہیں کہ ندیم سے کہنا شام کو مجھ سے ملنے تو آئے۔ ہر صبح آ کر چلا جاتا ہے۔''

میں دل میں شرمندہ ہو گیا۔ میں ہر روز خود ہی دوپہر سے پہلے کھسک جاتا تھا۔ ان کے والد کا سامنا کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ مجھے خوف تھا کہ وہ میری آنکھوں میں غزالہ کا چھپا پیار نہ دیکھ لیں۔ بعد میں اس خدشے کا اظہار میں نے غزالہ سے کیا تو وہ ہنسنے لگی۔ ''تم اس لیے چلے جاتے ہو؟ اور دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھاتے؟'' وہ میرے بازو پر چٹکی بھر کر بولی۔

''ڈرپوک۔ وہ ہر روز تمہارا پوچھتے ہیں۔ وہ تم کو اپنی بیٹی کا استاد سمجھنے لگے ہیں اور تم بھاگ رہے ہو۔''

میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ ''اب بولو، استاد کو ڈرپوک کہا ہے اور اتنے زور سے چٹکی بھی کاٹی ہے۔''

وہ درد سے کراہ کر بولی۔ ''میرا بازو تو چھوڑو، توڑو گے کیا؟''

''ایک شرط پر چھوڑوں گا۔''

''جلدی سے بتاؤ۔''

''مجھ سے شادی کرو گی؟''

''استاد جی شرم نہیں آتی۔ اپنی شاگرد کو شادی کا کہہ رہے ہو۔''

میں نے اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ سے نہیں پڑھاؤں گا۔ میں کوئی استاد وغیرہ نہیں تمہارا۔''

وہ مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پھر شادی کے بعد مجھ کو نالائق ہونے کے طعنے مت دینا۔''

شام کو ان کے گھر گیا تو اس کے والد بڑے تپاک سے چارپائی سے اٹھ کر ملے۔ دونوں بیٹیوں نے میری قابلیت بڑھا چڑھا کر بیان کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ بیٹی میتھ میں کمزور ہے تو تاکید کر رہے تھے اسے اس قابل کر دو کہ پاس ہو جائے۔ میں نے جب کہا کہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے گی تو تھپکی دے کر بولے۔ ''شاباش، رات کا کھانا کھا کر جانا۔''

تہمینہ بھی آ کر بولی۔ ''میں نے تندور سے روٹیاں منگوا لی ہیں۔''

مجھے کھانے کے لیے رکنا پڑا۔

کھانے کے دوران تہمینہ نے والد سے کہا۔ ''کل ہمیں چوک یادگار کڑھائی کے کپڑے لینے جانا ہے۔''

وہ اسے کہنے لگے۔ ''ندیم کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ پہلی بار پشاور آیا ہے تو اس کی بھی سیر ہو جائے گی۔''

حالانکہ میں کافی مرتبہ پشاور آ چکا تھا مگر تہمینہ کو بتایا کہ پہلی بار آیا ہوں۔ غزالہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں مسرور تھا کہ اس کے ہمراہ کل پشاور شہر کی سیر کروں گا۔

دوسرے دن صبح میں جلدی ان کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ آج اس کے دیے ایک سو تیس روپے اس کو لوٹا دوں گا۔ میں نے ان میں بیس روپے اپنے ملائے اور دس دس کے نوٹ بنا کر ایک سو پچاس روپے اپنے کرتے کی جیب میں علیحدہ رکھ لیے۔ دروازے پر دستک دی تو فوراً اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ تیار کھڑی تھی۔ میں دروازے میں کھڑا اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے صحن میں کھینچ لیا۔ ''اندر تو آؤ۔ غیروں کی طرح دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔''

میں تو اس کے خیال میں کھڑا تھا اور جب زور سے اس نے مجھے کھینچا تو تیزی کے ساتھ اس سے ٹکرا گیا۔ اس

سے پہلے کہ میں سے سنبھالتا وہ دیوار سے جا لگی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے آثار ٹھیک نہیں۔ سارا الزام مجھ پر دھرے گی۔

''بولو! دھکا کیوں دیا؟ کتنے ارمانوں سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ دیکھو سامنے چارپائی پر تکیہ بھی رکھا ہے۔ آج چائے نہیں تمہارے لیے لسی منگوائی ہے۔ کھن بھی ہے۔ کیچی بھی بھون کر پراٹھوں پر رکھ دی ہے مگر تم نے آتے ہی مجھے ایسا زور سے دھکا دیا کہ آج مرتے مرتے بچی ہوں۔ میرا سر پھٹ جاتا اور تم کو شادی نہ کرنے کا بہانہ مل جاتا۔''

''میں نے کہاں دیا ہے۔ وہ تو خود تم نے مجھے زور سے کھینچا۔''

''میں نے تو ہلکا سا ایسے کھینچا تھا۔'' میرا ہاتھ پکڑ کر ذرا سا اپنی جانب کھینچا اور میں نے تیزی سے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ بولی۔ ''دور تو ہٹو، ابھی تو بات کر رہی ہوں۔'' مجھے پرے کر کے بتانے لگی۔ ''میں نے ایسے ذرا سا کھینچا اور تمہارے دماغ میں فوراً آیا، موقع ہے بدلا لے لو۔ وہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے پیچھے دیوار تھی۔ مجھے لگ بھی رہا تھا تم کسی موقع کی تلاش میں ہو۔''

میں نے ملائمت سے کہا۔ ''غزالہ! تم سوچ سکتی ہو میں ایسا کروں گا۔''

''کیوں نہیں سوچ سکتی۔ اللہ نے دماغ دیا ہے تو سوچ بھی سکتی ہوں۔''

''پھر ذرا یہ بھی سوچو اگر تم گرنے لگتی تو اس طرح سے تھام نہ لیتا۔'' میں نے بڑھ کر دوبارہ اسے بانہوں میں لینا چاہا۔

''دور تو ہٹو، پہلے بات تو مجھے ختم کرنے دو۔''

''تم جلدی بات کرو ناں، تہمینہ آ جائے گی۔''

''آ جائے گی تو کیا ہوا۔ تم کیا سمجھتے ہو میں اس کے سامنے بات نہیں کر سکتی؟ ڈرتی ہوں اس سے؟''

میں سر جھٹک کر برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلی آئی۔ ''کہتا ہے تھام لیتا، خود کو تھام نہیں سکے اور مجھے کہتا ہے تھام نہ لیتا اس لیے خط میں بھی لکھ کر کہا تھا کہ کچھ کھایا پیا کرو، بالکل کانگڑی پہلوان لگ رہے ہو۔''

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے تہمینہ کا پوچھا تو بتایا ساتھ والے گھر سے کشیدے کے نمونے لینے گئی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ادھر میرے ساتھ چارپائی پر آ کر بیٹھو۔''

پوچھا۔ ''کوئی ضروری بات کرنی ہے؟''

''ہاں ضروری بات ہے۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''جب میں چلا گیا تو کس سے لڑا کرو گی؟''

وہ فٹ سے بولی۔ ''چپ کرو، چپ کرو، ایک لفظ مت بولنا۔ جانے سے صرف ایک دن پہلے بتانا ورنہ تمہارے جانے تک روتی رہوں گی۔''

اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ ''لگتا ہے تم کو میری عادت ہو گئی ہے۔''

''جی بالکل نہیں۔ عادت نہیں تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

''شادی تو کرو گی ناں مجھ سے۔''

شرما کر بولی۔ ''ایک نہیں سو بار کروں گی۔''

''منہ سے خیر نکال، شادی سو نہیں صرف ایک بار ہوتی ہے۔''

''جانتی ہوں۔ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ سو بار کا مقصد ہے کہ تم سے نہ ہوئی تو کسی سے نہیں کروں گی۔''

اس دوران میں نے دس دس کے پندرہ نوٹ جیب سے نکال لیے۔ ''تمہارے لیے کچھ نہیں لا سکا۔ یہ پیسے ہیں۔ آج جا رہے ہیں کچھ خرید لینا۔''

''نہیں تم خود دلا دو۔'' اٹھلا کر بولی۔

''تم یہ تو رکھو۔ ٹھیک ہے مل کر پسند کریں گے۔''

پیسے لیے اور انہیں پکڑے بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ سوچتے سوچتے آنکھوں میں چمک آئی تو اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ اندر سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی الماری یا ٹرنک کھول رہی ہے۔ باہر نکلی تو ہاتھ میں بہت سے پیسے تھے۔ بھاگ کر آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر وہ پیسے رکھ دیے۔

''بھائی کی شادی پر رسما جو پیسے ملے میرے حصے میں دو سو پندرہ روپے آئے۔ تم سے کہا تھا ناں کہ آؤ گے تو دروازے پر پھول پتیاں بچھاؤں گی۔'' پھر روٹھ کر بولی۔ ''آنے سے پہلے تو بتایا بھی نہیں کہ آ رہا ہوں۔ میں بھی تمہارے لیے کوئی تحفہ نہیں خرید سکی۔ یہ سارے پیسے لے لو۔ آج تم بھی اپنے لیے کچھ خرید لینا۔''

میں بت بنا اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جہاں اب بھی ناراضی چھائی تھی۔ مجھے مسلسل دیکھتے پا کر بولی۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔ بری لگ رہی ہوں ناں، مجھ سے تم

جان نہیں چھڑا سکتے۔ چڑیل کی طرح تم کو چمٹ گئی ہوں۔'' یہ کہہ کر کچن کی جانب گئی۔ جگ میں لسی بھری، پلیٹ میں مکھن اور کپڑے میں پراٹھے لپیٹے تھے۔ بولی۔ ''سارا کا سارا تم کھالو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

میں اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا متواتر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ معلوم نہیں پیار کی کس مٹی سے گوندھ کر بنی تھی کہ محبت سے رچی خوشبو اس میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اتنے میں تہمینہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ مجھے ناشتا کرتے دیکھا تو فر فر کہنے لگی۔

''ناشتا وہاں کیوں کر رہے ہو؟ قصہ خوانی میں نان اور پائے ملتے ہیں، وہیں کھاتے۔ میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ اچھا کوئی بات نہیں پھر بھوک لگ جائے گی۔ پیدل چلو گے تو ناشتا ہضم ہو جائے گا۔ غزالہ تم نے اسے ناشتا کیوں دیا؟''

تب غزالہ بولی۔ ''کرنے دو اسے ناشتا۔ رنگ دیکھو پیلا پیلا پڑ رہا ہے۔ اللہ کرے یرقان نہ ہو۔ کمزور اتنا ہے کہ ابھی ہاتھ پکڑا تو گر پڑا تھا۔''

کل مجھے ہارٹ اٹیک اور آج یرقان کرا دیا۔ سوچا اسے کہہ دوں کہ سیدھا مجھے لیڈی ریڈنگ اسپتال میں داخل کرا آؤ۔ یہ سوچ کر چپ کر گیا کہ پھر سے اپنا دماغ کھپائے گی۔

باڑہ سے آتی بسیں قریب ہی سے گزر کر خیبر بازار اتارتی ہیں۔ دونوں بہنوں نے کالے برقعے پہنے اور ہم اسٹاپ پر بس آنے کا انتظار کرنے لگے۔ کپڑوں کا تھیلا میں نے تھام رکھا تھا۔ بس آئی اور کچھ دیر بعد ہمیں خیبر بازار اتار دیا۔ ٹریفک کا رش تھا۔ سامنے پاکستان کا سب سے خوب صورت سنیما امان تھا۔ بائیں جانب پل کے ساتھ پارک ہوٹل کی عمارت تھی۔ دائیں جانب ایوب مینشن اور دوسری عمارتیں تھیں۔ جی ٹی ایس کی اومنی بسیں اور ڈبل ڈیکر چل رہی تھیں۔ خوب صورت سجی دکانیں اور صفائی دیکھ کر لگتا کہ میں کسی دوسرے ملک میں آ گیا ہوں۔

تہمینہ بولی۔ ''ناشتا تو تم نے کر لیا ہے۔ قصہ خوانی میں نہیں رکنا تو رکشا کر لیتے ہیں۔''

غزالہ کہنے لگی۔ ''نہیں نہیں، پیدل چلتے ہیں۔ چلے گا تو ناشتا ہضم ہو جائے گا۔ چوک یادگار پر کھٹے کچالو کھائیں گے۔''

ہم پیدل چل پڑے۔ خیبر بازار کی بڑی بڑی دکانوں میں الیکٹرونک کا سامان بھرا تھا۔ میں ارد گرد دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ بہت سے غیر ملکی گھوم رہے تھے جن میں بیشتر ہپی تھے۔ نشے کی لت میں پڑے یہ لوگ یورپ سے آ کر پشاور اور پھر کابل میں قیام کرتے تھے۔ کابل میں مجاہدین اور روسی افواج کی جنگ تھی تو سارا زور اب پشاور پر تھا۔ فٹ پاتھ کے کناروں پر بدحال ہپی لڑکے اور لڑکیاں میلے کچیلے بیٹھے تھے۔ رنگ زرد تھے اور آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ سکون کے متلاشی یہ لوگ حشیش میں پناہ لے رہے تھے۔ چلتے چلتے ہم قصہ خوانی میں داخل ہو گئے۔ قدیم دکانیں جن پر لکڑی کے چوبارے تھے۔ کپڑے، قہوے اور ڈرائی فروٹ کی بہت سی دکانیں تھیں۔ ایک ڈرائی فروٹ والی دکان مجھے دکھا کر تہمینہ بولی کہ یہ اداکار دلیپ کمار کے قریبی رشتے دار ہیں۔ پیدل چلنے والوں کا رش تھا۔ رکشے بھی بے تحاشا تھے۔ ہم فٹ پاتھ پر چلتے جا رہے تھے۔ خواتین بھی بہت تعداد میں شاپنگ کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہر جگہ دکانوں پر ہندکو بولی جا رہی تھی۔ قصہ خوانی بازار ختم ہوا تو تنگ گلیوں والے بازار شروع ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی جاپانی کپڑے سے بھری دکانیں تھیں۔ عورتوں کا رش یہاں زیادہ تھا۔ جاپانی استری اور الیکٹرونک کا سامان بہت بک رہا تھا۔ آگے مینا بازار تھا۔ یہ بھی تنگ سا لمبا بازار ہے۔ سلمیٰ ستارے اور کڑھائی کا کام کرنے والے خواتین سے دماغ کھپا رہے تھے۔ اوپر چوباروں پر بینڈ باجے والوں کی دکانیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں اور لکڑی کے چوبارے نہ معلوم کتنی مدت سے جوں کے توں کھڑے تھے۔

میں نے غزالہ سے کہا۔ ''تم اپنے لیے کوئی سوٹ یہاں سے لے لو۔''

''اچھا سا لوں؟'' بہن کو روک کر بتایا۔ ''اس نے مجھے ڈیڑھ سو روپے دیے ہیں۔ کہتا ہے کوئی سوٹ بنا لوں۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''یہ تو بہت زیادہ پیسے ہیں۔ اچھا سوٹ تو چالیس پینتالیس کا آئے گا۔ تم نے لیے کیوں؟''

بولی۔ ''ایسا کرتی ہوں ایک سوٹ لے کر باقی پیسے رکھ لوں گی۔''

''رکھ کیوں لوں گی۔ واپس کرا سے۔''

''نہیں کرتی واپس.....'' یہ کہہ کر میرے پاس چلی آئی۔ کہنے لگی۔ ''کہتی ہے باقی پیسے واپس کر۔ کیوں کروں۔ آج واپس کر دیئے تو کل اپنی کمائی میرے ہاتھ پر نہیں رکھو گے۔'' میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

وہاں اس نے اپنے لیے میرون کلر کا سوٹ خریدا۔ اس کے ہاتھوں میں اتنا نچ رہا تھا تو معلوم نہیں پہن کر اسے کیسا لگتا؟ وہاں اس نے بلو کے لیے بھی ایک سوٹ خریدا۔ خرچ چکی تو نوٹ گنتے ہوئے مجھ سے بولی۔ ''میرا خیال ہے تم رکھ ہی لو۔ بہت پیسے ہیں۔ تہمینہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔'' پھر گھورتی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ''مگر ساری تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھنا جیسے ابو امی کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔''

میں نے کہا کہ ابھی اپنے پاس رکھو۔ سمجھو یہ میری پہلی تنخواہ ہے۔ سوچتی رہی اور معصوم نے پتا نہیں کیا سوچا کہ پیسے اپنے پرس میں دوبارہ رکھ دیئے۔

آگے ایک اور بازار آیا جہاں چائے کی پتی اور پرندے بک رہے تھے۔ وہ دکانوں پر جھانکتی آگے بڑھ رہی تھیں اور میں اردگرد کا قدیم ماحول حیرت و شوق سے دیکھتا تھا۔

آگے مڑے تو سامنے ایک بہت بڑا چوک تھا۔ درمیان میں ایک یادگار بنی تھی۔ یہ چوک یادگار تھا۔ لوگوں کا ہجوم ہر جانب سے چلا آتا اور یہاں آکر آسانی سے سما جاتا۔ یہاں پہیوں کا قبضہ تھا۔ جوق در جوق بیٹھے آتے جاتے کو کھوکھلی نظروں سے تکتے تھے۔ لڑکیاں صحت مند ہوتیں تو یقین کروان سے بڑھ کر کوئی خوب صورت نہ تھا۔ یہاں کرنسی والوں کی بہت سی دکانیں ہیں۔ وہیں کئی ٹھیلے والے آلو، لوبیا، کچالو اور جنے چھولے کا ٹھیلا لگا کر کھڑے تھے۔ اتنی رونق اور مجمع دیکھ کر میں بے حد خوش ہو رہا تھا۔ میری خوشی کی سب سے بڑی وجہ تو غزالہ تھی جو میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں ہر چیز مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اس کی موجودگی میں نہ مجھے بھوک اور نہ پیاس لگتی تھی اور نہ ہی میں تھکتا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا ناشتا ہضم ہو گیا؟''

''پتا نہیں مگر کیوں؟''

''تم کو کھٹے والے ابلے ہوئے کچالو کھلاتی ہوں۔ بتاؤ ہضم ہوا۔''

''مجھے کیا معلوم ہضم ہوا کہ نہیں۔ کبھی کبھار بہت عجیب سوال پوچھتی ہو۔'' میں زچ ہو کر بولا۔

میرا منہ تکنے لگی۔ میرے لہجے کی ترشی برداشت نہ کر سکی۔ آنکھوں کے کونے فوراً بھیگ گئے اور اس کی سیاہ آنکھیں حیرت سے مجھے تک رہی تھیں۔ ایک دم مجھے احساس ہوا مگر تب تک میرے لہجے سے چھلنی ہو چکی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں۔ ٹھیک تو ہو۔'' میں فوراً لہجہ بدل کر پیار سے بولا۔

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''نہیں بولتی تم سے۔'' کہہ کر بہن کے پاس چلی گئی جو دکاندار کو کشیدہ کاری کے کپڑے دے کر کچھ سمجھا رہی تھی۔ میں سر جھکائے شرمندہ کھڑا خود کو کوس رہا تھا۔ جہاں اتنا پیار ملے وہاں کہا گیا ہے کہ ایک سخت لفظ محبت کے دریا کو آلودہ کر دیتا ہے۔ اسے دیکھا وہ مری جانب پیٹھ کیے بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا سراپا دیکھ کر میں پچھتاوں کی دلدل میں دھنس گیا۔

اس کے قریب جا کر بولا۔ ''غزالہ میری جانب دیکھو، ایک بات کرنی ہے۔''

مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ جو بے تحاشا پیار

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

کرے وہ حساس بھی بے پناہ ہوتا ہے۔ اس کا دل نازک آئینہ ہوتا ہے جو ہلکی سی ٹھوکر سے کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ وہ ناراضی کی حالت میں کھڑی رہی۔ میں نے جب کندھے پر ہاتھ رکھ کر بات دہرائی تو گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو چوٹ سیدھی دل پر آ لگی۔ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آواز نکلی۔

''روؤ نہیں، ورنہ قسم سے مر جاؤں گا۔'' جذبات سے میری آواز بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر آئیں اور آنسوؤں کی نمی میں نے اپنے دل پر محسوس کی۔ میری کیفیت دیکھی اور محبت کا الاؤ اس کے ماتھے پر چمکنے لگا۔ یوں تو روٹھی تھی مگر آنسوؤں سے بھری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ میری نم آنکھیں دیکھ کر اپنا موڈ فوراً بدلا۔ ہاتھ چھوڑ کر بولی۔ ''تم رونے لگے؟''

میں شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''پیار کرنے والوں کو تو سب کے لیے نرم لہجہ رکھنا پڑتا ہے اور یہاں کوئی اور نہیں میرا اپنا پیار تھا۔''

مصنوعی حیرت اپنے معصوم چہرے پر لا کر بولی۔ ''کیا بات کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟''

''ہر بات پر لڑتی ہو، اب کیوں نہیں لڑ رہی۔ تمہاری محبت کی مہک مجھے اور زیادہ شرمندہ کر رہی ہے۔''

کہنے لگی۔ ''لگتا ہے ناشتا ہضم ہو گیا ہے اسی لیے بھوک سے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تہمینہ فارغ ہو جائے پھر کچالو کھلاتی ہوں۔''

پھر گیلی پلکیں جھکا کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔

تہمینہ واپس آئی تو یہ مجھے ایک طرح سے دھکے لگاتی ٹھیلے تک کھینچ لائی۔ ریڑھی پر بڑے بڑے ابلے ہوئے کچالو پڑے تھے۔ ریڑھی والے نے کچالو چھیل کر اس کے ٹکڑے کیے۔ بڑے بڑے پیالے ان سے بھرے۔ دنیا بھر کا مسالا ان پر ڈالا اور بہت سا کھٹا نچوڑ کر پیالے ہمیں پکڑا دیے۔ ہم کھاتے جا رہے تھے اور تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس بھی رہے تھے۔ آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا تو غزالہ نے اپنا دوپٹا مجھے پکڑا دیا۔ اس دن ریڑھی پر کھڑے ہو کر کچالو کھانے کی لذت میں ابھی تک نہیں بھول سکا۔

کچالو کھا کر وہ سوں سوں کرتی ہوئی تہمینہ سے بولی۔ ''شرط لگاتی ہوں اس نے مسجد کے فوٹو بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

تہمینہ نے جواب دیا۔ ''وہ تو دیکھے ہوں گے۔ رسالے وغیرہ بہت پڑھتا ہے۔''

میں اس کے ہمراہ چل رہا ہوں اور یہ آپس میں بحث کر رہی ہیں۔ یہ نہیں کہ میرے متعلق بات ہے تو مجھ سے پوچھ لیں۔ جب معلوم ہوا کہ وہ مسجد صابت خان مجھے دکھانا چاہتی ہیں۔ میں خود ہی بول پڑا کہ تصویریں بھی نہیں دیکھیں تو پھر دوبارہ تہمینہ سے اس نے کہا۔

''مجھے اس کی سب باتوں کے بارے میں پتا ہوتا ہے۔ بہت سی اس کی باتیں تو اس کو بھی معلوم نہیں ہوتیں۔ میں اسے بتاتی ہوں۔''

اتنے میں ہم جیولرز بازار میں آ گئے۔ دونوں جانب زیورات سے بھری دکانیں تھیں۔ میں نے ایک دکان سے اس کے لیے چاندی کی انگوٹھی خریدی۔ انگوٹھی میں جڑا لال موتی اس کی انگلیوں میں آ کر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ کان میں آ کر آہستگی سے بولی۔ ''شک تو ہے ڈانٹو کے ضرور۔ مگر ایک بات کرنی ہے۔''

میں نے کہا کہ اگر یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ کچالو ہضم ہوئے ہیں کہ نہیں تو قسم کھاتا ہوں ابھی نہیں ہوئے۔ بلکہ ابھی تو منہ میں ہیں۔

وہ بولی۔ ''نہیں دوسری بات ہے۔ ایسا کرتے ہیں انگوٹھی شادی سے پہلے دلا دینا۔ اس وقت تک میرے ہاتھ بھی بڑے ہو جائیں گے۔ اس کا پھر کیا کروں گی۔''

حیرت سے با آواز بلند بولا۔ ''شادی پر چاندی کی انگوٹھی دوں گا؟'' پھر فوراً ہی پیار سے کہا۔ ''تب تو ہیرے کی انگوٹھی دوں گا۔''

''سچ۔'' یہ کہہ کر انگوٹھی پہنی اور انگلیاں آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے دیکھنے لگی۔

تاریخی مسجد صابت خان کا ایک دروازہ اسی بازار میں ہے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا بہت سے نمازی صحن کے ایک بڑے حوض کے گرد بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ اس مسجد کی بناوٹ بادشاہی مسجد کی طرح کی ہے۔ وہی وسیع صحن، وہی بڑا ہال۔ اسی طرح کے نقش و نگار۔ ہماری طرح کے اور ٹورسٹ بھی مسجد دیکھنے آئے ہوئے تھے۔

مسجد دیکھ کر باہر نکلے اور رکشا میں بیٹھ کر قدیم جی ٹی روڈ پر سکھوں کا بنایا قلعہ بالا حصار دیکھنے آئے۔ قلعہ ایف سی کے کنٹرول میں ہے لہٰذا دور سے اس کے در و دیوار دیکھتے رہے۔ جی ٹی روڈ پر ٹریفک بہت تھی۔ ہم تھکے ہوئے تھے تو سامنے جناح پارک میں آ بیٹھے۔ میں گھاس پر دراز ہو گیا۔ مجھ سے پوچھا۔ ''تھک گئے ہو؟'' میرے جواب دینے سے

پہلے ہی وہ تہمینہ سے لڑنے لگی۔

''میری بات تو مانتی بھی نہیں ہو۔ دیکھو ہم سب آئے اور یہ آتے ہی لیٹ گیا۔ کہا نہیں تھا کانگڑی پہلوان ہے۔ حالانکہ ابھی پیالہ بھر کر کچالو بھی اسے کھلائے ہیں اور پھر بھی تھک کے بے ہوش پڑا ہے۔''

تہمینہ مجھے دیکھ کر ہنسے جا رہی تھی۔ میں بھی لیٹا رہا۔ تہمینہ بولی۔ ''میں ڈرنک لے کر آتی ہوں۔''

وہ گئی اور یہ مجھے گھورنے لگی پھر بولی۔ ''لیٹے کیوں ہو؟ میں بیٹھی ہوں اور خود لیٹ گئے، اٹھو۔''

میں بیٹھ کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس کو رازداری سے بتایا۔ ''ایک بڑی پریشانی لگی ہے۔ سوچتا ہوں کس طرح بتاؤں۔''

بوکھلا کر پوچھا۔ ''ہائے اللہ کیا پریشانی ہے؟ کیوں مجھے دہلائے جا رہے ہو۔ بہانہ تو نہیں کر رہے کہ ماں نے میری منگنی کہیں اور کر رکھی ہے۔ میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''نہیں نہیں کوئی منگنی نہیں ہوئی۔ وہ تو صرف تم سے کروں گا۔''

''اور شادی بھی؟''

کہا۔ ''ہاں وہ بھی.....''

مکمل مطمئن ہو کر بولی۔ ''اس کے علاوہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''تم وہ دو سو پندرہ روپے ابھی میری امانت سمجھ کر رکھ لو۔ اپنے لیے کوئی چیز خریدتا ہوں تو ماں پکڑے گی کہ تبلیغ پر گئے تھے کہ کسی بڑے شہر خریداری کرنے اور یہ پیسے کہاں سے آئے؟''

پھر ٹھوڑی پر بایاں ہاتھ ٹکائے بہت دیر سوچتی رہی، سوچ کر بولی۔ ''میرا بتا دو، آخر ایک دن بتانا تو ہے۔''

''ابھی نہیں بتانا۔ جب میڈیکل کرنے پشاور جاؤں گا تو یہیں بیٹھ کر کوئی منصوبہ سوچ لیں گے۔''

''اگر تمہاری ماں نہیں مانی۔''

''کیوں نہیں مانیں گی۔ اتنی خوب صورت، نیک اور سلیقہ شعار بہو مل رہی ہے۔ وہ تو شکرانے کے نفل پڑھیں گی۔ تم بس میری یہ امانت رکھ لو۔''

اٹھلا کر بولی۔ ''خوش نصیب ہیں جو میری جیسی بہو ملے گی مگر یہ بتاؤ امانت لینے واپس کب آؤ گے۔''

''دو ماہ بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ آ جاؤں گا۔ مجھ پر اعتبار تو ہے ناں؟''

وہ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''اعتبار تو سو فیصد ہے مگر ابھی پورا یقین نہیں ہے۔ جیسے ابھی کھڑے کھڑے ڈانٹ دیا تھا۔ کیا معلوم ایک دن کھڑے کھڑے مکر جاؤ کہ میں نے تو کوئی امانت نہیں رکھوائی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے جیب سے پیسے نکالے۔ اس کے ہاتھ پر تھماتے ہوئے بولا۔ ''جب اعتبار کر لیا ہے تو یقین آنا نہ آنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل چیز اعتبار ہے۔ وہ ہو جائے تو یقین آتا ہے یا نہیں، اس کی فکر مت کیا کرو۔ ویسے بھی یقین آنے جانے کی چیز ہے۔''

نوٹ پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''بڑے چالاک ہو۔ یہ باتیں رسالوں میں پڑھتے ہو گے مگر بتا دوں امانت لینے نہ آئے تو اعتبار بھی اٹھ جائے گا۔ جب اعتبار اٹھ گیا تو سمجھو غزالہ تمہارے ہاتھ سے گئی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاتھ ملاؤ۔ مسلمانوں والا وعدہ کرتا ہوں ضرور آؤں گا۔''

''پاگل ہو کیا کہ ہاتھ ملاؤں۔ وہ بھی لوگوں سے بھرے پارک میں۔'' پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''کل کہو گے مجھے گلے بھی لگاؤ۔''

میں نے شرارت سے پوچھا۔ ''پھر کب.....؟''

شرما کر کہا۔ ''شادی کے بعد.....''

میں نے کہا۔ ''گلے تو پہلے بھی ڈیرہ میں میرے لگی تھیں؟''

''وہ والا تو مل سکتی ہوں مگر دوسرے والا نہیں۔ تہمینہ نے مجھے سختی سے منع کیا ہے۔ بے حیا ہوں کیا؟''

میں مسکراتا ہوا لیٹ گیا۔

لیٹے لیٹے اس سے کہا۔ ''ڈیرہ میں کتنی خاموش اور شرمائی شرمائی رہتی تھی۔ یہاں میں آیا تو لگتا ہے تمہیں پر لگ گئے ہیں۔''

پریشان ہو کر پوچھا۔ ''بہت زیادہ بول رہی ہوں۔''

''معلوم نہیں کتنا بول رہی ہو؟ مگر مجھے تمہارا یہ بولنا، مجھ سے ناراض ہونا اور پھر میرا خیال رکھنا..... سب بہت اچھا لگا ہے۔''

پھر کھسک کر میرے قریب آ گئی۔ ''تہمینہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ تم بولتی رہتی ہو اور وہ بے چارہ چپ چاپ بیٹھا تم کو دیکھتا رہتا ہے۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اس کو کہہ دیتی وہ مجھے دیکھنے ہی تو

آیا ہے۔"

یہ سن کر وہ خوش ہو گئی۔ کھسک کر اور زیادہ قریب آ کر کہنے لگی۔ "میں نے اس سے کہا کہ تھوڑے دنوں کے لیے تو آیا ہے۔ اب تین ماہ بعد آئے گا۔ بھائی کی طرح اللہ کرے خود بھی بے وفا نہ ہو۔ معلوم نہیں آتا ہے کہ نہیں۔" یہ کہہ کر اداس ہو گئی۔ پھر بولی۔ "میں نے اس کو کہا کہ اتنی باتیں اس سے کر لوں کہ تین ماہ تک میرے علاوہ کسی کو یاد بھی نہ کرے۔ میرے لیے اتنا تڑپے کہ نیند بھی اسے نہ آئے اور تین ماہ سے پہلے ایک ماہ میں ملنے آ جائے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا تو چڑ کر بولی۔ "بات تو کرنے دو۔ بولنے بھی نہیں دیتے۔"

"ہاں ہاں وہی تو پوچھ رہا تھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر تہمینہ بولی کہ میرے سامنے اس سے جھگڑا کر رہی ہو۔ میں نے اس کو صاف بتا دیا کہ جھگڑا وہ شروع کرتا ہے۔ میں صرف جواب دیتی ہوں مگر بدنام ہو جاتی ہوں۔" پھر آہستگی سے بولی۔ "میں نے اس کو کہا کہ ہم پہلے صرف بہنیں تھیں اور اب سہیلیاں بھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی رازداں بھی تو ہیں۔"

"رازداں؟ کون سے راز رکھے ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اپنے ہاتھ کی تھاپ میرے گھٹنے پر مارتے ہوئے بولی۔ "بالکل بدھو ہو۔ یہ راز ہی تو ہے کہ تم مجھ سے اور تہمینہ شکیل سے پیار کرتی ہے۔ یہ راز تب کھلے گا جب ایک گھر سے دو براتیں نکلیں گی۔"

میں پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے تہمینہ سے کہہ دیا ہے کہ ندیم اپنے بھائی سے بات کرے گا۔" پھر مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اس کو اپنی طرف سے کہنا کہ اتنی خوب صورت لڑکی تم سے پیار کرنے لگی ہے تو اللہ کے ناشکرے مت بنو۔ جن تو تمہارے ہاتھ کبھی نہیں آئے گا اور ایسا نہ ہو کہ اس کو بھی کھو دو۔"

"یہ تم کو تہمینہ نے بولا ہے کہ میں شکیل سے بات کروں؟"

"ہاں اور میں نے اس سے کہا تو میری نہیں ہے جو اتنا میرے لیے کر رہی ہے تو میں اس سے بڑھ کر کروں گی۔ دیکھتی نہیں ندیم میری مٹھی میں ہے۔ جو کہوں گی وہی کرے گا۔"

میں سن کر مضطرب ہو گیا۔ میں سمجھا تھا کہ جو تہمینہ شکیل کا تذکرہ میرے سامنے نہیں کر رہی تو اسے بھول بیٹھی ہو گی مگر وہ تو دھن کی پکی نکلی اور میں اس پر حیران تھا کہ غزالہ بہن کے سامنے کس طرح میرے ساتھ بے باکی سے بات کرتی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں اپنے دل ایک دوسرے کے سامنے کھول کر بیٹھی ہیں۔ میرے راستے محدود ہوتے جا رہے تھے۔ جھوٹ بول کر پھنستا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنا اور غزالہ کا تعلق کبھی مضبوط اور اکثر کمزور لگنے لگا۔ میں اور غزالہ اگر ایک بندھن میں بندھ جاتے تو اس جھوٹ نے کھلنا ہی کھلنا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ایک بڑا جوا کھیل کر سچ بتا دوں گا۔

غزالہ مجھ سے بولی۔ "تم نے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ وہ اسی لیے تو خود ڈرنکس لینے گئی ہے کہ میں تم سے بات کر سکوں۔"

میں نے سامنے دیکھا تو وہ کولڈ ڈرنکس لیے چلی آ رہی تھی۔

وہ واپس آئی تو اسے یقین تھا کہ غزالہ مجھ سے بات کر چکی ہے۔ اس کے چہرے پر حیا، خوشی اور پیار تھا۔ میں بیٹھا اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ کیا آس لیے بیٹھی تھی۔ چہرے پر امنگیں تھیں۔ میری جانب اُمید بھری نظر سے دیکھتی تو میرا دل کٹ جاتا۔

غزالہ اسے اشاروں کنایوں سے بتا رہی تھی کہ جو تیر مارنا تھا وہ میں نے مار لیا ہے۔

میں نے تہمینہ سے پوچھا۔ "کبھی شکیل نے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا؟"

"اس کے لیے لفظوں سے کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ ڈیرہ میں ہم ایک دوسرے کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ وہ تو بہت شرمیلا تھا۔ پشاور بھی ملنے آیا تو شرما کر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکو گے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا زیادہ پیار کرتے ہیں اور اپنی ساری باتیں میں تم کو بتا بھی نہیں سکتی۔" پھر میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں کی شکل ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ میں جانتی نہ ہوتی تو دھوکا کھا جاتی۔"

غزالہ بات اچک کر بولی۔ "مجھے یاد ہے۔ تم اگر مجھے نہ بتاتے تو تم کو بھی شکیل ہی سمجھتی۔" پھر اپنے ہاتھ کی انگلیاں اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ تم سے ملنے آ گیا تو کس طرح سے اسے پہچانو گی۔"

تہمینہ اس سے بولی۔ ''فکر نہ کرو۔ وہ مجھے پہچان لے گا۔'' یہ کہہ کر خود ہنسنے لگی۔

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر تہمینہ سے پوچھا۔ ''اگر وہ کسی اور سے پیار کرتا ہو تو.....؟''

اس کا رنگ ایکدم فق ہو گیا۔ چہرے سے جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔ ''نہیں ایسا مت کہو۔ وہ میرے علاوہ کسی اور سے پیار کر بھی نہیں سکتا۔''

''پھر ڈیرہ میں ملنے کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ تم اس کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''شاید میرا پیغام اسے نہ ملا ہو؟''

''تمہارا پیغام اسے حرف بہ حرف مل گیا تھا۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے اس سے ایک بار بات ضرور کرنی ہے۔ جب تک وہ میرے سامنے آ کر یہ نہ کہہ دے کہ میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔ تب تک میں کسی کی بات کا یقین نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

غزالہ مجھ سے بولی۔ ''اس کو تسلی دو۔ تم تو اسے رلا رہے ہو۔''

میں نے تہمینہ سے کہا۔ ''تم غزالہ کی بہن ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ویسے بھی بہت اچھی لگتی ہو۔ تم کو اپنی دوست سمجھتا ہوں تم سے اپنی ہر بات آسانی سے کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ کیا ایسا کروں کہ خوش ہو جاؤ۔''

غزالہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''تم زیادہ نہ سوچو۔ صرف یہ کرو کہ اسے تہمینہ کے سامنے لے آؤ۔'' پھر تیکھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''اب یہ مت کہنا کہ اسے سامنے بھی نہیں لا سکتا اگر اس کی تہمینہ سے ملاقات نہ کرائی تو تم کو بھی تمہارا پیار نہیں ملے گا۔''

سن کر میں تڑپ کر رہ گیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ کمزور لہجے میں بولا۔ ''اللہ کرے تمہاری بہن ہمیشہ خوش رہے۔ اس کو وہ ملے جو اسے بہت چاہتا ہو۔ اس کے لیے دعا کرو مگر مجھ کو تو بددعائیں مت دو۔''

میں اپنے آنسو تھامے آہیں روکے بیٹھا تھا۔ میری حالت دیکھ کر غزالہ پریشان ہو گئی۔ میرے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری تو صرف آنکھیں بھیگی تھیں مگر اس نے آنسوؤں سے اپنا چہرہ بھگو لیا۔ میں اس سے ہرگز خفا نہ تھا۔ میرے سامنے تو میرا جھوٹ حقیقت بن کر آ رہا تھا۔

تہمینہ بھی اسے ڈانٹ رہی تھی کہ ایسی باتیں منہ سے کیوں نکالتی ہے۔

غزالہ نے روتی آواز میں کہا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا اتنا کمزور دل ہے کہ ذرا سی بات پر رونے بیٹھ جائے گا۔''

''ذرا سی بات ہے؟'' تہمینہ نے کہا۔ ''قصور تو اس کا بھی ہے۔ میری ہر بات غور سے سنتا ہے۔ میری یہ بات نہ سنتا اور نہ روتا۔''

''تو اپنے کان بند کر کے بیٹھا کرے لیکن کان لگا کر بھی تو نہ بیٹھے۔''

میں نے کہا۔ ''واپس چلتے ہیں۔ انکل بھی آنے والے ہوں گے۔ ہمیں ان کے آنے سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔''

ہم رکشا لے کر ان کے گھر کے سامنے اترے۔ وہ تمام راستہ خاموش رہی۔ پھولوں کی طرح برستے الفاظ تھم چکے تھے۔ وہ مغموم سی رکشے سے اتری۔ تہمینہ دروازے کی جانب بڑھی جہاں ابھی تالا پڑا تھا۔ غزالہ گیلی آنکھیں لیے التجائی انداز سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس سے بولا۔ ''میری بات سنو۔'' تو کھنچی چلی آئی۔

اس سے کہا۔ ''اگر کبھی تم سے خفا ہوں تو مجھے میری بددعا ہے کہ میرا پیار مجھے کبھی نہ ملے۔''

دلگیر لہجے سے بولی۔ ''یہ بددعا تو مجھ کو ہے۔ کیوں غلط غلط باتیں منہ سے نکالتے رہتے ہو۔ سنوائی کا وقت ہوتا ہے۔ باتیں سنو تو لگتا ہے بہت سیانے ہو۔ کام دیکھو تو اصلیت کھل جاتی ہے۔ اب گیارہ مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھ کر اپنے اور تم پر پھونکنی پڑے گی۔''

میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے، معاف کر دو۔''

''معافی اللہ سے مانگو۔ مجھ سے کیوں مانگتے ہو۔ تم بھی سورۂ یٰسین پڑھنا۔ یہ بتاؤ قرآن پڑھنا آتا ہے؟''

''شکر ہے آتا ہے، کل صبح جلدی آ جانا۔ چھ دفعہ میں پڑھوں گی پانچ دفعہ تم پڑھنا۔''

''تم دس دفعہ پڑھ لینا۔ میرے لیے ایک دفعہ رکھنا۔ مسافر ہوں ناں۔ قصر نماز کی طرح قصر قرآن بھی ہوتا ہے۔''

سوچ کر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ صبح نماز پڑھوں گی اور شروع ہو جاؤں گی۔'' پھر چونک کر بولی۔ ''اندر تو آؤ.....''

میں نے کہا۔ ''تھک گیا ہوں۔ جا کر سوتا ہوں۔ صبح

آؤں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، جلدی آجانا۔ ہاں یاد سے وضو کر کے آنا۔" جاتے جاتے بولی۔ "سالن تو لیتے جاؤ۔ اچھا ہے گھر میں بنا ہوا ہے؟ یاد سے کھانا۔ کہتا ہے تھک گیا ہوں جیسے چل کر آیا ہو۔ اللہ حافظ۔"

ہمارے بیچ پیار کی شدت تیزی سے پڑھتی جا رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم عرصے سے ایک دوسرے سے پیار کرتے چلے آ رہے ہیں۔

واپس آیا اور وہموں وسوسوں میں گھر کر بیٹھا تھا۔ ڈائری نکال کر اس پر جو دل میں آیا لکھتا چلا گیا۔ دل جب بھی افسردہ ہوا یا مسرور ہوا میں اپنی حالت ڈائری پر لکھتا تھا۔

میرے جو لمحے اس کے ساتھ گزرے وہ یاد کرتا۔ میری پوری زندگی سمٹ کر اس میں سما گئی تھی۔ پن داستوں میں دبائے اسے سوچتا رہتا اور پھر چند سطریں لکھ کر دوبارہ اسی میں کھو جاتا۔

انسانی ذہن، مختلف تجربات اور مشاہدات حاصل کر کے بڑی تبدیلیوں سے گزرتا ہے۔ میں اسکول کے بعد کالج کے حسین دور سے گزر رہا تھا کہ محبت کا پھول روح کی زمین پر کھل اٹھا۔ ہر جانب خوشبو پھیل گئی۔ میں حیران کھڑا اس نئی تبدیلی سے آشنا ہو رہا تھا۔ چاہنے اور چاہے جانے کے دلکش مرحلوں سے گزرنا بڑا سحر انگیز تجربہ تھا۔ دل و دماغ کسی سرور میں ڈوبے تھے۔ ہر پل اس کی موجودگی کی خبر دیتا۔ ہر جانب پُراثر ساز بجتے سنائی دیتے۔ ہوائیں خوشبو میں لپٹی تھیں۔ سارا زمانہ نظروں کے سامنے بیچ تھا۔ ہر نیا دن ہمارے پیار کے بندھن کو مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ بیچ میں کچھ وہم کچھ وسوسے بھی تھے مگر پیار کی آندھی اتنی زور آور تھی کہ سب رکاوٹوں کی ماند اڑا کر لے گئی۔

اگلے دن میں صبح گیا تو اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چارپائی برآمدے میں، سامنے میز اور اس پہ چائے کا کپ بیچ میں الٹا پڑا تھا۔ تکیہ، چادر اور کھیس سب سجائے بیٹھی تھی۔ میں حیران یوں تھا کہ بنی سنوری چادر کی بکل مار کر قرآن کھولے بیٹھی تھی۔ گہرے رنگ کی چادر کے بیچ اس کا مکھ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ خود نہایت دلجمعی سے قرآن پڑھ رہی تھی۔ مجھے اشارہ کیا کہ جوتے اتار کر چارپائی پر بیٹھ جاؤں۔ تکیے پر ایک اور قرآن رکھا تھا۔ جہاں نشانی رکھی تھی وہاں سے کھولا تو سورۂ یٰسین سامنے تھی۔

شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے بولی کہ سورۂ یٰسین ایک بار پڑھو۔ میں مسکرانے لگا تو آنکھیں نکال کر مسکرانے سے روک دیا۔ کچن میں تہمینہ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھا تو وہ دوپٹے میں منہ چھپائے ہنس رہی تھی۔

میں نے حکم عدولی کرنا مناسب نہ سمجھا اور سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کر دی۔ وہ پہلے ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلاس پانی سے بھرا میز پر رکھا تھا۔ اس میں اس نے دم کر دیا۔ میں نے سورۃ ختم کی تو بولی۔ "میں بھی دم کر دوں یہ؟"

میں حکم بجا لایا۔ دو گھونٹ اس کے مجھے پلائے، خود پیے اور تہمینہ کو بھی پلائے۔ یہ سب کر کے قرآن لپیٹا اور طاق پر رکھ دیا اور پھر وہی بکل مارے سامنے بیٹھ کر مجھے گھورنے لگی۔

"اب کیا ہے؟" میں مسکرا کر بولا۔

"زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کل سے میرے لیے تمہارے منہ سے بددعائیں کیوں نکل رہی ہیں؟"

تہمینہ بولی۔ "یہ لفظ پہلے تو تم نے کہے تھے۔ اس بے چارے کے منہ سے وہی لفظ نکل گئے تو پکڑ کر بیٹھ گئی ہو۔" پھر تہمینہ میری جانب رخ کر کے بولی۔ "کل سے ساری نمازیں باقاعدگی سے پڑھی جا رہی ہیں اور عشاء کے بعد تو دیر تک نفل پڑھے گئے ہیں۔"

میں جھی دبا کر بیٹھا تھا تو بولی۔ "وظیفہ بھی کیا تھا۔" زور سے کسا ہوا بکل کھولا اور کہا۔ "انسان کو منہ سے ہمیشہ خیر کے کلمات نکالنے چاہئیں۔"

میں زور سے بولا۔ "آمین۔"

بگڑ کر بولی۔ "یہ دعا تو نہیں تھی۔ میں نے تم کو بولا ہے۔"

کچن میں تہمینہ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

میں نے غزالہ سے پوچھا۔ "آج میرا ناشتا نہیں ہے؟"

جواب دیا۔ "تم ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاؤ۔ میں ناشتا لاتی ہوں۔" میں چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھ گیا۔

اس نے میز پر سالن اور پراٹھے رکھے۔ میں نوالہ لے کر بولا۔ "واہ جی مزہ آ گیا۔"

کہنے لگی۔ "زیادہ تعریف مت کرو۔ میں نے نہیں بنایا۔"

"تمہاری تعریف تو نہیں کر رہا۔ بنانے والے کی تعریف کر رہا ہوں۔"

پہلے تو مجھے غصے سے دیکھتی رہی، پھر ہنس سے بولی۔ "تم کہتی ہو بے چارہ نہیں لڑتا۔ اب دیکھ لیا کس طرح سے مجھے بھڑکائے جا رہا ہے۔ میں کچھ کہوں تو بری بھی میں بنوں گی۔"

میں اسے محبت سے دیکھنے لگا۔ اس طرح دیکھنے پر مسکرا پڑی۔

میں اسے کمرے میں بیٹھا پڑھا رہا تھا کہ منیر کودتا ہوا آدھمکا۔ پوز مار کے جھک کر بولا۔ "لگتا ہے آج پڑھائی ہو رہی ہے؟"

تنک کر غزالہ نے جواب دیا۔ "منیر بھائی روزانہ پڑھائی ہوتی ہے۔"

بھائی کہنے پر ایک سیاہ سایہ اس کے وجود پر لہرایا، پیلا ہوا، فق ہوا اور پھر سنبھل گیا۔

مجھ سے پوچھا۔ "ریڈیو لے آؤں۔ آپ کے بھائی کا نام لگتا ہے آج پھر آئے گا۔"

"نہیں منیر بھائی۔" میں نے بھائی پر زور دیا۔ اس سے فرمائش کرتے ہوئے پھر بولا۔ "آج خود ہی کوئی گانا سنا دیں۔"

غزالہ جھٹ سے بولی۔ "مت کہیں یہ تو شروع ہو جائے گا۔"

پھر غزالہ کے خطرے کے اہتمام پر وہ واقعی شروع ہو گیا۔

یہ آج مجھ کو کیا ہوا للا للا للا۔۔۔

کہا سنا میرا معاف کرنا۔۔۔

ناہید اختر کے گانے گانے پر اسٹیپ بھی لے رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اس کی منتیں کر کے گانا ختم کروایا۔

"منیر بھائی، کل ذرا دیر سے آنا جب ہم پڑھ چکے ہوں۔" میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔ بڑا خوش ہوا اور اسی خوشی میں ناچتا ہوا باہر نکل گیا۔

غزالہ سے بولا۔ "یہ لڑکا میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ کہیں اس سے میرا جھگڑا نہ ہو جائے۔"

"جھگڑا بالکل نہ کرنا۔ ذرا بھی اسے معلوم ہو گیا تو یہ کیا سے کیا بات کرے گا۔" پھر سوچ کر مسکرانے لگی۔ "بلو ہوتا ناں تو وہ کچھ نہ کچھ کر گزرتا۔ شادی پر ہر وقت مجھے نظروں میں رکھتا تھا۔ کسی لڑکے کو میرے قریب سے بھی نہیں گزرنے دیتا تھا۔ کوئی آنے لگتا تو روک کر کہتا، او بھائی ادھر سے نہیں ادھر سے۔ ایک دن مجھ سے بولا۔ بھابی یہ جو بھائی جان ہیں آپ پر جان دیتے ہیں۔ آپ ذرا اکڑ کر رہا کریں ورنہ میں جانتا ہوں ایسے لڑکوں کو۔ لڑکی پھنس گئی تو سمجھتے ہیں یہ تو اب اپنے ہاتھ میں ہے اور پھر کوئی اور بھی ساتھ پھنسانے لگتے ہیں۔ لڑکی سمجھتی ہے کہ یہ مجھ پر فدا ہے مگر اس کو کیا معلوم دو اور پر بھی کام کر رہا ہے۔ میں تو بھائی جان سے کہتا رہتا ہوں کہ بھابی کو دھوکا مت دینا۔ ٹھرک کرنی ہے تو کوئی اور ڈھونڈ دیتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ پھر بھائی کیا بولے۔ تو کہا کہ آپ میں تو وہ کبھی بھی کسی اور جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ یہ بات بلو کہہ رہا ہے ناں تو یقین کر لیں۔"

پھر میرا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لا کر بولی۔ "ایک بات ہے نہیں بتاتی۔"

میں بولا۔ "بتا دو ناں۔ صبح سے بے چین ہو رہا ہوں۔"

مجھے بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے مزہ آتا تھا۔ روٹھنے سے زیادہ وہ ماں پر بہت پیاری لگتی۔ میرا دل کرتا کہ وہ روٹھے اور میں بار بار اسے مناؤں۔ مان جاتی تو پھر سے کوشش کرتا کہ روٹھ جائے۔ جاری پچھلی بات بھول کر مان جاتی۔ اس میں بے پناہ معصومیت اور انتہا کا پیار تھا۔

جب میں نے کہا کہ صبح سے بے چین ہو رہا ہوں تو حیرت سے بولی۔ "ابھی تو میں نے بتایا ہے کہ ایک بات ہے تم صبح سے کیسے بے چین ہو گئے؟"

"کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کوئی بات تم سے ہضم نہیں ہو رہی۔ جب تک میرے گلے لگ کر بتاؤ گی نہیں ایسے ہی ہاتھ پکڑ کر بیٹھی رہو گی۔"

سنتا تھا کہ ہاتھ جھٹک کر چھوڑ دیا۔ تنک کر بولی۔

"شک تو مجھے پہلے ہی تھا۔ ایک دن مغرور ہو جاؤ گے۔ جب سے ایک بار کہا ہے۔ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے۔ مجھے موت بھی آئے تو تیرے بازوؤں میں آئے، تب سے تم خود کو غلام محی الدین سمجھنے لگے ہو۔"

میں حیرت سے بولا۔ "اداکار غلام محی الدین کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں اسی کی۔ اس کو ہی تو بابرہ شریف فلم میں یہ گانا سناتی ہے اور وہ کتنا اس سے پیار کرتا ہے کہ آخر میں اس کے

ساتھ گاتے گاتے خود بھی مر جاتا ہے۔"

سننا تھا کہ میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ اور زیادہ بگڑ گئی۔

"بلو ٹھیک کہتا تھا اکڑ کر رہا کرو۔ آج اکڑ کر رہتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ پیار بھی کرو اور ساتھ میں باتیں بھی سنو۔"

شور سنا تو تہمینہ کمرے میں چلی آئی۔ "تم لوگوں کا نہ تو ہنسنے کا پتا چلتا ہے اور نہ لڑنے کا۔" پھر بہن سے بولی۔ "اگر روٹھنا ہے تو کچھ دیر تو روٹھو۔ ایک پل روٹھتی ہو تو دوسرے پل مان جاتی ہو۔"

سنا تو کمرے سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے کہہ گئی۔ "آدھا گھنٹا اس سے بالکل نہیں بولوں گی۔ اس کو بھی معلوم پڑے کہ دل پر چوٹ پڑتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔" پھر وہ کچن میں جا کر بیٹھ گئی۔

تہمینہ مجھے بتا رہی تھی۔ "یہ جو ہنستی روٹھتی غزالہ دیکھ رہے ہو۔ تمہارے جانے کے بعد اسے چپ لگ جاتی ہے۔ چادر اوڑھے اندر چارپائی پر پڑی رہتی ہے۔ ایسی خاموشی اسے لگتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہی تھی جو صبح گھر میں شور مچائے گھوم رہی تھی۔ پُرجوش ہو کر منہ اندھیرے اٹھتی ہے۔ نماز پڑھ کر کچن میں جگہ سنبھال کر بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے تو وہاں گھسنے بھی نہیں دیتی۔ میرا اور ابو کا ناشتا بنا کر تمہارا اور اپنا بناتی ہے۔ ابو جاتے ہیں اور جھٹ سے چارپائی بچھاتی ہے تکیہ، چادر اور کھیس رکھتی ہے۔ میز لا کر اس پر چائے کا خالی کپ رکھتی ہے، پھر کپڑے بدل کر اندر لیٹے ہوئے تمہارا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کی یہ شوخیاں اور لاڈ تمہارے جانے تک ہوتے ہیں۔ بعد میں تو بجھ سی جاتی ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اظہار کے لیے بار بار مصرعے بولنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پیار کو رچا لے۔ ایک دوسرے کا خیال کر کے، کبھی روٹھ کر اور کبھی مان کر پیار کے بول و اقرار کرتے رہیں مجھے پیار کا یہی طریقہ اچھا اور خوب صورت لگتا ہے۔ ناراض ہو کر راضی ہو جانا محبت کی نشانی ہے۔

میں اور تہمینہ باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ تہمینہ سے کہا۔ "اس سے کہو آدھے گھنٹے تک نہ میری باتیں کرے اور نہ سنے۔ آدھے گھنٹے سے پہلے کبھی نہیں مانوں گی۔ بھلے ہزار منتیں کرتا رہے۔"

تہمینہ مجھ سے بولی۔ "تم آدھا گھنٹا اس سے نہ بولو۔ دیکھو کیا کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیوں ہم دونوں کی جان کی دشمن بنی ہو۔ جانے میں آج کے بعد صرف دو دن رہ گئے ہیں اور یہ وقت اس سے روٹھ کر گزاروں۔"

پھر وہ مسکرا کر باہر چلی گئیں۔ میں کچھ دیر اندر چارپائی پر بیٹھا رہا اور وہ اسی دوران دروازے کے سامنے سے منہ پھیر کر متعدد بار گزری۔ پھر گزر رہی تھی تو میں باہر برآمدے میں چلا آیا۔ اسے آواز دے کر کہا۔ "سنو بہت پیاس لگی ہے۔ ایک گلاس پانی تو دے دو؟"

مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "کھایا کتنا تھا جو پیاس لگ گئی۔ ایک روٹی بھی پوری نہیں کھائی۔"

"سالن میں شاید مرچیں زیادہ تھیں اسی لیے پیاس لگ گئی ہوگی۔"

"مرچیں تو اتنی نہ تھیں۔ ذرا زبان دکھاؤ کہیں چھالے تو نہیں۔"

"چھالے کہاں سے آ گئے؟ میں نے کون سی چھالیا کھائی ہیں۔"

"اچھا تو چھالیا بھی کھاتے ہو؟"

"کب کہا ہے میں نے کہ چھالیا کھاتا ہوں؟"

"خود تو کہا ہے کہ آج کون سی چھالیا کھائی ہے۔ مطلب آج نہیں کھائی مگر عام دنوں میں کھاتے ہو۔"

"تمہاری قسم۔ عام دنوں میں بھی نہیں کھاتا مگر پھر بھی اتنی پیاس جانے کیوں لگی ہے؟"

وہ بولی۔ "مگر مجھے شک ہو رہا ہے بات کچھ اور ہے۔"

"اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ پیاس تو ہر بندے کو لگتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے تمہارا معدہ خراب ہے۔ ابو کا معدہ خراب ہوتا ہے تو امی پانی کے ساتھ سونف دیتی ہیں۔" کچن میں جاتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی سونف اور پانی لاتی ہوں۔ پیاس بھی ختم اور معدہ بھی ٹھیک۔"

اسے راضی کرنے کے لیے بولا۔ "ہاں ہاں جلدی سے لا دو۔ کتنا خیال رکھتی ہو۔ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ ہوں ناں؟"

وہ بولی۔ "کیوں نہیں، شکر ہے اللہ۔ اپنے منہ سے تو جان لیا۔"

سونف پانی کے ساتھ پھانکی اور پھر اس سے پوچھا۔ "وہ کون سی بات تھی جو نہیں بتا رہی تھی۔"

''ابو سے اجازت لے لی ہے۔ وہ آجائیں تو پھولوں کی نمائش دیکھنے کمپنی باغ جائیں گے۔ پھر ہم تینوں صدر بھی گھومنے جائیں گے۔''

''دور ہے یا قریب؟''

''ریلوے اسٹیشن کے پیچھے ہی تو ہے۔ رکشے میں جائیں گے۔ کھانا یہیں کھالو۔ ابو کے آنے کے فوراً بعد نکلیں گے۔''

ان کے ابو آئے مل کر سب نے کھانا کھایا۔ تیار ہوئیں، کالے برقعے پہنے اور رکشا لے کر کنٹونمنٹ کے علاقے میں کمپنی باغ پہنچ گئے۔ پشاور کا کینٹ اپنی خوب صورتی اور پھولوں کی بہتات سے بہت خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ اونچے اونچے قدیم درخت، صاف ستھری اور چوڑی سڑکیں، پرانی فوجی بیرکس اور دفاتر۔ انگریزوں کے بنے وسیع بنگلے سب مل کر اس کی دلکشی بڑھا دیتے ہیں۔ کمپنی باغ اسٹیڈیم روڈ اور مال روڈ کے درمیان ہے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ خواتین و حضرات اپنے بچوں سمیت گل داؤدی کے پھولوں کی نمائش دیکھنے آئے ہیں۔ لکڑی کی میزوں پر ایک لائن میں پھول سجے تھے جن کے گرد دیکھنے والوں کا رش تھا۔ دیسی رنگوں کے گل داؤدی بہار کی رونق بڑھا رہے تھے۔ اتنے سارے رنگوں کے پھول میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں بچوں کی طرح خوش ہو کر رنگ رنگ کا پھول دیکھتا اور انہیں دکھاتا۔ چھوٹے بڑے پھول دور دور تک پھیلے تھے۔ دونوں نے برقعوں کے نقاب اتار لیے تھے۔ پھول اپنے قدرتی ماحول میں زمین پر اُگا اچھا لگتا ہے مگر یہاں میں نے پہلی بار نمائش دیکھی تو محسوس ہوا کہ پھول تو پھول ہے۔ کہیں بھی کھلے اپنے رنگ خوب دکھاتا ہے۔ وہ اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر پھولوں کو قریب سے دیکھتی تو میں اس کا پھول جیسا چہرہ دیکھنے لگتا۔ میں جان بوجھ کر اسے کوئی پھول دیکھنے کا کہتا۔ پھر اس کا شگفتہ چہرہ دیکھتا جو جھکا پھولوں سے ہم کلام ہوتا۔ ایک بار مجھے اس طرح بغور دیکھتے پکڑ لیا۔ اپنی خمیل جیسی سیاہ آنکھوں سے پلکیں اٹھائیں۔ حیرت سے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ وہ لمحہ وہیں ٹھٹک ہوا اور تصویر بن کر میرے دل پر منقش ہو گیا۔ میں ہر لمحہ اسی طرح کی حیرتیں اور مسرتیں سمیٹ رہا تھا۔

قریب آکر خوشی سے معمور لہجے میں بولی۔ ''کیوں مجھ کو چوری چوری دیکھتے ہو۔ اب تو زندگی بھر کے لیے تمہاری ہوں۔ دیکھو تو مجھے نظریں بھر بھر کر دیکھو۔''

میں بولا۔ ''تم بھی ان پھولوں کی مانند ایک پھول ہو۔ تمہارا چہرہ ایسے نظر آرہا تھا کہ گل داؤدی کے پھولوں کے درمیان میں گلاب کھلا ہو۔ گلاب کو نظر بھر کر نہیں دیکھتے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ سب سے نظریں چرا کر اور نظروں میں بسا کر دیکھتے ہیں۔''

''اتنے اچھے الفاظ کہاں سے بولتے ہو۔ لگتا ہے تمہاری اردو بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے بھی پڑھا دو۔ مجھ سے میر تقی میر یاد نہیں ہوتا۔''

میں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

''سارے رومانس کو پتیوں کی طرح ہاتھ میں مسل ڈالا۔'' وہ ہنس دی اور بولی۔ ''اس لیے مسل ڈالا کہ تمہیں ہماری جانب آرہی ہے اور سارا رومانس شادی کے بعد کے لیے بچا کر رکھو۔''

تہمینہ قریب آکر بولی۔ ''پھولوں کو دیکھ کر اتنا اچھا لگ رہا ہے کہ جی کرتا ہے ایک گھنٹا اور دیکھوں۔''

غزالہ کینٹین سے باہر کرسیوں کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔ ''کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ آج تو خوب گھومیں گے۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔''

اسے احساس تھا کہ چند دنوں میں میری واپسی ہے۔ ہم دونوں اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان لمحوں کو خوش رہ کر گزارنا چاہتے تھے۔ جانے کا ذکر کر کے میں ماحول پر افسردگی طاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہنستے کھلتے چہرے کو میں مغموم نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میری طرح وہ بھی اچانک کہیں کھو جاتی۔ میں خود یہاں سے لوٹ کر جانے کا سوچتا تو دل مٹھی میں آجاتا۔ اس سے جدائی میرے لیے قطعاً آسان نہ تھی۔ میرا دن اس کے ہمراہ ہوتا اور میری راتیں اسی کے خیالوں میں گزرتیں۔ صحن میں چارپائی بچھائے آسمان پر پھیلے تارے دیر تک دیکھتا رہتا۔ میرے دن رات ایک تسلسل میں گزر رہے تھے۔ ہماری محبت کی ایک زنجیر بن گئی تھی۔ زنجیر کی ہر کڑی ہمارا ساتھ ساتھ گزارا لمحہ تھا۔ میں اس زنجیر میں جکڑا جا چکا تھا۔ اس آہنی گرفت سے باہر نکلنا آسان نہ تھا۔ جتنا سوچتا اتنا آزردہ ہو جاتا۔ لہٰذا میں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ہم کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دے کر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے پھول ہی پھول بکھرے نظر آرہے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہم پر ایک اونچے اور گھنے درخت کا سایہ تھا۔ سورج کی شعاعیں چھن چھن کر ہم پر پڑ رہی تھیں۔ اس

کے چہرے پر درخت کی پتیوں کے سائے رقصاں تھے۔
اس پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی میٹھی اور سہانی ہوتی ہے۔
جب آنکھیں دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی گہری ہوتی ہے۔ جب ہونٹ دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی رسیلی ہوتی ہے۔ پیشانی دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی تراشیدہ ہوتی ہے۔ مرمریں ہاتھ دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی نازک ہوتی ہے۔ مسکراہٹ دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی دلآویز ہوتی ہے۔ سراپا دیکھتا تو سوچتا محبت کتنی بے قرار ہوتی ہے۔ وہ چلتی تو سوچتا محبت آب رواں ہے۔ اس کا پیار دیکھتا تو سوچتا محبت آتش دروں ہے۔ اس کی باتیں سنتا تو سوچتا محبت بھری امید ہے۔ اس کے گیسو دیکھتا تو سوچتا محبت کالی گھٹا ہے۔ آنسو دیکھتا تو سوچتا محبت برستی پھوار ہے۔ اس کی بے قراری دیکھتا تو سوچتا محبت جنون ہے۔ غمگین ہوتی تو سوچتا محبت آفتاب لب بام ہے۔ اس کی چپ دیکھتا تو محسوس ہوتا محبت صبر ہے۔ اسے نماز پڑھتے دیکھتا تو لگتا محبت دھیان ہے۔ اسے کھویا کھویا دیکھتا تو لگتا محبت گیان ہے۔ وہ بولتی تو لگتا محبت دیپک ہے۔ اس نے نقاب اتارا تو لگا محبت جلوہ ہے اور جب وہ بچھڑ گئی تو معلوم ہوا محبت سراب ہے۔ ایک سہانا خواب ہے۔

درختوں کے سائے دراز ہونے لگے تو ہم وہاں سے اٹھے۔ اس شام پیار سے سجی محفل کو توڑ کر اٹھنا مجھے رنجیدہ کر گیا تھا۔ ہم نے رکشا لیا اور مال روڈ سے ہوتے ہوئے ارباب روڈ پر اتر گئے۔ بائیں جانب امریکن سینٹر کی خوب صورت عمارت تھی۔ دائیں جانب ایک قدیم سنیما فلک سیر پر کوئی انگریزی فلم لگی تھی اور ٹکٹ لینے والوں کی لائن باہر تک آرہی تھی۔ فٹ پاتھ پر گھومتے پھرتے۔ ناولٹی چوک سے وہ گورا بازار میں آجاتے ہیں۔ گورا بازار ایسے ہی ہے جیسے لاہور کا لبرٹی یا کراچی کا زیب النساء بازار۔ پاکستان بننے سے پہلے اس بازار میں گورے لوگ زیادہ آیا جایا کرتے تھے۔ ہم ارباب روڈ پر دکانوں میں تانک جھانک کر رہے تھے۔ پشاور کے چائنا شوز بہت مشہور ہیں۔ چینیوں نے ارباب روڈ پر اس کی دکانیں کھولی ہوئی ہیں۔ پیچھے خود ہی بیٹھ کر بناتے ہیں۔ میں چپل دیکھنے کے لیے اس دکان میں گیا۔ چینی کو صاف شفاف اردو بولتے دیکھ کر حیران تھا۔ مجھے ایک چپل بہت پسند تھی۔ وہ بولی۔ ''تم کو بہت اچھی لگ رہی ہے، لے لو ڈیرہ میں نہیں ملے گی۔''

میں سوچ میں بیٹھا رہا تو وہ بولی۔ ''تمہاری امانت میرے پاس پڑی ہے۔ اسی سے لے لو، سوچو مت۔''
میں نے ارادہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ماں کو کیا کہوں گا کہ تبلیغ پر جوتے خرید رہا تھا۔''
وہ بولی۔ ''ایسا کرو ابھی لے لو۔ میں امانت کے طور پر اسے بھی رکھ لوں گی۔ واپس آنا تو مجھ سے لے لینا۔''
میرے کندھے پر ہاتھ رکھے بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس سے کہا۔ ''تین ماہ بعد ایک ساتھ آئیں گے اور یہیں سے خرید لیں گے۔'' پھر اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری امانت کی حفاظت کرنا۔''
وہ سر ہلاتی بیٹھی رہی۔
روڈ کے کونے پر ایک بڑا اسٹور تھا۔ اس کے شیشوں کے پیچھے شوکیس میں پرفیوم ہمیں سڑک سے نظر آرہے تھے۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے پرفیوم دیکھ رہے تھے پھر تقاضا کرنے لگی کہ پرفیوم خرید لوں اور امانت کی رقم اس کے پاس پڑی ہے۔ وہ اپنے پیسے کسی طرح مجھ پر خرچ کرنا چاہتی تھی۔ ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے اور سامنے صدر روڈ پر سڑک کے عین درمیان ایک چھوٹی سی مسجد سے شام کی اذان ہوئی۔ فوراً دور دور تک صفیں بچھ گئیں۔ سڑک کی ایک سائیڈ ٹریفک کے لیے بند کر کے وہاں نمازی کھڑے ہو گئے۔ دکانوں سے نمازی جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ان کو فٹ پاتھ پر انتظار کرنے کا کہہ کر میں بھی صف میں جگہ بنائے کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھ کر واپس آیا تو مجھ سے بولی۔ ''یہ والی کریم لے لو۔ رنگ گورا ہو جائے گا۔ تمہاری امانت تو میرے پاس پڑی ہے۔''
وہ میرا بازو پکڑے مجھ سے لگی چل رہی تھی۔ ہم اسٹیڈیم چوک کی جانب جا رہے تھے۔ وہاں بہت سے کیفے تھے۔ خیبر کیفے پر میں پنیر کے پکوڑے کھا چکا تھا۔ اندر ایک گیلری خواتین کے لیے بنی تھی۔ اس کیفے کی ساری میزیں ہمیشہ بھری رہتیں۔ وہاں کی چائے پورے پشاور میں اپنے ذائقے کے لیے مشہور تھی۔ اس کیفے کی خاص بات یہ ہے کہ آپ اپنی فرمائش کا کوئی گانا ان کو لکھ کر کاؤنٹر پر دے آتے ہیں۔ ان کے پاس سینکڑوں ریکارڈ پلیئرز موجود ہیں۔ وہ گانا ڈھونڈ کر چینجر پر لگا کے آپ کی فرمائش پوری کرتے ہیں۔ چائے کا کپ پیتے ہوئے جب ہم اپنی فرمائش کا گانا سنتے ہیں تو یوں محسوس ہو رہا ہوتا کہ گانا ہم پر فلمایا گیا ہے۔ بولوں کے مخاطب ہم ہیں یا ہم کسی کو مخاطب کر رہے ہیں۔

میں نے تہمینہ کو خیبر کیفے کے آگے روک کر کہا۔
''یہاں سے تم لوگوں کو پنیر کے پکوڑے کھلاتا ہوں۔ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔''
وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔ ''تم نے کھائے ہوئے ہیں؟''
''ہاں ہاں کھائے ہوئے ہیں۔ آؤ ناں اندر۔ اوپر فیملیز کے لیے علیحدہ جگہ بھی بنی ہوئی ہے۔''
وہ میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مگر تم تو کبھی نہیں آئے پشاور؟''
میں ایکدم سٹپٹا گیا۔ ''نہیں جب آٹھویں میں تھا تو اسکاؤٹس کے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے پی ٹی صاحب ہمیں یہاں لائے تھے۔'' پھر وضاحت دینے لگا۔ ''پشاور آیا تھا مگر وہ والا نہیں آیا تھا جو تم پوچھ رہی تھیں۔ وہ تو شکیل تھا۔''
وہ خاموش تو ہوگئی مگر الجھی ہوئی کھڑی تھی۔ شکر کر رہا تھا کہ بات بن گئی۔ ورنہ میرا جھوٹ مجھے بری طرح سے پھنسا دیتا۔
ہم میزوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے کیفے کے آخر میں سیڑھیاں چڑھتے فیملیز روم میں جا بیٹھے۔ کاغذ پر فرمائشی گانا لکھا اور کاؤنٹر پر دے آیا۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ گانا پورے کیفے میں گونج رہا تھا۔

او ساتھی رے تیرے بنا بھی کیا جینا
پھولوں میں کلیوں میں سپنوں کی گلیوں میں
تیرے بنا کچھ کہیں ناں.....

ہم دونوں گانے کے بولوں سے ایک ساتھ بندھ گئے۔ گانے کی وساطت سے ہم ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔ ہر مصرعہ دوسرے کے لیے تھا۔ دل شدت سے چاہا کہ میز پر رکھے اس کے دونوں نازک ہاتھ بڑھ کر تھام لوں۔ اس سے کہوں

تجھ بن جوگن میری راتیں
تجھ بن میرے دن بنجارے

زبان سے کچھ نہ کہوں، صرف اسے دیکھتا رہوں۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں اور خواہشوں کی تحریریں پڑھوں، جو مجھ سے وہ اب تک کہہ نہ سکی تھی۔ وہ فسانے پڑھوں۔ وہ بیٹھی مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے بتا رہی ہو یہ ہے میری چاہت کا سحر جس نے تم کو باندھ رکھا ہے۔ تہمینہ چہرے پر ایک مسکراہٹ سجائے ہم سے بے نیاز بیٹھی تھی۔
گانا ختم ہوا مگر اس کا اثر دل پر ایسا ہوا کہ ابھی تک قائم ہے۔
وہاں سے ہم گورا بازار آئے۔ کپڑوں، جوتوں اور جنرل اسٹورز کی بھری اور دیدہ زیب دکانیں تھیں۔ تنگ اور چھوٹا بازار اِدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔ خواتین کا رش تھا۔ چادروں اور کالے برقعوں میں لپٹی خواتین خریداری میں مصروف تھیں۔ لڑکے اپنی جانب سے بھرپور فیشن کیے اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں سے ایسا لگ رہا تھا کہ جن کو وہ ڈھونڈ رہے ہیں وہ نہ کبھی انہیں ملی اور نہ کبھی ملے گی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر جانب دیکھے جا رہے تھے۔
ہم چلتے چلتے سنہری مسجد روڈ تک آئے۔ وہاں اندھیرا چھایا تھا۔ ہر جانب ہو کا عالم تھا۔ بمشکل ہمیں ایک رکشا ملا اور پندرہ منٹ میں ہم ان کے گھر کے سامنے آ اترے۔ شام ڈھل چکی تھی اور میں سیدھا سلیم اللہ کے گھر آ گیا۔ رات کا کھانا کھانے کی گنجائش نہ تھی۔ میں صحن میں کھلے آسمان تلے چارپائی بچھائے لیٹ گیا۔ سلیم اللہ برآمدے میں سویا تھا۔ کہتا رہا کہ بارش کا امکان ہے۔ تم بھی برآمدے میں آجاؤ مگر جو مزہ چارپائی پر بیٹھے آسمان تلے تیرتے بادلوں کو دیکھنے میں ہے۔ وہ برآمدے یا کمرے میں کہاں مل سکتا تھا۔
ایک سکوت ہر جانب چھایا تھا۔ تارے گم تھے اور تاریکی پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مجھے کسی سرور میں ڈبو گئے تھے۔ میں دل کی نگری میں اپنی محفل سجائے لیٹا تھا۔ سلیم اللہ نے ریڈیو پر گانوں کا فرمائشی پروگرام لگایا تھا۔

لوٹے کوئی من تانگر بن کے میرا ساتھی

پہلی پہلی محبتوں کا نشہ بھی نرالا ہوتا ہے۔ نہ دن کا چین اور نہ رات کی نیند میسر ہوتی ہے۔ آنکھیں کھلی ہوں یا بند، چہرہ اس کا سامنے رہتا ہے۔ کبھی ہوا بن کر گلے لگتی ہے اور کبھی ساز بن کر چھیڑتی ہے۔ سوچوں میں وہی ساتھ ہوتی ہے اور خوابوں میں بھی چلی آتی ہے۔ ہر خوب صورت چہرہ اس کا چہرہ ہوتا ہے۔ ہر پھول میں اس کا رنگ ہوتا ہے۔ جو چیز بھی دل کو اچھی لگتی ہے، اسی کے حوالے سے اچھی لگتی ہے۔ اس کے گھر کی در و دیوار سے محبت ہو جاتی ہے جو لوگ اس کے قریب ہوتے ہیں ان سے دوستی کرنے کو دل کرتا ہے۔
میں چارپائی پر لیٹا آج کے ہر اس لمحے کو یاد کر رہا تھا جو اس کی سنگت میں گزرا تھا۔ میں اپنے ہاتھ کو چوم لیتا جن کو

اس نے چھوا تھا۔ میں نے دو دن بعد چلے جانا تھا اور دل کا گلشن ویران ہو جاتا۔ اس کے رنگ پھیکے پڑ جاتے اور پھول ڈھلک جاتے۔ فضائیں سونی ہو جاتیں اور نیلے چمکتے آسمان پر کہر چھا جاتا۔ میرا ہر صبح یہاں سے تیار ہو کر ان کے گھر جانا، مجھے اس کا ناشتا دینا، ہماری باتیں، مسکراہٹیں، شرارتیں، چوری چوری کیے گئے محبت کے اشارے، آنکھوں سے بھیجے گئے سارے پیغام، اس کا روٹھ جانا اور پھر پلک جھپکتے ہی مان جانا، یہ سب ماضی کے حصے بن جاتے۔

میری آنکھیں ادھر ڈبڈبائیں اور ادھر آسمان سے پانی کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ میری حالت پر آسمان بھی پھٹ پڑا۔ چارپائی کھینچ کر برآمدے میں کی مگر نیند نہ آئی۔ دیر تک جاگتا رہا۔ تصور کے رنگین جزیروں میں اس کے ہمراہ گھومتا رہا۔ پانی ٹپ ٹپ صحن کے فرش پر گرتا رہا اور آنسو میرے دل کی زمین پر برستے رہے۔

صبح دیر سے بیدار ہوا۔ دس بج چکے تھے۔ ہر روز اس کے گھر نو بجے پہنچ جاتا تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہوا۔ مجھے معلوم تھا وہ انتظار کرتے کرتے ناراض ہو چکی ہوگی۔ دستک دی تو دروازہ تہمینہ نے کھولا۔ برآمدے میں دیکھا تو وہ تکیے میں چہرہ چھپا کر چادر اوڑھے اسی چارپائی پر لیٹی تھی۔

''اسے کیا ہوا؟'' میں نے تہمینہ سے پوچھا۔

''خود پوچھ لو، مجھے کیا بتائے گی؟''

قریب جا کر دیکھا تو تکیے پر بال بکھرے تھے اور پاؤں میں چپل پہنے لیٹی تھی۔ میں سر کے قریب جگہ بنائے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک بھینی بھینی خوشبو اس کے بالوں سے اٹھ رہی تھی۔ دل کرتا تھا یونہی لیٹی رہے۔ یونہی تکیے پر بال بکھرے رہیں۔ یونہی مٹھیاں بھینچ کر پڑی رہے۔ یونہی اس کے خوب صورت پاؤں دیکھتا رہوں اور یہ عمر یونہی بیت جائے۔ وہ اگر کروٹ بدلتی تو منظر بدل جاتا۔ ہم اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی بھی پہل کر کے اس قربت کے سحر کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں جانتے تھے ہم ایک دوسرے کے کتنا قریب ہیں۔

میں نے اس کے بال ذرا سمیٹے تو تھوڑا سا کسمسائی۔ کان کے بندے کو چھیڑا تو لرزی، پلکوں پر لب رکھے تو تڑپی۔ بند مٹھی کھولی تو انگلیاں ڈھیلی کر دیں۔ ہتھیلی دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لی تو پلکیں کھولیں اور پھر بند کر دیں۔ چہرہ تھام کر اٹھایا تو آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آنکھیں بھیگی تھیں اور رو کر تکیہ بھگو دیا تھا۔ اٹھ بیٹھی اور غمناک آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جیسے سارے گلے شکوے دھل گئے ہوں۔ خواب ناک آنکھوں میں محبتوں کے چراغ جلے تھے۔ اپنائیت سے پوچھا۔ ''اتنی دیر کیوں کر دی؟''

''کیا ناراض ہو کر لیٹی تھیں؟''

''ہاں اور روئی بھی مگر جب اتنے پیار سے چھوا تو ناراضی جیسے تھی ہی نہیں۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ گھنے بالوں کو سنبھالتے سنبھالتے اسے کچھ وقت لگا۔

میں اس سے بولا۔ ''جب پیار انتہا پر ہو تو ہم ناراض نہیں ہوتے بلکہ ناراض لگتے ہیں۔ جس شدت سے کسی کو یاد کر رہے ہوتے ہیں دل چاہتا ہے اسی شدت سے کوئی ہمیں منائے۔''

اپنی ہتھیلیوں کو خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں معلوم محبت میں کیا ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا۔ صرف یہ معلوم ہے محبت میں خود پر زور نہیں چلتا۔ سب کچھ مجھ سے ہی کروا رہی ہوتی ہے۔ کبھی خوشی دے جاتی ہے کبھی اداس کر جاتی ہے۔ کبھی نہ سمجھنا میں تم سے لڑتی ہوں۔ یہ تو میں لاڈ کر رہی ہوتی ہوں۔ میرے آنسو دیکھ کر تم تڑپ اٹھتے ہو، تمہیں نہیں معلوم تمہارا تڑپنا مجھے کتنی مسرتیں دے جاتا ہے۔'' پھر اپنی ہتھیلیوں سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا۔ ''یہ کتنا خوب صورت احساس ہے کہ مجھے تم چاہتے ہو۔ یہی احساس مجھے ساری زندگی خوش رکھے گا۔ اسی کے سہارے ہی میں یہ عمر گزار سکتی ہوں۔ ہم ملیں یا دور ہو جائیں مگر مجھ سے پیار کرنا کبھی نہ چھوڑنا۔''

اس کی سنجیدگی دیکھ کر میں حیران تھا۔ شوخ اور کھلنڈری لڑکی کس طرح کی باتیں مجھ سے کر رہی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے یہ بڑی بڑی باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

''رات کی بارش کے بعد بادل ابھی آسمان پر چھائے ہیں۔'' وہ برآمدے سے باہر صحن کے اوپر آسمان کو دیکھ کر بولی۔ ''مجھے یہ بادل، چاند تارے اور کھلا آسمان، سب بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہ مجھے اکیلا نہیں سونے دیتے۔ تم چلے جاؤ گے تو یہی میرے دوست ہوں گے۔ تم بھی ان سے دوستی کر لو کبھی اداس نہیں ہو گے۔''

میں بولا۔ ''مجھ سے تو کہتی تھیں میری اردو کمزور ہے اور بول دلی کی زبان رہی ہو۔ اتنی زیادہ سیریس باتیں مجھ

سے نہ کرو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

وہ مسکراہٹیں نوازتی کچن میں چلی گئی۔ سوچے ہوئے مسکرا رہا تھا کہ اس کا دماغ تو نہیں چل گیا جو اتنی الجھی الجھی باتیں کر رہی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہماری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ اس پر چھائی یہ انوکھی کیفیت تاعمر جدائی کی خبر دے رہی ہے۔ چند دنوں کی محبت عروج پر پہنچ گئی اور آگے کھیل ختم ہے۔

وہ ناشتا لائی اور میز پر سجا دیا۔ پانی بھر کر گلاس میں رکھا اور چائے بنا کر کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم بھی ناشتا کر لو۔"

سر ہلا کر بولی۔ "ٹھیک ہے۔" کپ میز پر رکھا اور ہم ایک ساتھ ناشتا کرنے لگے۔

ناشتا کرتے ہوئے اس سے بولا۔ "میں پرسوں واپس جا رہا ہوں۔"

وہ خاموش بیٹھی ناشتا کرتی رہی۔ ناشتا ختم کر کے پوچھا۔ "ٹکٹ لے لی؟"

"نہیں۔" اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ "آج شام جا کر لوں گا۔" وہ ضبط کیے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے پایا تو مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

اس کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ مجھے ستانے کے لیے سنجیدہ روپ اختیار کیا ہوا ہے۔

مجھے نصیحت کرتے ہوئے بولی۔ "ماں سے کیا ہوا وعدہ تم نے پورا کرنا ہے۔ لگ کر پڑھائی کرنی ہے۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو خوب محنت کرنا اور میڈیکل کرنے پشاور آ جانا۔"

میں بولا۔ "نانی اماں مت بنو، مجھ سے لڑ جھگڑ کر بات کیا کرو۔ آئندہ مجھ سے تمیز سے بات کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گا۔"

مجھے بغور دیکھتی رہی اور دیکھتے دیکھتے مسکرا پڑی۔

"آج تم نے سبق نہیں پڑھنا؟" میں نے پوچھا۔

"آج ضرور پڑھوں گی اور کل میں پڑھاؤں گی۔ جو پڑھنا پڑھانا ہے ان دو دنوں میں ختم کر لیں۔" پھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس کے بعد لمبی چھٹی۔ پھر تو تم نے مجھے اکیلا کر کے چلے جانا ہے۔"

مجھے خدشہ تھا کہ میرے واپس جانے کی خبر سنے گی تو رو پڑے گی مگر وہ اپنے پر اعتماد اور ٹھہرے ہوئے رویے سے میری ہمت بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ نہ خود اداس لگتی تھی نہ

مجھے اداس ہونے دے رہی تھی۔ ہم کمرے میں بیٹھے تھے۔ اس کو میتھ کی مشقیں کروا رہا تھا۔ وہ مگن بیٹھی سمجھ رہی تھی۔ نہ کوئی شوخی تھی اور نہ مجھے تنگ کر رہی تھی۔ میں بے چین ہو رہا تھا۔ چاہتا تھا کچھ تو مجھ سے جھگڑا کرے، تنگ کرے، روٹھے اور میری کوئی بات پکڑ کر اسے اپنے معافی پہنائے مگر وہ لگن سے بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ میں تھک گیا اور وہ نہ ہلی۔ اس کی پیٹھ پر دھپ لگا کر میں بولا۔ ''میں تمہارا کوئی سچ مچ کا ٹیوٹر نہیں کہ اتنے ادب سے میرے سامنے بیٹھو۔''

''آپ پرسوں جا رہے ہیں تو ان دو دنوں میں زیادہ سے زیادہ مجھے پڑھا دیں۔ آپ چلے جائیں گے تو کون مجھے پڑھائے گا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ تم سے آپ پر آ گئی ہو۔ میں سمجھا کسی اور سے باتیں کر رہی ہو۔''

بولی۔ ''یاد نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ جب آپ سے پڑھوں گی تو آپ کو تم نہیں بلکہ آپ کہوں گی۔''

''یہ کیا آپ آپ کا پہاڑہ پڑھ رہی ہو۔ اس طرح سے تو کبھی نہیں پڑھاؤں گا۔''

''تو پھر کس طرح سے پڑھائیں گے۔'' مسکرا کر بولی۔

''کچھ پیار سے دیکھو، کچھ مجھ کو دیکھنے دو۔ سادہ سادہ نہیں پڑھا سکتا۔''

''چلو مجھ کو جی بھر کر دیکھ لو۔'' وہ ہتھیلی پر اپنا چہرہ سجا کر بولی۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے مزاج ہی اور تھے۔ کچھ دیر مجھے بیٹھے دیکھ کر کہا۔ ''اب آگے پڑھیں؟''

میں نے اس کو ایک سوال حل کرنے کا کہا اور باہر آ کر کچن میں تہمینہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''آج اس کو کیا ہو گیا ہے بڑی سیریس نظر آ رہی ہے۔''

''اس کی یہ حالت کل شام سے ہے۔ تم چلے گئے تھے تو اسے چپ لگ گئی۔ تمہارے سامنے رونا نہیں چاہتی کہ تم پریشان ہو گے اور ہنسنا اب مشکل ہے کیونکہ پرسوں تم جا رہے ہو۔''

میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے دلاسا دینا چاہتی ہے مگر اسے معلوم نہیں دلاسے کی ضرورت اسے ہے۔ باہر سے مضبوط نظر آنے کی کوشش کرنے والی اندر سے بکھری بیٹھی ہے۔ میں دوبارہ کمرے میں چلا آیا۔ میں نے پکارا تو چونک پڑی۔ اس کو تنگ کرنے کے لیے بولا۔ ''مجھے رونا آ رہا ہے۔''

چونک کر مجھے دیکھا۔ ''رونا آ رہا ہے؟ اس لیے تو نہیں آ رہا کہ تمہارے جانے کے بعد میں اداس ہو جاؤں گی۔''

''ہاں بالکل یہی وجہ ہے۔''

''رونا تو مجھے بھی آ رہا ہے پوچھو گے نہیں کیوں؟''

''ہاں کیوں؟''

''اس لیے تم مجھے یاد کر کے بہت اداس ہو گے۔''

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ طے ہوئی کہ اداس ہم دونوں ہوں گے۔''

''کیوں نہ ہم دونوں مل کر روئیں؟'' بڑے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

سوال کے اندر چھپی خواہش پر میں ہکا بکا بیٹھا رہ گیا۔ وہ رونے کے لیے میرا کندھا مانگ رہی تھی۔ شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔ ''مگر کیسے؟''

بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''ایسے۔'' اس کے بعد میرے اور قریب آ گئی۔ سر کندھے پر رکھا، بانہیں گلے میں ڈالیں اور یہ کہنے کے بعد پھوٹ کر رونے لگی۔ ''تم نے بھی ساتھ ساتھ رونا ہے۔''

جب میں نے کہا کہ زور سے مت رو، تہمینہ سن لے گی اور آواز نیچی کر لی۔ اب اسے چپ بھی نہیں کروا سکتا تھا کیونکہ اس کے حساب سے میں بھی آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے پیار کی زور آوری دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے ادھر رو رو کر میرا کندھا گیلا کر دیا تھا۔

آہستگی سے اسے کہنے لگا۔ ''مجھے معلوم تھا تم آنسو ضبط کیے بیٹھی ہو۔ میں خود چاہتا تھا کہ آنسو روکو نہیں انہیں بہنے دو۔ اب رو چکی ہو تو میری بات غور سے سنو۔ تمہارا یہ خوب صورت چہرہ میں ہمیشہ ہنستا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ روتا چہرہ دیکھ کر میں کس طرح واپس جا پاؤں گا۔ جب پہنچ گیا تو پڑھائی کس طرح سے کر سکوں گا۔ اچھے نمبر نہ آئے تو ڈاکٹر بننے پشاور کیسے آ کر رہوں گا۔ مجھے پریشانی تو یہ ہے کہ اگر پشاور نہ آیا تو ہر ہفتے ہم کیسے ملا کریں گے۔ اگر ہر ہفتے نہ ملے تو ہماری شادی کیسے ہو گی؟''

منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے اگر رونا بند نہ کیا تو شادی نہیں کروں گا۔''

''میں تو کہتا ہوں تم کبھی نہ روؤ اور نہ کبھی رونے والی شکل بناؤ۔''

میری گردن میں منہ چھپاتے ہوئے بولی۔ ''خود تو کہا تھا رونا آرہا ہے سوچا اسی بہانے میں بھی رو کر دل ہلکا کرلوں گی۔''

''اچھا اب رولیا ناں۔ اس کے بعد نہیں رونا۔''

''ہوں۔'' کہہ کر گلے سے لگی بیٹھی رہی۔

میں اسے خود سے علیحدہ کرتا تو پھر سے رونے لگتی۔ اس سے بولا۔ ''یہ کس طرح سے گلے لگی ہو کہ پھر سے دل گھبرائے چلا جارہا ہے۔''

ہنس کر بولی۔ ''وہ والا دل گھبرا رہا ہے؟''

''ہاں وہ والا۔''

بولی۔ ''میرا تو زیادہ گھبرانے لگا ہے۔''

''گلے لگنے سے آنکھیں روتی نہیں بلکہ اس طرح سے دل ساتھ ساتھ گھبراتے ہیں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ ''دور ہٹو مجھ سے۔ اب شادی سے پہلے کبھی گلے نہیں لگوں گی۔'' یہ کہہ کر علیحدہ ہوگئی۔

تہمینہ نے اسی لمحے ہمیں آواز دے کر برآمدے میں بلا لیا۔ ''بہت ہوگیا تم لوگوں کا رونا دھونا۔ میں کب تک اکیلی بیٹھی رہوں گی۔''

باہر جاتے ہوئے غزالہ مجھ سے بولی۔ ''شکیل سے بات ضرور کرنا۔ معلوم نہیں میری مظلوم بہن تمہارے ظالم بھائی پر کیوں اتنی مرے جارہی ہے۔''

میں سوچتا ہوا برآمدے میں چارپائی پر آبیٹھا۔ غزالہ نے سامنے پڑی کرسی سنبھال لی۔ تہمینہ کچن سے نکل کر چارپائی کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔ کہنے لگی۔ ''تم چلے جاؤ گے تو ہمیں بہت یاد آؤ گے۔ جب بھی یہ چارپائی اس جگہ بچھائیں گے تو تم کو بہت یاد کریں گے۔''

''مجھے تو یوں لگتا ہے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ ہر صبح نئی امنگ لے کر بیدار ہونا، تیار ہو کر خوشی خوشی یہاں آنا۔ ساری باتیں بہت یاد آئیں گی۔''

تہمینہ بولی۔ ''ڈیرہ کون سا دور ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ضرور آنا۔'' پھر مسکرا کر بولی۔

''میں نے سوچ لیا ہے کہ اب شکیل سے خود رابطہ کروں گی۔''

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ غزالہ بھی سر اٹھائے اپنی بہن کو دیکھنے لگی۔

''میں اسے خط لکھ رہی ہوں۔ پہلے سوچا تمہارے ہاتھ بھیجوں گی۔ پھر خیال آیا کہ شاید تم دونوں بھائیوں میں بے تکلفی نہ ہو تو فیصلہ کیا کہ آج ہی سڑک والے ڈول میں ڈال آؤں گی۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ ''آخر اس سے پوچھنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھنا۔ بلکہ کچھ یاد دلانا ہے۔ اس سے کہوں گی کہ پشاور آئے تھے تو ڈیرہ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا ہوگیا پھر مڑ کر میری خبر بھی نہ لی۔ میں ڈیرہ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ ندیم کے ذریعے کئی پیغام بھیجے مگر تم نے تو کوئی جواب بھی نہ دیا۔ کوئی تو جواب مجھے ملے گا اور مجھے صرف اس کا جواب چاہیے۔''

''اگر وہ جواب بھی نہ دے تب؟''

وہ اکھڑے لہجے میں بولی۔ ''جواب کیوں نہیں دے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ میں اس کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا تھا۔ پھر بھی اگر وہ مجھے جواب نہیں دیتا تو سمجھوں گی میں نے کوئی جھوٹا خواب دیکھا تھا۔''

میں خوف زدہ ہوگیا۔ دونوں بہنیں حیرانگی سے میرا پریشان زدہ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

میں بولا۔ ''پھر اس کو جھوٹا خواب سمجھ کر بھول کیوں نہیں جاتی؟''

وہ مجھ کو الجھی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کوئی گتھی سلجھا رہی ہو۔ غزالہ کبھی بہن کو اور کبھی مجھے دیکھتی رہی۔ میں بے بس سا بیٹھا تھا۔ ایک جھوٹ مجھے کسی بھوت کی طرح چمٹ گیا تھا۔ ایک بار بول بیٹھا تو اب ہر موڑ پر بولنا پڑ گیا۔ پہلی بار مجھے سچ کی طاقت اور جھوٹ کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال کو کس طرح سنبھالوں۔ مجھے یہ ڈر نہ تھا کہ شکیل اس کے خط کا جواب دے گا۔ وہ تو خط سیدھا والد صاحب کو دے دیتا۔ وہاں سے ماں اور بہن بھائیوں تک خبر پہنچ جاتی۔ یہاں تک بھی میں برداشت کرلیتا مگر مجھے خوف اس بات کا تھا کہ میری والدہ فوراً اس کی والدہ سے رابطہ نہ کرے۔ دونوں ایک دوسرے کے بچوں کو قصوروار ٹھہراتیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور نام غزالہ کا اچھلتا جو مجھے ہرگز ہرگز گوارا نہ تھا۔

میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ ''تم اسے کتنا چاہتی ہو اور اسے پرواہ بھی نہیں۔ اس کے پیچھے بھاگنا فضول ہے۔''

وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ ''میں اسے نہیں بھول سکتی۔ لڑکے اپنی محبت بدلتے ہوں گے مگر لڑکی نہیں بدلتی۔''

''ہوسکتا ہے وہ کسی اور کو چاہتا ہو؟''

''ٹھیک ہے اس کا جواب نہ آیا تو میں اسے بھولنے کی کوشش کروں گی۔'' وہ طیش بھرے لہجے میں بولی۔

میں بولا۔ ''ٹھیک ہے یہ خط مجھے دے دو میں پہنچا دوں گا۔''

''بالکل نہیں دوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نہیں چاہتے ہم ایک ہوسکیں۔ کوئی بات ضرور ہے جو مجھے معلوم نہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں صرف تمہارا وہم ہے۔''

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے پہلے شک تھا مگر اب یقین ہو رہا ہے کہ تم نے شکیل کو میرے بارے میں کچھ غلط بتایا ہوگا جو وہ ملنے نہیں آیا تھا۔''

اس کے لہجے میں وہی عزم تھا جب مہندی والی رات بولی تھی کہ چاہوں تو تم اور غزالہ کبھی نہیں مل سکتے۔

اس وقت میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کہ اسے سچ بتادوں۔ مجھے معلوم تھا کہ حقیقت جان کر اسے اپنی ہتک محسوس ہوگی۔ شاید مجھے معاف کردے یا شاید میری محبت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔

میں نے تہمینہ کو شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''ادھر چارپائی پر میرے ساتھ آبیٹھو۔ تم کو سمجھاتا ہوں۔''

''میں یہاں ٹھیک ہوں۔ جو کہنا ہے وہیں میرے سامنے کہو۔''

میں نے غزالہ کی جانب بے بسی سے دیکھا اور وہ مجھے حواس باختہ دیکھ کر حیران بیٹھی تھی۔ میرا دماغ سن تھا اور خود کو بھنور میں پھنسا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے تہمینہ سے پوچھا۔ ''اس نے کبھی بولا تھا کہ وہ تم کو چاہتا ہے؟''

''یہ میری اور اس کی باتیں ہیں۔ آخر تم کو کیوں بتاؤں۔ میں نے کبھی غزالہ سے پوچھا ہے کہ ندیم تم سے کیا باتیں کرتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اب بات اور ہے تم کو بتانا ہوگا۔''

چیخ کر بولی۔ ''نہیں بتاتی۔''

میں بڑے آرام سے بولا۔ ''مجھے معلوم ہے تم دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔''

''تم کو کیسے معلوم ہے؟'' وہ مجھے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب میری پوری بات سننے کے بعد کئی سوال پوچھنا۔'' میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔

''تم آٹھویں کے امتحانوں کے بعد ڈیرہ آئی تھیں۔ اتوار کا دن تھا وہ تمہارے گھر ٹی وی دیکھنے آیا تھا۔ تم نے اس سے کہا تھا کہ یہاں میرے ساتھ بات کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ تم نے اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ نئی دوست پاکر بہت خوش ہوا تھا۔ تمہارے لیے کہانیاں لاتا، تمہاری تصویریں بناتا، تم اسے شعر لکھ کر دیتیں اور تمہارے اشعار والی کاپی کو تو ابھی تک سنبھالے ہوئے ہے۔

وہ جس دن اپنی دوست کو نہ دیکھتا، بے چین رہتا تھا۔ جب تم اپنی خالہ کے گھر دو دن کے لیے رہنے گئیں تو اس نے وہ دن بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اس کو یوں لگتا تھا کہ اس نے خود کو کھو دیا ہو۔ اس کے بعد جب تم پشاور چلی گئیں تو وہ تم کو یاد کرتا رہتا۔ وہ اداس رہنے لگا تھا۔ وہ اپنے اور تمہارے اس رشتے کو کوئی معنی دینے سے قاصر تھا۔ وہ اسے پیار اور دوستی کا رشتہ سمجھتا تھا۔ وہ کئی دنوں تک تم کو یاد کرتا رہا۔ پھر موقع پاکر تم سے ملنے پشاور آیا۔ وہ اس جگہ کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ تم اس الماری سے شربت کی بوتل اٹھانے دوسری کرسی پر چڑھی تھیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا۔ تمہاری باتیں اس کو بہت سچی لگ رہی تھیں۔ تم اتنی پُرجوش تھیں کہ بوتل سے ذرا سا شربت اس کے کُرتے پر گرا دیا، تم بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں اور وہ تمہیں پریشان ہونے سے روک رہا تھا۔''

تہمینہ یہاں رک کر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''یہ ساری باتیں اس نے تم کو بتائی تھیں؟''

میں نے بات جاری رکھی۔ ''اب آگے سنو۔ تمہارے والدین اور غزالہ باہر سے گھر کے اندر داخل ہوئے تو وہ یہاں برآمدے میں کھڑا تھا۔ غزالہ یہاں سے چل کر اس کمرے کے اندر چلی گئی تھی اور وہیں اسے غزالہ سے محبت ہوگئی۔''

اس کے بعد جیسے کوئی بم پھٹا تھا اور کرچیاں فضا میں تیر رہی تھیں۔ جیسے دیواریں اور چھتیں لرز رہی تھیں۔ غزالہ انتہائی خوف زدہ ہوگئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میری ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے تسلی دی۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

تہمینہ انتہائی نفرت سے بولی۔ ''تم کو شرم نہیں آتی، کتنی بے شرمی سے اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہے ہو کہ اسے غزالہ سے محبت ہو گئی تھی اور تم بھی اس لڑکی سے محبت جتلا رہے ہو جس کو تمہارا بھائی بھی پسند کرتا ہے۔''

''وہ شکیل نہیں میں تھا، ہر جگہ میں تھا۔ شکیل تو کہیں بھی نہیں ہوتا تھا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کا سرخ گلابی رنگ دھواں دھواں ہو گیا۔ ہر وقت مسکراتی آنکھیں مجھے بے یقینی اور دکھ سے دیکھ رہی تھیں۔ غزالہ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ ایسا کہ جیسے کسی نے سرا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں تہمینہ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ابھی ابھی ایک ہنستا مسکراتا پھول کملا گیا تھا۔

''تم جب بھی مجھ سے شکیل کے بارے میں پوچھتیں تو میں کسی طرح سے اس ذکر کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ بھول میری تھی کہ جب پشاور میں تم نے مجھے شکیل کہا اور میں نے تمہاری غلطی کی تصحیح نہیں کی تھی پھر حالات ایسے ہوتے گئے کہ چاہتے ہوئے بھی تم کو سچ نہ بتا سکا۔ میرا یقین کرو۔ میں غزالہ سے پیار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میری بہت عزیز دوست ہو۔ تم کو دکھی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تم اسے اگر میری غلطی سمجھتی ہو تو تم سے معافی مانگتا ہوں۔''

تہمینہ اٹھی اور کمرے میں چادر لے کر لیٹ گئی۔ غزالہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچن سے پانی کا گلاس بھرا اور بہن کے پاس بیٹھ گئی۔

میں ضمیر پر کوئی بوجھ لادے غزالہ سے اپنی محبت کو پروان نہیں چڑھا سکتا تھا۔ میں نے سچ بولنا تھا۔ اب سوچتا ہوں یہ سچ میں نے نہ بولا ہوتا۔ اس سے بہتر تھا کہ کوئی موڑ دے کر غزالہ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتا جیسے چلتے چلتے کسی بھرے میلے میں کوئی بچھڑ جاتا ہے۔ کم از کم میں غزالہ کا معصوم چہرہ جو مرجھا گیا تھا، وہ تو نہ دیکھ سکتا۔ تہمینہ کے چہرے پر چھائی اذیت تو نہ دیکھ سکتا۔ میرا اور غزالہ کا ملنا ویسے ہی مشکل تھا کیونکہ بیچ میں ہر وقت تہمینہ کھڑی تھی۔ محبت کو پروان چڑھانے کا ہنر مجھے نہیں آتا تھا اور میں مات کھا گیا۔ غزالہ جس کو اس صبح گلے سے لگائے مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا، وہ اسی دوپہر مجھ سے دور پرائی بنی بیٹھی تھی۔

دوسری صبح ان کے گھر گیا تو ایسا لگا جیسے کسی غلط جگہ آ گیا ہوں۔ ایک اجنبی فضا تھی۔ نہ برآمدے میں چارپائی بچھی تھی نہ تخت تھا اور میز بھی نجانے کہاں غائب تھی۔ تہمینہ کچن میں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھا تو بے زار سا چہرہ بنا لیا۔ غزالہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں کچھ دیر کھڑا رہا اور کسی نے مجھے بیٹھنے کا نہ کہا۔ خود ہی دیوار سے لگی چارپائی بچھائی اور بیٹھ گیا۔ جہاں میرے لیے کل تک پلکیں بچھائی گئی تھیں آج وہاں کی زمین میرے پیروں تلے سے کھینچ لی گئی تھی۔ درد سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھیں پتھرائی تھیں اور ٹانگوں میں جان نہ تھی۔ تہمینہ اٹھی اور پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''ناشتا کر کے آئے ہو؟''

اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔''

''ٹکٹ لے آئے؟''

''نہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

چونک گئی۔ ''کیا نہیں جا رہے؟''

بغیر پانی پیے گلاس واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ دیر بعد پشاور چھوڑ دوں گا۔ رات پنڈی میں گزار کر کل صبح ڈیرہ جاؤں گا۔''

''کل یہاں پشاور سے چلے جانا۔''

بمشکل آواز نکالتے ہوئے بولا۔ ''نہیں رک سکتا پشاور میں۔ مجھے یہاں سے آج بلکہ ابھی نکلنا ہے۔'' وہ میرا چہرہ اداس نظروں سے دیکھنے لگی۔

ان دونوں کے رویے دیکھ کر اچانک میرے اندر آگ جل اٹھی تھی۔ دل کر رہا تھا سب جلا کر راکھ کر دوں۔ تہس نہس کر دوں ہر چیز کو۔ یہ آسمان گرا دوں، یہ زمین پھاڑ دوں، فنا کر دوں سارے جہان کو۔ میرے اندر آتش فشاں دہکنے لگا تھا۔ یہاں میں اپنی بربادی کا سامان دیکھنے چلا آیا تھا۔

میں پوری رات نہ سو سکا تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے مجھے صبح ہو گئی تھی۔ نیند آنے بھی لگتی تو خود کو جگائے رکھتا کیونکہ کوئی برا خواب دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا مگر یہاں آیا تو میری بدنصیبی مجھ پر غرا رہی تھی۔

میں نے غزالہ کو آواز دے کر کمرے سے باہر بلایا۔ وہ سوجی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ بال بکھرے اور ان کی چمک معدوم تھی۔ اس سے کیا پوچھتا کیا تمہارے پڑھے سارے وظیفے رائیگاں گئے۔ وہ آنکھوں کے دیپ بجھائے مجھے کھوکھلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا اپنے اندر طوفان لیے بیٹھی ہو۔ پھٹ پڑی تو سب بہا لے جائے گی۔ میرے پیار کی کشتی میری نظروں کے سامنے ڈوب رہی تھی۔ ہم

دونوں ایک طوفان کی زد پر کھڑے تھے۔

''آج پڑھائی نہیں کرنی؟'' میں نے بے تاثر لہجے میں اس سے پوچھا۔

وہ اجنبی آواز میں بولی۔ ''اب کیا پڑھوں گی۔ لگتا ہے میں کسی بھی امتحان میں نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ بات کر کے اداس بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لہجے کی شکستگی میری روح کو زخمی کر گئی۔ وہ ہاری ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ آنکھیں جہاں ہمیشہ دلآویزی چھائی رہتی اب وہاں جلتے چراغ بجھ چکے تھے۔ چاند چہرے پر سیاہ بادل چھائے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تھک گئی ہو؟''

دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور لکیر بناتے ہونٹوں کے قریب آ رکے۔ میرے سوال پر ہاں میں سر ہلا کر ہونٹ کاٹتی مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا وہ سامنے نہیں کہیں دور سے بیٹھی مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس نے اپنے آنسو خشک نہیں کیے۔ وہ کٹھن مرحلے ہم دونوں کے لیے یکساں تھے۔

''غزالہ! مجھ سے کچھ کہو، کچھ بولو اگر خاموش رہی تو میں کئی سوال دل میں لیے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔'' وہ تڑپ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم بھی بہن کی طرح مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔'' وہ بولی۔ ''نہیں، کبھی نہیں۔''

اتنے میں کچن میں بیٹھی تہمینہ بولی۔ ''نفرت نہ میں کرتی ہوں اور نہ غزالہ کرتی ہے مگر جو حالات بن گئے ہیں اس میں بہتر یہی ہے کہ معاملہ یہیں ختم کر لیا جائے۔ تم غزالہ کو بھول جاؤ۔''

منت سماجت کرنا پیار کی رسم ہوتی تو یہ رسم بھی پوری کر دیتا۔ بھیک میں کوئی کسی کے گلے میں ہار نہیں ڈالتا۔ محبت تو گلے کا ہار ہے جو انعام میں ملتا ہے۔ محبت تو تڑکتی دو لہروں میں گھنے بادلوں کی طرح آسمان پر چھا جاتی ہے۔ یہ حبس کے موسم میں بارش کی صورت دل کی زمین پر پڑتی ہے۔ یہ ظلمتوں میں ڈوبے ویرانوں میں چاندنی کی مانند پھیلتی ہے۔ محبت ملے تو نواز دیتی ہے، چھن جائے تو مفلس کر دیتی ہے۔ تہمینہ کا دل ٹوٹا تو اس نے مجھے بھی ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔

میں نے تہمینہ سے کہا۔ ''اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تم کو دھوکا دیا ہے تو مجھے غزالہ کی قسم یہ غلط ہے۔''

اپنی قسم سن کر غزالہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اسے معلوم تھا مر جاؤں گا مگر اس کی جھوٹی قسم نہیں اٹھاؤں گا۔ تہمینہ بیٹھی دیوار کو تکتی رہی۔

غزالہ سے میں نے پوچھا۔ ''تم اپنا فیوچر مجھے سناؤ۔''

اندر کمرے میں گئی اور وہ کاپی اٹھا لائی جس پر NG, NG لکھ لکھ کر ہم نے صفحے بھر دیے تھے۔ پن کھولا اور پیار کی ان نشانیوں کو سیاہی سے مٹانے لگی۔ میں اپنی محبت کو مٹتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ہاتھوں کی مہندی پھیکی ہوتی جا رہی تھی۔ جب حرف کھرچتی تو میرا قتل کرتی۔ مجھے مارتی زندہ کرتی اور مار دیتی۔ مجھے میری بدنصیبی کی سزا مل رہی تھی۔ نہ کوئی احتجاج کیا اور نہ آنسو بہائے۔ میں اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھنے لگا جو میرے لیے ایکدم پرایا بن چکا تھا۔ جب کاپی کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے دل سے بھی کھرچ چکی تو اس سے پوچھا۔

''پیار کی گرہ تو بڑی مضبوطی سے میں نے لگائی تھی حیرت ہے تم سے کھل کیسے گئی۔ لگتا ہے مضبوط نہ تھی۔''

وہ آنسو بہاتی ہونٹ کاٹتی بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے کاپی مانگی تو دینے سے پہلے اس پر کئی بار مجھے معاف کر دو لکھا اور کاپی مجھے دے دی۔ میں نے کاپی کے سب صفحے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر آخری صفحے پر لکھا۔

''معاف تو نہیں کیا جاتا ہے جو قصوروار ہوں۔ بے قصور سے تو معافی مانگی جاتی ہے۔ مجھے معاف کر دو کہ محبت کی بازی میں ہار گیا۔ تمہارا دل دکھانے کا قصوروار میں ہوں۔ میں اس معاملے کو سنبھال سکتا تھا مگر سنبھال نہ سکا۔''

اس نے کاپی مجھ سے لے لی۔ میرے لکھے فقرے پڑھے اور ان پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا۔

''تم پیار میں جیت کر جا رہے ہو۔ مجھے بھول جانا۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے بہت چاہتے ہو۔ دیکھنا تم کو میرے جیسی ضرور ملے گی۔'' میرا ہاتھ پکڑا کر اپنی بات جاری رکھی۔

''میرے جتنا پیار کرنے والی لڑکی اللہ تم کو ضرور دے گا۔ میری کمی کو وہ محسوس نہیں ہونے دے گی۔''

''غزالہ تمہاری کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ کسی کی رفاقت تم کو میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔ یقین کرو کوئی انسان تم کو بھولنے میں میری مدد نہیں کر سکتا۔''

دیکھا کہ تہمینہ باورچی خانے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''تم

سے معافی مانگتا ہوں۔ میرے متواتر جھوٹ نے میرا پیار ہی نہیں بلکہ ساتھ میری اتنی پیاری دوست کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ میں بے وقوف تھا جو سچ بتانے سے ڈر گیا تھا۔ تمہارے جذبات اور تمہاری محبت سے کھیلنے کا میرا ارادہ ہرگز نہ تھا۔''

وہ کچھ نہ بولی۔ روتی رہی اور روتے روتے اپنے گال میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

اس سے کہا۔ ''غزالہ میرے دل میں رہے گی اور تم میری آنکھوں میں۔ دوست آنکھوں میں بستا ہے۔''

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

میں اپنا ہاتھ تہمینہ سے چھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم دونوں مجھے بہت یاد آؤ گے۔ سالوں گزر جائیں گے مگر نہیں بھول پاؤں گا نہ اپنے پیار کو اور نہ اپنی ہنستی مسکراتی دوست کو۔''

میں برآمدے ہی میں تھا کہ منیر باہر کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

''واہ جی بڑے مزے ہو رہے ہیں۔ کیا کھایا جا رہا ہے؟''

میرے لہو میں شرارے لپکنے لگے۔ اسے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا۔ خود سے بولا۔ ''آج تیرا حساب بھی برابر کر دیتا ہوں۔''

میرے لہجے نے ان دونوں بہنوں کو دہلا دیا۔ وہ ایک ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں وہ قریب آ گیا۔

''بھائی جان! ریڈیو لے آؤ۔ لگتا ہے آج میرا نام ضرور آئے گا۔''

پھر میرا ہاتھ اٹھا، چٹاخ کی آواز آئی اور وہ اگلے لمحے زمین کی مٹی چاٹ رہا تھا۔ دونوں بہنیں منہ دابے اپنی چیخیں روکے کھڑی تھیں۔ میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس سے کہا۔ ''جب تک ان کی ماں نہیں آتی ہے اس گھر سے دور رہنا۔ ورنہ تیرا ریڈیو تیرے سر پر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔''

میں صحن میں آیا۔ باہر کا دروازہ کھولنے سے پہلے انہیں پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں روتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور منیر فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر گلی میں نکل آیا۔

میری داستان ختم ہوئی تو میں خاموش بیٹھا سامنے باڑہ گلی کے درخت دیکھ رہا تھا جو تھکے ہارے کھڑے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور سرکیمپ کسی اجاڑ مقام کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ آسمان، چاند اور زمین سب غمگین تھے۔ لطیف نے سگریٹ سلگائی اور دھواں فضا میں تحلیل کر دیا پھر بولا۔

''تم کو ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ تو ڈرامے کرتا ہے۔ لو اسٹوری ہمیشہ سیدھی سادی ہوتی ہے اور تم نے دو بشکل بھائیوں کا پنگا بیچ میں لے لیا۔ میں چکرا گیا ہوں تو وہ دو معصوم لڑکیاں نہیں چکرائی ہوں گی؟'' پھر مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر بولا۔

''سمجھ نہیں آتی آخر تمہارا قصور کیا تھا؟''

''تم کو لگے گا کہ کوئی قصوروار نہیں مگر غور کرو تو قصوروار میں نظر آؤں گا۔ میرا قصور یہ نہیں کہ غزالہ سے محبت کیوں کی۔ قصور یہ ہے کہ محبت کا اظہار کیوں کیا جب اس کی بہن تہمینہ میری تلاش میں تھی اگر تہمینہ کو شروع سے سب سچ بتا کر غزالہ کو محبت کا پیغام بھیجتا تو وہ میرے سامنے شکیل سے اپنے پیار کا اقرار اور اظہار نہ کرتی اور اسے وہ ہتک محسوس نہ ہوتی جو میری اصلیت کھلنے پر اسے ہوئی تھی۔ یہ اس کی کھلی اہانت تھی میرے اور اپنی بہن کے سامنے۔ اس کے دل پر کیا گزری ہو گی کہ جس لڑکے سے وہ پیار کرتی ہے وہ اس کی نظروں کے سامنے بھیس بدل کر اس کی بہن کو گلے لگائے پھرتا ہے۔ حقیقت کھلنے کے بعد ہم جب جب اس کے سامنے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آتے تو وہ مر مر کر جیتی اور جی جی کر مرتی۔ وہ مجھے اپنے گھر میں بے لگام نہیں چھوڑ سکتی تھی اور بڑی بات یہ ہے کہ میں اور غزالہ کس منہ سے اس کے سامنے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آتے؟ لہٰذا غزالہ دل کے بجائے عقل کی مان کر مجھے چھوڑ گئی اور تہمینہ نے عقل کے بجائے دل کی مان کر مجھے غزالہ سے دور کر دیا۔

''اب بھی غزالہ کو اتنا ہی پیار کرتے ہو۔''

''لاکھ جتن کروں اسے دل سے نہیں نکال سکتا۔ میں نے کنول کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے اندر بیٹھی غزالہ کو دیکھا تو بے خودی میں اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کنول کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ نظروں نظروں میں غزالہ گلہ کر رہی ہو، مجھے دور دور سے دیکھتے ہو پہچان کیوں نہیں رہے؟''

لطیف بولا۔ ''تیری بات سو فیصد ٹھیک لگتی ہے۔ مجھے معلوم نہ ہوتا تو تصویر دیکھ کر یہی سمجھتا یہ غزالہ نہیں کنول ہے۔''

پھر ہنس کر بولا کہ تو اپنی اس فلم کا نام ''بشکل بھائی'' نہیں بلکہ ''بشکل بہنیں'' رکھ۔ بڑی ہٹ اسٹوری ہے۔''

میں نے لطیف سے کہا۔ ''مجھے غزالہ کسی بھی شکل میں کہیں بھی ملے، اسے فوراً پہچان لوں گا۔ وہ کنول بن کر آئے

یا کسی اور روپ میں، اس کی چاہت اپنی پہچان خود کرائے گی۔''

لطیف ہنس کر کہنے لگا۔ ''تو پھر ڈراما کر رہا ہے کہ غزالہ کی تلاش میں ہوں۔ تین سال سے زیادہ کا وقت گزر گیا ہے۔ تہمینہ کو بھی اب کچھ یاد نہیں ہوگا کہ کیا ہوا تھا اور جو اس کا روپ ہے کنول، وہ بھی آئی اور آ کر چلی گئی۔''

''تو کیا کروں؟''

''دوبارہ پہنچ جا ان کے گھر۔ دروازے پر جا کر دستک دے، یونیورسٹی میں فارمیسی کر رہے ہو۔ امریکا بھی چلے جاؤ گے کہاں کہاں اور کس کس لڑکی میں غزالہ کو تلاش کرو گے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اسی چکر میں کہیں نہ کہیں ضرور پٹو گے۔ دیکھ لینا اس کے ماں باپ فوراً راضی ہو جائیں گے۔''

''کس چیز پر راضی ہو جائیں گے؟''

''بیٹی سے شادی پر اور کس چیز پر۔''

''اس کی تو شادی بھی ہو گئی۔'' میں اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے بولا۔

وہ سن کر حیرت سے اچھل پڑا۔ ''کیوں؟ مگر کیسے؟ ہوئی کب؟''

''اس دن جب ہم پنڈی سے آ رہے تھے۔ اس دن جب کنول کو چھراپانی میں کار کے اندر بیٹھے دیکھا تھا۔ اسی شام جب غزالہ کی کہانی سنانی شروع کی تھی۔ اسی رات اس کا نکاح تھا۔''

وہ پوچھنے لگا۔ ''مگر تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔''

''اس لیے میرے اندر ایک بھونچال تھا۔ خود کو سنبھالنے کے مرحلوں میں تھا۔ میں کوئی سوگ نہیں منانا چاہتا تھا۔ اگلی دوپہر جب سیسل ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے کنول کو لان میں بیٹھے دیکھا تو میرے زخموں پر مرہم پڑنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی کسی سے جدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ آپ کے آس پاس ہوتا ہے۔ رات کو جب مال روڈ پر کنول ملی تھی۔ تو ایسا لگا کہ غزالہ انجان بنی پھر رہی ہے۔''

لطیف بہت سے سوال آنکھوں میں لیے مجھے پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

''اتنی جلدی اس کی شادی کیوں کر دی گئی؟''

اس نے انٹر کر لیا تھا۔ کوئی دور کا رشتہ دار دبئی میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ انہوں نے کہا کسی بھی لڑکی کا رشتہ ہمارے بیٹے کو دے دو۔ تہمینہ نے انکار کر دیا اور ماں باپ نے پکڑ کر دبئی کے امیرزادے کو غزالہ تھما دی۔''

''تم کو پہلے خبر نہ تھی؟''

''نہیں۔ سب جلدی جلدی میں ہوا۔ وہ شادی کر کے بیوی کو دبئی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ماں باپ نے ذرا بھی دیر نہ کی۔ شاید اب تک دبئی پہنچ بھی گئی ہو۔''

''نہیں یار یہ بڑا ظلم ہوا۔ میں تو حیران ہوں تو آرام سے بیٹھا رہا۔''

''میں کیا کرتا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ تہمینہ کی طرح وہ بھی انکار کر دیتی یا مجھے بلو کے ہاتھ ایک پیغام بھجوا دیتی تو یہ شادی ہرگز نہ ہونے دیتا۔ مگر اسے تو قربانی دینے کا شوق تھا۔''

''کیا وہ بلو سے ملی تھی؟''

''ایک نہیں کئی بار ملی تھی۔ وہ اس کی شادی کے بہت سے کام کر رہا تھا۔ بلو بتا رہا تھا کہ مجھ سے ہر بار مل کر روتی تھی۔ میرے بارے میں پوچھتی۔ یہ پوچھتی کہ اس سے ناراض تو نہیں۔ کہتی کہ پچھلی بار اپنے بھائی جان کی طرف سے خوشی بھرے پیغام اور خط لاتے تھے۔ اس سے کہتی کہ تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے وہ یاد آ جاتے ہیں۔ کئی بار لگا وہ صحن میں کہیں قریب کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ بلو نے جب اسے بتایا کہ بھائی جان کلاس کے ہمراہ مری جا رہے ہیں تو اسے بہت اطمینان ہوا۔ بولی تھی یہ ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوا ہے۔ ورنہ یہاں اس کی موجودگی ہم دونوں کو مار دیتی۔

ایک دن میں کمرے میں لیٹا تھا اور بلو اس کا خط لایا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے تصویر کے ہمراہ اس کا آخری خط نکالا۔ یہ دونوں میں سنبھال کر اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ خط لطیف کو دیا اور تصویر آنکھوں کے روبرو رکھ لی۔ میرے آنسو بہنے لگے۔ لطیف خط پڑھ رہا تھا۔

میرے.....

شاید میرا تمہارے لیے یہ آخری خط ہے۔ اپنے ہر خط کا جواب تم سے لڑ جھگڑ کر مانگا ہے۔ آج یہ لکھتے ہوئے میرا دل بہت دکھی ہے کہ مجھے اس خط کا جواب نہیں چاہیے۔ میں تمہارے پیار میں ڈوبے لفظوں کے قابل نہیں ہوں۔

میرے سامنے صرف ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اس رشتے کو قبول کر کے شادی کر لوں۔ جب تم ہی نہ ملے تو مجھے کیا غرض کون ملتا ہے۔ تم چلے گئے تھے اور پھر میری خوشیاں ہمیشہ کے لیے روٹھتی چلی گئیں۔ تم کو کتنا تنگ کر کے ہنستی تھی اور اس کے بعد شاید ہی کبھی ہنسی ہوں۔ منیر کو تو پہلے ہی سے ہمارے بارے میں شک تھا۔ جب تم سے مار کھائی تو امی کو

تمہارے بارے میں معلوم نہیں کیا کیا غلط بتا دیا۔ امی میرے بارے میں بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ کالج کے علاوہ میرا گھر سے اکیلے نکلنا بند کر دیا گیا۔ تمہارے ساتھ آخری بار جناح اور کمپنی باغ آزادی سے گئی تھی۔ امی میری شادی جلد کر دینا چاہتی تھیں۔ رشتہ آیا تو تہمینہ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد والدین نے میرے آگے جھولی پھیلا دی۔ نہ روئی، نہ چلائی اور نصیب سمجھ کر اس رشتے کو قبول کر لیا۔ جو خوشیاں تم کو دینی تھیں وہ بھی والدین کی جھولی میں ڈال دیں۔

تم سے محبت ہونا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ خوشی میرے اندر زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ درمیان میں تہمینہ نہ ہوتی تو ہمارا ایک ہو جانا مشکل نہ تھا مگر میں بے حس نہیں کہ اس کی خوشیاں روند کر تمہاری بن جاؤں۔ خود غرض بن کر میری محبت کو گہن لگ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہم دونوں مل جاتے تو تہمینہ اپنی محبت کی موت دیکھ کر زہر کھا لیتی۔ حالانکہ اس نے کئی بار مجھے رو رو کر کہا کہ تم سے رابطہ کروں۔ کہتی ہم دونوں کے درمیان کبھی پیار تھا ہی نہیں تو کیوں تم دونوں کی خوشیوں کی راہ میں آؤں۔ وہ پاگل میرے لیے قربانی دینا چاہتی تھی۔ اس کو کیا بتاتی کہ محبت میری تھی تو قربانی کی حق دار بھی میں ہوں۔ جس دن تم نے ہمیں اپنے بارے میں سچ سچ بتا دیا تھا، اسی رات ہم دونوں سینے سے لگ کر روتی رہی تھیں۔ اس رات تہمینہ کو بلک بلک کر روتے دیکھ کر میں حیران رہ گئی تھی کہ وہ تم کو اتنا چاہتی ہے۔ گلے میرے لگی تھی اور رو تم کو رہی تھی۔ اسی رات میں نے سوچا کہ اگر تم کو میں نے پا بھی لیا تو اس کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ وہیں میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی راہ تم سے جدا کر لوں اور اگلی صبح تمہارے سامنے کاپی پر لکھے حرف مٹا مٹا کر تمہارا دل ٹکڑے کر دیا۔ تم خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب چلے گئے تب سے اس دل کی کرچیاں چن رہی ہوں۔"

"تہمینہ تمہارا غم اپنے دل میں لے کر بیٹھی ہے۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی مگر بہن کے دل کی حالت میں جان سکتی ہوں۔ اس کے اندر تمہارے لیے اتنا پیار دیکھ کر سوچتی ہوں کاش تم کو مجھ سے نہیں اس سے محبت ہوتی۔ مجھے لگتا ہے وہ تم سے ملے گی۔ وہ میری طرح ہار ماننے والی نہیں۔ تم بہتر سمجھتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔ اس کو قصوروار سمجھ کر رلانا نہیں، غصے میں آ کر اس کو ایسا کچھ نہ کہنا کہ وہ دکھی ہو جائے۔ اس کو برا بھلا بھی نہیں کہنا بلکہ اس سے مسکرا کر بات کرنا۔ اس نے تم سے بہت زیادہ پیار کیا ہے۔ اس کے پیار کا یہ صلہ اسے ضرور دینا کہ وہ روتی ہوئی واپس نہ جائے۔ مجھے تم دونوں کی خوشی عزیز ہے۔

تمہاری سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا گو.....

لطیف خط ختم کر کے اسے کھوکھلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ سوچنے کے بعد پوچھا۔ "تہمینہ سے ملے تھے؟"

ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے سوچا نہیں ملتا مگر جب بلو نے کہا کہ تہمینہ باجی بہت اصرار کر رہی تھیں اور بعد میں رونے بھی لگی تھیں تو ملنے کا ارادہ کر لیا۔ غزالہ نے بھی خط میں اشارہ دیا تھا کہ اس سے ملنا ہے اور مسکرا کر ملنا ہے۔ ویسے بھی مجھے تہمینہ سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا۔ میری اچھی دوست تھی۔ اس کو میں پہلے ہی بہت دکھ دے چکا تھا۔ اس کے بعد اس کو میں کیا دکھ دیتا۔ اس کا میرا تعلق سات سال پرانا تھا۔ اس کا ہنستا کھلکھلاتا چہرہ اور چمکتی آنکھیں اس لیے نہ تھیں کہ انہیں رلایا جائے۔

میں نے بلو سے پوچھا کہ تو بتا کہاں ملنا ہے۔ وہ بولا تہمینہ باجی کو کپڑے سلوانے درزی کے پاس لے جاتا ہے اور شادی کے لیے کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔ اس کے بعد ماں کے پاس کشیدے کے کچھ کپڑے بھی دینے ہیں۔ میں تہمینہ باجی کو دریا پر لے آتا ہوں، آپ بھی وہاں آ جائیں۔ دیر ہوئی تو بہانہ کریں گے ماں نے بٹھا دیا تھا۔

میں نے بلو سے کہا۔ "اس کو کل دریا پر نہیں، ہوٹل کے لیڈیز سیکشن میں لے آنا۔ اسے وقت بھی بتا دیا۔

غزالہ کی محبت کے بعد تہمینہ کو اپنانا ممکن نہ تھا اگر غزالہ کا پیار مجھے جکڑے نہ ہوتا تو تہمینہ سے بڑھ کر کوئی لڑکی میرے سامنے موجود نہ تھی۔ میں اس کے ساتھ دوستی اور پسندیدگی کے بہت خوب صورت اور دلکش تعلق سے وابستہ رہا تھا۔ اس کی باتیں شہد کی طرح میٹھی اور قرب خوشبو سے بھرا تھا۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی مگر اس میں اضافہ اس کی سادگی، رکھ رکھاؤ اور دلچسپ باتوں نے کیا تھا۔ غزالہ سے جدائی کو تین سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا مگر اس کی محبت کی آگ میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکا تھا۔ اب تہمینہ سے ملنا میرے لیے ایک بڑا امتحان تھا۔ غزالہ نے اپنے خط میں مجھے تہمینہ کی سوچ اور ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہ روتی ہوئی واپس نہ آئے۔

وہ رات میں نے سوچتے سوچتے گزار دی۔ آخر کار فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس سے غزالہ کی بابت

کوئی سوال نہیں کروں گا اگر وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہے تو مجھے تہمینہ کو اس سے نکالنا ہے۔ اس کو یہ یقین مہیا کرنا ہے کہ اس کی چاہت، دوستی، اہمیت اور قدر کسی طرح غزالہ سے کم نہیں۔ اس کا اعتماد اسے لوٹانا ہے اور آخر میں یہ کہ وہ اگر میری جانب محبت کا ہاتھ بڑھاتی ہے تو اسے کسی طرح سے یہ سمجھانا ہوگا کہ غزالہ کی چاہت کے بعد یہ بہت مشکل ہوگا۔ اپنی کوئی ذاتی مجبوری اسے نہیں بتانی۔ اگر میں یہ کر جاتا تو غزالہ کی بات کو بھی پورا کر دیتا اور خود بھی مطمئن ہو جاتا کہ میری دوست مجھ سے روٹھ کر نہیں گئی۔ میری تو کوشش تھی کہ آخر میں وہ خود ہی مجھ سے کوئی تعلق جوڑنے سے انکار کر دے۔

میں ہوٹل کے لیڈیز سیکشن میں داخل ہوا تو وہ کسی دھیان میں گم صم بیٹھی تھی۔ تین سال بعد مجھے دیکھا چونک کر بے خیالی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چادر میں لپٹی ہراساں کھڑی تھی۔ چہرہ اس کا کسی ان دیکھی روشنی سے منور تھا۔ ہم تواتر سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں ندامت کی جھلک تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ مضطرب کھڑی ہے۔ مجھے وہ لڑکی یاد آ گئی جو تقریباً سات سال پہلے مجھ سے پہلی بار ملی تھی۔ میں اسے تین سالوں بعد دیکھ کر حیران کھڑا تھا۔ وقت نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا تھا۔ جن نظروں سے وہ مجھے دیکھ رہی تھی تو لگا دنیا کا اہم ترین انسان میں ہوں۔ وہ میرے تاثرات جانچ رہی تھی۔ میں نے ایک بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا پہلے تو لگا وہ سراسیمہ سی کھڑی رہی۔ پھر میرا احوال پوچھنے لگی۔ میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دوست کی محبت اور بہار کی صبح میں کوئی فرق نہیں۔ آج بہار کی صبح نہیں مگر تمہاری محبت تو ہے۔'' اس کو کرسی پر سامنے بٹھا کر پھر خود بیٹھا۔ اس کو دیکھ کر میرے اندر رنج کی ایسی لہر اٹھی کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اسے اور غزالہ کو اکٹھے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا سایہ ہوتی تھیں۔ آج تہمینہ کو تنہا دیکھا تو مغموم ہو گیا۔ اس نے پرس سے رومال نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنے آنسو تو پونچھ لو۔ کتنے سالوں بعد ملے ہو مگر ذرا بھی نہیں بدلے۔''

میں نے آنکھیں صاف کیں۔ پھر اس سے رسمی باتیں کرتا رہا۔ وہ انتظار میں رہی کہ میں کوئی شکایت و شکوہ کروں گا۔ کچھ طیش دکھاؤں گا، کچھ اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں گا۔ مگر میں اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

باتیں کرتے کرتے کرسی ذرا آگے کھسکا کر پوچھا۔ ''شکیل سے ملنے آئی ہو کہ ندیم سے؟''

چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی اُمید کے برعکس میں کوئی دوسری بات کر رہا تھا۔ میری بھرپور مسکراہٹ اور گلے لگانے نے اس کا اعتماد کافی حد تک بحال کر دیا تھا۔ مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہ بتاؤ تم کون ہو؟ ندیم ہو کہ شکیل؟''

''میں دونوں ہوں۔''

''پھر سوال خود سے کرو، مجھے آج کیا بن کر ملنا ہے۔''

''اگر یہ کہوں کہ میں نے دونوں کو اپنے اندر دفن کر دیا ہے۔''

''پھر بھی میں تم سے ملنے آئی ہوں۔'' اس نے برجستہ جواب دیا۔

''تم تو ان دونوں سے واقف تھیں۔ میں تو ایک اجنبی ہوں۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اجنبی کے دل میں میرے لیے نہ کوئی غصہ ہوگا، نہ کوئی ناراضگی۔''

''اگر تم کو سامنے بیٹھا دیکھ کر دونوں زندہ ہو گئے تو؟''

''پھر اپنا مقدمہ ان کے سامنے رکھ کر دونوں کا فیصلہ سنوں گی۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگوں گی۔''

''معافی تم مانگنے آئی ہو؟'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''قصور میرا تھا اور سزا کا حق دار بھی میں تھا۔ میں تو سمجھا تھا سزا دینے آئی ہو۔''

وہ چھت کی طرف ہونٹ کاٹتے ہوئے دیکھنے لگی۔ رندھے گلے سے بولی۔ ''تمہاری بات نے میرا غم بڑھا دیا ہے۔ اتنا سہہ کر بھی شکایت نہیں کر رہے؟'' وہ رونے لگی۔ کچھ دیر بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ میں نے سوچا اسے دل کے اندر چھپا یا غبار نکال لینے دو۔ معلوم نہیں کب سے یہ بوجھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ اچھی طرح سے رو چکی تو میز پر پڑا رومال اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ اس کے بعد میز پر نظر رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں اسے خاموشی سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا سوچوں میں کہیں بہت دور نکل گئی ہے۔ پھر آہستگی سے بولنے لگی۔ ''خطاوار تم نہ تھے۔ نہ میں نے کبھی سمجھا اور نہ غزالہ نے۔ تم ایک جھوٹ بول کر پھنس گئے تھے۔ وہ جھوٹ تم نے کسی لالچ میں نہیں بلکہ ڈر کر بولا تھا۔ میں جب بھی تم سے شکیل کا ذکر چھیڑتی تمہاری آنکھیں کسی کرب میں ڈوب جاتی تھیں۔ میں حیران ہوتی تم اس کے ذکر پر رنجیدہ کیوں ہو جاتے ہو۔ پھر سوچتی شاید تم نہیں چاہتے میں اس سے ملوں۔ کبھی کچھ بتاتے بتاتے خاموش ہو جاتے۔ تم اذیت میں گھرے نظر آتے تھے۔ گناہ گار میں ہوں۔ تمہاری اور غزالہ

کی خوشیاں میری وجہ سے برباد ہوتیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "جب میری اصلیت تم دونوں پر کھل گئی تھی تو درد تمہیں ہوا تھا۔ درد سے کراہتی نہیں تو اس کے سوا اور کیا کرتی؟"

"مجھے بات کسی مذاق میں اڑا دینی چاہیے تھی۔ تم دونوں کی خاطر صرف حیرت کا اظہار کرتی۔ روٹھ جاتی اور پھر تم مجھے منا لیتے۔ مجھے تم دونوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر اتنی ہتک مجھے محسوس ہوئی تھی کہ خود پر ذرا بھی قابو نہ پا سکی۔"

پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تم جانتے تھے میں تم سے بے حد پیار کرتی ہوں مگر تم نے میرے پیار کو رد کر کے غزالہ کو چنا، وہ میرے تاثرات جانچ رہی تھی۔ میں نے ایک بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا پہلے تو لگا وہ سراسیمہ سی کھڑی رہی ۔ پھر میرا احوال پوچھنے لگی۔ میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوست کی محبت اور بہار کی صبح میں کوئی فرق نہیں۔ آج بہار کی صبح نہیں مگر تمہاری محبت تو ہے۔" اس کو کرسی پر سامنے بٹھا کر پھر خود بیٹھا۔ اس کو دیکھ کر میرے اندر رنج کی ایسی لہر اٹھی کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اسے اور غزالہ کو اکٹھے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا سایہ ہوتی تھیں۔ آج تہمینہ کو تنہا دیکھا تو مغموم ہو گیا۔ اس نے پرس سے رومال نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے آنسو تو پونچھ لو، کتنے سالوں بعد ملے ہو مگر ذرا بھی نہیں بدلے۔" میں نے آنکھیں صاف کیں پھر اس سے رسمی باتیں کرتا رہا۔ وہ انتظار میں رہی کہ میں کوئی شکایت و شکوہ کروں گا۔ کچھ طیش دکھاؤں گا، کچھ اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں گا۔ مگر میں اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

باتیں کرتے کرتے کرسی ذرا آگے کھسکا کر پوچھا۔ "شکیل سے ملنے آئی ہو کہ ندیم سے؟"

چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی اُمید کے برعکس میں کوئی دوسری بات کر رہا تھا۔ میری بھرپور مسکراہٹ اور گلے لگانے نے اس کا اعتماد کافی حد تک بحال کر دیا تھا۔ مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ بتاؤ تم کون ہو؟ ندیم ہو کہ شکیل؟"

"میں دونوں ہوں۔"

"پھر سوال خود سے کرو، مجھے آج کیا بن کر ملنا ہے۔"

"اگر یہ کہوں کہ میں نے دونوں کو اپنے اندر دفن کر دیا ہے؟" "پھر میں تم سے ملنے آئی ہوں۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

"تم تو ان دونوں سے واقف تھیں۔ میں تو ایک اجنبی ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اجنبی کے دل میں میرے لیے نہ کوئی غصہ ہوگا، نہ کوئی ناراضی۔"

"اگر تم کو سامنے بیٹھا دیکھ کر دونوں زندہ ہو گئے تو؟"

"پھر اپنا مقدمہ ان کے سامنے رکھ کر دونوں کا فیصلہ سنوں گی۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگوں گی۔"

"معافی تم مانگنے آئی ہو؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "قصور میرا تھا اور سزا کا حق دار بھی میں تھا۔ میں تو سمجھا تھا سزا دینے آئی ہو۔"

وہ چھت کی طرف ہونٹ کاٹتے ہوئے دیکھنے لگی۔ رندھے گلے سے بولی۔ "تمہاری بات نے میرا غم بڑھا دیا ہے۔ استعجب کر بھی شکایت نہیں کر رہے؟" وہ رونے لگی۔ کچھ دیر بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ میں نے سوچا اسے دل کے اندر چھایا غبار نکال لینے دو۔ معلوم نہیں کب سے یہ بوجھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ اچھی طرح سے رو چکی تو میز پر پڑا رومال اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ اس کے بعد میز پر نظر رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔ میں اسے خاموشی سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا سوچوں میں کہیں بہت دور نکل گئی ہے۔ پھر آہستگی سے بولنے لگی۔

"خطاوار تم نہ تھے۔ نہ میں نے کبھی سمجھا اور نہ غزالہ نے۔ تم ایک جھوٹ بول کر پھنس گئے تھے۔ وہ جھوٹ تم نے کسی لالچ میں نہیں بلکہ ڈر کر بولا تھا۔ میں جب بھی تم سے شکیل کا ذکر چھیڑتی، تمہاری آنکھیں کسی کرب میں ڈوب جاتی تھیں۔ میں حیران ہوتی تم اس کے ذکر پر رنجیدہ کیوں ہو جاتے ہو۔ پھر سوچتی شاید تم نہیں چاہتے میں اس سے ملوں۔ کبھی کچھ بتاتے بتاتے خاموش ہو جاتے۔ تم اذیت میں گھرے نظر آتے تھے۔ گناہ گار میں ہوں۔ تمہاری اور غزالہ کی خوشیاں میری وجہ سے ویران ہوئیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "جب میری اصلیت تم دونوں پر کھل گئی تھی تو وہ تمہیں ہوا تھا۔ وہ سے اگر کرا ہی نہیں تو اس کے سوا اور کیا کرتی؟"

"مجھے بات کسی مذاق میں اڑا دینی چاہیے تھی۔ تم دونوں کی خاطر صرف حیرت کا اظہار کرتی۔ روٹھ جاتی اور پھر تم مجھے منا لیتے۔ مجھے تم دونوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا مگر اتنی تک مجھے محسوس ہوئی تھی کہ خود پر ذرا بھی قابو نہ پا سکی۔" پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تم جانتے تھے میں تم سے بے حد پیار کرتی ہوں مگر تم نے میرے پیار کو رد کر کے غزالہ کو چن لیا۔ پھر تم نے اپنی اصلیت بھی چھپا دی۔ میرے ساتھ دوستی کے دعوے دار تو تم بڑے تھے مگر تم اس دوستی سے بھی مکر گئے۔ مجھے بے عزتی محسوس ہوتی کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھتی رہی اور تم میرا دل رونڈ کر اپنے بارے میں بھی غلط بتاتے رہے۔ تم مجھے ٹھوکر مار کر کہیں دور چلے جاتے تو مجھے اتنا دکھ نہ پہنچتا مگر ادھر مجھ کو ٹھکرایا اور اُدھر میری بہن سے پیار رچا لیا۔ تم ہی بتاؤ میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے تھا؟ تمہارے بعد غزالہ تو صرف تم کو روتی تھی مگر میں اپنی بے عزتی کے علاوہ تمہاری جدائی پر بھی روتی رہی۔"

میں اس سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔ سر جھکا کر پوچھا۔ "پھر بھی مجھے بے گناہ سمجھتی ہو؟"

"کبھی کبھی ہم سے وہ غلطیاں ہو جاتی ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم غلطی کر کے بہت پچھتا رہے ہوتے ہیں مگر اسے درست نہیں کر سکتے۔ انسان اپنا پیار اور اپنی جان بچانے کے لیے اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔"

"مگر غزالہ نے تو اپنا پیار قربان کر دیا۔"

"وہ میرے اندازوں سے بڑھ کر سمجھ دار اور مختلف نکلی۔ تم جس کو کھلنڈری سمجھتے تھے وہ ایسی نہ تھی۔ بڑی مضبوط ہے میری بہن۔ اس کو کئی بار منتیں کر کے کہا کہ تم کو خط لکھے۔ اس کو کہا کہ دیکھ لینا تمہارا خط پا کر وہ واپس آ جائے گا مگر وہ انکار کرتی رہی۔ کہتی اسے ٹھکرا کر اس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ حالانکہ بات یہ نہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا تم سے دوبارہ ملنا میرے لیے اذیت کا باعث ہوگا اور یہ اذیت ایک دن کی نہیں عمر بھر کی ہوگی۔ اس نے بڑا فیصلہ کیا تم کو چھوڑ کر میرے لیے بڑی قربانی دی۔"

میں یہی فقرہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا مگر سن کر خاموش بیٹھا رہا۔

"میں تو بولتی جا رہی ہوں اور تم چپ بیٹھے ہو۔ تم بھی کچھ بولو۔"

"ہمیشہ سے بول بول کر تھک جاتی تھی تو یہی کہتی کہ میں تو بولتی جا رہی ہوں، تم بھی کچھ بولو۔ یہ فقرہ سن سن کر میرے بھی کان پک گئے ہیں۔"

پھر ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں مسکرائیں تو لگا خوشی کی لہریں لپک رہی ہیں۔

مجھ سے پوچھا۔ "کبھی تمہارا ہاتھ نہیں پکڑا۔ پہلی بار پکڑا

ہے ناں؟''

میں بولا۔ ''لیکن کئی بار ہم نے ہاتھ ملایا تو ہے۔''

''ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔ ہاتھ پکڑنے والا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر بتانے لگی۔ ''اچھا ہوا تم سے مل لی۔ رو کر اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کر دیا ہے۔ معلوم نہیں تم مجھ کو کیا سمجھتے رہے ہو گے؟''

''بتاؤں کیا سمجھتا رہا تھا؟''

گھبرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''میں تمہیں وہی تہمینہ سمجھتا رہا ہوں جو آٹھویں کا امتحان دے کر بڑے بھائی کے گھر ڈیرہ آئی تھی۔ اتوار کا دن تھا اور سب لوگ دروازے کھڑکیاں بند کر کے اندھیرے کمرے میں فلم دیکھ رہے تھے۔ اس اندھیرے کمرے میں ایک ٹی وی کی اسکرین چمک رہی تھی اور دوسرا تمہارا مسکراتا چہرہ۔ شمیم آرا کی رونے دھونے والی فلم تھی مگر تمہارا چہرہ پھول کی طرح کھلا تھا۔ وہیں تم نے ہاتھ ملا کر مجھ سے دوستی کی ابتدا کی تھی۔ تم میرے کان میں بولے ہی جا رہی تھی مگر جب دادا نے ڈانٹا تو بولنا بند کر دیا مگر اشاروں میں باتیں کرنے لگی تھیں۔''

دھیرے دھیرے وہ پُرسکون ہو رہی تھی۔ مجھ کو سننے کے بعد پہلے کی طرح بولی۔ ''ہائے اللہ! کتنے چالاک ہو۔ سب یاد رکھا ہوا ہے۔ مجھے تو ڈر تھا بھول گئے ہو گے۔''

''نہیں مجھے تو ساری باتیں یاد ہیں۔'' میں اس کی بات پر ہنس کر بولا۔

اس کے بعد وہ پہلے والی تہمینہ بن گئی۔ جوش میں میرے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔ ''وہ یاد ہے جب ہم شام کو بالکل ساتھ ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اتنا ساتھ ساتھ کبھی بیٹھتے تھے؟''

وہ بولی۔ ''درمیان میں مت بولو۔ بس تھوڑا سا دور ہو گئے۔ ہاں تو بتا رہی تھی ہم بہت ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ بھابی نے چنگیر میں روٹی کے اوپر تلے آلو رکھ کر مجھے کھانے کے لیے دیئے۔ میں ضد کر بیٹھی تھی کہ آدھی روٹی تم کھاؤ گے۔ تم ایک شرط پر راضی ہوئے کہ گھر سے اپنا کھانا لاؤ گے اور وہ آدھا مجھے کھانا پڑے گا۔'' پھر منہ بنا کر بولی۔ ''مگر اتنے بھوکے تھے کہ میرا سارا کھانا اکیلے کھا گئے۔''

''مگر اپنا کھانا گھر سے لا کر تم کو دیا تو تھا۔''

''جی ہاں دیا تھا۔ میں نے آدھا ہی کھایا تھا کہ لگا تم کو ابھی بھی بھوک لگی ہے تو آدھا تم کو دے دیا تھا اور تم وہ بھی سارا کھا گئے تھے۔'' ہم دونوں پھر بہت دیر تک ہنستے رہے۔

میں بولا۔ ''وہ یاد ہے جب ایک دن سوچا تھا کہ دو ٹو کی بوتلیں پیتے ہیں۔ میرے پاس پیسے نہ تھے اور تم بولی تھیں فکر نہ کرو میں اپنے پیسے لائی ہوں۔''

میرا ہاتھ دبا کر بولی۔ ''پلیز آگے مت سناؤ۔ شرم آتی ہے۔''

''شرم کیوں آتی ہے۔ ایک دوسرے ہی کو تو سنا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں اس کو بتانے لگا۔ ''تم اندر کمرے سے ایک روپیا لے کر آئیں۔ میں دو بوتلیں لے آیا۔ ہم بیٹھے پی رہے تھے کہ دادے نے شور مچا دیا تھا، میرا روپیا کسی ظالم نے اٹھا لیا ہے۔ میں نے ڈر کر آدھی بوتل چھوڑ دی تھی۔ میں تمہاری جانب دیکھ رہا تھا کہ تمہارا رنگ اڑ گیا۔ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتیں مگر الفاظ تمہارے گلے میں پھنس گئے تھے۔ تم بے ہوش ہو جاتیں اگر دادا پھر سے شور مچا کر یہ نہ کہتا، مل گیا..... مل گیا۔ چارپائی کے نیچے پڑا تھا۔''

ناراض ہو کر بولی۔ ''مجھے معلوم ہے مجھ پر شک کر رہے تھے۔ جب دادا کو روپیا مل گیا تو میں رونے لگ گئی تھی۔''

''جی ہاں! اچھی طرح یاد ہے۔ تم کو منانے کے لیے دو دن لگاتار بوتلیں لا لا کر تم کو پلاتا رہا۔ تم بغیر نکی کے پوری بوتل چند سانسوں میں پی جاتی اور ختم کر کے پھر ناراض ہو جاتی تھیں۔''

اب وہ میرے ہاتھ سے کھیل رہی تھی۔ کبھی دباتی، کبھی انگلیاں مروڑتی اور کبھی چٹکیاں بھرتی۔ میں نے کہا۔ ''کہیں کاٹ نہ لینا۔''

ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''بلی ہوں کیا جو تمہارا ہاتھ کاٹ کھاؤں گی۔''

پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے فوراً تھما دیا۔ میں بولا۔ ''ایک بار تم اپنی خالہ کے گھر دو دن کے لیے رہنے گئی تھیں۔''

بات کاٹ کر بولی۔ ''ٹھہرو ٹھہرو۔ آگے میں بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بتانے لگی۔ ''میں دو دن کے لیے کیا گئی کہ پیچھے جناب اداس ہو گئے تھے۔'' پھر بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''میں چلی گئی تھی تو جناب اداس کیوں ہو گئے تھے؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''جناب اداس اس لیے ہوئے تھے کہ مجھے تمہاری عادت ہو گئی تھی۔ وہ دو دن میرے لیے دو سال کے برابر تھے۔ میں بے چین پھر رہا تھا۔ کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ تمہاری خالہ کے گھر کے سامنے سبزی والی دکان پر دو دو گھنٹے بیٹھا رہتا کہ شاید تم دروازے سے باہر جھانکو۔ میں تمہارے بغیر بور ہو گیا تھا۔ کہانیاں پڑھنے بیٹھتا تو لگتا کہ الفاظ تحلیل ہو گئے ہیں۔ ریڈیو پر گانے سنتا تو لگتا سب گانا گانا بھول گئے ہیں۔ پتنگ اڑاتا تو ہوا میں اٹھتے ہی کٹ جاتی۔ گراؤنڈ میں ہاکی کھیلنے گیا تو دوسرے تمام مجھے ڈاجیں دینے لگے۔ ہر چیز الٹی چل پڑی تھی۔ سارا جہاں میرا دشمن ہو گیا تھا۔ میں تمہارے گھر میں مغموم بیٹھا تھا۔ تم ڈیوڑھی سے صحن میں داخل ہوئیں تو لگا بھولے سے چاند نکل آیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے یاد ہے مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور فوراً ہی ناراضی والا منہ بنا لیا تھا۔''

''ناراض اس لیے ہوا تھا کہ تم نے میرا احساس بھی نہیں کیا اور دو دن کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔''

''اس کے بعد گھنٹوں میرا سر کھاتے رہے کہ ہر روز بوتل لا کر پلاؤں گا۔ بہت سی کہانیاں لے آؤں گا۔ تمہاری اچھی اچھی تصویریں بناؤں گا مگر کہیں جایا نہ کرو۔''

''اور تم پھر کہیں نہیں گئیں۔''

''ہاں نہیں گئی تم کو اکیلا کر کے کیوں جاتی؟'' یہ کہہ کر اپنا دوسرا ہاتھ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولی۔ ''آخر تم مجھے کہیں جانے کیوں نہیں دیتے تھے؟''

یہ کہہ کر مجھے بغور دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نظروں میں وہ خمار تھا کہ میں نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی سحر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اس سے بولا۔ ''تم میری کوئی عام دوست نہ تھیں۔ خاص بھی نہ تھیں بلکہ جگری دوست تھیں۔ ایسی دوست جس سے پل کی جدائی بھی گوارا نہ ہوتی۔ مجھے اچھی لگتی تھیں ایسے جیسے مجھے برفی اچھی لگتی ہے۔ ایسا دوست جس سے کوئی دوسرا بات کرے تو جلن ہونے لگتی ہے۔ جب تم نے مجھے بتایا کہ تم واپس پشاور جا رہی ہو تو ایسا لگا دنیا کی رنگینی ایکدم سے پھیکی پڑ گئی ہو۔ تمہارے ساتھ بیٹھا ہوتا تو تازہ پھولوں جیسی خوشبو آتی اور تمہارے جاتے ہی ساری مہک کہیں اڑ جاتی۔ تم پاس بیٹھی ہوتی تو لگتا خنک ہوا چل رہی ہے۔ تم نہ ہوتیں تو لگتا جھلسا دینے والی گرم لو چل پڑی ہے۔'' پھر اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر آگے بولا۔ ''یہ چہرہ خیال میں دیکھ کر میں صبح جاگتا تھا اور اس چہرے سے باتیں کرتے کرتے رات کو سوتا۔ تم نہیں جانتی کیا مقام تمہارا ہے میرے دل میں۔''

حیران ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جگنو ٹمٹماتے تھے۔ پوچھنے لگی۔ ''ایسی باتیں مجھ سے کبھی نہیں کیں۔ کبھی میرا خیال بھی نہیں آیا۔ بتاؤ پہلے کیوں نہیں کیں؟''

''کیونکہ ہماری دوستی کے بیچ جھوٹ کی دیوار کھڑی ہو

گئی تھی۔"

وہ بولی۔ "میرے لیے بڑی خوشی کا دن تھا جب تم خاص طور پر مجھ سے ملنے پشاور آئے تھے۔ تم نے جب کہا تھا کہ میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں تو لگا میں نے غلط سنا ہے۔ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر اڑی پھرتی تھی۔ تمہارے کُرتے پر شربت گرا اور پھر نظریں ملا کر مجھے دیکھا تو لگا مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ جب تم کو بتایا کہ میں بھائی کی شادی پر ڈیرہ آؤں گی تو تم بہت خوش ہوئے تھے۔"

ہم ایک دوسرے کو نام سے کبھی نہیں بلاتے تھے۔ ہمیشہ تو اور تم کر کے پکارتے تھے، اگر غلطی سے میں نے تم کو شکیل کہہ دیا تھا تو میری غلطی دوست کر دیتے۔ اتنی بڑی سزا تو نہ دیتے۔"

"یہ غلطی اتنی بڑی غلطی نہ تھی۔ یہ بڑی تب بنی جب غزالہ سے مجھے پیار ہوا۔"

وہ پھر سے رو رہی تھی۔ اسے کیا بتاتا کہ محبت پر کسی کا زور کب چلا ہے؟ محبت جہاں نہ ہونی ہو تو لاکھ کوشش کے باوجود نہیں ہوتی۔ جہاں ہو جاتی ہے تو ایسے ہوتی ہے کہ جیسے غزالہ کو ایک نظر دیکھا اور تیر دل کے پار تھا۔ میں چاہتا تھا۔ وہ مجھے خود چھوڑ دے۔ غزالہ کا پیار دل میں رکھ کر اس سے محبت کرنا ایک ناممکن بات تھی۔ اسے رلا کر بھی نہیں بھیجنا تھا۔ غزالہ نہ بھی کہتی تو تب بھی اسے دکھی کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ وہ میرے لیے غیر نہ تھی۔ میری اپنی تھی۔ میری دوست تھی۔ میں ارادہ کر کے بیٹھا تھا کہ مجھے جھوٹ بھی بولنا پڑے تو وہ بھی بول کر اس کی ساری بدگمانیاں دور کروں گا۔

وہ بڑے دلدوز طریقے سے رو رہی تھی۔ میرے یقین سے بھی پرے کی بات تھی کہ ایک حسین لڑکی میری خاطر بھی رو سکتی ہے۔ اس دن مجھے اپنی قسمت پر رشک نہیں افسوس ہو رہا تھا۔ جس کا پیار دل میں لیے پھرتا تھا وہ پرائی ہونے جا رہی ہے۔ اس کی بہن جو سامنے آبدیدہ بیٹھی ہے اسے اپنا نہیں سکتا۔

میں کرسی کھینچ کر اس کے ہمراہ جا بیٹھا۔ اس کے سر کے پیچھے ہاتھ رکھا اور اس نے سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کا ہاتھ تھاما تو روتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "بار بار پوچھ رہی ہوں مجھ سے پیار کرتے ہو کہ نہیں۔ میرے سوال کو کیوں ٹال رہے ہو۔ مجھے بے وقعت تو نہ بناؤ۔"

اس کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ معلوم نہیں وہ سمجھتی کیوں نہ تھی کہ میرا پیار اس کی بہن ہے۔ غزالہ سے میرے پیار نے اس کے پندار پر گہری چوٹ لگائی تھی۔ وہ سوچتے سمجھنے کے قابل تب ہو گی جب تک اس چوٹ پر اپنی محبت کا مرہم نہ رکھتا۔ میں اس سے بولا۔ "خود کو بے وقعت کہہ کر مجھے دکھی نہ کرو۔ تمہاری دوستی اب محبت میں بدل گئی ہے۔ ایسی لڑکی جس کے چہرے کے آگے چاند بھی پھیکا لگنے لگتا ہو، اس کی محبت سے منہ موڑنا انتہائی بدنصیبی ہے۔ تم نے پہلے مجھے دوستی کا درس دیا اور پھر اسی دوستی کو پیار میں بدل دیا۔ میں نے تم کو بہت دکھ دیئے۔ تمہارے دکھوں کا ازالہ معلوم نہیں کس طرح سے ادا کروں؟"

"غزالہ کی تو شادی ہو جائے گی۔ تم کسی سے تو شادی کرو گے۔ میں بھی تو ہو سکتی ہوں۔" وہ حرفِ مدعا زبان پر لے آئی۔

کندھے سے سر اٹھا کر میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں قریب سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم ہو نہیں سکتی بلکہ تم ہو۔ تمہارے ساتھ جو لمحے گزرے وہ اب پیار میں ڈھل رہے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ بولو مجھ سے شادی کرو گی؟"

سنتے ہی وہ حیران و پریشان نظر آنے لگی۔ مجھے نظروں سے ٹٹول رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب مجھ سے بولا ہے؟"

"اس کمرے میں تمہارے علاوہ کوئی ہے؟" اسے آنکھ بھر کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے بہلا تو نہیں رہے؟"

"نہیں بالکل نہیں بہلا رہا۔"

"زبان سے پھر تو نہیں جاؤ گے؟"

"میرا وعدہ ہے نہیں پھروں گا۔"

اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ ایسا چمکنے لگا کہ میری نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔ ہونٹ بھینچ کر اپنی خوشی چھپا رہی تھی۔ اس کے اندر کا پیار جوش مارنے لگا تو گلے آ لگی۔ "تم نے دوستی کو میری محبت مان کر میری لاج رکھ لی ہے۔ تم نے اقرار کر کے میرے اندر کا رنج دھو ڈالا کہ آخر تم میرے کیوں نہیں بن سکتے۔" وہ آسودگی سے میرے گلے لگی بیٹھی تھی۔ جیسے کہ طوفان میں پھنسی ناؤ کنارے آ لگی ہو۔

"میں سوچتی تھی کہ پیار میرا تھا تو مجھے ملنا چاہیے تھا۔ غزالہ کو کس طرح سے مل گیا۔ مجھ میں کیا کمی تھی۔ کیا میں تمہارے قابل نہ تھی؟ یہی سوالات خود سے کرتی اور مرتی رہتی۔ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔"

وہ اپنے آنسوؤں سے محبتوں کی تسبیح گھمائے جا رہی تھی۔ میں اسے اپنی محبت کا یقین دلائے چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کر کے مجھے حیران کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"لگتا ہے تم کو اپنی خوب صورتی کا قطعاً احساس نہیں جو میرے جیسے ایک عام لڑکے کے لیے اتنی چاہت لیے پھرتی ہو۔ اس سے کم شکل کی لڑکیوں کے لیے کئی امیر زادے تیار کھڑے نظر آتے ہیں۔"

مسکرا کر بولی۔ "خوب صورتی کے احساس کے ساتھ ٹھکرائے جانے کا احساس جب مل جائے تو تیز دھار آلے کی طرح دل کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔"

کچھ دیر بعد منجدھار سے نکل کر اطمینان کی لہروں پر بہنے لگی تو پوچھا۔ "غزالہ سے بہت پیار کرتے تھے؟"

"ہاں بے انتہا پیار کرتا ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی تو اس سے کہا۔ "مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی۔" اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے کتنا زیادہ پیار کرتے ہو؟"

"بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ تم یقین بھی نہیں کر سکو گی۔"

"پھر بھی بتاؤ کتنا زیادہ؟"

"اتنا زیادہ جتنا غزالہ مجھ سے کرتی ہے۔" وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو آنکھوں میں سوچوں کے آئینے تھے۔ بولی۔ "غزالہ تو تم سے بھی بہت پیار کرتی تھی۔"

"ہاں بہت زیادہ۔ اب چند دن بعد پرائی ہو کر دبئی چلی جائے گی۔ تم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ ہوتی تھیں۔ تم اس کی باتوں پر ہر وقت ہنسا کرتی۔ وہ مجھ پر کس طرح سے اپنا حق جتایا کرتی تھی۔ یاد نہیں جب ایک بار کہا تھا اگر جھوٹ بول رہا ہوں تو میرا پیار مجھے نہ ملے۔ اگلے دن اپنے ساتھ مجھے بھی سورۃ یٰسین پڑھوائی تھی۔ پانی دم کر کے میرے علاوہ تم کو بھی پلایا تھا۔"

تہمینہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "مجھے تو اس لیے پلایا تھا کہ اس کے ساتھ مجھے بھی میرا پیار ملے۔"

"ہاں اسے تمہاری فکر رہتی تھی۔ ہر وقت کہتی میری مظلوم بہن۔ پھر کہتی میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ تم مجھ سے کتنا زیادہ پیار کرتے ہو۔"

وہ بتا رہی تھی۔ "ہم دونوں بہنوں کے درمیان بہت زیادہ پیار ہے مگر جو پیار اس کے دل میں تمہارے لیے تھا وہ میں نے کہیں نہیں پڑھا۔ تمہاری پڑھائی کی اسے فکر رہتی تھی۔ تمہارے کپڑوں، کھانے، جوتوں اور سونے کا غم بھی اس نے لے رکھا تھا۔ آج کمزور لگ رہا ہے۔ آج پیلا لگ رہا ہے۔ ابو کی طرح اس کا پیٹ تو خراب نہیں رہتا۔ بھائی اس کا کرتے میں اچھا لگتا ہو گا مگر خود تو کانگڑی پہلوان لگتا ہے۔ تم ناشتا کرتے تو پڑھ کر تم پر چپکے سے پھونکتی رہتی کہ آج ذرا زیادہ کھا لے گا۔ تعویذ گنڈوں کی کتاب کہیں سے اسے ملی تھی تو اسے پڑھتی رہتی۔ مجھ سے پوچھتی ان میں سے کون سا ایسا تعویذ اس پر کروں کہ ہمیشہ خوش رہے۔" یہ بتا کر وہ سوچوں میں مسکرانے لگی۔ مسکراتے مسکراتے اچانک چونک کر بولی۔ "غزالہ سے بھی پیار کرتے ہو اور مجھ سے بھی؟"

"غزالہ تو اپنا پیار قربان کر کے دبئی چلی جائے گی۔ دیکھتی نہیں کہ میں تم کو کتنا چاہنے لگا ہوں۔ ہم یہاں اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزاریں گے۔ آہستہ آہستہ وہ ہمیں بھول جائے گی۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "تمہارے بعد وہ بہت اداس رہنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہے وہ اس شادی سے بھی خوش نہیں ہے مگر کتنی بڑی قربانی اس نے میرے لیے دے دی۔"

بمشکل میں اپنے آنسو دبا کر بولا۔ "اسے خدشہ تھا کہ اگر میری اس کے ساتھ شادی ہو جاتی ہے تو تہمینہ کو ایسا دکھ لگے گا کہ وہ زندگی بھر ختم نہ ہو گا۔"

وہ میرے کندھے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اسے میری اتنی زیادہ فکر تھی؟"

"کیوں نہیں، تم سے کتنی زیادہ محبت کرتی ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے بھی چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کتنی بڑی اذیت سے گزری ہو گی۔ کس طرح سے خود کو سنبھالا ہو گا... مگر تمہاری خوشی کی خاطر وہ سب کر گزری۔"

وہ سن کر دوبارہ میرے کندھے کے سہارے بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "ہم ہمیشہ دعا کریں گے اللہ اسے اپنے گھر میں خوش رکھے۔"

وہ بولی۔ "آمین اور اللہ اسے سکون بھی دے۔"

میں نے کہا۔ "اچھی بات یہ ہے کہ وہ دبئی میں ہو گی ہمارا آمنا سامنا تو نہیں ہو گا۔"

وہ مجھ سے الگ ہوئی اور میری جانب دیکھ کر شدید حیرت سے پوچھا۔ "ہم اس سے نہیں ملیں گے؟"

"میں تو تمہارے لیے کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے تو گلہ نہیں

کر سکتی کیونکہ خود اس نے مجھے چھوڑا ہے اگر اس نے آنکھوں آنکھوں میں بھی یہ سوال تم سے پوچھ لیا کہ میری بہن تم نے شادی اس سے کر لی؟ اس کو جو بھی جواب دینا ہے وہ ہم دونوں کو سوچنا پڑے گا۔ آخر تمہاری بہن ہے۔"

اس کا رنگ فق پڑ گیا۔ رنگت پیلی ہو گئی۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "یہ بعد کی باتیں ہیں۔ غزالہ کو مل کر منا لیں گے۔ تم سے تو وہ ویسے ہی بہت پیار کرتی ہے۔ تم اتنی پریشان کیوں ہوتی ہو میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

تہمینہ دلگیر لہجے میں بولی۔ "جب ہم سب دریا پر گئے تھے۔ واپس پہنچے تو میرے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔ کہتی تھی ہم کل پشاور جا رہے ہیں۔ اس کے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گی۔ مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تم سے ملانے کے لیے میں اس کا ساتھ دوں گی۔"

میری آنکھوں سے چند آنسو ٹپکے اور تہمینہ کے چہرے پر گرے۔ وہ بے تابی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "رو کیوں رہے ہو؟"

میں اس کے چہرے پر گرے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "اس لیے کہ نہ میں اس سے کیے کسی وعدے کو پورا کر سکا اور نہ تم اور وہ اکیلی ہم سب کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسی۔"

یہ سن کر تہمینہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ "اس کو میرا ایک پیغام دے دینا۔ اس سے کہنا کہ میں نے تم سے شدید محبت کی ہے اگر ہماری شادی نہیں ہوئی تو یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ اس سے کہنا کہ شادی ایک انسانی فعل ہے اور محبت تو فرشتوں کا وصف ہے۔"

وہ خود ہی دہرانے لگی کہ شادی ایک انسانی فعل ہے۔ محبت تو فرشتوں کا وصف ہے۔

میری یہ بات جیسے اس کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔ یہ آخری ضرب لگا کر میں انتظار میں بیٹھا تھا۔ غزالہ کی طرح تہمینہ بھی حیا اور وفا کی مٹی سے گوندھ کر بنی تھی۔ غزالہ نے قربانی دی تو اس نے کہاں پیچھے رہنا تھا۔ میں نے تہمینہ کو اپنے پیار کا اعتبار دے کر اس کے اندر بہن کی دی گئی قربانی اور پیار کا احساس جگا دیا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس کے اندر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ اگر مجھ سے شادی ہو بھی گئی تو بہن کا سامنا کس چہرے سے کرو گی۔ اس کی نگاہیں کسی تیز تیر کی طرح چبھتی رہیں گی۔

اس دن وہ اپنی محبت پا کر بھی الجھ گئی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ وہ صحیح فیصلہ کرنے میں چند دن لے گی مگر جب ایک دن بعد بلو میرے پاس آ کر بولا۔ "بھائی جان! تہمینہ باجی کچھ دیر کے لیے آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں مسکرایا۔

"بڑے خوش ہیں بھائی جان! محلے کے دوسرے لڑکے ایسا کرتے ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو کون سا گناہ کیا۔"

"بتاؤ محلے کے دوسرے لڑکے کیا کرتے ہیں؟"

اپنی فطری جرأت سے بولا۔ "ایک بہن نہ پھنسی تو دوسری کو پھنسا لیا۔"

میں اس کی توقع کے برخلاف ہنس پڑا۔ "تیری غزالہ باجی نے تجھ کو صحیح بولا تھا کہ بلو مانتی ہوں تو بڑا سیانا ہے مگر اتنا نہیں کہ اپنے بھائی جان کی ہر بات کو سمجھ سکے۔"

"بلو چھوٹا بھی نہیں رہا۔ پہلے تو صرف سمجھ جاتا تھا اور اب تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر انتظار کر۔ تیری تہمینہ باجی سے بات کر لوں۔ پھر تجھ سے پوچھوں گا کہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

اگلی شام سامنے گھر کی بیٹھک میں وہ آئی۔ میں پہلے سے موجود تھا۔ گلے لگ کر آنسوؤں کے تار باندھ دیے۔ پوچھا تو نہیں بتاتی تھی۔ کرسی پر آرام سے بٹھایا اور بڑے پیار سے رونے کا سبب پوچھا تو ٹوٹے الفاظوں میں بتانے لگی۔

"تمہارے پیار نے میرے اندر ایک کمی تھی جس کو پورا کر دیا۔ میں نے تم سے محبت کی اور آخر کار اپنی منزل پا لی مگر تمہاری یہ بات میرے دل میں جا اتری کہ شادی ایک انسانی فعل ہے اور محبت تو فرشتوں کا وصف ہے۔ رات بھر سوچتی رہی کہ اگر ہماری شادی نہ ہو سکی مگر ہمارا پیار تو سلامت رہے گا۔ ایک قربانی غزالہ نے میرے لیے دی اور ایک قربانی ہم دونوں کو غزالہ کے لیے دینا ہو گی۔ ہماری شادی ہم دونوں کو غزالہ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دے گی۔ میں تو اس کے لیے تیار ہوں، کیا تم بھی تیار ہو؟"

میں نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا جہاں اس شام چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ میرے سامنے ایک بلند مرتبہ بہن کھڑی تھی جو ایثار میں اپنی بہن سے کم نہ تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ آنکھوں دیکھا ہمیشہ سچ نہیں ہوتا۔ اس وقت میں نے اسے نفسیاتی طور پر سہارا دینے کے لیے اس کی پیشانی چومی تھی اور یہ بھول گیا تھا کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔

(جاری ہے)

مطبع

ظفر عابدی

ابتداء میں پتھروں پر اشکال کندہ کر کے پیغام رسانی ہوتی تھی۔ پتھروں کے وزن سے چھٹکارا تب ملا جب پیرس والوں نے کاغذ ایجاد کیا۔ تب تک حروف ایجاد ہوئے نہ تھے اس لیے اشکال ہی کا سہارا لیا جاتا جس کی وجہ سے پیغام طوالت اختیار کر جاتا۔ طوالت کو کم کرنے کے لیے حروف ایجاد ہوئے اور تحریر کی رفتار تیز ہو گئی لیکن مسودوں کی نقل تیار کرنے میں اکثر الفاظ چھوٹ جاتے اور متن میں فرق آجاتا۔ یکساں نقل کیسے تیار ہو اس مسئلے کو حل کرنے پر غور کیا جانے لگا۔ تجربات ہوتے رہے، انہی تجربات کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

مطبع نے کس طرح ترقی کے مراحل طے کیے

علم کی ترسیل میں پرنٹنگ پریس نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں۔ حالانکہ علم کی ترسیل کے لیے ہزاروں سال قبل دجلہ وفرات اور نیل کی وادی میں رہنے والوں نے تصویری خاکوں اور لکیروں کے ذریعے سے کوشش شروع کردی تھی لیکن اس طرح اپنی بات آگے پہنچانے میں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا۔ پھر تصاویر اور لکیروں نے حرف تہجی کی شکل اختیار کی تو کام کچھ سہل ہوا لیکن ہاتھ سے نقل تیار کرنے میں ابھی بھی وقت اسی طرح لگتا تھا۔ لوگ اس کا حل ڈھونڈ

رہے تھے۔ چین میں لکڑی کے ٹھپوں سے پھول پتیوں کی چھپائی کا آغاز ہو چکا تھا مگر حرف کو سطر میں لا کر تحریر مکمل کرنا ہنوز باقی تھا کہ گیارہویں صدی عیسوی میں ایک شخص پی شنگ نے حرکت میں لائے جانے والے حروف کو دھات کے ٹائپ حروف میں ڈھال کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ان حروف کی کل تعداد پانچ ہزار مختلف حروف پر مشتمل تھی۔ اس نے ان حروف (ٹائپ) کو حسب ضرورت کتاب کے کسی صفحے کی چھپائی کے لیے ایک لکڑی کے تختے پر سطر سطر جمایا اور ان ٹائپ شدہ حروف پر روشنائی لگا کر ان کو کاغذ پر دبانے کا وہی اصول اختیار کیا جس پر آج تک دنیا کے ہر پریس کی بنیاد قائم ہے۔ اس طرح ایک ایک صفحہ کی چھپائی کر کے اس نے پوری کتاب چھاپ لی۔ پی شنگ کی چھاپی ہوئی کتاب کے طریقہ عمل اور 1456ء میں یورپ کی ایک بائبل کی پرنٹنگ کے طریقے میں اصولاً کوئی فرق نہ تھا لیکن دو ممالک کے درمیان وہی فاصلہ چار سو برس کا ہے۔ پی شنگ کے انتقال کے بعد ٹائپ سے چھپائی کا یہ طریقہ ترک کر دیا گیا اور پھر پرانے طریقہ سے چھپائی ٹھپوں کے ذریعے کی جانے لگی کیونکہ ہزاروں علامتوں کو ڈھالنا اور ایک قطار میں رکھ کر جملہ بنانا طویل صبر آزما کام تھا۔

گیارہویں صدی میں ادھورا چھوڑا گیا کام دوبارہ سے شروع ہوا۔ اس بار کوریا کے دو دوستوں نے مل کر پریس بنانے کا تجربہ کیا۔ 1431 میں شروع کیے گئے تجربے نے ان دونوں کو تھکا دیا اور وہ اس کٹھن مرحلے کو خیر آباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔

چین نے جب یہ طریقہ طباعت چھوڑا، تو اہل یورپ نے اسے اپنا لیا کیونکہ کاغذ کی ایجاد کے بعد زیادہ سے زیادہ مواد اور موضوعات اشاعت کے منتظر تھے۔ یورپ میں سامان کی کمی نہ تھی لیکن طباعت میں سست رفتاری کتابوں کی مانگ پوری کرنے سے قاصر تھی۔ ادھر یورپ میں تہذیبی ارتقاء کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔

یورپ میں لکڑی یا دھات کے ٹھپے پر بنے ہوئے ڈیزائن سے کپڑوں پر چھپائی کا کام شروع ہو چکا تھا، اسے کتابوں کی چھپائی میں آزمانے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

اس دور میں جب یورپ میں کتابوں کی چھپائی کا آسان طریقہ معلوم کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں کہ ایک سیاح نے چین میں رائج حروف کی ڈھلائی کی ایجاد سے باخبر کیا۔ ہارو۔ ے۔ اور۔ ے۔ ج ہمپڈن جیسے معروف مورخین نے اپنی کتاب "پیپرس سے پشت قرطاس تک" میں ذکر کیا کہ مارکو پولو کے سفر کے نتیجے میں اہل یورپ اس طریقہ طباعت سے باخبر ہوئے مگر چین کو اس ایجاد کا محرک قرار دیا گیا۔

یورپ میں علوم و فنون کے احیاء کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں کی توجہ پڑھنے لکھنے کی طرف مائل تھی کہ گاٹن برگ نے 1456ء میں ایک بڑی لاطینی بائبل طبع کیا اور 1469ء تک اس نے مزید کئی کتابیں شائع کیں۔ ابھی وہ تجربے کر ہی رہا تھا کہ اجل کا نقارہ بج اٹھا۔ اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔

1465ء میں روم میں مطبع کو پذیرائی ملی تو بہت سے جرمن باشندے اٹلی اور دوسرے شہروں میں پھیل گئے تاکہ پریس کے قیام سے روزی روٹی حاصل کر سکیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انگلستان میں پہلا پرنٹنگ پریس ولیم کیکسٹن نے قائم کیا تھا۔ وہ ایک سوداگر تھا لیکن اسے ادبی کتابوں سے شغف تھا۔ وہ ایک اچھا مترجم بھی تھا۔ خود کتاب تصنیف کرتا اور اسے خود ہی چھاپتا۔ اس کی تحریر میں جذبیت تھی اس لیے لوگ اسے پڑھنا پسند کرتے۔ قارئین کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے وہ زیادہ سے زیادہ کتابیں بیک وقت مارکیٹ میں لانا چاہتا تھا تاکہ اس کی تحریر کو پسند کرنے والے فوراً اس کی کتاب خرید لیں گویا وہ اپنی تحریروں کی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر پریس کی ایجاد کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی وجہ سے اسے طباعت کے پیشے میں بڑی شہرت ملی۔ 1474ء میں اس نے ویسٹ منسٹر انگلستان میں پہلا مطبع قائم کیا۔ اس نے 1491ء میں اپنے انتقال تک تقریباً 100 کتابیں چھاپیں تھیں جس میں اس کے اپنے بعض تراجم اور قومی ادبیات سے متعلق کتب شامل تھیں۔ چاسر کی مشہور کتب "کینٹربری کی بدایتیں" بھی ان میں شامل تھیں۔

انگلستان میں پندرہویں صدی کے آخر تک جان لائن، ولیم دل شینا اور رچرڈ پسنسن جیسے ناشر بہت مشہور ہوئے۔ انہی لوگوں نے انگلستان میں رومن ٹائپ کو رائج کیا۔

یورپ میں چھاپے خانے جس تیزی سے قائم ہوئے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پندرہویں صدی کے اختتام سے قبل فرانس کے چالیس شہروں اور قصبوں میں پریس قائم ہو گئے تھے۔ ولیم کیکسٹن نامی مالکِ مطبع نے انگریزی کتاب "دی کال آف دی ہسٹری آف ٹرائے" شائع کی۔ انہوں نے 1476ء میں انگلستان میں ویسٹ منسٹر میں پہلا پریس کھولا تھا۔ کیکسٹن نے 1484ء

تک کام کرتا رہا۔

چھپائی کی ایجاد نے چرچ کے نظام کو مسمار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لوتھر جو تحریک کا بانی تھا اس کے پمفلٹ کی چار ہزار کاپیاں پانچ دن میں چھپ کر انگلستان میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ جرمن اس کام میں پیش پیش تھے وہاں لوتھر کی ترجمہ شدہ بائبل اور دوسرا علمی مواد ستمبر تا دسمبر 1522ء تک ناقابل یقین تعداد میں شائع ہوا۔ انگلستان میں اس بائبل کے سو ایڈیشن شائع ہوئے۔

گاٹن برگ نے چھپائی کی جو نئی راہیں دکھائیں، اس نے چھپائی کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ 50 سال کے عرصہ میں یورپ کے 20 شہروں میں تقریباً 1100 چھاپے خانے قائم ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی تک گاٹن برگ کا طریقہ چھپائی تقریباً اسی طرح قائم رہا۔ صنعتی انقلاب نے انجینئرنگ کی دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیوں سے ہر شعبے کو متاثر کیا جس میں چھپائی کا شعبہ بھی شامل ہے۔ چھپائی کی رفتار تیز سے تیز تر ہونے سے کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

یورپ میں اس سلسلے میں پہلا بڑا قدم 1800ء میں اس وقت اٹھایا گیا، جب ارل اسٹان ہوپ نے لوہے سے پریس تیار کیا۔ یہ ابتدائی پریس ہاتھ سے چلتا تھا۔ 29 نومبر 1814ء کو مشہور اخبار دی ٹائمز ایک ایسے پریس میں چھپا جو بھاپ کی طاقت سے چلتا تھا۔ اس کی ایجاد کا سہرا ''فریڈرک کونگ'' کے سر ہے۔ کونگ نے گھومتے ہوئے پہیے کا اصول استعمال کیا جب کہ اس سے پہلے تک چھپائی چوڑے تختے نما شکنجے کے ذریعے جس میں ٹائپ سیٹ کیے ہوئے تھے، کو ایک حرکت کے ذریعے دوسرے تک پہنچایا جاتا تھا جس پر کاغذ رکھا ہوتا تھا۔ یہ عمل بہت سست تھا۔ جب پہیے کے گھومنے سے چھپائی کی مشین چلنا شروع ہوئی تو اس پہیے سے چھپائی کی رفتار پچاس پرنٹ فی گھنٹا تھی۔ یہ رفتار اٹھارہویں صدی کے اختتام تک تقریباً 300 تک پہنچ چکی تھی۔ کونگ کے دو سیلنڈر کے پریس کے ذریعے یہ رفتار گیارہ سو پرنٹ فی گھنٹا ہو گئی اور اس پریس کو مزید ترقی دے کر جب چار سیلنڈر سے چلایا گیا تو چھپائی کی رفتار 1828ء میں چار ہزار فی گھنٹا ہو گئی تھی۔ روٹری پریس کے ذریعے جو 1848ء میں تیار ہوا، یہ ہی رفتار بڑھ کر آٹھ ہزار ہو گئی تھی۔

صنعتی انقلاب کے بعد خودکار مشینیں تیار ہونے لگی تھیں لیکن کمپوزنگ کے سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہاتھ ہی سے کمپوزنگ ہوتی تھی۔ یعنی ایک ایک حرف کو قطار میں رکھ کر جملہ بنایا جاتا پھر اس کو پریس کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا تھا۔

1883ء میں امریکا میں مقیم جرمن باشندے مارجن تھیلر نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جو چھپائی کی پوری سطر ڈھال دیتی تھی۔ اس طرح دو سال کے بعد لائینو ٹائپ مشین تیار ہو گئی۔ 1890ء میں مونو ٹائپ مشین تیار ہوئی جس میں حروف ایک ہی وقت میں ڈھلنے کی جگہ ایک کاغذ میں سوراخ بنا کر دوسری مشین کے ذریعے ڈھالے جا سکتے تھے۔ ایک عام کمپوزیٹر ایک گھنٹے میں تقریباً پندرہ سو حروف سیٹ کر سکتا ہے جب کہ مونو اور لائینو سے اسی وقت میں چھے ہزار حروف سیٹ کیے جا رہے تھے۔ کمپوزنگ کے سلسلے میں مزید پیش رفت فوٹو کمپوزنگ کی شکل میں ہوئی۔ اب کمپیوٹر کے استعمال کے بعد کمپوزنگ کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔

چھپائی کی دنیا میں دوسرا بڑا انقلاب لیتھوگرافی طریقہ سے چھپائی ہے جس کو عرف عام میں آفسٹ چھپائی کہا جاتا ہے۔ ابھرے ہوئے حروف سے چھپائی کے برخلاف یہ ہموار سطح سے چھپائی کا طریقہ ہے اور اس طریقے سے چھپائی کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ خصوصاً تصویروں کی چھپائی میں۔ اس ایجاد کا سہرا الاوس سینے فیلڈر کے سر جاتا ہے جس نے اس سائنسی اصول کو استعمال کیا کہ پانی اور گریس ایک دوسرے سے نہیں ملتے ہیں۔ اس اصول کو استعمال کرتے

2 جون 1800ء کو انگریز کمپنی کے اعلیٰ افسر نے فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا اور مسٹر گلکرائسٹ کو اس میں ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر کیا۔ یہ کالج نصف صدی سے زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ 1804ء میں گلکرائسٹ خود استعفیٰ دے کر لندن واپس چلا گیا۔ اسی ادارے سے منسلک اردو ادب کی مشہور شخصیتوں میں باغ و بہار کے مولف میر امن دہلوی، اندر سبھا کے مصنف شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری اور انشاء اللہ خان انشاء وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے مل کر تقریباً 63 کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ یہ کتابیں اردو، فارسی اور دیوناگری خط میں ہیں۔ 4 مارچ 1774ء کو کلکتہ گزٹ کا اجراء ہوا جب کہ 1778ء میں بنگلہ زبان کی پہلی گرامر شائع ہوئی۔

ہوئے پلیٹ کی سطح چھپنے والی اور نہ چھپنے والی جگہوں میں تقسیم ہوجاتی ہے اگر تصویر کسی چکنی شے سے ایک خاص قسم کے پتھر پر بنائی جائے اور پھر اس پر پانی بہایا جائے تو چکنی جگہ یعنی تصویر روشنائی قبول کرلے گی کیونکہ روشنائی خود چکنی ہوتی ہے اور اس روشنائی کا عکس کاغذ پر منتقل ہوجاتا ہے اور چھپائی بہت نفیس ہوتی ہے۔ چھپنے والی چیز کی چھوٹی چھوٹی تفصیل پوری طرح کاغذ پر منتقل ہوجاتی ہے۔

طباعت کی تیکنیک اتنی تیز رفتاری سے ترقی کررہی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ خصوصاً کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے استعمال سے ایک انقلاب آگیا ہے۔ ابلاغ کی ترقی نے یہ بھی ممکن کردیا ہے کہ مسودہ کراچی میں تیار ہو اور اس کی چھپائی بالکل اسی وقت لاہور میں ہو۔ اب آواز کی لہروں سے بھی متن ٹائپ ہوجاتا ہے۔ کسی قسم کا ٹائپ شدہ مسودہ مشین کو دیجیے، وہ اس کو اسکیننگ کے ذریعے اپنے حافظے میں محفوظ کرلے گی اور پھر آپ اس کو جس انداز جس سائز میں اور جس خط میں چاہیں دوبارہ قرطاس پر لے آئیں۔ مشین خود ہی پروف ریڈنگ کرے گی اور صفحات بنادے گی۔ یہی نہیں چھپا چھپایا صفحہ بٹن دباتے ہی جتنی تعداد میں مطلوب ہو نکال لیں۔

یہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی ہے جس نے اردو نستعلیق کے پیچیدہ مسئلے کو بھی حل کردیا ہے۔ ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اردو میں مشینی کتابت کیسے ترقی کرپائے گی کیونکہ مشینی کتابت صرف نسخ رسم الخط تک ہی محدود تھا اور یہ ایسا خط ہے جس سے قارئین اردو پڑھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ اردو ٹائپ کو ترقی دینے کی جتنی بھی کوشش کی گئی وہ صرف اس لیے ناکام رہی کہ نستعلیق حروف کے دائرے شوشے اور جوڑ بہت بڑے کی بورڈ کے ضرورت مند تھے جس کا تیار کرنا آسان نہ تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کمپیوٹر کی موجودگی میں جناب میرزا جمیل احمد اور مطلوب الحسن سید مرحوم کی کوششوں نے اسے کامیاب کیا۔ نوری نستعلیق کی شکل میں مشینی کتابت کو انہوں نے ہی روشناس کرایا جس نے اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے مزید روشن راہیں کھول دیں۔

برصغیر پاک و ہند میں پہلا چھاپہ خانہ موسیو لبٹا مانٹے نامی پرتگالی باشندے نے لگایا تھا۔ یہ چھاپہ خانہ 1556ء میں ''گوا'' میں قائم ہوا تھا۔ اس چھاپہ خانے میں جو پہلی کتاب شائع ہوئی وہ پرتگالی زبان میں تھی جب کہ یہاں کی مقامی زبان میں چھپنے والی پہلی کتاب ''مالا باری'' ٹائپ حروف میں تھی۔ اس کے حروف ایک ہسپانوی باشندے جوانس گانسالوس نے تیار کیے تھے۔ اصل میں پرنٹنگ پریس میں جتنی بھی دلچسپی لی جاتی تھی وہ باہر سے آنے والے تاجر اور ان کی کمپنی کے ارکان کو مقامی زبانوں سے آگاہی کے لیے تھی، چنانچہ برصغیر میں جتنے بھی مطبع خانوں کا ذکر ملتا ہے، وہ سمندر کے ساتھ آباد بڑے بڑے شہروں اور دریاؤں کے کنارے بستیوں میں لگائے گئے لیکن جب کاروباری کمپنیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی جماعتوں کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا تو انہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کو تیز کرنے کی خاطر جگہ جگہ چھاپے خانے لگا کر نشر و اشاعت کی رفتار تیز کردی۔ ورنہ ابتداء میں یہ بیرونی جماعتیں اور کمپنیاں بہت سا ادب اپنے ممالک سے چھپوا کر منگواتی تھیں۔ چنئی مدراس میں پہلا پرنٹنگ پریس وابیری کے مقام پر لگایا گیا جو بعد میں ڈایوسیسن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد مقامی زبانوں کی ترقی کے لیے فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس 1812ء میں قائم ہوا۔ یہ کالج فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نمونے پر تھا۔

بمبئی میں طباعت کو روشناس کروانے کی پہلی کوشش 75-1674ء میں کی گئی۔ اس کے قیام کے سلسلے میں ایک گجراتی تاجر ہیم جی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اصل میں بمبئی میں چھپائی کا کام اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوا اور اس میں جو ٹائپ استعمال کیا گیا وہ بیرونی ممالک سے منگوایا گیا تھا۔ بمبئی میں جو اوّلین کتاب چھاپی گئی، وہ ٹیپو سلطان کی جیل سے فرار ہونے والے قیدی ہنری پچر نے اپنی قید کے دوران تحریر کی تھی۔ یہ کتاب 1793ء میں بمبئی میں چھاپی گئی اور آج بھی بمبئی کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کا نام ''ریمارکس اینڈ اکرنسز'' ہے۔

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب 1756ء میں نظم و نسق سنبھالا تو اپنے ملازمین کے انتظامی کام کو آسان بنانے کے لیے بنگال کی زبان کو سکھانا شروع کردیا۔ چنانچہ بنگالی زبان سکھانے کی غرض سے طباعت کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ سر چارلس ولکنس نے 1770ء میں بنگال آکر یہاں کی زبانوں میں دلچسپی لی۔ یہاں کی کتابوں مثلاً شکنتلا وغیرہ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ گورنر جنرل کی فرمائش پر بنگالی حروف بھی ڈھالے گئے۔ کرنافلی دریا کے کنارے پریس قائم کرنے میں سر ولکنس کا نام لیا جاتا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد بھی سر ولکنس اور سر ولیم جانسن

نے ساتھ مل کر رکھی۔ سر ولیم کلکتہ میں بحیثیت جج سپریم کورٹ نامزد ہو کر آئے تھے۔ مشہور کتاب ''گرائمر آف ہندوستانی لینگویج'' مسٹر گلکرائسٹ نے دیوناگری ٹائپ میں 1792ء میں کرانکل پریس کلکتہ سے چھپوا کر شائع کی تھی۔

برصغیر میں ترسیل علم و ادب کے لیے فورٹ ولیم کالج کی خدمات نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کالج اگست 1800ء میں قائم ہوا تھا تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو مقامی زبانوں سے روشناس کیا جاسکے... چنانچہ کالج نے اپنی دوسری ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بنگال میں اشاعت اور چھپائی کو فروغ دینے کی طرف بھی توجہ دی۔ ہندوستانی زبان میں کتابوں کی ابتدا گلکرائسٹ کے عہد سے وابستہ ہے۔ اس شخص نے یہاں کی زبانوں میں بلا کی استعداد حاصل کی اور اس زمانے کی قابل ترین علمی، ادبی شخصیتوں کو کلکتہ میں جمع کر لیا اور یہی نہیں بلکہ ان کی علمی قابلیت سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک درس گاہ اورینٹل کالج کے نام سے قائم کی۔ یہ 1799ء میں قائم ہوئی تھی۔

بمبئی میں طباعت کی ابتداء 1780ء میں ہوئی۔ 1849ء میں برصغیر کے دور دراز علاقوں، پنجاب، آگرہ اور دہلی وغیرہ میں 23 لیتھو پریس قائم ہو چکے تھے جن میں ''مراۃ الاخبار'' کلکتہ 1822ء میں، خیر خواہ ہند، میرزاپور 1837ء میں، سید الاخبار دہلی 1837ء میں، آفتاب عالم تاب، مدراس 1841ء، پیسا اخبار لاہور، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور 1867ء اور سندھ گزٹ 1884ء کراچی سے شائع ہوتے رہے جب کہ سیالکوٹ سے ''چشمہ فیض'' 1852ء میں جاری ہوا تھا۔

سرسید تحریک کے نتیجے میں برصغیر میں نشر و اشاعت کا کام اور آگے بڑھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک کے نتیجے میں تصنیفی تحریک نے جنم لیا تو غلط نہ ہو گا۔ سرسید کی تحریک نے برصغیر کی صحافت اور ادب میں وہ چراغ روشن کیے جن کی روشنی آج بھی پاکستان و ہندوستان کی چھوٹی بڑی علمی درس گاہوں اور دانش کدوں کو منور کیے ہوئے ہے۔

1917ء میں دارالترجمہ حیدر آباد حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوا۔ اس نے تمام علوم و فنون کو انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کرنے کا بڑا مفید کام سر انجام دیا۔ اس ادارے کی سائنس اور انجینئرنگ پر مطبوعہ کتب آج بھی حوالہ جاتی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے 1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا۔ ابتداء میں اس ادارے کو علی گڑھ میں اس لیے قائم کیا تھا کہ اردو میں آزاد ذہن کے مسلمان دانشور اس ادارے سے پیدا ہوں۔ اس سے وابستہ ایک کتابی اشاعت کا ادارہ ''مکتبہ جامعہ'' کے نام سے قائم کیا گیا۔ گزشتہ پچاس سالوں میں اس ادارے نے نہ صرف نصابی اور درسی کتب شائع کیں بلکہ علوم ادبیات پر کتابوں کا بہت بڑا سرمایہ بھی قارئین کے لیے فراہم کیا۔ اس طرح نشر و اشاعت کے اور بھی ادارے قائم کیے گئے جن سے بلند پائے کا بے شمار ادب حاصل ہوا۔

قیام پاکستان کے وقت جتنی بڑی صنعتیں برطانوی دور میں قائم کی گئی تھیں وہ زیادہ تر ان علاقوں میں لگائی گئی تھیں جو اب پاکستان میں شامل نہیں ہیں۔ مغربی پنجاب کے زیادہ تر علاقے صرف روئی، گندم اور دوسری اشیاء کی پیداوار کے لیے مختص کر دیے گئے تھے... چنانچہ ایک وقت میں موجودہ فیصل آباد جو پہلے لائل پور کے نام سے جانا جاتا تھا، برصغیر کے تمام علاقوں کو غلہ فراہم کیا کرتا تھا۔ اسی طرح پاکستان کے شمالی حصوں کو دانستہ طور پر غیر ترقی یافتہ رکھا گیا۔ برطانوی سرکار یہاں کے جوانوں کو چند روپوں اور مراعات کے عوض اپنے توسیع پسندانہ منصوبوں اور جارحانہ جنگی مقاصد کی تکمیل کی خاطر بھرتی کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔.. چنانچہ آزادی کے بعد موجودہ پاکستانی علاقوں میں قابل ذکر صنعت و حرفت کے ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ لے دے کر لاہور قیام پاکستان کے وقت برصغیر میں طباعت و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کے بعد پشاور، ملتان اور کراچی جیسے مزید چند بڑے شہروں کا نام اس فہرست میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ان شہروں میں جو رفاعی ادارے طباعت اور نشر و اشاعت میں مصروف تھے، وہ بہت کم فعال تھے کیونکہ نہ ان کے پاس وافر مقدار میں سرمایہ تھا اور نہ انہیں صاحب حیثیت لوگوں کی سرپرستی نصیب تھی۔ کتابوں، رسائل و جرائد کی زیادہ تر اشاعت انگریزی اور اردو میں ہوتی تھی۔ جب کہ ''پشتو''، پنجابی، سندھی اور براہوی زبان کا ادب بہت کم چھاپا جاتا تھا۔ اردو کے قومی زبان ہونے کی وجہ سے 1950ء کے بعد سے اس زبان میں کتب و رسائل کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جب کہ اردو کے بعد انگریزی میں کتابیں شائع کی جانے لگیں۔ 1960ء کے بعد سرکاری اور نیم سرکاری

طباعتی ادارے بھی میدان میں آئے جن کی وجہ سے سندھی، پشتو اور براہوی زبانوں سے متعلق ادب چھاپنے کی طرف رجحان ہوا۔ پاکستان میں جو طباعتی ادارے کام کر رہے ہیں، ان کے تین طریق کار تھے، لیتھو ٹائپ۔ بلاک یعنی بلاک لیٹر پریس کا طریقہ طباعت۔

لیتھو پرنٹنگ کے ذریعے اردو، عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں میں کتابیں طبع ہوتی تھیں چونکہ اس وقت اچھا سفید کاغذ عام طور پر آسانی سے دستیاب نہیں تھا اور اگر تھا تو اس کی قیمت بہت زیادہ تھی اس لیے ان کتابوں میں مقامی ہاتھ سے بنا ہوا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ طباعت کے لیے اخباری کاغذ یعنی سستا اور کمزور کاغذ استعمال میں لایا جاتا تھا جب کہ انگریزی کتابوں کے لیے باہر کا درآمد شدہ کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ لیتھو کی طباعت عمدہ ہوتی تھی۔ کیونکہ لیتھو میں استعمال ہونے والا سفید پتھر اور روشنائی یورپ سے درآمد شدہ بازاروں میں عام دستیاب تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم کے بعد بہت سے ممالک کی صنعتیں متاثر ہوئیں تو طباعت کے لیے سیاہی اور کاغذ کی درآمد میں بھی دشواریاں ہونے لگی تھیں۔ لہٰذا سیاہی اور کاغذ کی تیاری میں مقامی طور پر توجہ دی جانے لگی۔ طباعت کا ناقص سامان اور اس کے حصول میں دشواریوں کی وجہ سے چھاپے خانے کی صنعت پر برے اثرات مرتب ہوئے اور آہستہ آہستہ کچھ سالوں کے بعد لیتھو پریس تقریباً بند ہو گئے۔ 1960ء کے بعد سے لیتھو پریس کی تعداد برائے نام رہ گئی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ٹائپ کو فروغ ملا اور 1970ء کے بعد سے آف سیٹ طرز طباعت کو فروغ ملنے لگا اور لیتھو پریس پر طباعت کا کام بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔

آزادی کے بعد لاہور شہر لیتھو پریس کا گھر تھا جب کہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ملتان، کراچی، پشاور اور دوسرے چند شہروں میں لیتھو پریس قائم تھے۔ حرفی طباعت یا لیٹر پریس بھی پاکستان کے بعض شہروں میں چل رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر انگریزی ٹائپ طباعت کے پریس تھے۔ اگرچہ اردو ٹائپ بعض سرکاری مطبع خانوں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، مطبع کوہ نور لاہور، مشن پریس حیدر آباد دکن میں فروغ پا چکا تھا لیکن اسے عوام میں مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی تھی اور یہ صورت حال 1960ء تک بدستور برقرار رہی تھی۔

اردو ٹائپ کا چہرہ اور بناوٹ خط نسخ کے قریب تھا جب کہ اردو قاری خط نستعلیق میں پڑھنے کا عادی تھا۔ نستعلیق خط میں کئی تجربات کیے جا چکے تھے اور خطاطوں اور کاتبوں نے اس کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی محنت کی تھی۔ خاص طور سے اردو صحافت میں کام کرنے والے خطاطوں اور کاتبوں نے اس فن کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ بیشتر اردو داں قارئین ٹائپ پر طبع شدہ کتب اور رسائل کو مطالعہ کے لیے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ گویا ٹائپ کا رواج اردو ادب کی طباعت کے لیے دل سے قبول نہیں کیا گیا تھا اور یہ طریقہ تقریباً پاکستان کے قیام سے پہلے ہی ترک کیا جا چکا تھا۔ خط نسخ کا ٹائپ البتہ چلتا رہا۔ انگریزی فاؤنڈریاں اردو ٹائپ ڈھالتی رہیں لیکن اردو ٹائپ ایک ہی انداز سے بنتا تھا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ دو ریخ تھے۔ عام (رومن) اور ثلث (بولڈ) یہ ٹائپ اٹھارہ سے بیس پوائنٹ تک بنتا تھا جو خاصہ موٹا ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ ان تکنیکی وجوہات کی بناء پر اردو ٹائپ کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ 1960ء کے بعد سرکاری سرپرستی کے باعث کتابیں ٹائپ میں چھپنے لگیں اور اس سے اگلے دس سال تک اس کی بناوٹ تجرباتی مراحل سے گزرتی رہی۔

اس طرح ٹائپ طباعت کے فروغ میں حکومت کی کوششوں کو بڑا دخل رہا۔ وہ ٹائپ سے طباعت کو عام کرنے میں کوشاں رہی۔ سرکاری اور درسی کتابوں کو ٹائپ اور نسخ میں طبع کیا جانے لگا۔ ٹائپ کے چہرے یعنی (Face) کی بناوٹ پر کافی توجہ دینے لگے جس سے ٹائپ کے کام کو تقویت ملی۔ اسی دوران کریسنٹ ٹائپ فاؤنڈری، عبدل ٹائپ فاؤنڈری، جدید اردو ٹائپ پریس، کراچی ٹائپ فاؤنڈری، حبیب فاؤنڈری، مکتبہ جدید پریس لاہور نے اس صنعت کو کافی فروغ دیا۔ اس کے علاوہ بعض مغربی ممالک کی کمپنیوں مثلاً مونو ٹائپ، لائینو ٹائپ نے بھی اردو ٹائپ پیش کیا جس کو عوام نے کافی سراہا۔ چنانچہ بعض پریس ان کمپنیوں کی بنائی ہوئی مشینوں کو آسانی سے استعمال کرنے لگے۔ مثلاً ''ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد'' میں موجود لائینو ٹائپ بہت خوب صورت تھا۔ اسی طرح کراچی میں اردو لغت بورڈ کے پریس میں اردو ٹائپ پر عمدہ طریقے سے اعراب نگاری اور علامات نگاری کی جاتی تھی۔ پاکستانی صحافت نے بھی اردو ٹائپ کو پذیرائی بخشی۔ روزنامہ جنگ لاہور، روزنامہ نوائے وقت لاہور اور روزنامہ مشرق جیسے اردو کے مایہ ناز پریس اپنا طباعتی کام اردو ٹائپ کے ذریعے ہی انجام دینے لگے تھے۔

لاہور کو ابتدا سے طباعت کے سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق لاہور میں تقریباً چار ہزار پریس کام کر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر تعداد لیٹر پریس کی تھی۔ لاہور کا سب سے بڑا طباعتی ادارہ پکچرز لمیٹڈ تھا جو اشتہارات، کارڈ اور ڈبے طبع کرنے کے ساتھ ساتھ بعض خوب صورت کتابیں بھی شائع کرتا تھا۔ دوسرا بڑا اور پرانا ادارہ شاہ آرٹ پریس تھا۔ رنگین طباعت میں اس ادارے نے اپنا نام پیدا کیا۔ ایسا ہی ایک ادارہ عظمت لمیٹڈ تھا جو معیاری طباعت کے لیے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اسی طرح خوب صورت اور رنگین کتابوں کی طباعت اور اشاعت میں فیروز سنز لمیٹڈ کے پریس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہاں پر ہر قسم کی طباعت کا انتظام موجود تھا۔ پرانے پریسوں میں لائن آرٹ پریس، علمی پرنٹنگ پریس، جدید اردو ٹائپ پریس اور مکتبہ جدید پریس کافی مشہور تھے۔ (مگر اب ہر جگہ کمپوزنگ ہو رہی ہے)

آزادی کے وقت لیتھو اور حرفی طباعت بمشکل ہوتی تھی لیکن آف سیٹ طباعت نے اردو کی بہت سی مشکلات کو دور کر دیا۔ خط نستعلیق کے ذوق کو اردو ٹائپ میں جو رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، آف سیٹ طباعت نے اس کو ختم کرنے میں کافی مدد دی۔ عام کتابت بہ آسانی آفسٹ کے ذریعے طبع کی جانے لگی۔ اخبارات اور کتابیں اس نظام کے تحت چھپنے لگے۔

لیزر کومپ نے حروف سازی (کمپوزنگ) کے مسئلے کو بھی حل کر دیا، اس کی وجہ سے اردو کتابت میں جو تاخیر ہوا کرتی تھی اس کے ذریعے اس کا ازالہ ممکن ہو گیا ہے۔ IBM کمپیوٹر نے عام سیسے کے ٹائپ کی حروف سازی کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے ٹائپ ہو کر کاغذ پر کمپوز کیے گئے جملے پیراگراف اور صفحے ترتیب پاتے رہتے ہیں اور ان کی پروف ریڈنگ اور تصحیح انجام دے کر حتمی صفحہ تیار کیا جا سکتا ہے... چنانچہ طباعت بھی بہتر اور آسان ہو گئی ہے۔ جدید طباعتی رجحانات میں خوب صورت کتابیں اور سرورق طبع کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ کتابوں کے سرورق اور جلد سازی کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ پیپر بیک کتابوں کو بھی پلاسٹک کی لیمی نیشن کے ذریعے چمکدار اور پائیدار بنایا جاتا ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن اور نیشنل بک کونسل کے قیام کے بعد طباعتی میدان میں کافی استحکام پیدا ہوا۔ سرکاری مطبوعات کو پیش کرنے کے لیے محکمہ فلم و مطبوعات بڑی

دہلی کالج 1829ء میں قائم ہوا جس نے ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ جیسے عظیم مصنفین پیدا کیے۔ دوسری محمڈن ایجوکیشن کانفرنس جو 1886ء میں قائم ہوئی، اس ادارے سے سرسید احمد خان کے رفقاء کار مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر اور دوسرے بہت سے عظیم مصنفین کی مطبوعات شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں نولکشور کا مطبع لکھنو میں قائم ہوا۔

ان اداروں کے علاوہ اردو کتابوں کے اور بھی بہت سے بڑے بڑے اشاعتی ادارے قائم ہوئے۔ ان میں انجمن ترقی اردو 1903ء میں حیدرآباد دکن میں قائم ہوئی۔ 1913ء میں مولوی عبدالحق بابائے اردو کی قیادت میں اس ادارے نے اردو کے نفاذ کے سلسلے میں بڑی گراں قدر کتب شائع کیں۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن ترقی اردو کا دفتر ہندوستان سے کراچی منتقل ہوا اور یہاں بھی اپنی نشر و اشاعت کی شہرت کو مزید آگے بڑھایا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اردو کی کتابوں کی اشاعت کے لیے بہت بڑا ادارہ خیال کیا جاتا تھا۔ یہ 1915ء میں مولانا شبلی نعمانی کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اس ادارے میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا شاہ محی الدین اور مولانا صباح الدین عبدالرحمن وغیرہ نمایاں خدمات سر انجام دے چکے ہیں۔ سنجیدہ علمی و ادبی اور تاریخی مستند کتب کی اشاعت و ترقی میں اس ادارے کا بڑا نام ہے۔

اہمیت کا حامل ہے جب کہ وزارت تعلیم، وزارت مذہبی امور، وزارت اطلاعات و نشریات خود اور اپنے ذیلی اداروں کے ذریعے بڑی مفید ادبی طباعت کر کے قارئین اور شائقین مطالعہ کے ضروری تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کر رہے ہیں جب کہ نیم سرکاری اداروں کی طباعتی کوششیں بھی قابلِ تعریف ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود پاکستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد پچاس فیصد سے زیادہ نہ ہو سکی۔ تعلیم کے میدان میں پاکستان کی موجودہ پسماندگی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے ملک میں اشاعت کتب کی موجودہ صورت حال تسلی بخش نہیں ہے۔ زیادہ تر ناشرین پرانی کتابیں شائع کرنے کی طرف

راغب ہیں اور کتابوں کو ناقص کاغذ پر چھاپ کر قارئین سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی فکر میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ادبی موضوعات میں صرف ناول شائع کر کے اپنی دکان چمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ علمی اور سائنسی موضوعات پر کم دھیان دیتے ہیں۔ بچوں کے ادب کو تعلیمی بنیاد پر شائع نہیں کرتے۔ یہی بات سرکاری طباعتی اداروں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے۔

انسان صدیوں کی مسافت طے کر کے موجودہ فن طباعت کی کٹھن منزل تک پہنچا ہے۔ پہیا، بھاپ اور بجلی جیسی توانائی اس فن کے اصل محرک ہیں۔ چارلس ڈکنز نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''فن طباعت ہی تہذیب کی وہ پیداوار ہے جو آزاد انسان کے وجود کے لیے ضروری ہے۔'' پانچ سو سال سے زائد عرصے سے چھاپے خانے علم وادب کی ترقی، سیاست اور آزادی کی علم برداری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہر روز نئی نئی ایجادات مثلاً تیز رفتار آفسٹ مشین فوٹو سے براہ راست کمپوز کرنے کا طریقہ، رنگین فلم، ماسکنگ، زیرو گرافی، پلاسٹک رولر، چمکدار رنگین روشنائیاں اور مختلف اقسام کے کاغذ وغیرہ سب نے مل کر موجودہ خلائی دور کو حیرت انگیز بنا دیا ہے۔ یہ سب طباعت اور فن طباعت کے کرشمے ہیں۔ گویا ترقی کی دوڑ میں چھاپہ خانے اہم کردار ادا کر رہے ہیں اس لیے فن طباعت کے معروف طریقوں میں سے چند ایک کا ذکر بھی کرتا چلوں۔

فن طباعت کے مختلف طریقوں میں آفسٹ لیتھو گرافی بھی ایک طریقہ طباعت ہے۔ اس طریقہ کے موجد کا نام الائس سنی فیلڈر ہے۔ وہ 6 نومبر 1771ء کو پراگ شہر میں پیدا ہوا۔ اگرچہ بچپن میں اس کا تعلق تھیٹر کمپنی سے رہا مگر جب میونخ پہنچا تو اس نے شاعری شروع کر دی اور اس کی اشاعت کے ذریعے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ اپنی نظمیں، گیت خود چھاپنے میں اسے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کام کے لیے اس نے اپنا پریس لگا لیا اور اس میں نئی نئی ایجادات و اختراعات کرنے لگا۔ اس طرح جلد ہی اس نے چھپائی کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا۔ یہی وہ طریقہ طباعت ہے جس سے ہم سب مستفید ہو رہے ہیں۔

سنی فیلڈر نے ابتداء میں کھدائی کر کے چھپائی شروع کی۔ پہلے تو اسے اس میں قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی تاہم جہد مسلسل سے اس نے موم اور صابن وغیرہ کے مرکب سے ایسی روشنائی بنائی جس سے تانبے پر اچھی

کرنے میں کافی مدد ملی اور کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سیاہی سے اس نے الٹے حروف لکھنے کی مشق شروع کر دی۔ ایک دن اس کی والدہ نے اس کو دھلائی کے کپڑے لکھنے کے لیے کہا۔ اس وقت اس کے پاس کاغذ نہ تھا۔ لہٰذا اس نے قریب پڑے پالش شدہ پتھر پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ بعد میں کسی کاغذ پر نقل کر لے گا۔ دوسرے روز پتھر سے تحریر نقل کرنے سے قبل اس کے ذہن میں آیا کہ وہ اس تحریر پر کیوں نہ تھوڑا سا تیزاب ڈال کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے جونہی ہلکا سا تیزاب پتھر پر ڈالا تو اس نے دیکھا کہ کچھ دیر بعد وہ حروف پتھر کی سطح سے تقریباً 10/1 انچ ابھر گئے ہیں۔ اس نے فوراً ان حروف پر سیاہی لگا کر پرنٹ لیا جو کامیاب رہا۔ اس طرح دنیا میں پتھر سے پہلا پرنٹ حاصل ہوا اور اسی سے لیتھو گرافی کی بنیاد پڑی۔ بعد میں اس نے مزید تجربات کیے اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ پتھر روغنی سیاہی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ بغیر تیزاب کے بھی چھپائی کی جاسکتی ہے۔

چونکہ پتھر یا پلیٹوں سے براہِ راست چھپائی سے کاغذ پر سیاہی کی بہت مقدار آتی تھی اور پھر ان سے ٹین کی چادروں پر چھپائی ممکن نہ تھی۔ اسی وجہ سے آفسٹ کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس اصول کے تحت مشین پر پلیٹ داب کے سلنڈروں کے علاوہ ایک تیسرے سلنڈر کا اضافہ کیا گیا جس کو آفسٹ یا بلینکٹ سلنڈر کہا جاتا ہے۔ اس ترمیم کی وجہ سے اب پلیٹیں الٹی کی بجائے سیدھی بنائی جانے لگیں۔ اس لیے کہ پلیٹ پر داب پہلے بلینکٹ پر لی جاتی ہے اور بلینکٹ سلنڈر سے الٹے عکس کاغذ یا ٹین وغیرہ پر سیدھے منتقل کیے جانے لگے جس کے معنی یہ ہوئے کہ براہِ راست پلیٹ سے چھپائی کے برخلاف ربر بلینکٹ سے سیاہی منتقل کی جانے لگی۔

براہ راست چھپائی کے مقابلے میں اس طرح سیاہی کا خرچ ہی کم نہیں ہوا بلکہ صحیح مقدار میں صفائی کے ساتھ تصاویر کے نقطے اور دوسرے کام ٹھیک سائز میں چھاپنا ممکن ہو گیا۔ سب سے پہلے برطانیہ میں برکلے نامی شخص نے 1875ء میں اس طریقے کو ٹین پر طباعت کے لیے ایجاد کیا جو اپنی خوبیوں کی بناء پر دنیا بھر میں مقبول ہو گیا۔ جدید مشینوں پر اچھی طباعت کے لیے ربر بلینکٹ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

آف سیٹ لیتھو، فوٹو لیتھو گرافی، فوٹو آفسٹ اور محض

لیتھوب ایک ہی طریق کار یعنی آف سیٹ لیتھوگرافی کے مختلف نام ہیں۔ طباعت کا یہ طریقہ لیٹر پریس کی نسبت مشکل اور پیچیدہ ہے... کیونکہ اس میں متعدد کیمیاوی عملیات ہی شامل نہیں بلکہ اس کے لیے پلیٹوں کی تیاری بھی دیدہ ریزی کا کام ہے، پھر اس کی مشینیں نازک مگر قابل بھروسا ہوتی ہیں کہ بہتر نتائج کے لیے ہر عمل اور ہر قدم پر توازن برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اس جدید طریق کار کے تحت رنگین چھپائی بھی آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ چارٹ، نقشے، ڈایا گرام وغیرہ بڑی خوبی سی مختلف رنگوں میں چھاپے جاتے ہیں۔ پلیٹ پر عکس سیدھا ہوتا ہے ایک رولر اس عکس کو ایک بلینکٹ (کمبل) پر الٹا منتقل کر دیتا ہے جو اس کے عکس کو دوبارہ کاغذ پر Offset یعنی الٹ کر کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ اس طرح پلیٹ پر بنا ہوا عکس کاغذ پر سیدھا چھپ جاتا ہے۔

اسکرین پرنٹنگ جسے پہلے سلک اسکرین کہتے تھے اور کبھی کبھی اسٹینسل پراسیس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اب ایک گھریلو دستکاری نہیں رہی بلکہ اس نے بجائے خود ایک صنعت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ پہلے دس پندرہ سالوں میں اس کام کو مشینی طریقوں پر کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے اور اب کامیابی کے ساتھ مشین اور اس کے اضافی آلات تیار ہو چکے ہیں۔ یہ طریقہ ان اشیاء پر چھپائی کے لیے مستعمل ہے جن پر عموماً کوئی دوسرا طریقہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف قسم کی ایسی اشیاء مثلاً ریڈیو کے ڈائل، کھلونے، چمڑے اور پلاسٹک کا سامان، شیشے کی بوتلیں، ربڑ کے سیٹ یا چٹائیاں، گلدان اور اس طرح کی دوسری بہت سی اشیاء جو ہموار سطح کے پریسوں پر نہیں چھاپی جاسکتیں، صرف اسی طریقہ سے چھپتی ہیں۔

پہلے اسٹینسل سے چھپائی کو قدیم چینیوں اور مصریوں نے ظروف اور کپڑے پر رنگین نقش و نگار کے لیے استعمال کیا۔ اس طریقے کے تحت پہلے ایک مضبوط چیز پر نقوش کو کاٹ کر اسٹینسل، خالص سلک، ٹائیلان، آرکنڈی یا بہت باریک تاروں کی جالی پر تیار کیے جاتے ہیں جو ایک فریم پر لگی ہوتی ہیں۔ اسٹینسل کے ڈیزائن ہاتھ سے خاص کوٹیڈ کاغذ پر کاٹ کر یا فوٹو کے ذریعے تیار کر کے اس جالی پر منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ فریم قبضوں کے ذریعے اونچا نیچا کیا جاسکتا ہے۔ میز کی سطح پر فریم کے نیچے وہ چیز یا کاغذ اپنی صحیح جگہ پر رکھ کر اوپر سے جالی والی فریم اپنی پوزیشن پر نیچے لے آتے ہیں۔ ربر کے بلیڈ گلی ہوئی اسکوئجی سے ذرا داب کے ساتھ فریم میں رکھی ہوئی سیاہی ایک طرف سے دوسری طرف گزار دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے پر سیاہی باریک جالی سے صرف ان حصوں سے گزر کر جو جالی میں ننگے ہوتے ہیں، کاغذ یا اس چیز پر لگ جاتی ہے۔ یہ اس کا بنیادی طریقہ ہے جو کافی عرصے سے رائج ہے لیکن اب اس کی خودکار مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں جن پر بڑی پھرتی سے چھپائی کی جاسکتی ہے۔

چھپائی کے اس طریقے سے بڑے بڑے نمائشی پوسٹر، سنیما کے رنگین مصور اشتہارات جن کی معمولی تعداد میں ضرورت ہوتی ہے، اس کے ذریعے کم قیمت پر طبع کیے جاتے ہیں۔ آج کل اسکرین پرنٹنگ کے ذریعے بڑے بڑے پردے ساڑیاں وغیرہ اور دوسرے خوب صورت ڈیزائن ملبوسات پر چھاپ کر منڈیوں میں کامیابی کے ساتھ فروخت کیے جانے لگے ہیں بلکہ بعض ٹیکسٹائل ملز نے اس کو بطور خاص ایک شعبے کے ذریعے شروع کر دیا ہے۔ اسکرین پرنٹنگ کی سیاہیاں بھی مخصوص ہوتی ہیں جو روغنی اور سیلولوس

ساشا

زندگی کے نشیب و فراز کی ایک عجیب داستان، کبھی پرخطر جزیروں، دائروں میں قید تو کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکے ہوئے راہی کے مانند، سنسنی خیز حالات سے نبرد آزما.....

عمر عبداللہ کے سحر انگیز قلم سے

ایک نئے انداز، نئے رنگ، نئے ڈھنگ میں.....
عشق کے دشوار گزار مرحلے..... حسن کے قافلے.....
جذبات کا تلاطم..... دریاؤں کی روانی..... سمندر کے طوفانوں اور بھنور میں لپٹی خوبصورت داستان.....

بہت جلد

سسپنس کے صفحات پر جلد ہی پڑھیں گے

کی بنیاد پر تیار کی جاتی ہیں۔ اسکرین پرنٹنگ کی سیاہیوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ کالے رنگ پر بہ آسانی دوسرے اور تیسرے رنگ کی چھپائی کی جاسکتی ہے۔

پتھر سے چھپائی کے ابتدائی دور ہی سے "سنی فیلڈر" نے مختلف دھاتوں پر تجربات شروع کر دیئے تھے اور وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ دھات کی پلیٹوں پر بھی پتھر کی طرح چھپائی کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد مختلف ممالک میں مزید تجربات کیے گئے جن میں بہت کامیابی ملی اور اس طرح دھات کی پلیٹوں کی سطح کو مصنوعی طریقے سے گرین کر کے لیتھوگرافک پتھر جیسا بنا لیا گیا اور ان سے بہت اچھی طباعت کی جانے لگی۔ کافی تجربات کے بعد معلوم ہوا کہ جست اور المونیم ہی ایسی دو دھاتیں ہیں جو لیتھوگرافی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

لیتھوگرافی کا آغاز ایسے پتھر سے ہوا تھا جس کی سطح پر قدرتی طور پر کھردراپن یا گرین پایا جاتا تھا۔ اس وجہ سے پانی کی ایک ہلکی تہ اس پر قائم رکھی جاسکتی تھی مگر جب سے المونیم اور جست کی چادروں یا پلیٹوں کے ذریعے سے طباعت کا رواج ہوا اس وقت سے دھات کی پلیٹوں کی سطح کو ایک مقررہ معیار کے مطابق دانے دار بنایا جانا لازمی عمل ہو گیا ہے جس کو گرینگ کہا جاتا ہے۔ لیتھوگرافک طریقہ طباعت میں پلیٹ کا کھردرا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ مطلوبہ کام اس پر مضبوطی سے قائم رہے۔ نیز خالی حصوں پر پانی یا نمی کی اتنی ہلکی تہ موجود رہے کہ وہ حصے سیاہی لگنے سے محفوظ رہ سکیں۔ دراصل لیتھوگرافک طریقہ طباعت میں پانی اور چکناہٹ کا قدرتی تضاد بنیادی اصول ہیں اس لیے پلیٹوں پر گرینگ بہت ضروری ہے۔ پلیٹوں کی گرینگ کرنے کے لیے جو مشین استعمال کی جاتی ہے، اس کو گرینگ مشین یا پلیٹ گریز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مشین بجلی کی طاقت سے ایک مقررہ رفتار اور خاص انداز سے چلتی ہے تاکہ گولیاں برابر گھومتی رہیں۔ پلیٹ کو مشین کے ہموار تختے پر باندھ کر اس پر شیشے کی یا فولاد کی گولیاں اتنی تعداد میں ڈالی جاتی ہیں کہ پوری پلیٹ ڈھک جائے اس کے بعد اس پر چھنی ہوئی ریت اور تھوڑا سا پانی چھڑک کر مشین کو چلا دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پلیٹ پوری طرح گرین نہ ہو جائے۔ اس عمل کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ طباعت کے بعد پلیٹیں دوبارہ گرین کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے پہلے پلیٹوں سے سیاہی دور کر لی جاتی ہے۔ اس کے بعد جست کی پلیٹوں کو کاسٹک میں ڈال کر صاف کر لیا جاتا ہے۔ ان کو دھونے کے لیے مشین یا ہاتھ کے ذریعے برش سے خوب رگڑا جاتا ہے اور پھر پہلے کی طرح مشین میں لگا کر گرینگ کا عمل دوبارہ کیا جاتا ہے۔

چھپائی کا ایک اور طریقہ ہے جسے مونو ٹائپ پرنٹنگ کہا جاتا ہے۔ جس میں چھپائی کی ایک پلیٹ سے صرف ایک کاغذ پر پہلا نقش حاصل کر لیا جاتا ہے۔ یہ پہلا نقش چھپائی کا سب سے بہتر نمونہ ہوتا ہے، بعد میں چھپنے والے نقوش پہلے سے مدھم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں مشین سے ٹائپ کو ترتیب دینے کا نظام جاری ہوا۔ ٹائپ ڈھلائی کی مشین پر جسے مونو ٹائپ کہتے ہیں، ہر حرف جدا جدا کر کے ڈھالا جاتا تھا جب کہ لائن کاسٹنگ مشین پر الفاظ کی ایک پوری لائن ڈھل کر نکلتی تھی جسے سلگ کہتے ہیں۔ یہ دونوں مشینیں خودکار تھیں۔ اس قسم کی اور بھی مشینیں تیار کی گئیں جنہیں لڈلو کہا جاتا ہے۔ مونو ٹائپ 1897ء میں ایجاد ہوئی۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں ایک کی بورڈ جس پر آپریٹر کاغذ کے اسپول پر حرف کا ایک سوراخ کرتا جاتا ہے جو بعد میں مشین پر ٹائپ ڈھالنے کا کنٹرول کرتا ہے اور دوسرا کاسٹر ہوتا ہے جس پر سوراخ شدہ کاغذ کے مطابق حروف خود بخود ڈھلتے جاتے ہیں یعنی پگھلی ہوئی دھات ان سوراخوں سے نکل کر حروف ڈھالتی جاتی ہے۔ مونو ٹائپ کے کاسٹر پر سیسے کے رول، بیلیں، کواڈ اور 72 پوائنٹ تک ٹائپ میں ڈھل سکتے ہیں۔ یہ مشینیں 1886ء میں ایجاد ہوئیں جن کو بعد میں مزید ترقی دے کر بہتر بنایا گیا تھا۔

پریس کا کمپوزنگ کا شعبہ جدا رکھا جاتا ہے۔ وہاں ٹائپ کے ریک، ان کے کیس اور متعلقہ سامان یکجا ہوتے ہیں۔ کیس وغیرہ لکڑی اور فولادی چادروں سے تیار کیے جاتے ہیں لیکن لکڑی کے کیس عموماً سستے اور بہتر ہوتے ہیں۔ ٹائپ کے کیس جوڑوں میں ہوتے ہیں۔ بالائی کیس میں حروف تہجی اور ہندسے لکھے ہوئے ہوتے ہیں جن کے نچلے کیس میں تحریر والے حروف اور علامتوں وغیرہ کے ٹائپ استعمال کی مناسبت سے چھوٹے بڑے خانوں میں رکھے جاتے ہیں، کبھی کبھی ایک کیس میں دونوں قسم کے ٹائپ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹائپ کو لکھے ہوئے مسودے کے مطابق ایک ایک کر کے اٹھا کر جوڑنے کے طریقے کو کمپوزنگ کہا جاتا ہے اور یہ کام ایک کمپوزر پہلے کمپوزنگ

اسٹک میں کام کرتا ہے۔ اس کام کو درست فاصلے کے ساتھ میخ ٹائپوں کے استعمال اور تیزی سے کرنے کے لیے کافی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمپوز شدہ مواد کے پروف پڑھنے کے بعد غلطیوں کی تصحیح کر کے ان کو حسب ضرورت صفحات کی شکل دے کر طباعت کے لیے متعلقہ شعبہ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ کتاب کے کمپوز صفحات کو ایک خاص ترتیب کے تحت چھاپا جاتا ہے تاکہ پوری شیٹ کو موڑنے پر صفحات کی ترتیب درست رہے اور کتاب کے کٹنے کے بعد حاشیہ وغیرہ ڈیزائن کے مطابق ہو۔

لیٹر پریس کی مشین عام طور پر پلیٹن سیلنڈر اور روٹری قسم کی ہوتی ہیں۔ پلیٹن مشین چھوٹے سائز کی ہوتی ہے۔ یہ ہر پریس کے لیے خصوصاً کم تعداد میں چھوٹے چھوٹے کام مثلاً ملاقاتی کارڈ، دعوت نامے، کیش میمو اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کو باکفایت اور جلد کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ جب کہ سیلنڈر مشینیں عموماً کتابوں کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ یہ تقریباً ہر بڑے سائز میں دستیاب ہوتی ہیں۔ 1851ء میں روٹری مشین اصولی طور پر ایجاد ہو چکی تھی لیکن 1870ء میں واٹر پریس کے نام سے تجارتی اغراض کے لیے پہلی روٹری مشین ایجاد ہوئی جس میں گولائی کی شکل میں سیلنڈر پر ''طسیر یو'' لگا کر کئی گنا تیز چھپائی کی جانے لگی۔ انگریزی زبان کے اخبارات، ٹیلی فون ڈائریکٹری، زیادہ تعداد میں طبع کی جانے والی کتب اور رسالے اور فارموں کی طباعت عموماً ان ہی روٹری مشینوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ یہ مشینیں متعلقہ ساز و سامان کے ساتھ قدرے مہنگی ہوتی ہیں۔ تاہم ان کی کارکردگی قدرے تسلی بخش قرار دی جاتی ہے۔

کرنسی نوٹ، ڈاک کے ٹکٹ، چیک، بانڈز اور حصص سرٹیفکیٹ وغیرہ کی طباعت سیکیورٹی پرنٹنگ سے تعلق رکھتی ہے۔ طباعت میں ان کا ایک امتیازی دائرہ عمل کہا جاتا ہے اور اس کی طباعت میں مخصوص فنی صلاحیتوں کو کام میں لایا جاتا ہے۔

رنگین چھپائی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے لیکن عام طور پر فوٹو انگریونگ کا طریقہ اس چھپائی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ چھپائی کے اس طریقے میں سرخ، زرد، نیلے رنگوں کے لیے علیحدہ علیحدہ تین پلیٹیں تیار کی جاتی ہیں اور ایک پلیٹ سیاہ حصہ چھاپنے کے لیے۔ الغرض کاغذ چار پلیٹوں کی مدد سے چار بار چھاپا جاتا ہے۔ فوٹو گرافی کی مدد سے چار علیحدہ رنگوں کے علیحدہ نیگٹو تیار کیے جاتے ہیں۔ اس طریقے کو Colour Separation کہا جاتا ہے۔ ان نیگٹو سے چار ایسی علیحدہ علیحدہ پلیٹیں تیار کی جاتی ہیں جس میں تصویر کو چھوٹے چھوٹے نقطوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ نقطے چھوٹے اور بڑے ہوتے ہیں۔ بڑے نقطے گہرے شیڈ کو ظاہر کرتے ہیں۔ چھپائی میں کاغذ پر یہ نقطے ایک دوسرے کے انتہائی قریب یا ایک دوسرے کے اوپر چھپتے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ ان نقاط کو علیحدہ علیحدہ نہیں دیکھ سکتی۔ چنانچہ اجمالی طور پر دیکھنے سے تصویر میں مختلف رنگ نظر آئیں گے۔ مثلاً جب نیلا نقطہ پیلے کے بہت قریب ہوگا وہ نقطہ سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ یعنی فوٹو گرافی کی مدد سے تصویر کو نقاط کی صورت میں پلیٹ پر منتقل کرنے کو Half-tone بھی کہتے ہیں۔ رنگین چھپائی میں Grarure چھپائی زیادہ موزوں ہوتی ہے کیونکہ اس طریقے میں چھپائی کرنے والے رنگ شفاف ہوتے ہیں اور جب ایک حصے پر دو یا تین رنگ چھپتے ہیں تو بے شمار رنگ اور ان کے شیڈ حاصل ہوتے ہیں۔ چار رنگوں کی چھپائی کے اس طریقے سے تقریباً سولہ رنگوں کی تصویروں کی چھپائی کی جاسکتی ہے۔ عام طور پر چھپائی میں پہلے پیلا رنگ پھر نیلا اور بعد ازاں سرخ اور آخر میں سیاہ رنگ چھاپے جاتے ہیں۔ ان ہی رنگوں کے امتزاج سے بے شمار رنگ حاصل ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کی جدید مشینوں میں بنیادی اہمیت ٹیکسٹ ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے پورے پورے صفحات کی ترتیب و تدوین کی جاسکتی ہے۔ مسودے میں ضرورت کے مطابق ترتیب کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ فقرے یا پیرا گراف آگے پیچھے لائے جاسکتے ہیں۔ نئے الفاظ اور فقرے شامل کیے جاسکتے ہیں یا غیر ضروری حصے حذف کیے جاسکتے ہیں۔ ہجے درست کیے جاسکتے ہیں الغرض کوئی بھی تبدیلی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ ان مختلف رائج پروگراموں میں ٹی میٹ، ورڈز اسٹار اور واکس رائٹر زیادہ مقبول ہیں۔ اس طریقے سے اشاعت کو ''ڈیسک ٹاپ پبلشنگ'' کہتے ہیں۔ جدید کمپیوٹر کے ہمراہ رنگین چھپائی کے لیے کلر پرنٹر بھی دستیاب ہیں۔

ماخذات

کتب خانوں کی تاریخ از اشرف علی
پاکستان کے قدیم مطبع خانے از عنایت بھٹی
انٹرنیٹ کے مضامین

پہلا حصہ

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہن پوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

ہمارے معاشرے میں کئی ایسے نوجوان موجود ہیں جنہیں لڑکیوں کے سامنے ''ہیرو'' بننے کا بہت شوق ہوتا ہے اور اپنے اس شوق کی خاطر وہ ایسے ایسے خطرناک کام کر جاتے ہیں جن کے بارے میں سوچ کر روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ میرے خیال میں یہ کام صرف لڑکیوں کو امپریس کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خود میں بھی اسی عارضہ میں مبتلا ہوں۔ لڑکیوں کو امپریس کرنے کا شوق خود مجھے بھی ہے۔

میرا نام علی حسن ہے اور میری عمر چوبیس سال کے لگ بھگ ہے۔ میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ بی ایڈ کیا ہوا ہے لیکن ابھی تک مجھے سرکاری یا پرائیویٹ نوکری نہیں ملی۔ چند ہوم ٹیوشنز پڑھاتا ہوں جن سے ملنے والی ''رقم'' سے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ گزر بسر ہو رہی ہے۔ والد صاحب کو فوت ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ بڑی روزینہ بی اے جبکہ اس سے دو سال چھوٹی مرینہ ایف اے کر رہی ہے۔ چونکہ والد صاحب ایک پرائیویٹ فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے اس لیے ان کی وفات کے بعد پنشن کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ میری والدہ علاقے کی مشہور اور ماہر درزن تھیں اور دور دراز سے عورتیں ان سے اپنے کپڑے سلوانے آتی تھیں۔ میری امی کے ہاتھ میں غضب کی صفائی تھی۔ ان کی سلائی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ہمارا گھر اپنا تھا۔ اس کی صفائی ستھرائی پر امی اتنی توجہ دیتیں کہ اس کے تمام عیب چھپ جاتے اگر کرائے کا ہوتا تو نجانے کیا ہوتا۔

ہمارا گھر کافی پرانا تھا لیکن صاف ستھرا اور ہمارے لیے جنت سے کم نہیں تھا۔ اس گھر سے ہماری خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔

میں بھی نوکری کی تلاش میں تھا۔ میں نے مختلف اداروں اور اسکولوں میں اپلائی کیا ہوا تھا لیکن کسی طرف سے خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس فیکٹری میں بھی اپلائی کیا تھا جہاں میرے ابو ملازمت کرتے تھے لیکن انہوں نے یہی کہا تھا کہ ابھی جگہ نہیں ہے۔ جیسے ہی کوئی جگہ بنی تو مجھے ملازمت پر رکھ لیا جائے گا۔

ہر انسان میں مختلف عادات ہوتی ہیں۔ کسی میں بری تو کسی میں اچھی۔ اچھی یا بری عادات کی وجہ سے ہی انسان پہچانا جاتا ہے۔ مجھ میں بھی بری عادات ہیں تو اچھی عادات بھی ہیں۔ میں سگریٹ نوشی، مے نوشی اور کئی برائیوں سے دور ہوں۔ یہاں تک کہ برے دوستوں کی بری صحبت سے بھی دور ہوں البتہ ایک برائی مجھ میں ہے۔

میری بری عادت یہ ہے کہ دوسرے ہینڈسم نوجوانوں کی طرح مجھے بھی لڑکیوں کے سامنے ''ہیرو'' بننے کا بے حد شوق ہے۔ میں بھی خطرناک سے خطرناک کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ کوئی لڑکی مجھ سے امپریس ہو کر مجھے اپنا دل دے دے یا میرا دل لے لے۔ جوڈو کراٹے سیکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں سب میں نمایاں رہوں، منفرد نظر آؤں۔ بلیک بیلٹ ہولڈر بننے کی وجہ بھی یہی ایک نکتہ تھا۔

میرے پاس ایک موٹر بائیک ہے۔ ہے تو پرانی لیکن بے حد اچھی اور تیز رفتار۔ میں روزانہ اسے ''چمکانے'' کی ناکام کوشش کرتا ہوں لیکن بات وہی ہے کہ گیدڑ اگر شیر کی کھال پہن لے تو وہ شیر نہیں بن جاتا وہ گیدڑ ہی رہتا ہے۔ یہی حال میری موٹر سائیکل کا ہے۔ میں اسے جتنا چمکانے کی کوشش کرتا ہوں وہ ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے جیسی تھی۔ اس کے رنگ و روغن میں معمولی سا فرق بھی نہیں آتا۔ جہاں کہیں مجھے اسکول اور کالج سے گھروں کو جاتی رکشے میں بیٹھی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں تو میں رکشے کے پیچھے موٹر بائیک لگا دیتا ہوں۔ پھر جیسے ہی مجھے موقع ملتا ہے تو میں لڑکیوں کو امپریس کرنے کے لیے ون ویلنگ شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے ون ویلنگ کرتے دیکھ کر لڑکیاں انگشت بدنداں رہ جاتی ہیں۔ کئی ایک کی تو آنکھیں تک باہر نکل آتی ہیں اور میں ان کی اس حالت پر محظوظ ہوئے بنا نہیں رہتا۔ آس پاس کے کچھ لوگ حیرت اور غصے سے مجھے دیکھتے ہیں لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میرا مقصد تو لڑکیوں کو امپریس کرنا ہوتا ہے لیکن شومئی قسمت، میرے اس کرتب سے اب تک کوئی بھی لڑکی امپریس نہیں ہوئی اور نہ ہی مجھے اپنا ''دل'' دینے کا اشارہ کیا حالانکہ میں شکل و صورت سے بھی ''ہیرو'' سے کم دکھائی نہیں دیتا۔ یہ میرا اپنا دعویٰ ہے۔ دوسرے میرے بارے میں کیا کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے کبھی معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

ایک روز میں ہوم ٹیوشن کے بعد گھر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں پیٹرول ختم ہو گیا۔ ریزرو میں بھی ایک قطرہ نہ تھا۔ قرب و جوار میں مجھے کوئی پمپ دکھائی نہ دیا تو میں پیدل ہی موٹر بائیک گھسیٹتے ہوئے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ جس روڈ سے میں گزر رہا تھا وہاں قدرے دور ایک پیٹرول

پمپ تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہیں سے پیٹرول ڈلوا کر گھر کی طرف نکل جاؤں گا۔

میں اس وقت ایک مارکیٹ سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک کار کے پچھلے پہیے کے قریب پڑے ایک ہینڈ بیگ پر ٹھہر گئی اور میں چونک کر رک گیا۔ ہینڈ بیگ کا کلر براؤن تھا۔ وہ قیمتی اور نیا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بائیک کھڑی کی اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے جھک کر کار کے پہیے کے قریب پڑے ہینڈ بیگ کو اٹھایا اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اس کی مالکن کو تلاش کرتا مگر پتا نہیں وہ کون سا جذبہ تھا کہ میں نے اس نکتے کی جانب سوچا بھی نہیں، دراصل اس وقت میرے ذہن میں ایک پرانی فلم کا سین تازہ ہو گیا تھا کہ ہیرو کو ایک ایسا ہی بیگ ملا تھا۔ وہ بیگ ہیروئن تک پہنچاتا ہے اور دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہ تھی کہ حقیقی زندگی اور فلم میں فرق ہوتا ہے۔ بس میں فلمی ہیرو بننے پر تیار ہو گیا تھا۔

ہینڈ بیگ وزن میں ہلکا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ خالی ہو۔ میں نے ہینڈ بیگ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر لٹکایا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ہینڈ بیگ واقعی خالی تھا یا اس میں کچھ تھا بھی۔ شاید وہ ہینڈ بیگ کسی خاتون سے گر گیا تھا یا اس نے اسے بے کار سمجھ کر پھینک دیا تھا لیکن ایک بات اور بھی تھی جس کی طرف میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ آج کل ہینڈ بیگ چھیننے کی وارداتیں عام ہیں۔ لڑکیاں کاندھے پر بیگ لٹکائے جا رہی ہوتی ہیں کہ اچکے چھین کر دوڑ لگا دیتے ہیں اور کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر قیمتی چیزیں نکال کر بیگ کو پھینک دیتے ہیں۔ اگر اس بیگ والی کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا ہوگا تو بیگ میرے گلے کی رسی بن سکتا تھا۔

کافی دور ویران جگہ پر پہنچ کر میں نے موٹر بائیک کھڑی کی اور ہینڈل سے ہینڈ بیگ اتار کر اسے کھول کر جائزہ لینے لگا۔ ہینڈ بیگ میں سوائے ایک آئی ڈی کارڈ اور چند کاغذات کے کچھ نہیں تھا۔ میں نے آئی ڈی کارڈ پر نظر ڈالی۔ وہ کسی لڑکی کا تھا۔ لڑکی کا نام عذرا اسماعیل تھا اور آئی ڈی کارڈ کے مطابق اس کی عمر بیس سال تھی۔ لڑکی کافی خوبصورت اور متمول گھرانے کی لگتی تھی۔ اس کا گھر راوی کالونی میں تھا۔ ایسی لڑکی شکریہ ادا کرے، ایسا خواب میں کب سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے آئی ڈی کارڈ بیگ میں رکھ کر کاغذات نکالے اور انہیں چیک کرنے لگا۔ وہ کاغذات یونیورسٹی سے متعلق تھے اس لیے ان پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں نے انہیں واپس بیگ میں رکھ کر زپ بند کر دی اور کچھ سوچنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ ہینڈ بیگ اس لڑکی کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔ یقیناً اس کا یہ بیگ اس سے گر گیا ہوگا۔ اب وہ لڑکی کاغذات کی وجہ سے ازحد پریشان ہو گی۔ بیگ دیکھتے ہی وہ خوشی سے سرشار ہو جائے گی اور میرا ہاتھ تھام کر شکریہ ادا کرے گی مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس بیگ کو پہنچاتے ہی میری زندگی میں ایسی تبدیلی آ جائے گی۔

میں نے ہینڈ بیگ موٹر بائیک کے ہینڈل پر لٹکایا اور پھر اسے گھسیٹتے ہوئے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے دور سے فلنگ اسٹیشن دکھائی دیا تو میں نے طویل سانس لیتے ہوئے شکر ادا کیا۔ بائیک میں پیٹرول ڈلواتے ہی میں راوی کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب راوی کالونی پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

راوی کالونی کافی وسیع تھی۔ وہاں زیادہ تر امیر طبقے کی کوٹھیاں تھیں اور ہر کوٹھی خوبصورتی اور شاندار طرز تعمیر میں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ میں مطلوبہ کوٹھی تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور بالآخر ایک شاندار اور جدید انداز کی بنی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جس کے جہازی سائز گیٹ کے ساتھ ستون پر ''اسماعیل شاہد'' کے نام کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔

میں نے بائیک ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور ہینڈ بیگ اتار کر جہازی سائز گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت ذہن کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔ ''بھائی میاں، عقل سے کام لو، اگر یہ بیگ کسی اسنیچر نے چھینا ہے اور قیمتی چیزیں اپنی جیب میں منتقل کر کے اسے پھینک دیا ہے تو بیگ کے مالک کا شک تم پر جائے گا۔ وہ قیمتی چیزوں کا مطالبہ کر سکتی ہے۔''

میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر کال بیل بجائی تو چند لمحوں کے بعد ذیلی دروازہ کھلا اور ایک لڑکی دکھائی دی جس نے اپنے کانوں پر ہینڈ فری لگایا ہوا تھا اور اس کے بائیں ہاتھ میں اینڈرائیڈ فون تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کا آئی ڈی کارڈ میں نے دیکھا تھا۔ یعنی عذرا اسماعیل۔

''ایک منٹ، میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔'' عذرا

اسماعیل نے کہا اور کال کاٹ دی پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

''السلام علیکم۔'' میں نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ فرمایئے۔ کس سے ملنا ہے؟'' عذرا اسماعیل نے استفہامیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ لہجے میں نرمی اور بات کرنے کا سلیقہ تھا اس لڑکی میں۔

''میرا نام علی حسن ہے۔ وہ۔ وہ میں.....'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا اور مڑ کر اپنی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کے ہینڈل کے ساتھ لٹکے ہینڈ بیگ کو اتارا اور مڑ کر عذرا اسماعیل کی طرف دیکھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ہینڈ بیگ دیکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

''میں یہ آپ کا بیگ دینے آیا ہوں۔'' میں نے بیگ عذرا اسماعیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تھینک گاڈ۔'' عذرا اسماعیل نے بیگ لیتے ہوئے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ کو کہاں سے ملا؟''

میں نے اسے بتا دیا کہ اس کا ہینڈ بیگ مجھے مون مارکیٹ کے باہر ایک کار کے قریب پڑا ہوا ملا تھا۔

عذرا اسماعیل کی خوشی دیدنی تھی اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان کوئی بات ہوتی اسی لمحے ایک ادھیڑ عمر آدمی وہاں آ گیا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی لیکن اس عمر میں بھی وہ صحت مند اور چاق و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کمان کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ اس کا سر درمیان سے بالوں سے بے نیاز تھا البتہ سائیڈوں پر بال موجود تھے۔ اس نے سفید رنگ کا سوٹ اور کالے رنگ کی واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ بارعب شخصیت کا مالک تھا۔

''بابا۔ یہ دیکھیں۔ میرا بیگ مل گیا!'' عذرا اسماعیل نے اسے بیگ دکھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس کا باپ اسماعیل شاہد ہے۔

''کہاں سے ملا؟''

''مارکیٹ کے باہر۔''

''آئی تھنک، جہاں میں نے کار پارک کی تھی وہیں گر گیا تھا۔ یہ اس نوجوان کو ملا تو یہ مجھے دینے آیا ہے۔'' عذرا اسماعیل نے جواب دیا۔

''ہونہہ۔'' بارعب شخص نے ہنکارا بھرا۔

''آپ کا بے حد شکریہ۔'' عذرا اسماعیل نے اس بار میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہ بیگ لا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ بھی یہی کرتا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

میں کہہ کر مڑنے ہی لگا تھا کہ اسماعیل شاہد کی بارعب آواز گونجی۔ ''رکو بیٹا۔''

میں نے رک کر ان کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم نے ہماری بیٹی کا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے اس لیے تمہیں چائے پیئے بغیر تو نہیں جانے دیں گے نا۔''

یہ بات اسماعیل شاہد نے مسکراتے ہوئے کہی وہ باتیں مسکرا کر نرم لہجے میں کر رہا تھا مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس کے انداز میں مصنوعی پن محسوس ہو رہا تھا پھر بھی میں نے انکار نہیں کیا۔ میں نے اپنی بائیک کوٹھی کے پورچ میں کھڑی کی اور اسماعیل شاہد کی رہنمائی میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ عذرا اسماعیل ہم سے پہلے ہی اندر چلی گئی تھی شاید وہ ملازمہ کو چائے بنانے کا کہنے گئی تھی۔

''بیٹھو۔'' اسماعیل شاہد نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں بیٹھ گیا اور ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم خاصہ وسیع اور خوبصورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ جتنا بڑا ڈرائنگ روم تھا اس سے چھوٹا ہمارا مکان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈرائنگ روم کی ہر چیز مجھے مرعوب کر رہی تھی۔ اسماعیل شاہد میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے لیکن نجانے ان کی شخصیت میں کیسا سحر، رعب و دبدبہ تھا جو مجھے مرعوب کر رہا تھا۔

''کیا کرتے ہو؟'' اسماعیل شاہد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں ایم ایڈ کر رہا ہوں اور ہوم ٹیوشنز پڑھاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں سوچ کر آیا تھا کہ میں لڑکی کے سامنے خود کو امیر کبیر ثابت کروں گا مگر پتا نہیں اس شخص میں اس کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے سچ اگل دیا۔

''والد کیا کرتے ہیں؟''

''جی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''ہونہہ۔ سن کر افسوس ہوا۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔ ''کیا ہوم ٹیوشنز پڑھانے سے گھر کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں؟''

''میں جاب تلاش کر رہا ہوں۔ کئی اسکولوں میں اپلائی کیا ہوا ہے۔ انشاء اللہ کسی نہ کسی اسکول میں جاب مل ہی جائے گی۔''

''ہونہہ۔'' انہوں نے ایک بار پھر ہنکارا بھرا۔ وہ بولے۔ ''اگر میں تمہیں جاب کی آفر کروں تو کیا تم قبول کرو گے؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''جاب۔'' میں نے کہا۔ میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ ''جی، بالکل کروں گا۔'' اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ نوکریاں یوں ریوڑیوں کی طرح بانٹی نہیں جاتیں۔

''ہونہہ۔'' انہوں نے ہنکارا بھرا اور پھر خاموش ہو گئے۔ شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ میں استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''میرا سرکس ہے۔ ایشین سرکس۔'' چند لمحوں کے بعد وہ گویا ہوئے۔ ''سرکس کے بارے میں تو تم جانتے ہو گے؟''

''جی۔ میں جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم سے ابھی ایک ہی ملاقات ہوئی ہے پھر بھی میرا تجربہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک ایماندار لڑکے ہو اور مجھے ایک کیشئر کی ضرورت ہے جو ایماندار ہو۔'' اسماعیل شاہد نے دوبارہ کہا۔ ''کیا تم کیشئر کی جاب کرو گے؟''

''جی، میں کروں گا۔'' میں نے ہامی بھر لی۔

''ہونہہ۔'' اس نے دوبارہ ہنکارا بھرا۔ ''چونکہ تم مجھے ایماندار اور اچھے کردار کے مالک لگے ہو اس لیے میں نے تمہیں آفر کی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری آفر قبول کر لی۔''

''آپ کا بے حد شکریہ۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے بیٹھے بیٹھائے نوکری مل جائے گی۔

''سیلری کتنی لو گے؟''

''جی، جو آپ مناسب سمجھیں۔''

''ہونہہ۔'' اسماعیل شاہد نے پھر ہنکارا بھرا۔ شاید ہنکارہ بھرنا ان کی عادت تھی۔ ''تمہاری سیلری بیس ہزار ہو گی لیکن ہر سال اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔''

بیس ہزار کا سن کر میں دل ہی دل میں بے حد خوش ہوا۔ یہ رقم میرے اندازے سے بہت زیادہ تھی اور زیادہ رقم کی آفر بھی ہوتی ہے جب خطرہ زیادہ ہو پھر بھی میں خوش تھا اور سوچنے لگا کہ جب میں گھر جا کر اپنی ماں اور بہنوں کو نوکری کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم چائے دے گیا اور ہم چائے پینے کے دوران بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسماعیل شاہد نے بتایا کہ ان دنوں ان کا سرکس ملتان میں ہی لگا ہوا ہے لیکن ہر تین ماہ کے بعد سرکس دوسرے شہر منتقل ہو جاتا ہے اور مجھے بھی سرکس کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔ میں جانتا تھا کہ امی مجھے بڑی مشکل سے اجازت دیں گی کیونکہ وہ نہیں چاہتیں کہ میں ان کی نظروں سے دور رہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں گھر میں واحد مرد ہوں۔

جب میں روانہ ہونے لگا تو اسماعیل شاہد نے مجھے ایک وزیٹنگ کارڈ دیا اور کل صبح نو بجے دفتر پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا کہ موسیٰ آگ لینے گئے اور پیغمبری مل گئی۔

وزیٹنگ کارڈ اسماعیل شاہد کا تھا اور بیک سائیڈ پر قاسم منیر لکھا ہوا تھا۔ اسماعیل شاہد نے مجھے ہدایت کی تھی کہ دفتر پہنچ کر میں قاسم منیر سے مل لوں۔ وہ اسے فون کر دیں گے۔

گھر پہنچ کر رات کے کھانے کے بعد ہم ''ڈرائنگ روم'' میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کیا تھا وہ ایک چھوٹا سا برآمدہ ٹائپ تھا جسے ہم نے ڈرائنگ روم کا درجہ دے دیا تھا۔ سب وہیں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ ٹی وی بھی وہیں رکھا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ ہم سب وہیں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتے تھے۔ اس وقت بھی روزینہ اور مرینہ دونوں بہنیں ایک ساتھ جڑی ٹی وی دیکھنے میں مگن تھیں۔ ان کی پسند کا کوئی ڈراما چل رہا تھا اور انہوں نے آواز کافی بلند کر رکھی تھی۔ البتہ امی کسی گہری سوچ میں تھیں۔ نجانے وہ کیا سوچ رہی تھیں۔ وہ ماں تھیں اور ماں میں وہ تمام باتیں ہوتی ہیں جو خدا کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو پیدا کرتا ہے اور ذریعہ ماں بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے اور بچوں تک رزق ماں پہنچاتی ہے۔ ماں کے اندر مامتا کا سمندر بہتا ہے اور خدا بندے سے ستر ماؤں جتنی محبت کرتا ہے۔ خدائی صفات کا حصہ ہونے کی وجہ سے ماں اولاد پر آنے والی مصیبت کو بھی وقت سے پہلے بھانپ لیتی ہے۔

''روزینہ!'' میں نے چائے کی چسکی لینے کے بعد روزینہ سے مخاطب ہو کر کہا تو اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

''جی بھائی؟''

''ٹی وی کی آواز کم کر دو۔ مجھے امی سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ٹی وی کی آواز قدرے کم کر دی۔

''امی!'' میں نے امی کو مخاطب کیا۔

''ہاں بولو۔'' امی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''امی!'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نوکری مل گئی ہے۔''

میری اس بات پر سب بے اختیار چونک پڑے۔

''نوکری۔'' یہ بات مرینہ نے کہی تھی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی کا عنصر تھا۔

''کہاں تم نے تو بتایا ہی نہیں۔'' امی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''آج ملی ہے۔'' میں نے کہا اور پھر انہیں ساری بات بتا دی۔ میری بات سن کر امی پریشان ہو گئیں جبکہ میری بہنیں خوش تھیں۔

''اب تم سرکس میں کام کرو گے!'' امی نے حیرت بھری آواز میں کہا تو میں ہنس پڑا۔

''امی! میں سرکس میں کام نہیں کروں گا۔''

''تو۔۔۔''

''میں بطور کیشئر جاب کروں گا۔'' میں نے ان کی الجھن دور کرنے کی کوشش کی۔ میری بہنیں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔

''لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔'' امی نے بدستور الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر تین ماہ بعد تم دوسرے شہر میں چلے جاؤ گے۔''

مجھے یہی بات کھٹک رہی تھی اور امی کا خدشہ بھی درست تھا۔ ظاہر ہے وہ میری ماں تھیں۔ ایک ماں بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا لخت جگر تین ماہ کے لیے اس کی نظروں سے دور ہو جائے۔ میں اپنی ماں کے احساسات سمجھ سکتا تھا لیکن مجھے جاب کی اشد ضرورت تھی۔ میں اپنی بہنوں اور ماں کی محرومیاں ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری ماں لوگوں کے کپڑے سینے چھوڑ کر آرام کرے۔

''امی!'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ساری زندگی سرکس میں نوکری تھوڑی کرنی ہے۔ جیسے ہی مجھے کوئی اچھی اور معقول جاب مل گئی تو میں یہ چھوڑ دوں گا۔ پلیز امی۔ مان جائیں نا۔''

میرے ملتجیانہ لہجے سے امی چند لمحے خاموش بیٹھی مجھے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

''ٹھیک ہے۔'' امی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔''

میں اور میری بہنوں نے بیک وقت آمین کہا۔ میں خوش ہو گیا تھا کہ امی نے میری بات مان لی تھی۔

''شکریہ امی!''

''بھیا! خوشی کے اس موقع پر مٹھائی تو بنتی ہے۔'' روزینہ نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی لے آتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر میں گھر سے نکل کر سویٹ شاپ جا پہنچا جو ہمارے گھر کے قریب ہی واقع تھی۔

☆.....☆

اگلے روز میں اپنی بائیک پر سوار ہو کر نو بجنے سے پانچ منٹ پہلے ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ میدان کے چاروں طرف ٹینٹ لگے ہوئے تھے اور ایک سائیڈ پر داخلی دروازہ بنایا گیا تھا۔ چونکہ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اس لیے وہاں سرکس دیکھنے والے موجود نہیں تھے۔ میں نے داخلی دروازے پر پہنچ کر دیکھا تو وہاں ایک بڑا سا بینر لگا ہوا تھا جس پر سرکس شروع ہونے کے اوقات، ٹکٹ ریٹ درج تھے اور ساتھ ہی وہ آئٹمز بھی لکھے ہوئے تھے جنہیں لوگ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ سرکس دن کے بارہ بجے سے شام سات بجے تک جاری رہتا ہے۔

داخلی دروازے پر دو لڑکے موجود تھے جو میرے ہی ہم عمر تھے البتہ ان دونوں کی رنگت گندمی تھی اور انہوں نے جوکروں جیسے لباس پہنے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے بائیک ایک سائیڈ پر کھڑی کر کے لاک کی اور دونوں لڑکوں کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے قاسم منیر صاحب سے ملنا ہے۔'' قریب جا کر میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کیا صاحب آپ کو جانتے ہیں؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے اسماعیل شاہد صاحب نے بھیجا ہے۔'' میں نے کہا تو ایک لڑکا مڑ کر اندر چلا گیا اور میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں نوجوان لڑکوں کے علاوہ کئی لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر چلتی پھرتی دکھائی دیں۔ تھوڑی دیر

کے بعد لڑکا واپس آ گیا۔

''آئیں، صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' لڑکے نے کہا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ لڑکا مجھے ایک بڑے سے خیمے کے پاس لے گیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کر کے خود واپس چلا گیا۔ میں خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ خیمہ اندر سے کسی دفتر کے انداز میں سجایا گیا تھا۔ ایک میز کے پیچھے کرسی پر ایک ادھیڑ عمر نوجوان بیٹھا ہوا تھا جب کہ اس کے دائیں بائیں دو خوبصورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

قاسم منیر کا آدھا سر بالوں سے عاری تھا جبکہ اس کے سر کے دائیں بائیں بال جھالروں کی صورت میں موجود تھے۔ وہ شکل وصورت سے خرانٹ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے دائیں گال پر کٹ کا چھوٹا سا نشان تھا جو کسی چاقو کے وار کا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں لڑکیاں بھی گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

''رات اسماعیل شاہد صاحب کا فون آیا تھا۔'' جب میں کرسی پر بیٹھ چکا تو قاسم منیر نے بات کا آغاز کیا۔

''جی۔'' میں نے صرف اتنا کہا۔

''اسماعیل صاحب تمہارے کیا لگتے ہیں؟''

''جی..... کچھ نہیں۔''

''کیا کسی سے سفارش کرائی ہے نوکری کے لیے؟''

''جی..... نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے مجھے خود نوکری کی آفر کی تھی۔''

''حیرت ہے۔ نہ جان نہ پہچان۔ اسماعیل صاحب نے تمہیں نوکری پر رکھ لیا؟'' قاسم منیر نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نجانے وہ کیا سمجھ رہا تھا یا وہ کیا سمجھنا چاہتا تھا۔ تاہم میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''خیر، اسماعیل صاحب نے تمہیں بھیجا ہے اس لیے میں تمہیں نوکری پر رکھنے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ آج سے تمہاری ڈیوٹی شروع۔ چار گھنٹے کے بعد سرکس شروع ہونے والا ہے۔ تمہیں دو گھنٹے بعد ڈیوٹی پر بٹھا دیا جائے گا۔''

''شکریہ۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔

''شکریہ تو اسماعیل صاحب کا ادا کرنا جنہوں نے تمہیں نوکری دی ہے۔'' قاسم منیر نے کہا اور پھر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

میری وہاں جاب ہو گئی اور مجھے کیشئر کی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ جب سرکس کا وقت شروع ہوا تو لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ میرے ساتھ میرا اسسٹنٹ ولید لگا تھا جو ٹکٹ فروخت کرنے پر مامور تھا۔ وہ لوگوں کو ٹکٹ دے کر ان سے پیسے وصول کرتا اور پیسے میری طرف بڑھا دیتا میں ان کو جمع کرتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

مجھے وہاں جاب کرتے ہوئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ہوم ٹیوشنز پڑھانا چھوڑ دی تھیں کیونکہ اب وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ میں رات کو تھکا ہارا گھر جاتا تھا اس لیے کوئی اور کام کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

اسماعیل شاہد تک میری کارکردگی رپورٹ پہنچ رہی تھی، وہ میری ایمانداری، وقت کی پابندی سے بے حد متاثر تھے۔ انہیں میرے جیسا ہی بندہ چاہئے تھا اس لیے وہ بے فکر ہو گئے تھے۔ سرکس بھی کم کم ہی آتے تھے۔ یہاں کے سارے معاملات قاسم منیر نے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے احترام اور محتاط انداز میں گفتگو کرتا تھا جبکہ دیگر ملازمین سے اس کا رویہ حاکمانہ اور مغرورانہ تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ قاسم منیر میری جاسوسی کرتا ہے۔ بغیر سامنے آئے، چھپ چھپ کر میرے ہر کام کو نظر میں رکھتا ہے۔ شو شروع ہونے سے کچھ دیر قبل پنڈال میں جا کر ہر چیز کا جائزہ لینا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا مگر وہ اکثر ادھورا کام چھوڑ کر میرا جائزہ لینے آ جاتا تھا۔ اگر میں کسی سے فون پر باتیں کر رہا ہوتا تو وہ چھپ کر میری باتیں سنتا تھا۔ ان حرکتوں سے میں نالاں تھا مگر ایسا کوئی راستہ بھی نہ تھا کہ میں اسے ٹوکتا۔ اگر ٹوکتا تو وہ ہوشیار ہو کر یہ کام کرتا اس لیے میں خاموشی سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

سرکس میں کام کرنے والے تمام مرد و زن سے میری سلام دعا ہو گئی تھی۔ وہ سب بہت اچھے اور محنتی لوگ تھے۔ ان سب کا تعلق پاکستان کے مختلف شہروں سے تھا۔ وہ اپنے کام میں ہر فن مولا تھے۔ کوئی موت کے کنویں میں موٹر بائیک چلاتا تھا، کوئی رسی پر چلتا تھا تو کوئی شیر کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے میں یدطولیٰ تھا۔

چونکہ میرا سارا وقت کاؤنٹر پر ہی گزرتا تھا اس لیے مجھے کبھی سرکس میں ہونے والے آئٹمز دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ میں بھی ایک ایک آئٹم دیکھوں۔

خاص کر مجھے موت کا کنواں دیکھنے کا بے حد شوق تھا کیونکہ میں نے زندگی میں کبھی بھی موت کا کنواں نہیں دیکھا تھا البتہ اس کے بارے میں سنا ضرور تھا کہ موت کے کنویں میں موٹر بائیک چلانے والا اس انداز میں موٹر بائیک چلاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر لوگوں کے دل اچھل کر ان کے حلق میں آجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد خوفناک منظر ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کی بھی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ دوسروں سے سنا تھا کہ روشی نامی لڑکی نہایت خطرناک کرتب دکھاتی ہے۔ بائیک کو موت کے کنواں میں ایسے دوڑاتی ہے کہ ناظرین کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

روشی کو اللہ تعالیٰ نے خوب حسن دیا تھا۔ بالکل کانچ کی گڑیا جیسی تھی۔ کبھی کبھی میرے پاس بھی آجاتی تھی۔ اسے باتیں کرنے کا فن آتا تھا۔ گھنٹوں بھی بیٹھی رہتی تو بوریت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے کئی بار کہا بھی تھا کہ کسی دن میرا کرتب ضرور دیکھیں مگر موقع مل نہیں رہا تھا کہ ایک روز میری بہنوں روزینہ اور مرینہ نے مجھ سے فرمائش کی کہ وہ موت کا کنواں دیکھنا چاہتی ہیں۔ امی نے انہیں بہت منع کیا کہ وہاں بے حد رش ہوتا ہے اس لیے وہ نہ جائیں لیکن دونوں بضد تھیں اور بالآخر امی نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کرتا بہنیں تھیں اور انہوں نے انتہائی لاڈ اور مان بھرے انداز میں فرمائش کی تھی اس لیے میں ان کی فرمائش ٹال نہ سکا۔ میں خود تو جاب پر چلا گیا اور انہیں کہا کہ وہ دونوں دو بجے سرکس پہنچ جائیں کیونکہ اس دوران رش ذرا کم ہوتا ہے۔ میں نے انہیں ایڈریس سمجھا دیا تھا اس لیے وہ دونوں دو بجے تک سرکس پہنچ گئیں۔ انہیں لینے میں خود گیٹ پر آیا تھا۔

قاسم منیر کو میں نے آتے ہی بتا دیا تھا کہ میری بہنیں سرکس دیکھنے آرہی ہیں اس لیے مجھے تھوڑی دیر کے لیے چھٹی چاہیے تو اس نے ٹال مٹول کرنے کی بجائے ایک گھنٹے کی چھٹی دے دی۔ پھر میں نے اپنی بہنوں کے ساتھ خود بھی سرکس کے تقریباً سارے آئٹمز دیکھے۔ اس دوران میں نے مارک کیا کہ دور دور سے قاسم منیر میری بہنوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور لڑکا جو کربن کر تماشائیوں کو ہنسایا کرتا تھا وہ بھی مسلسل میری بہنوں کو نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔

میری بہنیں بہت خوش ہو رہی تھیں اور حیران بھی تھیں۔ میری حالت بھی ان سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ واقعی موت کے کنویں میں روشی کو خوفناک انداز میں بائیک چلاتے دیکھ کر میں تو حقیقتاً دہل ہی گیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد شو ختم ہونے پر میری بہنیں چلی گئیں اور میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں جس لڑکے نے فرائض انجام دیئے تھے۔ اس کا نام کرامت تھا، وہ بے حد اچھا نوجوان تھا۔ اس کا تعلق فیصل آباد سے تھا اور میٹرک پاس تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور ہم فارغ وقت اکٹھے ہی گزارتے تھے۔ یہاں تک کہ لنچ بھی ساتھ ہی کرتے تھے۔ اس نے مجھے اپنے گھر کے حالات کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کی چار بہنیں ہیں اور بھائی سب سے چھوٹا ہے۔ اس کے والد مزدور تھے اور ایک روز مزدوری کرتے ہوئے بلڈنگ کی چوتھی منزل سے گر کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ گھر بھی کرائے کا تھا اس لیے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے پڑھائی چھوڑ کر کسی کام کی تلاش شروع کر دی تھی۔ پہلے پہل تو وہ مزدوری بھی کرتا رہا تھا پھر اسے کسی نے سرکس کے بارے میں بتایا تو اس نے یہاں اپلائی کیا اور اسے ٹکٹ فروخت کرنے والی نوکری مل گئی۔ اسے کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ وہ ہر تین ماہ بعد دو چھٹیاں لے کر گھر جاتا تھا اور پھر سب سے مل ملا کر واپس آجاتا تھا۔ اس کے حالاتِ زندگی سن کر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور میں نے اسے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔

ایک مہینا پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ پہلی تنخواہ ملی تو میری خوشی دیدنی تھی۔ گھر جاتے وقت میں مٹھائی لینا نہیں بھولا تھا۔ میں نے گھر جا کر ساری تنخواہ امی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ امی بھی بے حد خوش ہوئیں اور انہوں نے مجھے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ میری بہنیں بھی خوش تھیں۔

سرکس اب ملتان سے رحیم یار خان شفٹ ہو رہا تھا۔ دو روز کے بعد مجھے بھی رحیم یار خان جانا تھا اس لیے جب میں نے امی کو بتایا تو وہ اداس ہو گئیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی اور جاب بھی تلاش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی مجھے جاب مل جائے گی تو میں سرکس کی نوکری چھوڑ دوں گا۔ میری تسلی سے امی کی ڈھارس بندھی اور انہوں نے مجھے بخوشی رحیم یار خان جانے کی اجازت دے دی۔

شام کو میں اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا تھا۔ دوستوں سے ملنے اور گپ شپ کرنے کے بعد میں جب گھر واپس آ

رہا تھا تو اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اچانک ہی آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا گئے تھے اور ساتھ ہی بجلی بھی کڑکنا شروع ہو گئی تھی۔ کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی اور میری کوشش تھی کہ میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے لوگ سرِ شام ہی اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔ گلیاں اور سڑکیں تقریباً ویران اور سنسان ہی ہو جاتی تھیں۔ سردی بھی بے حد تھی۔ میں جس روڈ پر موجود تھا وہ میرے گھر سے قدرے دور تھا اور ہو سکتا تھا کہ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بارش شروع ہو جاتی اس لیے میں نے شارٹ کٹ روڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پرانی بائیک بیچ کر نئی لے لی تھی۔ قسطوں پر لی تھی مگر قسطیں بڑی رکھی تھیں تاکہ جلد ادا ہو جائیں۔ بائیک نئی ہونے کی وجہ سے رفتار تیز تھی۔ سامنے ایک گلی تھی۔ میں نے بائیک اس گلی میں موڑی اور رفتار کچھ ہلکی کر لی۔ گلی بھی ویران و سنسان پڑی تھی۔ کہیں کہیں مرکری بلب اونگھ رہے تھے۔

میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک سامنے سے دو سائے دوڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کا رخ اسی طرف تھا جدھر سے میں آ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی بائیک کی لائٹ ان سایوں پر پڑی تو دیکھا کہ وہ مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں یکلخت یہ خیال آیا تھا کہ کہیں یہ دونوں ڈاکو نہ ہوں۔ کیونکہ آج کل بائیکس اور موبائل فون چھیننے کی وارداتیں عام تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہ دونوں ڈاکو ہوئے تو ان کے پاس ریوالور بھی ہوں گے۔ میں اگر فرار ہونے کی کوشش کروں گا تو یہ پیچھے سے مجھ پر فائر کریں گے۔ اس لیے میں ذہنی طور پر کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بالآخر دماغ نے حکم دیا کہ میں بائیک روک لوں۔ جان ہے تو جہان ہے۔ ویسے بھی میں نے کالج کے دور میں باکسنگ بھی سیکھی ہوئی تھی۔ کراٹے کی کلاس بھی لیتا رہا تھا۔ کئی مقابلے جیتے بھی تھے۔ بڑے بڑے باکسروں کو ناک آؤٹ کیا تھا لیکن ریوالوروں کے سامنے میری ساری باکسری دھری کی دھری رہ جانی تھی۔ میں نے خود کو ہمت دلاتے ہوئے موٹر بائیک ان کے قریب جا کر روک دی۔

دونوں لڑکے امیر زادے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا قد و قامت میں لمبا اور خاصا جسیم تھا جبکہ دوسرا درمیانے قد کا تھا۔ ان دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی جیسے میلوں دور سے دوڑ کر آ رہے ہوں۔ میں غائرانہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا ان کے پاس ریوالور نہیں تھے۔

"کیا تم نے کسی لڑکی کو دیکھا ہے۔" لمبے قد کے لڑکے نے پوچھا۔

"لڑکی!" میں نے تعجب بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں لڑکی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس نے سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ کئی سوال میرے ذہن میں کسمسانے لگے تھے کہ یہ کس لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کون ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں اسے کیوں تلاش کر رہے ہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شانی۔ وہ لڑکی اسی طرف آئی تھی۔" دوسرے لڑکے نے لمبے لڑکے سے کہا۔

"ہاں۔ وہ اسی طرف آئی تھی۔" لمبے لڑکے شانی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دکان کے تھلے کے نیچے بیٹھی ہوئی ہو۔"

یہ کیا ماجرہ تھا۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں غائرانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ اچانک قریبی دکان کے تھلے کے نیچے سے سفید لباس میں ملبوس کوئی نکل کر سڑک کی طرف دوڑا۔

"وہ رہی۔" شانی کے ساتھی نے چیختے ہوئے کہا تو وہ دونوں اس کی طرف لپک پڑے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ لڑکی جو کوئی بھی ہے مظلوم ہے اور ان لڑکوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے اس لیے مجھے اس لڑکی کی مدد کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے میری وجہ سے اس لڑکی کی عزت بچ جائے۔ ہر لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی تو قیمتی متاع ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوڑا چننے والے کی بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو دونوں لڑکے سفید لباس میں ملبوس لڑکی کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور اسے موڑ کر دونوں کے پیچھے بڑھ گیا۔

وہ دونوں سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے کچھ پہلے بائیک روک لی اور ان لڑکوں کی طرف دیکھا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے بائیک ایک سائیڈ پر کھڑی کر دی اور اسے بند کر کے نیچے اتر آیا۔ دونوں لڑکے میری طرف

مڑنے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" شانی نے تحکم آمیز انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ مجھے اس کا یہ لہجہ پسند نہیں آیا تھا لیکن میں ضبط کر گیا۔

"میں......" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"چلو، جاؤ یہاں سے۔" شانی کا دوست بھڑک کر بولا اور پھر وہ دونوں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"ایک بار وہ لڑکی میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" شانی جھنجلا کر بولا۔ اچانک اس کی نظر قسائی کے ایک پھٹے کی طرف پڑی تو وہ اپنے دوست کو لے کر اس طرف بڑھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور دماغ میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ یقیناً انہیں وہ لڑکی مل گئی تھی۔

میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ لڑکی واقعی قسائی کے پھٹے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ شانی اور اس کا دوست دونوں اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کھینچ لائے تھے۔ لڑکی چیخ رہی تھی۔ چلّا رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی لیکن وہ دونوں اسے ایسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے جیسے قسائی بکرے کو ذبح کرنے مذبحہ لے جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آس پاس کے گھروں سے کسی ہلچل کے آثار نظر نہیں آئے۔ عجب دنیا ہو چلی ہے کہ لوگ اب ایسے معاملات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"چپ کرو ورنہ ایک تھپڑ لگاؤں گا۔" شانی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

گلی کے کونے میں نصب کھمبے پر لگا بلب روشن تھا۔ روشنی میں مجھے لڑکی کا چہرہ تو واضح دکھائی نہیں دیا لیکن وہ بے حد ڈری ڈری سی دکھائی دی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پیروں میں جوتی بھی نہیں تھی۔ وہ شانی کی دھمکی سن کر خوفزدہ ہونے کی بجائے اور زیادہ زور زور سے چلّانے لگی۔

"بچاؤ...... بچاؤ۔"

"اس کی تو......" شانی نے ایک گندی گالی دی اور پھر اس نے لڑکی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ چٹاخ کی آواز سناٹا چیر گئی تھی۔ لڑکی اور زیادہ زور زور سے چلّانے لگی۔ وہ بدستور اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑو۔" لڑکی چلّانے کے ساتھ ساتھ مزاحمت بھی کرنے لگی۔ میں تماش بین بنا کھڑا دیکھتا رہا۔

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں لیکن پھر میرے اندر ڈھارس سی بندھی کہ میں تو باکسر ہوں۔ شانی اور اس کے دوست کے پاس ریوالور نہیں ہیں اس لیے میں انہیں آسانی سے چت کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں تیزی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو۔" قریب پہنچ کر میں نے کہا تو شانی اور اس کا دوست رک گئے اور استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی رنگت سانولی تھی۔ خوبصورت نین نقوش کی مالک تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ مترشح اور پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر اُمید کی کرن لہرا گئی۔

"مجھے بچا لو۔ خدا کے لیے مجھے ان درندوں سے بچا لو۔" لڑکی نے متوحش لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ...... یہ...... یہ مجھے اغوا...... کرنا چاہتے ہیں۔"

کچھ کچھ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ دونوں امیر زادے، آوارہ اور عیاش ہیں لیکن یہ لڑکی کون ہے اور انہیں کہاں سے ملی، اس بارے میں وہی بتا سکتی ہیں البتہ میں خطرے کی سنگینی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"اس لڑکی کو چھوڑ دو۔" میں نے کہا تو شانی اور اس کا دوست غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"کیا یہ تیری بہن لگتی ہے۔" شانی نے لڑکی کو ایک بار پھر گندی گالی دیتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" شانی نے اس لڑکی کا بازو چھوڑ کر میری طرف غلط ارادے سے آتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے قریب پہنچتے ہی مکا مارنا چاہا لیکن میں نہ صرف بجلی کی سی تیزی سے جھکائی دے گیا بلکہ میں نے یکدم سیدھا ہوتے ہی اس کے جبڑے پر ماہر ریسلر کی طرح مکا رسید کر دیا۔ شانی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بے اختیار اپنے جبڑے پر رکھ لیا تھا۔ شانی کے دوست نے اسے مکا کھاتے دیکھا تو وہ بھی طیش میں آ گیا لیکن اس نے لڑکی کا بازو نہ چھوڑا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ لڑکی دوبارہ فرار نہ ہو جائے۔

"تیری تو......" شانی گندی گالی نکالتا ہوا ارنے بھینسے کی طرح میری طرف لپکا لیکن جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اس کی ناک پر مکا رسید کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا

اٹھا اور لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی ناک سے خون کے قطرے نکل کر ٹھوڑی سے پھسلتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔

''شانی۔ شانی۔ تم ٹھیک تو ہو ناں۔'' اس کا دوست اسے پکارنے لگا۔ اچانک لڑکی نے اسے دھکا دیا اور بھاگ کر میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ بالکل فلمی سین کی طرح تھا کہ ایک لڑکا ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لیے شہدوں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر شہدوں سے بھڑ جاتا ہے۔ اس وقت بھی ویسا ہی منظر تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے لیکن یہ شوٹنگ نہ تھی بلکہ حقیقت پر مبنی مناظر تھے۔ اس لڑکی کی عزت واقعی خطرے میں پڑ جاتی اگر میں بروقت اس کی مدد کے لیے یہاں نہ پہنچتا۔ میری زندگی کی یہ پہلی اور حقیقی لڑائی تھی اس لیے میں خود کو ہیرو اور دونوں لڑکوں کو شہدے سمجھ رہا تھا۔ شانی کا دوست الجھی ہوئی نظروں سے کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی شانی کو۔

''تم جانتے نہیں ہو کہ یہ کون ہیں۔'' نوجوان نے غضبناک لہجے میں کہا۔

''میں واقعی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا تم چودھری باسط کو جانتے ہو؟'' اس نے کہا تو میں چونک پڑا۔ میں چودھری باسط کو ذاتی طور پر تو نہیں جانتا تھا لیکن میں نے اسے ایک بار اپنے حلقے میں ضرور دیکھا تھا۔ وہ سیاست کا بازیگر کہلاتا تھا۔

''ہاں۔ جانتا ہوں۔''

''یہ اس کا بیٹا ہے۔''

''تو.....''

''تم نے اس پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔ اس کا باپ تمہاری کھال اتروا دے گا۔'' شانی کے دوست نے کہا۔

''اچھا پھر وہ اس کھال کا کیا کرے گا؟'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا تو شانی کا دوست خاموش ہو گیا البتہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

''بابا تو بعد میں اس کی کھال اتارے گا فی الحال تو ابھی میں اتاروں گا۔'' شانی نے زہر خند لہجے میں کہا اور پھر اس نے اپنے لباس کی جیب سے ایک عجیب قسم کا ہلال نما ہتھیار نکال لیا۔ ایسے ہتھیار میں نے انگلش فلموں میں دیکھے تھے۔ خاص کر چائنیز اداکاروں والی فلموں میں۔ اسے پنجے پر پہن کر گھونسا مارنے کی تیکنیک سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا پھل بلیڈ سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ مقابل کی گردن اڑانے پر قادر ہوتا ہے۔ شانی کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا تھا لیکن میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ شانی گھونسا لہراتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن میں بندر کی سی پھرتی کے ساتھ پیچھے ہو گیا۔ لڑکی پہلے ہی ایک سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ میرے پیچھے ہونے کی وجہ سے شانی کا وار ناکام گیا تھا لیکن وہ رکا نہیں تھا۔ اس نے پھر مجھ پر وار کیا۔ میں نے اس بار بھی بچنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس ہتھیار کی نوک میرے بازو پر لگی اور میرے حلق سے سسکاری سی نکل گئی۔ کافی گہرا کٹ لگا تھا جس کی وجہ سے وہاں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ شانی دوبارہ مجھ پر وار کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زور سے دھکا دے دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل سڑک پر گر گیا۔ سڑک پر گرنے سے اس کے ہاتھ سے وہ ہتھیار بھی نکل کر تاریک گوشے میں چلا گیا تھا۔ اسی لمحے شانی کا ساتھی لڑکی کی طرف بڑھا تو لڑکی نے خوفزدہ ہو کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں چونکہ شانی کی طرف متوجہ تھا اس لیے میں اس کے دوست کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

لڑکی ایک طرف دوڑی چلی جا رہی تھی اور شانی کا دوست بھی اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے بڑھا لیکن عین اسی لمحے شانی نے میری ٹانگ پکڑ لی اور میں پہلو کے بل سڑک پر گر گیا۔ شانی نے میری ٹانگ انتہائی مضبوطی کے ساتھ پکڑ لی تھی۔ میں نے دوسری ٹانگ اس کے ہاتھ پر ماری تو اس نے میری ٹانگ چھوڑ دی۔ میں جلدی سے اٹھا اور شانی کے دوست کے پیچھے بڑھنے لگا لیکن لڑکی اور شانی کا دوست کافی دور چلے گئے تھے۔ میرے ذہن میں یکدم بائیک کا خیال آیا تو میں جلدی سے اپنی بائیک کی طرف بڑھا۔ بائیک پر بیٹھتے ہی میں نے کک ماری تو وہ اسٹارٹ ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔

شانی نے اٹھ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس کی دسترس سے دور نکل چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی آگے آگے دوڑتی جا رہی تھی اور شانی کا دوست اس کے قریب پہنچنے والا تھا اور کسی بھی لمحے لڑکی اس کے پنجے میں آ سکتی تھی۔ مجھے کچھ اور سجھائی نہ دیا تو میں نے چلتی بائیک پر بیٹھے بیٹھے بائیں ٹانگ لمبی کر دی۔ شانی کا دوست الجھ کر

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر پہلو کے بل گرا اور دردناک چیخ مار کر دُہرا ہو گیا۔ میں نے بائیک لڑکی کے قریب جا کر روک دی۔

''بیٹھو۔'' میں نے چیخ کر کہا تو وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر مڑ کر جلدی سے میری طرف آئی۔ اس کے بیٹھتے ہی میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔

میں نے شانی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا ہمارے پیچھے آیا تھا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ہم کافی دور نکل چکے تھے اور پھر دوسری سڑک پر پہنچتے ہی میں نے بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔

لڑکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سردی ہونے کے باوجود وہ پسینے سے شرابور تھی۔ عام طور پر بائیک پر پیچھے بیٹھنے والے بالکل چٹ کر بیٹھتے ہیں مگر وہ مجھ سے قدرے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میں اس لڑکی کو شہدوں کے پنجوں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے زخمی بازو سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ خون بھی جم چکا تھا لیکن میں ضبط کر رہا تھا۔

''شش۔ شش۔ شکریہ آپ کا۔'' لڑکی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نہ ہوتے تو.....''

''تمہارا نام کیا ہے اور تمہارا گھر کہاں ہے؟'' میں نے اس کی بات منقطع کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام ---- پروین ہے اور میں..... میں سمن آباد میں رہتی ہوں۔'' اس نے بدستور ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

''تم ان بدمعاشوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئی تھیں؟''

''وہ..... دراصل میں اپنی ماں کے ساتھ ملک اسد کے گھر کام کاج کے لیے گئی تھی۔ آج ملک اسد کی بیٹی کی مہندی تھی۔ ان کے گھر کام بہت زیادہ تھا اس لیے میری ماں مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''یہ دونوں بھی وہیں موجود تھے اور مجھے برے برے اشارے کر رہے تھے۔ میں کسی کام سے باہر صحن میں آئی تو ان دونوں نے میرے ساتھ دست درازی بھی کی۔ میں نے شور مچانے اور کسی کو بلانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی۔ میں بڑی مشکل سے ان سے جان بچا کر بھاگی تو یہ دونوں میری تلاش میں آ گئے۔ آپ میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔''

یکدم مجھے ایک خیال آیا تو میں نے ایک سائیڈ پر موٹر بائیک روک دی اور اسے نیچے اترنے کا کہا تو وہ اتر گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت ہویدا تھی۔ ٹھنڈ بہت زیادہ تھی اور اس لڑکی کے پاس دوپٹا بھی نہیں تھا اس لیے میں نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ پہن لو۔''

''لیکن.....''

''ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر تمہارے پاس دوپٹا بھی نہیں ہے۔''

پروین میری بات سمجھ گئی تھی اس لیے اس نے کوٹ پہن لیا۔ چند لمحوں کے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

''تمہاری ماں تو تمہاری غیر موجودگی میں بہت پریشان ہو رہی ہو گی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' پروین نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''پڑھی لکھی ہو؟''

''نہیں جی۔ میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں پڑھنا تو چاہتی تھی لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔''

''ہونہہ۔'' میں نے ہنکارا بھرا اور اس سے مزید سوالات کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد بوڑھے ہیں اور ایک ٹانگ سے معذور بھی ہیں۔ دو بھائی ہیں جو اس سے چھوٹے ہیں۔ وہ دونوں بھی مزدوری کرتے ہیں جبکہ اس کی ماں مختلف گھروں میں کام کاج کرتی ہے جس سے ان کی گزر اوقات ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم سمن آباد پہنچ گئے۔ میں نے اسے اس کے گھر چھوڑا اور اپنے گھر کی بجائے اپنے ایک واقف کار کے پرائیویٹ اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ پروین نے مجھے گھر آنے کا کہا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ مجھے میرا کوٹ واپس کرنا نہیں بھولی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اسپتال سے اپنے زخمی بازو کی بینڈیج کرا کر پھر گھر جاؤں ورنہ میری امی اور بہنیں مجھے زخمی دیکھ کر پریشان ہو جائیں گی۔ اسپتال سے زخمی بازو کی بینڈیج کرا کر جب میں گھر پہنچا تو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ دروازہ امی نے ہی کھولا تھا۔

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ''علی بیٹا۔ بہت دیر لگا دی ہے تم نے۔ کہاں رہ گئے تھے۔ تمہیں فون بھی کیا تھا لیکن تم نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ تمہارے دوست کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ تم

نو بجے ہی نکل گئے تھے۔"

ان کی نظر میرے بینڈیج شدہ ہاتھ پر نہیں پڑی تھی کیونکہ میں نے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں نے بائیک صحن میں کھڑی کی اور دروازہ بند کر کے امی کی طرف دیکھنے لگا۔

"امی! راستے میں موٹر بائیک خراب ہوگئی تھی اس لیے دیر ہوگئی۔" میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"فون اٹینڈ کیوں نہیں کیا تھا؟"

میں جانتا تھا جب تک امی کو تسلی بخش جواب نہیں دوں گا وہ سوالات پر سوالات کرتی رہیں گی۔ میں نے اس سوال پر بھی یہ بہانہ بنایا کہ سیل فون کی بیل سائلنٹ پر تھی اس لیے میں فون اٹینڈ نہیں کر سکا تھا۔ امی نے مجھے بہت ساری نصیحتیں کیں کہ آئندہ میں اپنا فون سائلنٹ پر نہ رکھا کروں۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے تو اس طرح مشکل بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے امی کو یقین دہانی کرائی کہ میں آئندہ اپنا فون سائلنٹ پر نہیں رکھوں گا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کوٹ اتار کر اسے ہینگر سے لٹکایا اور اپنے ہاتھ کا جائزہ لینے لگا۔ بینڈیج ہونے سے اب ٹیسیں نہیں اٹھ رہی تھیں البتہ سفید پٹی پر خون کے نشان موجود تھے۔ کٹ کافی گہرا تھا۔ میں بستر پر لیٹا شانی اور اس کے دوست کے بارے میں سوچنے لگا جو پروین کی عزت تار تار کرنے کے درپے تھے۔ آج میری کراٹے کی ٹریننگ کام آ گئی تھی۔ اگر میں نے کراٹے نہ سیکھی ہوتی تو شاید میں پروین کو ان کے چنگل سے نہ بچا سکتا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت تھی جو دوسروں کی بیٹیوں، بہنوں پر بری نظریں رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کی اپنی بھی بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی برا کرے تو ان کا کیا ردعمل ہوگا لیکن ایسا کم ہی لوگ سوچتے ہیں۔ انہیں اپنی عزتوں کی بہت پرواہ ہوتی ہے لیکن دوسروں کی عزت کو عزت نہیں سمجھتے۔ یہی حال شانی اور اس کے دوست کا تھا۔

سوچتے سوچتے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں کروٹ بدل کر سو گیا۔ صبح روزینہ نے ہی مجھے جگایا تھا۔ وہ مجھے ناشتے کے لیے جگانے آئی تھی اور جب اس نے میرے ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھی تو وہ حیران رہ گئی تھی۔

"بب۔ بھائی جان۔ یہ پٹی کیوں بندھی ہے....."

"تھوڑی سی چوٹ لگ گئی تھی۔" میں نے کہا۔

"چوٹ۔ کیسے چوٹ لگی؟" اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہاں بیٹھو میں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو روزینہ میرے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں اسے اعتماد میں لینا چاہتا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ وہ فوراً جا کر امی کو بتا دے گی۔

''مجھے زخم لگا ہے۔'' میں نے کہا تو روزینہ کا منہ حیرت اور پریشانی سے کھل گیا۔

''زخم۔'' اس نے گویا اعلان کرنے والے انداز میں کہا تو میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آہستہ بولو۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' پھر میں نے اسے مختصر طور پر بتا دیا کہ کیسے میں نے ایک لڑکی کی عزت بچاتے ہوئے دو لڑکوں سے مقابلہ کیا تھا۔ روزینہ تو منہ کھولے مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

میں نے کہا۔ ''سنو۔ امی کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ خوا مخواہ پریشان ہوں گی۔''

''اوہ۔ تو آپ نے فائٹنگ کی تھی۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل فلمی سین تھا۔ اگر تم وہاں ہوتیں تو تم خوب انجوائے کرتیں۔''

''بھائی جان۔ گہرا زخم لگا ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔'' روزینہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو.....''

''اللہ کا شکر ہے مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میں اس لڑکی کی عزت اور جان بچانے میں کامیاب رہا ہوں۔''

''بہر حال آپ آئندہ احتیاط کیجئے گا۔'' روزینہ نے کہا۔

''امی سے یہ پٹی کیسے چھپائیں گے؟''

اس نے پٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''شرٹ اور کوٹ پہن کر۔'' میں نے زخمی ہاتھ کو چھپانے کا حل نکال لیا تھا۔

''اچھا چلیں آئیں۔ ناشتا تیار ہے۔'' روزینہ نے کہا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔''

روزینہ کے جانے کے بعد میں نے شرٹ تبدیل کی اور کمرے سے نکل کر واش روم میں گھس گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا اور رحیم یار خان جانے کی تیاری کرنے لگا کیونکہ میری دوسری چھٹی تھی اور مجھے آج رات ہی رحیم یار خان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ روزینہ نے امی کو میرے زخم کے بارے میں نہیں بتایا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔ سارا دن گھر والوں کے ساتھ گزارنے کے بعد میں رحیم یار خان کے لیے روانہ ہو گیا۔

ملتان سے رحیم یار خان کا سفر چھ گھنٹے میں طے ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ چونکہ مجھے پہلے ہی قاسم منیر نے سرکس والی جگہ کا ایڈریس بتا دیا تھا اس لیے مجھے مطلوبہ جگہ پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک کھلے میدان میں سرکس سج چکا تھا۔ تھوڑا بہت کام رہ گیا تھا جسے مزدور مکمل کر رہے تھے۔

یہ تیسرے روز کی بات تھی۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھا کیش وصول کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میرا فون میز پر ہی پڑا ہوا تھا میں نے دیکھا تو اسکرین پر امی لکھا جگمگا رہا تھا۔ امی کال کر رہی تھیں۔ میں نے سیل فون اٹھایا اور یس کا بٹن پریس کر کے اسے بائیں کان سے لگا کر شانے سے سہارا دے دیا کیونکہ میرے ہاتھ میں پیسے تھے اور میں انہیں گن رہا تھا۔

''السلام علیکم امی۔'' میں نے امی کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ علی! فوراً گھر آؤ۔'' امی کے لہجے میں پریشانی چھلک رہی تھی جس کی وجہ سے میں پریشان ہو گیا اور نوٹ گننے میں مصروف میرے ہاتھ رک گئے۔

''کیا ہوا امی۔ خیریت تو ہے ناں۔'' میں نے سراسیمہ آواز میں پوچھا۔

''بیٹا! خیریت ہی تو نہیں ہے۔ تم جلدی سے آ جاؤ۔'' امی کی روہانسی آواز سنائی دی جس سے میرے دل کی دھڑکن نہ صرف تیز ہو گئی بلکہ ہاتھ میں کپکپاہٹ بھی ہوئی۔ میں نے نوٹ میز پر رکھے اور فون پکڑ لیا۔

''امی! کچھ بتائیں تو سہی۔ آخر ہوا کیا ہے؟''

''روزینہ..... روزینہ کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔'' امی نے رک رک کر کہا تو میں یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اوہ۔ یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''ہاں بیٹا۔ یہ سچ ہے۔ وہ صبح کالج گئی تھی۔ سہیلی حمیرا کے ساتھ گھر آ رہی تھی کہ ایک وین میں سوار لڑکوں نے اسے اغوا کر لیا۔ جب کہ حمیرا کو چھوا تک نہیں، صرف اسے کھینچ کر اندر کیا اور گاڑی بھگا لے گئے۔ بیٹا! جلدی آ جاؤ۔''

اس کے بعد امی کی آواز بند ہو گئی شاید وہ شدت غم سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا لیکن امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری پریشانی یکدم بڑھ گئی تھی اور مجھے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔

''بھائی جان! امی بے ہوش ہوگئی ہیں۔'' چند لمحوں کے بعد مرینہ کی آواز سنائی دی۔

''امی کا خیال رکھو، میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔

''کیا ہوا ہے علی صاحب؟'' میرے اسسٹنٹ ولید گل نے پوچھا۔

''میرے گھر پرابلم ہوگئی ہے اس لیے مجھے فوری جانا ہو گا۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جارہا ہوں اگر قاسم صاحب میرا پوچھیں تو بتا دینا۔''

''قاسم صاحب اپنے آفس میں ہوں گے آپ انہیں بتاتے جائیں۔''

''نہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔'' میں نے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر ولید گل کی کوئی بات سنے بغیر ہی وہاں سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے خارجی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سرکس سے نکلتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر فوراً بس اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب میں اڈے پر پہنچا تو ایک وین ملتان جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد وین ملتان کے لیے روانہ ہوگئی۔ میرا ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط گزر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر فوراً ہی اپنے گھر پہنچ جاتا۔

وین تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی اور اس سے زیادہ تیز رفتاری سے میرا ذہن سوچنے میں مگن تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکے کون ہوسکتے ہیں جنہوں نے میری بہن روزینہ کو دن دہاڑے اغوا کیا ہے۔ سوچتے سوچتے اچانک میرا ذہن شانی کی طرف چلا گیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگر یہ شانی کی کارستانی تھی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑنے والا لیکن سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ شانی کو میرے، میری فیملی اور میرے گھر کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ وہ تو مجھے نہیں جانتا اور نہ ہی اسے میرے گھر کا پتا معلوم ہوگا۔ اس سوچ کی وجہ سے میرا دماغ الجھ گیا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو وین کو رحیم یار خان سے روانہ ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنی بہن کی عزت اور اس کی سلامتی کی دعائیں کررہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے کو بے تاب تھے لیکن میں نے ضبط کیا ہوا تھا۔ میرے وین میں بیٹھے لوگوں پر نظر دوڑائی تو سب اپنی اپنی دنیا میں مست تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

شام ساڑھے سات بجے وین ملتان پہنچی۔ اڈے سے نکلتے ہی میں نے ٹیکسی لی اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ بیس منٹ کے بعد گھر پہنچا تو وہاں میرے رشتے دار، ہمسائے اور روزینہ کی سہیلی حمیرا بھی اپنی فیملی کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ امی کی حالت خراب تھی وہ نڈھال کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ میں جب امی سے ملا تو وہ مجھ سے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

''علی! میری بیٹی کو تلاش کرو۔ نجانے وہ کہاں ہے؟'' امی نے روتے ہوئے کہا۔ میں امی کو تسلی دینے لگا۔

''امی! آپ تسلی رکھیں۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔''

''روزینہ۔ میری بچی۔''

میں نے امی کو چارپائی پر بٹھایا اور روزینہ کی سہیلی حمیرا کی طرف دیکھنے لگا جو اسی کی ہم عمر تھی۔ میں نے اس سے اغوا کاروں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور روزینہ کالج سے پیدل ہی گھر کی طرف آرہی تھیں کہ اچانک سفید رنگ کی ایک وین ان کے قریب آکر رکی اس کے دروازے کھلے اور دو لڑکے باہر نکلے۔ انہوں نے روزینہ کو پکڑ کر وین میں ڈالا اور پھر وین تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ حمیرہ نے شور مچایا تھا اور اس کے شور پر وہاں کافی لوگ جمع ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی وین کے پیچھے جاتا وین رش میں کہیں گم ہوگئی تھی، پھر وہ میرے گھر آئی اور اس نے امی اور مرینہ کو روزینہ کے اغوا کی خبر دی اور امی نے مجھے فون کیا۔

میرے رشتے دار اور ہمسائے مجھے تسلیاں دے رہے تھے لیکن مجھے ایک پل چین نہیں آرہا تھا۔ میں اپنے ہمسائے فاروق کے کہنے پر اس کے ساتھ متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ تھانے میں ایس ایچ او تو موجود نہیں تھا اس لیے ہم اے ایس آئی کے کمرے میں آگئے۔

''فرمایئے۔ کس لیے آئے ہیں؟'' اے ایس آئی نے ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں رپورٹ درج کرانے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیسی رپورٹ؟'' اے ایس آئی نے کہا۔ ''کیا کسی نے تمہیں لوٹ لیا ہے؟''

''نہیں۔ میری بہن اغوا ہوگئی ہے۔'' میں نے رک کر جواب دیا۔ ''آپ رپورٹ درج کرکے اسے تلاش کریں

اور بازیاب کرائیں۔"

اے ایس آئی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر رجسٹر کھولا اور رپورٹ درج کرنے لگا۔

"آپ کی بہن کا نام؟"

"روزینہ۔"

"والد کا نام؟"

"حسن کامران۔"

"لڑکی کی عمر؟"

"اکیس سال۔"

"کب اغوا ہوئی ہے؟"

"آج دوپہر میں۔"

"کس نے اغوا کیا ہے؟" اے ایس آئی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ کیا آپ اغوا کاروں کو جانتے ہیں؟"

"نہیں۔ اسے نامعلوم لڑکوں نے اغوا کیا ہے۔"

"ہونہہ۔" اے ایس آئی نے ہنکارا بھرا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی بہن کو اغوا کیا گیا ہے؟"

"کیا مطلب۔" میں چونکا۔

"مطلب، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بہن کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر وکر....."

اس سوال پر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور اپنے..... ہونٹ بھینچ لیے لیکن اس میں اے ایس آئی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایسے سوالات پوچھنا تو اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ وہ ہر رخ سے تفتیش کرتے تھے۔

"نہیں جناب۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔" اے ایس آئی نے پھر ہنکارا بھرا۔ "کیا آپ کی کسی سے کوئی دشمنی؟"

"نہیں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"اچھی طرح سوچ لیں کیونکہ بعد میں پتا چلتا ہے کہ کسی دشمن نے ہی ایسی کارروائی کی ہوتی ہے۔"

"نہیں جناب۔ آپ میرا یقین کریں میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "وقوعہ کیسے ہوا ہے؟"

میں نے حمیرا کی بتائی ہوئی بات دُہرا دی جو اے ایس آئی نے اپنے رجسٹر میں درج کر لی۔ آخر میں اس نے مجھ سے میری بہن کی تصویر مانگی تو میں نے وہ بھی دے دی کیونکہ گھر سے نکلتے وقت میں نے اس کی تصویر اٹھالی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "آپ جائیں ہم آپ کی بہن کی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے آپ بھی کوشش کرتے رہیں۔ اگر آپ کی بہن مل جائے تو ہمیں اطلاع کر دیجئے گا۔"

اسی وقت ایس ایچ او اندر داخل ہوا اور میری طرف دیکھتا ہوا اے ایس آئی کی طرف بڑھ گیا۔

میں اور فاروق تھانے سے نکل آئے اور روزینہ کو تلاش کرنے لگے۔ ہم نے اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی لیکن ہم روزینہ کو تلاش نہ کر سکے۔ امی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نہ کچھ کھا رہی تھیں اور نہ ہی کچھ پی رہی تھیں۔ وہ روزینہ کا روگ دل پر لگا بیٹھی تھیں۔ ظاہر ہے وہ ماں تھیں۔ رشتے دار بھی وہیں موجود تھے اور وہ سب روزینہ کی بخیریت واپسی کے لیے دعا گو تھے۔ امی نے جب مجھے دیکھا تو وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔

"علی..... مل گئی روزینہ۔ لے آئے ہو اسے۔" امی ہذیانی انداز میں مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے لیکن خاموش رہا۔ ظاہر ہے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

امی نے ایک بار پھر مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "تم بول کیوں نہیں رہے۔ روزینہ کہاں ہے۔ بتاؤ۔ کہاں ہے روزینہ۔"

"امی!" میں نے لب کشائی کی۔ "میں نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ آپ، آپ تسلی رکھیں۔ مل جائے گی۔"

یہ سنتے ہی امی کی حالت مزید بگڑ گئی۔ میں نے ان کی آنکھیں بند ہوتے دیکھا تو جلدی سے انہیں تھام لیا ورنہ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر جاتیں۔ رشتہ دار خواتین جلدی سے آئیں اور امی کو سہارا دے کر چارپائی پر لے گئیں اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ امی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا لیکن میں مجبور اور بے بس تھا۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں خود بھی بے حد الجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور روزینہ کو کہاں تلاش کروں۔ ایک ہی سوال بار بار میرے دماغ میں گونجتا تھا کہ روزینہ کو اغوا کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔ کئی بار میرا ذہن شائی کی طرف بھی

ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے بیٹے کے بارے میں بھلا جانتے ہی کیا ہیں۔ وہ انتہائی کمینہ اور بدقماش ہے۔''

میری اس بات پر چودھری باسط کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا تاہم وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو لڑکے! تم میرے سامنے میرے بیٹے کے بارے میں مغلظات بک رہے ہو۔ اگر تم نے اب ایک لفظ بھی مزید کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم ابھی کے ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔''

اس کی دھمکی نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا اور نہ میں خوفزدہ ہوا۔ میں نے کہا۔ ''لگتا ہے آپ اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اس کے کرتوتوں کا پتا ہے۔''

چودھری باسط ہونٹ بھینچے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کیا چل رہا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ البتہ میری بات سن کر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔

''کیا کرتوت ہیں میرے بیٹے کے۔ بولو۔'' چودھری باسط پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

''تین روز قبل اس نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہوں اور میں نے ہی اس لڑکی کو شانی اور اس کے دوست کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ شاید شانی کو مجھ سے یہی پرخاش تھی اور اس نے مجھ سے بدلا لینے کے لیے میری بہن کو اغوا کر لیا۔ آپ اسے بلائیں اور اس سے پوچھیں کہ میری بہن کہاں ہے۔''

چودھری باسط ہونٹ بھینچے میری طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے مڑ کر ایک گارڈ سے کہا۔ ''شانی کو بلواؤ۔ فوراً۔''

''جی سر۔'' ایک گارڈ نے کہا اور تیزی سے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا گارڈ بھی ہماری گفتگو سن کر ہنگشت بدنداں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلا گارڈ واپس آ گیا اور کہا۔ ''سر! فون کر دیا ہے۔''

چودھری باسط نے جواباً ہنکارا بھرا اور ہم شانی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد شانی باہر آیا۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے البتہ چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔ اس نے نائٹ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی اور میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی خود بخود بھنچ گئی لیکن میں نے خود پر ضبط کر لیا۔ چودھری باسط بھی کینہ توز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شانی نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر وہ چودھری باسط سے مخاطب ہوا۔ ''بابا! آپ نے بلایا ہے؟ خیریت تو ہے ناں۔''

چودھری باسط نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

شانی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ بولا۔ ''نہیں بابا۔ میں اسے نہیں جانتا۔''

''لیکن یہ کہتا ہے کہ تم نے اس کی بہن کو اغوا کیا ہے؟''

شانی یکدم چونک پڑا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس کی بہن کو اغوا کیا ہے؟''

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر

DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI

پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوز اور فلیٹ
کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام

ریاض حسین

ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

ٹھوکر کیا اثر ڈالتی۔ صرف ہلکی سی آواز ہی گونجی تھی پھر میں نے ذیلی دروازے کو زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میں بلند آواز میں چیخا۔ ''شانی! باہر نکلو۔ کمینے، رزیل انسان۔ باہر نکلو۔''

دونوں سیکیورٹی گارڈ بھی بلاخیزی سے میری طرف دوڑے اور مجھے پکڑ کر انہوں نے گیٹ سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت مجھ میں جیسے طاقت سی بھر گئی تھی۔

ان دونوں میں سے ابھی تک کسی نے اپنی بندوق مجھ پر نہیں تانی تھی۔ شاید انہیں کسی پر بندوق تاننے کا حکم نہیں تھا۔ میں نے دونوں گارڈوں کی رکاوٹ کو عبور کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک بار پھر مجھے پکڑ کر سڑک پر دھکا دینا چاہا لیکن میں نے ایک گارڈ کے سر پر اپنے سر کی ٹکر ماری تو اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ اس کا دماغ بھی جھنجھنا گیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے میرا بازو چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے۔ جیسے ہی میرا بازو آزاد ہوا تو میں نے دوسرے گارڈ کو دھکا دے دیا۔ شاید دوسرے گارڈ کو مجھ سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل سڑک پر گر گیا۔ آزاد ہوتے ہی میں تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا بلکہ میں نے گیٹ پر چڑھنے کی کوشش بھی کی لیکن گیٹ کافی بلند اور سپاٹ تھا اس لیے میری کوشش رائیگاں گئی۔

اسی اثناء میں دونوں گارڈ پھرتی کے ساتھ اٹھ کر میری طرف بڑھے اور مجھے پکڑ کر سڑک پر گرا دیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن دونوں گارڈ مجھ پر پل پڑے اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں مارنے لگے۔ ساتھ ہی ہذیان بھی بکنے لگے۔ میں ان کی ٹھوکروں سے بچنے کی حتی الوسع کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مجھے بچنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ ایک ٹھوکر میری پسلی میں لگی تو میرے حلق سے دردناک کراہ سی نکل گئی۔ اب تو وہاں نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں کا مجمع لگ گیا تھا۔ کسی میں بھی اتنی ''توفیق'' اور ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھے ان گارڈوں کی ٹھوکروں سے بچاتا یا انہیں منع کرتا۔ دونوں گارڈ مجھے اس بے دردی سے پیٹ رہے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے یہ۔'' اچانک ایک کرخت آواز گونجی تو دونوں گارڈ رک گئے۔ میں نے بھی کراہتے ہوئے دیکھا تو گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے براؤن کلر کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں قدرے گھنی اور اس کے چہرے کی مناسبت سے جچ رہی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سیل فون تھا اور وہ آنکھیں چوڑی کر کے گارڈز کو دیکھ رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگی کیونکہ میں نے اس کے پوسٹر اپنے محلے کی دیواروں پر لگے دیکھے تھے۔ وہ چودھری باسط تھا۔

''سلام صاحب۔'' دونوں گارڈوں نے ہانپتے ہوئے یکے بعد دیگرے اسے سلام کیا۔

''کون ہے یہ اور اسے کیوں پیٹ رہے ہو؟'' چودھری باسط نے سلام کا جواب نہ دیا اور پوچھا۔ میں بھی کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''صاحب جی! یہ کہتا ہے کہ اسے شانی صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ابھی سو رہے ہیں گیارہ بجے آ جانا لیکن اس نے واپس جانے کی بجائے شانی صاحب کے خلاف اول فول بکنا شروع کر دیا اور گیٹ کو ٹھوکریں ماریں۔'' ایک گارڈ نے بدستور ہانپتے ہوئے کہا تو چودھری باسط بے اختیار چونک کر میری طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں بھئی، کون ہو تم اور شانی سے کیا چاہتے ہو؟'' چودھری باسط کا لہجہ سوالیہ تھا۔

میں نے گویا بم پھوڑتے ہوئے کہا۔ ''شانی نے میری بہن کو اغوا کیا ہے۔''

شاید چودھری باسط کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یہ بات کر سکتا ہوں اس لیے اس کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات موجود تھے۔ اس نے سڑک پر کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

اس کے ساتھ ذیلی دروازے سے لان میں آ گیا۔ اندر پہنچ کر چودھری باسط سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اس نے تمہاری بہن کو اغوا کیا ہے؟''

''مجھے یقین ہے۔''

''صرف یقین سے کچھ نہیں ہوتا۔'' چودھری باسط نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''کوئی ثبوت ہے تو دکھاؤ۔''

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن مجھے یقین.....''

میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ چودھری باسط نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا۔ ''بس۔ اب خاموش ہو جاؤ اور جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے انکار میں سر

گیا تھا لیکن اس لیکن کے آگے مجھے کچھ سجھ نہیں آتا تھا بلکہ دماغ مزید الجھ جاتا تھا۔

''بھائی۔'' میں گہری سوچوں میں غرق تھا کہ مجھے مرینہ کی آواز سنائی دی۔

میں نے سر اٹھا کر مرینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔''ہاں۔''

''ناشتا کرلو۔ تم رات سے بھوکے ہو۔''

''ناشتا نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

مرینہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر مڑ کر چلی گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ دماغ میں مسلسل ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرا ذہن ایک بار پھر شانی کی طرف چلا گیا تھا اور میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روزینہ کے اغوا میں اس کا ہاتھ ہے۔ بالآخر میں نے اپنے دل کی بات مان لی اور فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

''بھائی! کہاں جارہے ہو؟'' میں بائیک لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے مرینہ کی آواز سنائی دی۔

''آرہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر میں نے بائیک گھر سے باہر نکالی اور اس پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس وقت میرے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہوگئی تھی۔ دماغ میں بس ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ اگر ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ اس اغوا میں شانی ملوث ہے اس کے چنگل سے مجھے اپنی بہن کو آزاد کرانا ہے۔ میں چونکہ چودھری باسط کا گھر نہیں جانتا تھا لیکن میں چند لوگوں سے پوچھتا پوچھتا اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس کا گھر شاداب کالونی میں تھا۔

گھر کیا تھا ایک شاندار اور پرشکوہ محل تھا جس کے در و دیوار بلند ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت رنگوں سے مزین تھے۔ جہازی سائز گیٹ کے دائیں طرف لکڑی کا ایک کیبن رکھا ہوا تھا جس کے اندر دو سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ میں نے بائیک ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور اترکر گیٹ کی طرف بڑھنے لگا تو کیبن سے ایک سیکیورٹی گارڈ نکل کر باہر آگیا۔ اس نے بڑی نال والی بندوق اپنے کاندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ وہ قدرے جسیم اور چہرے مہرے سے سخت دکھائی دیتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

''ہاں بھئی..... کس سے ملنا ہے؟'' اس نے مجھ سے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

وہ کیا پوچھ رہا ہے مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس میکنکی انداز میں جواب دیا۔''مجھے شانی سے ملنا ہے۔''

''کس سلسلے میں؟''

''ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

گارڈ مڑ کر کیبن کی طرف بڑھ گیا تو میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے کیبن کے اندر میز پر پڑے ٹیلی فون کا رسیور اٹھایا اور یکے بعد دیگرے دو نمبر پریس کردیئے۔ پھر رسیور کان سے لگا کر کال رسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''ہیلو نوراں..... کیا شانی صاحب جاگ رہے ہیں..... نہیں..... اچھا ٹھیک ہے۔'' گارڈ نے بات ختم کر کے رسیور کریڈل پر رکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''شانی صاحب ابھی سو رہے ہیں۔ تم گیارہ بجے آجانا۔''

''نہیں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا ہے۔ اسے جگاؤ۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا تو دونوں گارڈز بے اختیار چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

''تم نے سنا نہیں کہ شانی صاحب سو رہے ہیں۔'' دوسرے گارڈ نے بارعب لہجے میں کہا۔ شاید وہ مجھے اپنے لہجے سے ڈرانا چاہتا تھا لیکن اس کے لہجے کا مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی بہن کی عزت اور زندگی مقصود تھی اس لیے میں نے اس کے بارعب لہجے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود پر جبر کر کے کہا۔

''دیکھیں، میرا ابھی اور اس وقت اس سے ملنا ضروری ہے۔ برائے مہربانی آپ اسے جگائیں۔''

پہلا گارڈ غصے سے بولا۔''کیا تم پاگل ہو؟''

''ہاں میں پاگل ہوں۔'' مجھے بھی غصہ آگیا اور چیخ کر کہا۔''میں تم سے بار بار کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس سے ملنا ہے تو ملنا ہے۔ اسے جگاؤ۔''

''تمہیں کہا تو ہے کہ وہ سو رہے ہیں اور.....'' دوسرے گارڈ کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''اس کے سونے کی ایسی کی تیسی۔''

میں کیبن سے نکل کر جہازی سائز گیٹ کے ذیلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے گیٹ کے قریب جا کر زور سے ٹھوکر ماری لیکن گیٹ پر بھلا میری

''یہ کہتا ہے کہ تین روز قبل تم نے اپنے کسی دوست کے ساتھ ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے اس لڑکی کو بچایا تھا۔'' چودھری باسط نے کہا تو شانی کا رنگ فق ہو گیا۔

''نن۔ نہیں بابا۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' شانی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کسی لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

اس کے سفید جھوٹ پر مجھے طیش آ گیا۔ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''جھوٹ مت بولو شانی۔ تم نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر پروین نامی لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اس لڑکی کو بچانے کی کوشش کی تو تم نے مجھے اپنے باپ کا نام بتا کر دھمکی دی تھی ؟ پھر تم نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے۔ بتاؤ کہاں ہے میری بہن۔''

''بابا! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ نہ میں اسے جانتا ہوں اور نہ ہی میں نے اس کی بہن.....''

اسی وقت گیٹ پر پولیس موبائل رکی اور چار پولیس اہلکار ذیلی گیٹ سے اندر آئے اور بغیر سوال جواب کیے مجھے ''حراست'' میں لے لیا۔ چودھری باسط نے باہر آنے سے پہلے فون کر دیا ہوگا۔ ایس ایچ او بھی ڈالے سے باہر نکل آیا تھا اور کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ اسی تھانے کا ایس ایچ او تھا جس تھانے میں، میں نے روزینہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی تھی۔

''ایس ایچ او صاحب۔ اسی نے میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ آپ اسے گرفتار کریں۔'' میں نے ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

ایس ایچ او نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''اس ہیرو کو ڈالے میں بٹھاؤ۔''

چاروں پولیس اہلکار مجھے گھسیٹتے ہوئے موبائل وین کی طرف لے جانے لگے تو میں چلایا۔

''جناب! میری بات کا یقین کریں۔ شانی نے ہی میری بہن اغوا کی ہے۔''

لیکن ایس ایچ او نے میری آہ و پکار پر کوئی توجہ نہ دی۔ چاروں پولیس والوں نے مجھے اٹھا کر موبائل وین میں یوں پھینکا جیسے میں کوئی فالتو چیز ہوں ؟ پھر وہ چاروں بھی موبائل وین میں سوار ہو گئے تو میری مزاحمت کم ہو گئی۔

''چودھری صاحب، آپ فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' مجھے ایس ایچ او کی آواز سنائی دی۔ چودھری باسط نے جواب میں کیا کہا مجھے اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ شاید اس نے ہلکی آواز میں بات کی تھی یا ڈالے کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا اس کی آواز میں چودھری باسط کی آواز دب گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد موبائل تھانے کی سمت روانہ ہو گئی۔

موبائل تھانے کی عمارت میں داخل ہو کر ایک جگہ رک گئی تو چاروں پولیس والے مجھے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے نیچے اتار کر ایس ایچ او کے کمرے میں لے جانے لگے۔ ایس ایچ او بھی موبائل سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ اس کے ماتحت مجھے مجرموں کی طرح گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

''ہاں بھئی ہیرو۔ آج تم نے چودھری باسط کی کوٹھی کے باہر کیا تماشا لگا رکھا تھا۔'' ایس ایچ او نے میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی ٹیبل کے دائیں طرف اس کے نام کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ میں نے اس کا نام پڑھ لیا تھا۔ اس کا نام ارشد وڑائچ تھا۔

''جناب۔ میں نے کوئی تماشا نہیں لگایا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کو تو پتا ہے کہ چودھری باسط کے بیٹے شانی نے میری بہن کو اغوا کیا ہے آپ نے شانی کو گرفتار کرنے کے بجائے مجھے ہی پکڑ لیا۔''

میری بات سن کر ایس ایچ او مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ ''کیا تم نے اپنی بہن کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی ہے؟''

''جی جناب۔ میں اپنی بہن کے اغوا کی رپورٹ کل آپ کے تھانے میں ہی درج کرا گیا تھا۔'' میں نے بتایا تو ایس ایچ او بے اختیار چونک پڑا، پھر اس نے ٹوکری میں پڑی ایک فائل اٹھائی اور اسے کھول کر ورق گردانی کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے فائل بند کر کے واپس ٹوکری میں رکھ دی۔

کچھ دیر سوچتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ شانی نے ہی تمہاری بہن کو اغوا کیا ہے؟ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے۔''

''نہیں جناب۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' میں نے وہی الفاظ دُہرائے جو میں نے چودھری باسط سے کہے تھے۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ—''

''یہ تمہارا قیاس ہے۔'' ایس ایچ او ارشد وڑائچ نے

میری بات قطع کی۔ ''قانون ثبوت مانگتا ہے یقین وقین نہیں دیکھتا۔ اگر تمہارے پاس شانی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو دو ورنہ گھر جا کر انتظار کرو۔ پولیس تمہاری بہن کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے میرے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ ایس ایچ او ٹھیک کہہ رہا تھا کہ قانون ٹھوس ثبوت مانگتا ہے۔ وہ قیاس آرائیوں پر یقین نہیں رکھتا۔

''میں ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

ارشد وڑائچ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ثبوت تلاش کرو لیکن شانی کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ اس بار تو میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن اگلی بار نقص امن کے تحت جیل میں بند کر دوں گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میری بائیک چودھری باسط کی کوٹھی کے باہر کھڑی ہے۔ وہ.....''

ارشد وڑائچ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم یہیں بیٹھو، تمہاری موٹر بائیک یہیں پہنچا دی جائے گی۔''

پھر وہ اپنے سیل فون سے کسی کو کال کرنے لگا جبکہ مجھے ایک کرسی پیش کی گئی اور میں اس پر بیٹھ کر اپنی بائیک کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پندرہ منٹ کے بعد چودھری باسط کا ایک ملازم میری بائیک تھانے لے آیا تو میں اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر جھکڑ چل پڑے تھے کہ میں یہ کیسے ثابت کروں کہ میری بہن کے اغوا میں شانی کا ہی ہاتھ ہے۔ جس طرح شانی اپنی کوٹھی سے باہر آیا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ واقعی اس کا ہاتھ میری بہن کے اغوا میں نہیں ہے لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دل بار بار چیخ کر یہی کہہ رہا تھا کہ روزینہ کے اغوا میں شانی کا ہاتھ ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں گھر پہنچ گیا۔ امی کی حالت بدستور ویسی ہی تھی۔ انہیں مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ دور پرے کے رشتے دار بھی روزینہ کے اغوا کی اطلاع پر گھر پہنچ گئے تھے اور وہ سب امی کو تسلیاں دے رہے تھے۔ پولیس بھی روزینہ کی تلاش میں مسلسل سرگرداں تھی لیکن تین روز گزرنے کے باوجود اس کا سراغ کہیں بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں بھی بے بس و مجبور تھا۔ امی بھی نیم پاگل ہو گئی تھیں اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھیں۔ امی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل پھٹنے پر آ جاتا تھا لیکن پھٹتا نہیں تھا۔

چوتھے روز میں گھر میں موجود تھا کہ شام کو اسماعیل شاہد کی کال آ گئی۔ سلام و دعا کے بعد انہوں نے کہا۔ ''علی! میں ملک سے باہر تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری بہن اغوا ہو چکی ہے۔ آج واپس آیا ہوں تو قاسم منیر نے بتایا۔''

''جی سر۔ یہ سچ ہے۔''

''اس کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں سر۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔''

''ہونہہ۔'' انہوں نے اپنے انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''ڈی آئی جی احسان اللہ میرا دوست ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ تمہاری بہن جلد مل جائے گی۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے بھی کہا۔ ''آپ کا شکریہ سر۔''

''شکریہ کی کوئی بات نہیں۔'' اسماعیل شاہد نے کہا۔ ''تم میرے ورکر ہو اور ورکر کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔''

''شکریہ سر۔''

''اور ہاں..... تم اپنی جاب کی فکر مت کرو، جب تک تمہاری بہن نہیں مل جاتی تمہیں جاب پر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری سیلری تمہارے گھر پہنچا دی جائے گی۔''

میں نے ایک بار پھر ممنون انداز میں اسماعیل شاہد کا شکریہ ادا کیا۔ کال ختم ہوئی تو میں نے فون بند کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔

اسماعیل شاہد نے ڈی آئی جی احسان اللہ سے بات کی تو پولیس کی تیزی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ روزینہ کی تصویر شہر کے ہر تھانے میں پہنچا دی گئی لیکن ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود پولیس اس کی گرد تک پانے میں ناکام رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے روزینہ کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نے نگل لیا ہے جسے پولیس بازیاب کرنے میں کامیاب ہی نہیں ہو رہی۔

ایک روز میں تھانے کا چکر لگا کر گھر آ رہا تھا کہ چوک پر سگنل بند ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی رک کر سگنل کے کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ گرمیوں کے دن تھے اور سورج سوا نیزے پر تھا۔ تپتی لو کے تھپیڑے منہ پر پڑ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے اچانک میری نظر سیاہ رنگ کی ایک پجارو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی تو میں چونک پڑا۔

''روزینہ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

وہ روزینہ ہی تھی۔ اس نے چہرے پر میک اپ اس انداز میں کیا تھا کہ وہ پہلی نظر میں پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ اس کے ساتھ شانی بھی بڑے طمطراق سے بیٹھا ہوا تھا۔ روزینہ کے چہرے کے تاثرات سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس نے ایسے میک اپ کیا ہوا تھا جیسے وہ کسی کی شادی میں جارہی ہو۔ اس نے لباس بھی بیش قیمت زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ ایسے اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جیسے بخوشی شانی کے ساتھ کہیں جارہی ہو۔ میرے دماغ میں لاوا سا ابلنے لگا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ شانی بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور پھر اس کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی تو اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرادیا۔ اس سے پہلے کہ میں موٹر بائیک سے اتر کر پجارو کی طرف بڑھتا اسی وقت سگنل کھل گیا اور گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے کی جانب رینگنے لگیں۔ میں نے پجارو کا تعاقب کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے موٹر بائیک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی لیکن گاڑیوں کا جم غفیر تھا اس لیے میں پجارو کا تعاقب کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ ایسے غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

گاڑیوں کے رش کی وجہ سے میں پجارو کا نمبر بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے گھر جانے کی بجائے تھانے کا رخ کیا۔ ایس ایچ او ارشد وڑائچ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس لیے مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔

''کیا ہوا؟''

''ایس ایچ او صاحب۔ وہ شانی.....''

''کیا ہوا شانی کو؟'' ایس ایچ او چونک گیا۔

میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے شانی کو اپنی بہن روزینہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ ایک پجارو میں سوار تھے۔ بلیک کلر کی پجارو تھی۔''

ایس ایچ او نے ہونٹ بھینچ لیے اور چند ساعت خاموشی کے بعد بولا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ شانی کے ساتھ تمہاری بہن تھی۔''

''میں نے..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ روزینہ ہی تھی۔ میری بہن۔'' میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''میں کیسے مان لوں؟''

''آپ کو اب بھی میری بات کا یقین نہیں آرہا۔'' میرا لہجہ کاٹ دار اور طنزیہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایس ایچ او ارشد وڑائچ سلگ اٹھا اور میز پر مکا مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں تمہاری بات پر کیسے یقین کرلوں۔'' اس کی آواز میں غصہ شامل تھا۔ ''تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ قانون ثبوت مانگتا ہے، یقین وقین نہیں۔''

میں نے بھی ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایس ایچ او ارشد وڑائچ آخر کیا چاہتا ہے۔ وہ میری بات پر یقین کیوں نہیں کررہا۔ ذہن میں ایک ہی بات آرہی تھی کہ وہ چودھری باسط سے ملا ہوا ہے اور شانی کو بچانے کے لیے مجھے الجھا رہا ہے۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ شانی کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے اپنے دل کی بات زبان پر لائی تو وہ بھڑک اٹھا۔

''کیا بکواس کررہے ہو۔''

''یہ بکواس نہیں سچ ہے ایس ایچ او صاحب۔'' میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے لہجے اور آپ کے رویے سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔ دو ہفتے گزر چکے ہیں لیکن آپ میری بہن کو بازیاب نہیں کرا سکے۔ اب جبکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ شانی میری بہن کے ساتھ پجارو میں موجود تھا تو آپ میری بات پر یقین نہیں کررہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ چودھری باسط سے ملے ہوئے ہیں اور اس کے بیٹے شانی کو بچانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

ارشد وڑائچ مجھے غضب ناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے ایسے گھور رہا تھا جیسے مجھے زندہ نگلنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ''دیکھو، تم حد سے بڑھ رہے ہو؟''

''میں حد سے بڑھ رہا ہوں؟ حیرت کی بات ہے۔'' میں نے اپنی آواز کو حتی المقدور نیچی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ میری جگہ خود کو رکھ کر ذرا سوچیں، اگر آپ ایک عام شہری ہوتے اور آپ کی بہن اغوا ہوچکی ہوتی اور پولیس آپ کے ساتھ تعاون نہ کرتی تو آپ کا کیا ردِعمل ہوتا؟''

میری بات نے ارشد وڑائچ کی بولتی بند کردی تھی۔ میں مزید وہاں نہ رکا اور تھانے سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ یہ بات تو کنفرم ہوگئی تھی کہ شانی نے ہی میری بہن کو اغوا کیا ہے لیکن مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ روزینہ انتہائی سکون

کے ساتھ اس کے ساتھ کیوں بیٹھی تھی۔ وہ شور بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ شور کرتی تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور یوں وہ شانی کے چنگل سے آزاد ہو سکتی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اسی الجھن میں مبتلا رہا لیکن میں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ امی کی حالت بھی بدستور ویسی ہی تھی۔ ان کی ذہنی حالت بگڑ چکی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہیں سکون آور دوا دی جا رہی تھی لیکن جیسے ہی دوا کا اثر ختم ہوتا تو وہ اپنی جون میں واپس آ جاتیں اور ''روزینہ روزینہ'' پکارنے لگ جاتیں۔ امی کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ جاتا تھا لیکن میں مجبور اور بے بس تھا۔ ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆.....☆

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میں گھر سے نکل کر شانی کی کوٹھی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں شانی کی ریکی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ریکی کے ذریعے ہی میں روزینہ تک پہنچ سکتا تھا۔ پولیس پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا تھا اس لیے میں نے اپنے طور پر ہی کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے شانی کی کوٹھی سے قدرے فاصلے پر ایک درخت منتخب کیا اور اس کے نیچے موٹر بائیک روک کر شانی کی کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شانی اپنی کوٹھی میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں رات گیارہ بجے تک کوٹھی کی نگرانی کرتا رہا لیکن شانی نہیں آیا تھا یا شاید وہ گھر پر موجود ہی نہیں تھا۔ کوٹھی کے مکینوں کی حفاظت کے لیے گارڈز کی تعداد بھی دگنی ہو گئی تھی۔ اب باہر چار مسلح گارڈز موجود تھے۔

میں دو روز تک کوٹھی کی نگرانی کرتا رہا۔ میں سر شام ہی وہاں پہنچ جاتا اور رات گیارہ بجے تک موجود رہتا۔ ان دو روز میں شانی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا اور میرے اندازے کے مطابق شاید وہ کوٹھی میں موجود نہیں تھا۔

تیسرے روز شام کے وقت میں بائیک پر سوار شانی کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسپیڈ لمٹ میں تھی، آگے ایک موڑ تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنی بائیک کالونی کی طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑی تو عین اسی لمحے سامنے ایک پجارو آتی ہوئی دکھائی دی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شانی موجود تھا۔ یہ وہی پجارو تھی جس میں، میں نے روزینہ اور شانی کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ چونکہ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ نہ سکا۔ جیسے ہی پجارو میرے قریب سے گزری تو میں نے بھی موٹر بائیک موڑی اور پجارو کا تعاقب کرنے لگا۔

میں نے چونکہ ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ اگر شانی نے مجھے دیکھا بھی ہو گا تو وہ مجھے پہچان نہیں سکا ہو گا۔ شانی کی پجارو شہر سے ہٹ کر بنائی گئی کالونی میں داخل ہو گئی تھی۔ میں اس کے تعاقب میں لگا رہا۔ پھر وہ پجارو ایک کوٹھی کے اندر چلی گئی تو میں نے موٹر بائیک موڑی اور ایک زیر تعمیر کوٹھی کے گیٹ سے قدرے فاصلے پر روک کر اندھیرا گہرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ جب میں کوٹھی میں جاؤں تو اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔

میں نے اس کوٹھی کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ گیٹ پر مجھے چوکیدار یا کوئی اور دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جب اندھیرا پھیل گیا تو میں کوٹھی کے عقبی طرف آ گیا۔ دیواریں زیادہ بلند نہ تھیں اور نہ ہی ان پر خاردار تاریں موجود تھیں۔ بہر حال میں دیوار پھاند کر کوٹھی کے پائیں باغ میں پہنچا اور پھر جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا راہداری کی طرف بڑھنے لگا۔

راہداری کی نکڑ پر پہنچ کر میں نے دیوار کے ساتھ لگ کر دوسری طرف جھانکا مگر راہداری خالی پڑی تھی۔ میں آگے بڑھا اور شانی کو تلاش کرنے لگا۔ کوٹھی ڈبل پورشن پر مشتمل تھی۔ نیچے کا پورشن خالی پڑا تھا اس لیے میں اوپر کے پورشن میں آ گیا۔

مختلف کمروں کو چیک کرتا ہوا جب میں ایک کمرے کے دروازے کے پاس پہنچا تو اچانک وہ دروازہ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر عورت باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک ٹرے تھی جس پر ایک رومال اور چند برتن رکھے ہوئے تھے۔ میں فوراً دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ ادھیڑ عمر عورت ٹرے اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ نیچے چلی گئی تو میں دیوار کی اوٹ سے نکل کر اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جس کمرے سے ادھیڑ عمر عورت نکلی تھی۔

کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ٹی وی چلنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو مجھے شانی دکھائی دیا جو ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریموٹ تھا اور وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر قرب و جوار کا جائزہ لیا پھر میں بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ کمرا

پندرہ بائے پندرہ فٹ کا تھا۔ فرش پر براؤن کلر کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ شانی یہی سمجھا تھا کہ اس کی ملازمہ آئی ہے لیکن جب اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے صوفے سے یکدم اسپرنگ نمودار ہو گئے ہوں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے میرے وہاں پہنچنے کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی تاکہ ملازمہ "مداخلت" نہ کرے۔ کمرے میں شراب کی بوتلیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

"ت..... تم۔" شانی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

اسے دیکھ کر ہی میرا دماغ کھول گیا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں خود بخود بھنچ گئی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر رک کر انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

"حیران ہو گئے ہو کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا۔" میرے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں..... ہاں..... لیکن یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ مرتعش آواز میں بولا۔

"تم جانتے ہو۔"

میری بات کا شانی نے اس بار کوئی جواب نہ دیا۔

"میری بہن کہاں ہے؟" اس بار میرا لہجہ سرد تھا۔

"م..... مجھے نہیں معلوم کہ....." وہ خوف بھری آواز میں کہنے لگا۔ اس کا فقرہ مکمل ہی نہ ہوا تھا کہ میں نے اس کے جبڑے پر مکا جڑ دیا۔ وہ کراہ کر صوفے پر جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے ریموٹ بھی نکل کر قالین پر گر گیا تھا جسے میں نے اٹھایا اور اس کا رخ ٹی وی کی طرف کر کے آواز اونچی کر دی تاکہ میری یا شانی کی آواز ملازمہ نہ سن سکے۔ پھر میں نے ریموٹ ایک سائیڈ پر پھینکا اور آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا وہ بھی مسلسل مقابلہ کر رہا تھا کہ اس کی گردن میرے ہاتھ میں آ گئی اور میں اس کی گردن دبانے لگا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں اور وہ دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بتاؤ..... میری بہن کہاں ہے ورنہ میں گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔" میں نے جنونی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میری آواز ٹی وی کی آواز میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ڈراما چل رہا ہو۔

"م..... م..... میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ....." اس کی بات ایک بار پھر مکمل نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے سر کی ٹکر اس کے سر پر ماری شاید اس کا سر جھنجھنا اٹھا تھا کیونکہ کرب کی جھلک چہرے پر صاف نظر آئی تھی۔ وہ صوفے سے لڑھکنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے کالر سے دبوچ کر صوفے پر پھینک دیا۔ میرے انداز میں جنونیت تھی۔ انسان پر جب جنونیت طاری ہو جاتی ہے تو وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔

"جھوٹ بول رہے ہو خبیث انسان۔" میں غرایا۔ "میں نے چند روز پہلے اسے تمہارے ساتھ پجارو میں دیکھا تھا۔ تم نے بھی مجھے دیکھا تھا اور اب تم بکواس کر رہے ہو کہ تم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ بتاؤ، کہاں ہے وہ؟"

شانی صوفے پر پڑا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ اس کے ناک سے نکلنے والا خون اس کے ہونٹوں سے ہوتا ہوا ٹھوڑی تک پہنچ چکا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شانی اتنی آسانی سے بتانے والا نہیں ہے۔ اس کی اچھی خاصی "مرمت" کرنی پڑے گی تب جا کر یہ زبان کھولے گا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک اور مکا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے دردناک چیخ نکل گئی۔ وہ سنبھلا ہی تھا کہ میں نے ایک بار پھر اس کی گردن دبوچ لی اور دباؤ بڑھانے لگا۔

"میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا اور تمہارا گلا دبا دوں گا۔" میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا تو اس کے حلق سے ایک بار پھر خرخراہٹیں نکلنے لگیں لیکن میں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔

"بتاؤ..... بتاؤ۔" میں نے ایک بار پھر اس کے سر پر اپنے سر کی ٹکر مارتے ہوئے کہا۔ سانس رکنے اور سر پر ٹکر لگنے سے شانی کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں جیسے ابھی باہر نکل آئیں گی۔ موقع دینے کے لیے میں نے اس کی گردن چھوڑی تو اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑی ہوئی تھی۔ میں خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاہاہا۔" چند لمحے کھانسنے کے بعد اچانک شانی نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ اس کا اچانک قہقہہ لگانا میری سمجھ سے باہر تھا۔

''تم ہنس کیوں رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی حالت بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی لیکن وقفے وقفے سے وہ اب بھی کھانس رہا تھا۔ چہرے پر میرے گھونسوں کے نشانات ثبت تھے، ان کی تکلیف کا احساس بھی اسے ہو رہا ہو گا لیکن اس نے خود پر ایک خول سا چڑھا لیا تھا۔ مجھے بار بار اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میری بات کا جواب نہ دے کر مجھے طیش دلا دیا۔
''کیوں ہنس رہے ہو۔ بولو، کیوں ہنس رہے ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا لیکن اس کی ہنسی میں کمی نہ آئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہو۔
''میں تمہاری بے بسی پر ہنس رہا ہوں۔ تم اس وقت کتنے بے بس دکھائی دے رہے ہو۔ کاش تم میری آنکھوں سے خود کو دیکھ سکتے۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں طنز تھا۔ گویا وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کے طنز نے میرے اندر آگ سی بھر دی۔ میں نے ایک اور تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا تو اس کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا لیکن اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ وہ خود کو بچانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن دوبارہ دبوچ لی۔
''دیکھو شانی! تم میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے، مجھے بتا دو میری بہن کہاں ہے۔''
''ہونہہ۔ بتا دیتا ہوں لیکن اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ اب تک بہت دور جا چکی ہو گی اور تم مجھے مار بھی نہیں سکتے کیونکہ تمہیں اپنی بہن تک پہنچنا ہے۔'' شانی نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑ دی اور دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
''کیا بکواس کر رہے ہو۔''
''سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔
میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''کہاں گئی ہے وہ۔''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ ابھی یہاں پاکستان میں ہے یا چلی گئی ہے۔'' شانی نے کہا تو میں الجھ کر رہ گیا۔
''پہیلیاں مت بجھواؤ، سیدھی طرح بتاؤ۔'' میں غرایا۔ ایک بار پھر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔
''شاید وہ لندن چلی گئی ہو یا شاید امریکا۔'' شانی نے ناقابل یقین انداز میں کہا۔
''کیا.....؟'' میں حلق کے بل چیخا۔ شانی کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔
''ہاں۔'' شانی نے مضحکہ خیز انداز میں کہا جیسے مجھے یقین دلانا چاہتا ہو۔
''تم نے اسے کہاں اور کیوں بھیجا ہے؟''
شانی نے کہا۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ شاید وہ چلی گئی ہو۔ کہاں گئی ہو یہ مجھے نہیں معلوم۔''
''تو پھر کس کو معلوم ہے خبیث انسان؟'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا اور جھپٹ کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ سسکاری سی لے کر رہ گیا۔ میرے گھونسے لگنے سے اس کا چہرہ بھی سوجا سوجا سا دکھائی دے رہا تھا۔ سرخ سرخ نشان بھی پڑ چکے تھے اس کے چہرے پر۔
''چوہدری ساجد کو معلوم ہو گا۔'' شانی نے نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر چوہدری ساجد سے معلوم کر سکتے ہو تو معلوم کر لو۔''
شانی کی باتیں الجھن آمیز تھیں یا وہ جان بوجھ کر مجھے الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں حقیقتاً جھنجلا گیا تھا۔ میرا ضبط ایک بار پھر کھو رہا تھا تاہم میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کون ہے یہ چوہدری ساجد.....''
''لڑکیوں کا اسمگلر۔'' شانی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ دشمنی تم نے خود پالی ہے۔ اگر تم اس رات میری راہ میں رکاوٹ نہ بنتے تو میں کبھی تمہارا پیچھا نہ کرتا اور نہ ہی تمہاری بہن کو اغوا کرتا۔ یہ سب میں نے تم سے بدلا لینے کے لیے کیا ہے۔ میں نے تمہاری بہن کو اغوا کرنے کے بعد چند روز اسی گھر، بلکہ اسی کمرے میں رکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہی ہے پھر میں نے اسے چوہدری ساجد کو فروخت کر دیا۔''
اس کی باتوں نے میرے تن بدن میں جیسے آگ بھڑکا دی تھی۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس پر پل پڑا۔ میں نے گھونسے مار مار کر شانی کا چہرہ لہولہان کر دیا تھا۔ مجھ پر ایک بار پھر جنون طاری ہو گیا تھا۔ میرا دل تو یہی کر رہا تھا کہ میں اسے جان سے مار دوں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا ہو۔ شانی نڈھال ہو چکا تھا لیکن اس کے چہرے پر طنز

بدستور موجود تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شانی اس قدر گھٹیا انسان ہوگا۔ مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر اس نے میری بہن کی زندگی برباد کردی تھی۔

شانی بھی ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مزاحمت نہیں کی تھی بلکہ خاموشی سے میرے ہاتھوں پٹتا رہا تھا۔ جب میں رک گیا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کیا تھک گئے ہو؟ اور مارو مجھے۔ بعد میں جب میں بدلا لینے پر آؤں تو سوچنا نہ پڑے۔ ہر زخم یاد دلا دے کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔''

میں نے اس کی ہرزہ سرائی کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ چودھری ساجد کون ہے۔''

''نہیں بتاؤں گا۔'' شانی نے نحیف لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھ سے اگلوا سکتے ہو تو اگلوا لو کیونکہ مار تو سکتے نہیں ہو اگر میں مر گیا تو تم اپنی بہن تک کیسے پہنچو گے۔''

اس کے لہجے و انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مار کھانے کے باوجود بھی نہیں بتانے والا۔ اگر میں اسے اپنی بہن کے ساتھ نہ دیکھتا تو شاید وہ روزینہ کو اغوا کرنے کا اعتراف بھی نہ کرتا۔ کیونکہ شک کی بنیاد پر تو میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچے اور ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر مارا۔ شانی کے حلق سے دردناک چیخ نکل گئی لیکن اس نے پھر مجھے مارنے کی دعوت دی لیکن میں نے اس بار اسے نہیں مارا بلکہ اسے بازو سے پکڑ کر صوفے سے کھڑا کر دیا۔

''چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟''

''تھانے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے جو باتیں مجھے بتائی ہیں وہی باتیں تم تھانے میں جا کر بتاؤ گے اور یہ بھی کہ چودھری ساجد کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس نے میری بہن کو کہاں بھیجا ہے۔''

''میں تھانے نہیں جاؤں گا۔'' اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے ایک جھٹکے سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

''تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔'' میں نے سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے کہا اور بائیں ہاتھ سے دروازے کی کنڈی کھول دی پھر میں نے دروازہ کھولا اور اسے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شانی مسلسل خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں بھلا اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ جیسے اس نے میرے سامنے اپنے جرائم کا اعتراف کیا تھا یہی اعتراف میں اس سے تھانے میں جا کر ایس ایچ او کے سامنے کروانا چاہتا تھا تاکہ وہ میری بہن روزینہ کی بازیابی کے لیے اقدامات کر سکے۔ پتا نہیں اس وقت میری عقل کہاں جا چھپی تھی۔ میں جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا، یہ بھول گیا تھا کہ ہمارے ہاں کی پولیس میں کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں۔ ہر افسر ایماندار نہیں، کچھ افسر شانی کے باپ جیسے لوگوں سے دبتے بھی ہیں، پھر بھی میں اسے تھانے لے جانے کے لیے کھینچ رہا تھا۔

ہم سیڑھیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اچانک شانی نے ایک بار پھر خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی مزاحمت شروع کر دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے ساتھ تھانے نہیں جانا چاہتا تھا لیکن میں اسے ہر صورت تھانے لے جانا چاہتا تھا مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیسے قابو کر کے تھانے لے جاؤں۔ اسی کشمکش اور شور وغوغا میں گھر کی ملازمہ بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ حیران کن نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اور شانی نبرد آزما تھے کہ جیسے ہی میری گرفت ڈھیلی ہوئی اچانک شانی نے مجھے سیڑھیوں کی طرف دھکا دے دیا۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے گرل پکڑنے کی کوشش کی لیکن شانی نے ایک بار پھر مجھے دھکا دے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس بار خود کو سنبھال نہ پایا تھا اور سیڑھیوں سے لڑھکتا چلا گیا۔ آخری سیڑھی سے نیچے فرش پر گرتے وقت میں نے شانی کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اوپر موجود نہیں تھا۔ اسی اثناء میں مجھے گھر کی ملازمہ کی آواز سنائی دی۔

''جی چودھری صاحب۔ پتا نہیں وہ کون ہے۔ شانی بابا بھی کافی زخمی ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ملازمہ چوہدری باسط کو فون کر رہی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن میں پہنچا۔ شانی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن شانی کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں پلٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں اچھل کر کمرے کے وسط میں پڑی میز پر آ گرا لیکن پھرتی سے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا اور میں کمرے میں مقید ہو کر رہ گیا۔

(لمحہ بہ لمحہ واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

دردآشنا

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
لوگ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں لیکن میں اپنی کہانی بھیج رہی ہوں جو سو فیصد سچی ہے اور سبق آموز بھی ہے۔ لوگ طعنے کستے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اگلے پر کیا گزرے گی۔ اس کا دل کس طرح کرچیوں میں بٹ جائے گا۔

سبین
(لاہور)

میں نشست گاہ کے دروازے کے قریب سے گزرتی ہوئی ٹھٹک گئی۔

میرے نام کی گونج نے میرے پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اندر مہمان عورتیں موجود تھیں جو میری چھوٹی بہن کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے نازنین مہمانوں کے لیے چائے ناشتا لے کر گئی تھی اور کوئی دس منٹ بیٹھ کر ان سے باتیں بھی کی تھی۔ پھر باہر آگئی تھی اس وقت نازنین کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی اور اب دوبارہ جا کر برتن اٹھانے کی ہمت نہیں جٹا رہی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زندگی کا سب سے سنسنی خیز انٹرویو دے کر آئی ہو۔ اس لیے کہ وہ تینوں جو اسے دیکھنے آئی تھیں نازنین سے کہیں زیادہ حسین اور پرکشش تھیں۔ دوسری چھوٹی بہنوں کو رشتے داروں کے ہاں بھیج دیا گیا تھا اس لیے کہ وہ تینوں نازنین سے کہیں حسین اور پرکشش تھیں اور ان کی موجودگی سے نازنین کے ناپسند ہو جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ عموماً ایسا ہوتا رہتا تھا۔ نازنین کی ہم بہنوں جیسی سرخ و سپید رنگت نہ تھی۔ وہ ابو کی رنگت پر گئی تھی گو کہ اس کی نمکین گندمی رنگت میں بھی بڑی جاذبیت اور نکھار تھا مگر اس سفید چمڑی کا کیا کیا جائے جس نے آج کل لڑکوں کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ ہر ماں اور لڑکوں کی بہنیں بھی حسین بہو کی تلاش میں رہتی ہیں۔ لہٰذا میں ہی برتن لینے اندر چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

مہمانوں نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر میری امی کی جانب تو انہوں نے میرا تعارف کس قدر بے دلی اور ناگواری سے کرایا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ میں برتن اٹھانے کیوں آئی۔

''یہ میری سب سے بڑی بیٹی سبین ہے۔''

تعارف بے حد مختصر سا تھا۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا مزید تعارف کرانے سے قاصر تھیں۔ لڑکے کی ماں جن کا نام زیب النساء تھا انہوں نے پہلے تو مجھ پر ایک نظر اچٹتی سی ڈالی پھر انہوں نے میرا چہرہ اور سراپا ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ نازنین کو نہیں مجھے دیکھنے آئی ہوں۔ وہ چند ساعتوں تک بغور اور ناقدانہ انداز سے میرا جائزہ لیتی رہیں، نامعلوم کیوں میرے چہرے پر سنسناہٹ سی آگئی تھی اور سینے میں ایک عجیب سی دھک دھک ہونے لگی تھی۔ پھر انہوں نے جیسے میرے وجود پر دہکتا انگارہ رکھ دیا تھا۔

''کیا سبین بیٹی کی شادی ہو چکی ہے؟''

''جی.....!!'' امی جیسے کسی گہری کھائی میں گر گئی تھیں۔ یہ جواب دینے میں گریز کر رہی تھیں۔ اس اچانک اور غیر متوقع سوال نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ امی کا شاید یہ خیال تھا کہ وہ مجھے ملازمہ سمجھ کر میرے متعلق کوئی سوال نہیں کریں گی۔ امی کو میری موجودگی یا میرے آبگینہ دل کو ٹھیس پہنچنے کا خوف نہیں تھا۔ اگر تھا تو اس بات کا تھا کہ کہیں نازنین میری بدنصیبی کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ مجھے پہلے ہی اشاروں اور کنایوں سے تاکید کر دی گئی تھی کہ میں مہمانوں کے سامنے آنے سے احتراز

کروں۔ جب کہ میں خود بھی مہمانوں کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تو پھوپی اماں تھیں جنہوں نے نازنین کی حالت پر ترس کھا کر مجھے زبردستی برتن لانے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ امی نے ان کے اس سوال کا مزید کیا جواب دیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا اور نہ ہی میں ان کا جواب سننے کی متمنی تھی۔ ان کا میرے بارے میں جو بھی جواب ہوتا وہ میرے وجود میں کسی زہریلے ڈنک کی طرح چبھ جاتا۔ میں تو یہ سوال سنتے ہی فوراً ہی تیزی کے ساتھ برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گئی تھی اور کچن کی طرف کسی سنسناتے ہوئے تیر کی طرح لپکی تھی جیسے کوئی عفریت میرے تعاقب میں ہو اگر میری موجودگی میں ان کی زبان سے بچ نکل گیا ہوتا تو وہ میرے لیے بڑا اذیت ناک بن جاتا۔

مہمان خواتین بڑی دیر سے کمرے میں براجمان تھیں جیسے رشتے کی بات آگے بڑھ رہی ہو۔ میں کوئی دس منٹ بعد ادھر سے گزر رہی تھی کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی بلکہ ایسے رک گئی جیسے روک دیا گیا۔ جیسے گاڑی کو بریک لگا کر روک دیا جاتا ہے۔ زیب النساء کو معلوم نہیں کیوں میری ذات میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں تو بہن! آپ نے اپنی بیٹی سبین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

امی نے انہیں خوب صورتی سے ٹال دیا تھا مگر زیب النساء نے انہیں جیسے پھر سے جکڑ لیا تھا۔ ہمارے روایتی اور لگے بندھے معاشرے میں رشتے آسانی سے طے نہیں ہو پاتے اور نہ ہی کیے جاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں نہیں بلکہ جرم ہوتی ہیں۔ صرف لڑکیوں کو ہی روز محشر سے گزرنا نہیں پڑتا بلکہ اس خاندان کے تمام افراد کو بھی ذہنی اذیت بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر لڑکی کے خاندان کے کسی فرد پر کوئی دھبا موجود ہو تو لڑکی کی ذات بھی متاثر ہوتی ہے جب کہ اس لڑکی کا اس قصور سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو زمانے کی پرانی ریت ہے جو معلوم نہیں کیوں اب تک ختم نہیں ہو سکی ہے۔ جب کہ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے اور جا رہی ہے۔ تعلیم بھی انسانی ذہن میں وسعت پیدا نہیں کر سکی بلکہ معاشرہ مزید تنگ نظری اور بوسیدگی سے آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد ان کی آواز سنائی نہیں دی البتہ زیتون خالہ کی آواز گونجی تھی جو نازنین کا رشتہ اور مہمانوں کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"سبین کو طلاق ہو چکی ہے۔"

"طلاق؟" زیب النساء کے لہجے میں شدید حیرت اور بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔

زیب النساء کی زبان سے جس انداز سے یہ لفظ نکلا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا کہ انہوں نے جیسے میری ذات کو ایک نفرت انگیز گالی دی ہو، جیسے مطلقہ عورت ان کے نزدیک دنیا کی سب سے حقیر ترین شے اور گندے نالے کا کیڑا ہو۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا تھا کہ زبان سے نکلا ہوا یہ لفظ میرے منہ پر توہین آمیز بن کر لگا ہے۔ مجھے اپنی نس نس میں خون کی بجائے گرم گرم لوہا ابلتا محسوس ہونے لگا تھا۔ میرے وجود میں ایک آتش فشاں دہک اٹھا تھا۔

"سبین کب سے مطلقہ ہے؟" زیب النساء نے دریافت کیا۔

"کوئی تین برس کا عرصہ ہوا۔" امی نے چند لمحوں کی گہری خاموشی کے بعد بتایا۔

"تو کیا آپ لوگوں نے اس کی شادی کی کوشش نہیں کی؟" زیب النساء حیرت سے بولی۔ "ماشاء اللہ وہ ابھی جوان اور حسین بھی ہے۔ اسے کسی کا پسند نہ کرنا حیران کن بات ہے۔"

"کوشش تو بہت ہو رہی ہے۔ میں زیتون خالہ سے بھی ہمیشہ کہتی رہتی ہوں کہ اس کا بھی خیال رکھو لیکن زیتون خالہ نے ابھی اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں ڈھونڈا۔" امی نے حسرت بھرے لہجے میں گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں کوشش تو بہت کر رہی ہوں مگر آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں بیوہ اور مطلقہ سے شادی کرنا مرد پسند نہیں کرتے۔ عمر رسیدہ لوگ بھی کنواری لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں اور کتنی ہی لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں کسی جوان بیوہ یا حسین طلاق یافتہ کا رشتہ طے ہونا ہی مشکل ہوتا ہے۔ میں جھوٹ بول کر سبین کو کنواری اور غیر شادی شدہ بتا کر اس کے رشتہ طے کرا دوں تو یہ بھانڈا بھی نہ بھی پھوٹے گا ضرور۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہوں گی کہ ایسی لڑکی کی شادی نہ ہونا ایک طرح اس کے حق میں بہت ہی اچھا ہوتا ہے اسے اپنی ساری زندگی اپنے ہی گھر میں کاٹ دینا چاہیے۔"

"یہ کس لیے زیتون خالہ؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"ایسا تم کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا جوان مطلقہ کا اپنی ساری زندگی گھر میں کاٹ دینا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا؟"

"اس لیے کہ دوسری شادی کرنے پر وہ عزت، مقام اور احترام نہیں ملتا جو ایک کنواری لڑکی کو ملتا ہے جس کی ہر

شادی شدہ عورت مستحق ہوتی ہے۔ دوسری شادی ہونے کے بعد اگر اس سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔ ان گھروں میں جہاں ایسی شادیاں ہوئی ہیں اکثر جاتی رہتی ہوں۔ مجھے ان کی زندگیوں کو دیکھ کر ایک عورت ہونے کے ناتے بڑا ترس آتا ہے۔ وہ بھی جیسے شادی کر کے پچھتا رہی ہیں۔ وہ بڑے دکھ اور بڑی حسرتوں سے جب وہ اکیلی ہوتیں، موقع ملتا تو مجھ سے اکثر و بیشتر کہتی رہتی ہیں کہ کاش ہماری دوبارہ شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تب ایک زخم تھا، رونا تھا مگر آج جتنے غم ہیں اتنے ہی دکھ ہیں۔'' پھر لمحاتی توقف کے بعد زیتون خالہ نے کہا۔ ''وہ کہتی ہیں کہ مطلقہ عورتوں کی جو شادی نہیں ہو رہی ہے ہم ان کے لیے دعا گو ہیں کہ کبھی ان کی شادی نہ ہو۔''

''آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟'' کوئی دوسری عورت بولی۔ ''گھر تو عورت کی ذات سے اجڑتا اور بستا ہے۔ گھر اجڑنے میں مرد کا نہیں عورت کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ مرد کو دوش نہیں دیا جا سکتا۔''

میرے وجود کے پرخچے جیسے کسی بم سے اڑا دیئے گئے تھے۔ میری، میرے ہی گھر میں ہتک کی جا رہی تھی۔ میں نے

جایداد کی طرح دیکھ کر خریدنا چاہتا ہے۔ میں تب بیس برس کی تھی اور بدصورت بھی نہیں تھی۔ میرا بدن چھریرا اور متناسب تھا۔ میرے نکلتے ہوئے قد نے نوجوانی کے آغاز سے ہی مجھ میں بے حد کشش اور دلکشی پیدا کر دی تھی۔ میری رنگت بھی سرخ و سپید تھی۔ سہیلیاں کہتیں کہ چہرہ اور اس کے نقوش میں جاذبیت اور تیکھا پن ہے۔ میری بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں سحر آگیں ہیں۔ میری ہم جماعت لڑکیاں مشورہ دیتی تھیں کہ میں شوبزنس کی دنیا میں چلی جاؤں وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ کسی بھی فلم میں ہیروئن لیا جا سکتا ہے۔ اگر میں ٹیلی ویژن پر آگئی تو نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاؤں گی۔ اس کے علاوہ ٹی وی کمرشل بھی دھڑا دھڑ ملیں گے۔ عزت، شہرت اور دولت قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گی لیکن مجھے ان کی آرزو نہیں تھی۔ میں نے اس دنیا کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اسے سن کر مجھ جیسی لڑکی اس دلدل میں کود نہیں سکتی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اس دنیا میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ عورت ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے وجود پر اتنے دھبے ہوتے ہیں کہ ان کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔

میری سہیلیاں کہتی تھیں کہ اگر ہم تم جیسی ہوتیں تو آج شوبزنس کے افق کا ستارہ ہوتیں مگر مجھ میں کبھی غرورِ حسن پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تھا جو لڑکی کسی قدر حسین ہوتی تھی اس میں پندارِ حسن پیدا ہو جاتا تھا۔ میں نے کبھی بھی بھولے سے اپنے حسن و شباب کے زعم میں آ کر ایسے خواب نہیں دیکھے تھے جو میری دسترس سے باہر ہوں۔ نہ ہی کوئی میرا آئیڈیل تھا۔ میں اس جھوٹی عزت، شہرت اور دولت کے لیے خود کو آلودہ کرنے اور پاک بازی کو داغ دار کیونکر کرتی۔

امی نے اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت بھی کی تھی۔ والدین اور سرپرست لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلواتے ہیں لیکن تربیت سے غافل رہ جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فون، ٹی وی اور انٹرنیٹ مخربِ اخلاق بھی ہے۔ موبائل اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہر عمر کی لڑکیاں ممنوعہ فلمیں دیکھتی ہیں۔ ان کی دوستی لڑکوں سے اس قدر جذباتی اور رومانی ہو جاتی ہے کہ وہ بہک جاتی ہیں اور بلیک میل ہو کر اپنا بدنما چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہتیں۔ ہمارے گھر میں اگر موبائل تھا تو صرف ابو کے پاس۔ انٹرنیٹ تو درکنار کمپیوٹر اور ٹی وی تک نہ تھا۔ جب کہ محلے میں ایسا کون سا گھر تھا جہاں ٹی وی نہ ہو۔ ہر گھر کے فرد کے پاس موبائل تعویذ بنا ہوا ہے۔ ان کے نہ ہونے کے باوجود ہمارا گھر ہماری دنیا چل رہی ہے۔ امی کا کہنا تھا کہ ایک لڑکی کا حسن، سیرت اور گھر کی عزت اس کے سگھڑ پن اور سلیقہ شعاری میں ہے۔ انہوں نے مجھے امورِ خانہ داری کی ایسی تربیت دی ہے کہ کسی بھی گھر میں جا کر اجالا بن سکتی تھی۔ جب ہی شاید میرے لیے رشتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ یوں بھی میں نے جوانی کی منزل سے نکل کر شباب کی دنیا میں جو قدم رکھ دیا تھا۔ دو رشتے میرے لیے کچھ مناسب نہیں تھے۔ امی میرے بے مثل حسن کے باعث کسی اونچے گھر میں میرا رشتہ طے کرنا چاہتی تھیں۔ اتفاق سے انہی دنوں رضوان کا رشتہ آ گیا تھا مگر شرط کے ساتھ اور میں نے صاف انکار کر دیا تھا کہ میں رضوان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ اگر اس نے مجھے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تو میرے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ بھابی نے مجھے سمجھایا کہ تمہیں کوئی شہزادہ بھی ناپسند نہیں کر سکتا۔ اب تو معاشرہ اتنا بدل گیا اور بدلتا جا رہا ہے کہ رشتہ طے ہونے کے بعد جب منگنی ہو جاتی ہے تو لڑکیاں اپنے منگیتروں کے ساتھ شامیں بھی گزارتی ہیں، ساحلِ سمندر پر جاتی ہیں، ہوٹل بازی ہوتی ہے تاکہ ذہنی ہم آہنگی ہو۔ والدین بھی اجازت دے دیتے ہیں۔ بعض ایسے واقعات کی بھنک میرے کانوں میں پڑی تھی کہ منگنیاں ٹوٹ گئی تھیں کیونکہ ذہنی ہم آہنگی اتنی بڑھی کہ جسمانی ہم آہنگی میں ڈھل گئی۔ لڑکے نے آبرو باختہ کا الزام دے کر کسی اور لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ مرد کا دل ایسی لڑکی سے فوراً بھر جاتا ہے۔

بھابی نے یہ دلیل دی تھی کہ ہر لڑکی کو ہمارے معاشرے میں ناپسند قرار دیئے جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ اس میں کسی رنج اور دل شکنی کی بات نہیں ہے۔ زمانے کی یہی ریت ہے۔ جب ہم کوئی چیز لینے بازار جاتے ہیں تو اپنی پسند کو اہمیت دیتے ہیں، کتنی ہی چیزوں کو دیکھنے کے بعد اپنی پسند کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی طرح لڑکیوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔ رضوان تصویر کا قائل نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ فوٹو گرافر کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ چڑیل کو بھی پری بنا دے۔

جس روز رضوان مجھے دیکھنے کے لیے آ رہا تھا اس روز میرے دل کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ سینے میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ سہ پہر کے ڈھلتے ہی ایک لمبی سی کار گھر کے سامنے آ کر رکی۔ اس کار کو رضوان ہی چلا رہا تھا۔ میں نے اسے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ کسی شہزادے کی طرح دکھائی دیا تھا۔ وہ جوان اور اسمارٹ تھا۔ خوش پوش بھی تھا اور کسی اعلیٰ

گھرانے کا فرد بھی۔ اس کی رنگت نکھری ہوئی سانولی تھی۔

میں نے اپنے تصور اور خواب میں کبھی کسی ایسے تصوراتی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا اس لیے میں جو ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی میں جانتی تھی کہ میرا مقام اور اوقات کیا ہے۔ میں چونکہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی اس لیے خواب نہیں دیکھتی تھی۔ یوں تو کون ایسا تھا جو خواب نہ دیکھتا ہو مگر میں جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے کی عادی نہ تھی۔

میری حیرانی کئی دنوں تک میرے دل کے کونوں میں بسی رہی تھی کہ رضوان کے گھرانے نے ایسے گھر کی لڑکی کس لیے پسند کی جو اپنے ساتھ مطلوبہ جہیز لانے سے قاصر ہے۔ شاید اس لیے میرا حسن و شباب ایک ایسا جہیز ہے جس کے آگے کوئی خزانہ بھی ماند ہو جائے۔ ادھر رضوان کی حیثیت، مرتبہ اور اعلیٰ خاندان میرے گھر والوں کو بھا گیا تھا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے صرف لڑکی چاہیے۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ ایک لڑکی کا حسن کیا معنی رکھتا ہے۔

رضوان مجھے دیکھتے ہی مجھ پر اس بری طرح فریفتہ ہوا تھا کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ رضوان کو پا کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کوئی ادھورا خواب پورا ہو گیا اور زندگی جھوم اٹھی تھی۔ اس نے اتنا پیار دیا کہ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ کون سا دن اور رات تھی جس پر سندر سپنے کا دھوکا نہ ہوتا ہو، مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرد کے پیار کی کوئی حد تک نہیں ہوتی۔ کتنے ہی دن سہانے اور رنگین خوابوں کی طرح گزر گئے۔ اتنی گرم جوشی اور وارفتگی ہوتی کہ میں نڈھال اور تھکن سے چور پڑی رہتی۔ ادھر میں رضوان کی چاہت میں ایسی پاگل ہو جاتی تھی کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر خود سپردگی اور فیاضی سے اس پر مہربان ہوتی رہتی تھی۔

رضوان نے ایک لگژری فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا جس میں تین بیڈ رومز، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم تھے۔ لاؤنج بھی بے حد وسیع اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پیار میں گھر والوں کی دخل اندازی ہوتی ہے لیکن مجھے رضوان سے اس بات پر اختلاف تھا مگر میں نے اس کی خوشنودی کے لیے اسے دیوار نہیں بنایا۔ تاہم میں نے اشارے کنایوں میں اس کے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ رضوان نے اپنی مرضی اور خوشی سے یہ فلیٹ کرائے پر لیا ہے تاکہ مجھ پر الزام نہ آ جائے کہ اس میں میری خواہش کا دخل ہے اور میں مفت میں بدنام ہو جاؤں۔

میں نے غیر محسوس انداز سے یہ سب ظاہر کر دیا تھا۔

ہم اس خوب صورت، آراستہ و پیراستہ اور خواب ناک ماحول کے لگژری فلیٹ میں آ گئے۔ اس کی آرائش و زیبائش پر اس نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا تاکہ اس کے کونے کونے سے راحت و آسائش مل سکے۔

رضوان ملٹی نیشنل فرم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا مگر اس عہدے پر قانع نہیں تھا اور آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں زندگی کو جنت کی طرح ہونا چاہیے تھا مگر میں اس زندگی سے مطمئن اور سرشار تھی کہ خواب میں بھی مجھے ایسی زندگی نہیں مل سکتی۔ اسی لیے نازاں اور شاکر تھی کہ میں نشیب و فراز سے گزر کر اس طلسماتی دنیا میں آئی تھی جو ہر طرح سے سحر انگیز تھی۔

میں نے رضوان سے کئی بار پوچھا بھی تھا کہ تم آخر کس زندگی کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہو؟ کیا یہ سب کچھ ہمارے لیے بہت زیادہ نہیں ہے؟ بہت آگے جا کر کیا کرو گے؟ کس لیے تم اتنا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو؟ وہ زندگی کس تصرف میں آئے گی؟

اسے میری باتیں سن کر ہنسی آتی تھی اس لیے کہ اس نے ابھی تک وہ نہیں پایا تھا جو پانا چاہتا تھا۔ وہ بہت کچھ پانا چاہتا تھا، اس کی اندھا دھند دوڑ دیکھ کر میرے دل کے کسی کونے میں ایک انجانا سا خوف زہریلے سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا اس لیے کہ اس میں آسمان کی وسعتوں کو پانے کی خواہش روز بہ روز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی عجلت پسند فطرت کی وجہ سے سب کچھ پا لینا چاہتا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں جو خوف بیٹھا تھا وہ یہ تھا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔

میں نے بہت جلد اس کی باتوں اور خیالات سے محسوس کر لیا تھا بلکہ رضوان نے غیر محسوس انداز سے سمجھایا بھی تھا کہ کسی منزل پر پہنچنے اور بلندیوں کو چھونے کے لیے ایک نہیں کئی راستے ہوتے ہیں گو ہر راستہ جدا ہوتا ہے مگر وہ منزل پر ضرور پہنچاتا ہے اس لیے ان راستوں پر سے کسی ایک راستے پر چلنا پڑتا ہے پھر اس راستے کا انتخاب اپنی پسند اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ اس نے مجھ سے کئی بار یہ کہا تھا کہ ہم کچھ برس کے بعد دنیا کی سیر و سیاحت پر نکل جائیں گے۔ دنیا کا ہر وہ حسین خطہ دیکھ کر آئیں گے جو خوش نصیبوں کے لیے ہے۔ اس کے بعد ہم ہر برس جاتے رہیں گے۔ وہ دن ہماری زندگی کے سب سے حسین ہوں گے۔ اگر کوئی خلل

پسند آیا تو وہیں بس جائیں گے۔

رضوان نے غیر محسوس انداز سے میرے مزاج میں کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر لباس میں خوب نظر آتا تھا۔ کیونکہ میرے لباس میں وہ حجاب نہ رہا تھا جو میں شرم و حیا سے اسے بے حجاب نہ ہونے دیتی۔ بغیر آستین اور نیچی تراش کا بلاؤز، انتہائی چست سوٹ ایسا لباس پہن کر میں تقریبات میں شرکت کرنے لگی جو میری ذات کی بھرپور نمائش کرتا تھا اور میں اپنے بدن پر کتنی نگاہیں جو حریصانہ ہوتی تھیں چبھی محسوس کرتی تھیں۔

یہ بات صرف یہیں تک محدود نہیں تھی۔ کمپنی کے چیئرمین احسان ملک میرے لیے وبال جان بن گئے تھے۔ رضوان چاہتا تھا کہ میں محفلوں میں سنجیدگی اور بے اعتنائی کے خول میں بند نہ رہوں۔ کم از کم کسی اور سے نہ سہی احسان ملک صاحب سے خوب گھل مل کر اور بے تکلفی سے باتیں کروں۔ خود کو ایک ہنس مکھ اور زندہ دل قسم کی عورت کی طرح خود کو پیش کروں جیسے ان کی دیرینہ دوست ہو۔ ان کے ساتھ اکیلی کلب میں جایا کروں۔ وہ بعض تقریبات میں بھی کسی بہانے سے میری عریاں گداز بانہیں تھام کر کہتے، چلیں ڈنر شروع ہو رہا ہے۔ بعض اوقات غیر محسوس انداز میں میری عریاں کمر میں ہاتھ ڈال کر پوچھتے کہ آپ کیا پینا پسند کریں گی۔ میں بھری محفل میں ان کا ہاتھ جھڑکنے سے رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسے موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں جہاں تنہائی ہو تو مجھے دبوچ لیں۔ رضوان کو شلوار قمیص سے چڑ تھی۔ وہ مجھے بلاؤز اور ساڑی میں لے جاتا تھا۔ بلاؤز کیا تھا وہ زیر جامہ لگتا تھا۔ کالی ساڑی میں میری ہیئت قیامت ہو جاتی تھی۔ اب میری لمبی چوٹی بھی نہیں رہی تھی۔ بال نفاست سے گردن تک ترشے ہوئے تھے۔

ایک روز ہم تینوں نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ اس سے ایک روز قبل رضوان نے مجھے ان کے ساتھ کلب بھیج دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کلب کے کس کمرے میں لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ جھانسا دیا کہ امی کی طبیعت ناساز ہے، میں میکے جا رہی ہوں۔ اتوار کے روز پکنک کا پروگرام بنایا۔ عین وقت پر راستے میں کسی بہانے کچھ دیر کے لیے کھسک گیا۔ سینڈز پٹ پہنچ کر احسان ملک کے بنگلا نما فلیٹ میں پہنچے۔ رضوان کوئی تین گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا تھا۔ اس تین گھنٹے کی تنہائی میں احسان ملک نے بے تکلفی کی حدوں کو پھلانگنے کی کوشش کی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے تیور نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ پھر میرے دائرے کے اندر تک نہ آ سکے تھے۔ اگر میں ذرا سا بھی بے تکلف ہو جاتی اور ہنس کر بات کر لیتی تو مجھ پر آنچ آنا ضروری تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ رضوان مجھے ترقی کا زینہ بنا رہا ہے۔ اسے ایک حسین اور پُرشباب گداز بدن کی ایک لڑکی کی تلاش تھی جو عام گھرانے کی ہو، اس لیے اس نے مجھے پسند کیا اور بغیر جہیز کے شادی کی۔ مجھے خواب ناک زندگی کے سحر میں جکڑنے کے لیے لگژری فلیٹ میں رکھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میں اس انجانے راستے پر بہک جاؤں گی کیونکہ میں زندگی اور احساس محرومیوں کے نشیب و فراز سے گزری ہوئی ہوں۔ اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میں اس کی سوچ کے برعکس نکلی۔

اس روز کے بعد سے مجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ میں ان تقریبات میں اس کے ہاں جانے سے کسی نہ کسی بہانے سے کترانے لگی جہاں لڑکیاں اور عورتیں غیر مردوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نہ صرف چہکتی تھیں بلکہ ان سے اس طرح گھل مل کر بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں جیسے وہ ان کے شوہر یا محبوب ہوں۔ میں نے یہ دیکھا کہ احسان ملک صاحب دو ایک عورتوں کو غیر محسوس انداز سے محفل سے لے کر غائب ہو جاتے، کچھ دیر بعد پہلے عورتیں آتیں تو ان کے بال اور لباس بے ترتیب ہوتے۔ گزرے لمحات کا فسانہ ان کے چہروں سے عیاں ہوتا مگر خوش دکھائی دیتیں جیسا کہ بعد میں میرے علم میں آیا کہ یہ احسان ملک کے دفتر کی ہیں۔

رضوان نے بار بار مجھے سمجھانا اور کہنا شروع کر دیا۔ اس کا لہجہ شکایتی سا ہوتا تھا۔

''احسان ملک صاحب سے گھر یا کسی تقریب میں ملاقات ہوتی ہے تو دور دور کیوں رہتی ہو؟ وہ میرے باس ہیں۔ انہی کے ہاتھ میں تو میری ترقی کی کنجی ہے۔ یہ لگژری فلیٹ اور اس کا کرایہ اور کار تو انہوں نے ہی تو مجھے دی ہے، تمہارا ان سے گہری دوستی رکھنا بے تکلفی سے ملنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا میری ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے مگر تم ہو کہ انہیں لفٹ ہی نہیں کراتیں جس کی شکایت انہوں نے مجھ سے کئی بار کی ہے۔ آج کل تو تم کسی تقریب میں شرکت نہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانا بنا دیتی ہو اور اگر کسی تقریب میں جاتی ہو تو ایسا لباس پہن کر جاتی ہو جیسے میلاد یا تبلیغ کی محفل میں جا رہی ہو۔''

میں یہ سب کچھ خاموشی سے سن لیتی تھی اور پھر صاف صاف جواب دیتی تھی۔ ''آپ میرے شوہر ہیں۔ مجازی خدا

ہیں۔ احسان ملک میرے لیے نامحرم ہیں۔ ایک بیوی کا سنگھار اس کے شوہر کے لیے ہوتا ہے۔ میں اپنے حسن کی تعریف صرف آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔ ایک بیوی ہونے کے ناطے یہ بات مجھے قطعی پسند نہیں کہ کوئی غیر مرد میرے حسن اور میرے سراپا کی تعریف کرے۔ مجھے ندیدی نظروں سے گھورے۔ اس کی تعریف مجھے زہر لگتی ہے۔ آپ کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہونا چاہیے لیکن آپ ہیں کہ خوش ہو جاتے ہیں۔''

رضوان تمسخرانہ انداز سے کہتا تھا۔ ''تم اس دور میں پاگل پن کی باتیں کرتی ہو۔ سنو! میں ایسی بکواس اور خرافات سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

ہم دونوں کی شادی دو برس سے زیادہ نہ چل سکی۔ رضوان نے جب دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ اب وہ میرے حسن و شباب کو ترقی کا زینہ نہیں بنا سکتا تو اس نے مجھے طلاق دے دی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں احسان ملک کی جھولی میں ایک پھل کی طرح ٹپکتی رہوں۔ میں ایک روایتی عورت کی طرح طلاق پر نہ تو گڑگڑائی اور نہ ہی روئی۔ میں نے سوچا کہ اس بے حیائی کی زندگی اور کھلونا بننے سے تو بہتر ہے کہ مجھے طلاق مل جائے۔ طلاق کے بعد میں کسی غریب اور شریف آدمی کی بیوی بن کر اس کے قدموں میں اپنی زندگی گزار لوں۔

میں طلاق لے کر گھر آ گئی۔ میرے گھر والوں نے میرے زخموں پر ہمدردی سے مرہم لگایا۔ جذباتی محبت کا بڑا اظہار کیا مگر رفتہ رفتہ جذباتی محبت کا رنگ و روغن اترنے لگا تو مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا جانے لگا کہ میں نے دانستہ رضوان کو کھو دیا۔ ایسا ہیرا جیسا شوہر تھا کہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہیے جس نے مجھے ایک مہارانی کی طرح رکھا ہوا تھا۔ یہ سب اس کے لیے کہا جا رہا تھا جس نے مجھ پر مطلقہ کا لیبل لگایا تھا۔ میں کیوں کر بتاتی کہ اصل بات کیا تھی؟ یہ بات ایسی تھی کہ کسی کو بھی گھر میں اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میں نے انہیں صرف یہ بتایا کہ رضوان نے اپنی سیکریٹری سے دوسری شادی خفیہ کر لی ہے۔

طلاق کے لیبل کی وجہ سے میری بہنوں کی شادیوں کے لیے جو حسین و جمیل رشتے نہیں آ رہے تھے، میری داغ نے انہیں داغ دار کر دیا تھا گھر کے ہر فرد کی نظر میں میری حیثیت ایک خارش زدہ کتیا کی سی ہو گئی تھی۔ میرے لیے ماں باپ کا سہارا نہ ہوتا تو میں خودکشی کر لیتی لیکن میں نے پھر خودکشی اس لیے نہیں کی کہ زندگی پھر بھی بہت پیاری اور قیمتی ہوتی ہے۔ میں اس لیے مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ ہر حال میں رہنا تھا اس اُمید پر کہ کوئی مجھے قبول کر لے گا۔ اس میں شک نہیں کہ میرا حسن و شباب، گداز بدن اور تناسب مردوں کو متوجہ کرتا ہے۔ جب بھی میں کسی کام یا سودا سلف لینے بازار جاتی تھی مرد مجھے بار بار اور مڑ مڑ کر اس طرح دیکھتے تھے جیسے فطری حالت میں ہوں۔ ان کی حریصانہ نگاہیں میرے انگ انگ سے لپٹی پڑتی تھیں۔ یہی میری خود فریبی تھی جس نے مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس معاشرے میں مطلقہ ایک کوڑھ زدہ سے کم نہیں ہوتی ہے۔ اب میرا گھر خواب میں بھی نہیں بسے گا۔ حسین ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھل کیسا ہی رسیلا اور تر و تازہ نظر آئے اگر اس پر داغ ہو تو خریدار اسے خریدتا نہیں ہے۔

ماں، باپ، بھائی بھابی اور بہنوں کی نفرتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ رشتے داروں اور ملنے والوں نے بھی میرے دل کو کم اذیت نہیں پہنچائی۔ ان کی باتیں میرے دل میں زہریلے ڈنک کی طرح چبھتی رہتی تھیں۔ میرے لیے کہیں اور پناہ نہیں تھی۔ میں نے نفرتوں اور حقارتوں سے بچنے کے لیے اسکول میں ملازمت کر لی۔ میرے پاس دن میں چند گھنٹے ان سے نجات پانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میں نے اپنے ہی گھر میں ایک الگ دنیا بنا لی تھی۔ اپنے آپ کو اپنی ذات میں گم کر لیا تھا۔ میں کسی تقریب میں شرکت نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کوئی مجھے بلا کر خوش ہوتا تھا۔ اگر میں کسی لڑکی کی شادی میں شرکت کرتی تو لڑکی والے اس پر میرا سایہ تک پڑنے نہیں دیتے تھے۔ میں دنیا والوں کی نظروں میں قصوروار اور منحوس تھی۔ کسی نے بھی میرا دکھ درد، غم اور کرب جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی میرا کوئی غمگسار تھا۔ میں تنہائی کی آگ میں جل رہی تھی۔ گھر میں دن رات گھر والوں کی خدمت کر رہی تھی۔ اس کے باوجود کوئی مجھ سے خوش نہ تھا۔

☆.....☆

نازنین کا رشتہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ لڑکے والوں نے اپنی پسند کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ امی کو حتمی جواب کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب زیتون خالہ سے کہا تو جواب آیا کہ لڑکی اور اس کے خاندان کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے۔ چند دنوں میں وہ اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں گے۔

میں اس چھان بین کی تہہ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ نازنین

اور میرے گھر والوں کے بارے میں نہیں بلکہ میرے بارے میں چھان بین کر رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں طلاق کی وجہ کیا تھی؟ اتنی حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی کو اتنی جلدی طلاق کیوں مل گئی تھی؟ کہیں اس لڑکی کا چال چلن خراب تو نہیں تھا؟ اگر اس کا چال چلن خراب ہے تو اس کی بہنوں کا بھی ہوگا؟ ان کا کردار بھی اچھا نہیں ہوگا۔ وہ لوگ شاید میرے کردار کی روشنی میں نازنین کو پسند کرنا چاہتے تھے۔ نازنین کے لیے میں ایک کانٹا بن گئی تھی۔

ایک روز اچانک زیب النساء آ گئیں۔ وہ بغیر اطلاع کے آدھمکی تھیں۔ چھان بین کرنے اور لڑکی کو پرکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے۔ اس روز اتفاق سے گھر کے تمام افراد ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے۔ میں گھر پر اکیلی تھی اور اپنی کاٹ کھانے والی تنہائی دور کرنے کے لیے گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ کیونکہ مصروفیت سے دکھ اور ذہن کس قدر بٹ جاتا ہے۔ میں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''یہ تم شادی میں کیوں نہیں گئیں؟''

''میں کسی شادی میں جاتی ہوں تو مجھے ایک وحشت سی ہوتی ہے۔ جی بہت گھبراتا ہے۔''

''کیا ملنے والوں اور رشتے داروں کی باتوں سے.....؟''

''جی..... جی.....'' میرے منہ سے غیر اختیاری طور پر نکل گیا۔

وہ مجھ سے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں اور پھر کچھ دیر نازنین بھی موضوع بنی رہی۔ پھر انہوں نے مجھے بھی غیر محسوس انداز سے کریدا۔ میرا ماضی تو کسی بجھے ہوئے آتش فشاں کی طرح تھا لیکن آج بھی اس میں سے دھواں اٹھتا رہتا تھا جو دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں بجھتے ہوئے انگارے تھے۔ میرے دل میں تو بہت سارے پھپھولے تھے۔ ان کی باتوں میں ایسی ہمدردی تھی، ایسی مٹھاس اور ایسی اپنائیت تھی کہ میں کچھ پھپھولے پھوڑے بغیر نہ رہ سکی۔ معلوم نہیں کیوں دل بڑا ہلکا سا محسوس ہوا۔ پھر میں نے انہیں رات کے کھانے پر اصرار کر کے روک لیا۔

جب وہ جانے لگیں تو میں نے ان سے پوچھا۔ ''آپ نے ابھی تک فیصلے سے آگاہ نہیں کیا؟''

''بھئی! لڑکی تو میں نے اسی دن پسند کر لی تھی۔''

''سچ۔'' میں خوش ہو گئی۔ ''پھر آپ نے.....''

وہ میری بات کاٹ کر بولیں۔ ''میرا بیٹا اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اس سے بھی تو رائے مشورہ لینا بے حد ضروری تھا۔ اسے کچھ سمجھانا بھی تھا اس لیے کہ آج کل لڑکے، لڑکی کے بارے میں بہت خواب دیکھتے ہیں لڑکا کل ہی آیا ہے۔ اسے میری پسند اور انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کل زیتون خالہ تمہاری امی کو آ کر بتا دیں گی کہ ہم بات چیت پکی کرنے کون سے دن آئیں گے۔''

نازنین کو پسند کرنے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو رہی تھی۔ تین برسوں کے بعد پہلی بار میرے من میں کوئی خوشی پھوٹی تھی۔ میری اس بے پناہ خوشی کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ شاید میں بھی کر نہیں پا رہی تھی اس لیے کہ میری ذات نازنین کے مستقبل کے لیے دیوار نہیں بنی تھی۔ اب میری ذات کسی بھی بہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

میں حسبِ معمول اسکول چلی گئی تھی۔ دوپہر کو اسکول سے لوٹی تو پتا چلا کہ زیتون خالہ آ کر گئی ہیں۔ گھر میں پُراسرار سی خاموشی طاری تھی۔ میں نے کھلی فضا میں کبھی ایسی وحشت گھلی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ امی نے جس لہجے میں مجھے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا تھا اس نے میرے سینے میں ایک عجیب سی دھک دھک بھر دی تھی۔ امی نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔ ''زیب النساء نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ نازنین کا نہیں تمہارا۔ وہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرنا چاہتی ہیں۔ کیا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟''

☆☆☆

میں نے شادی کے ایک ہفتے بعد تنہائی میں اپنی ساس سے پوچھا۔ ''امی! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ نے ایک مطلقہ کو بہو بنانا کیوں پسند کیا؟''

''بس یہ سمجھ لو کہ ایک عورت ہونے کے ناتے۔''

''مگر امی کتنی ہی عورتیں مجھے اپنی بہو بنانا تو درکنار وہ میرا سایہ تک اپنے گھر پر پڑتا دیکھ نہیں سکتیں مگر آپ نے مجھے ایک کنواری لڑکی پر ترجیح دی، اس کے لیے آپ نے شاید کوئی اہم خیال بھی بنایا؟''

''جو درد سے گزر چکا ہو اور جو گزر رہا ہو، وہی درد آشنا ہوتا ہے بیٹی۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بولیں۔ ''میں نے تمہیں اپنی بہو اس لیے بنایا کہ میں بھی ایک مطلقہ ہوں۔ اس پل صراط سے گزر چکی ہوں جس سے تم گزری ہو۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی کل میری طرح درد آشنا ہو۔''

++

سفرِ آخرت

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
یہ روداد میرے ایک جاننے والے کی ہے۔ شمسی صاحب ایک دیندار آدمی ہیں۔ انہوں نے جس طرح ہاشمی صاحب کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ وہ سبق آموز ہے اسی لیے میں نے اسے بطور کہانی بیان کردی ہے۔

عمران قریشی
(کوئٹہ)

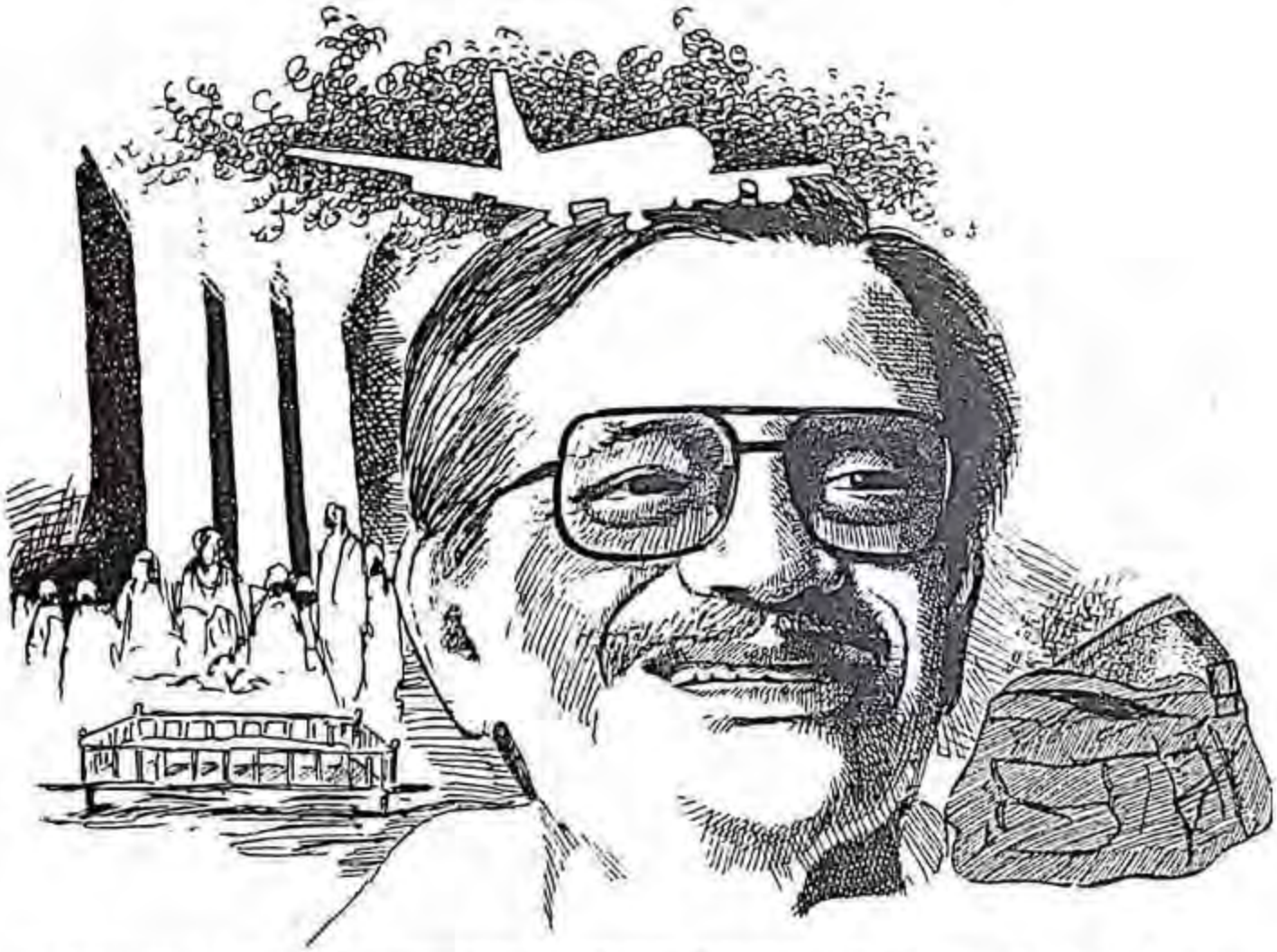

ایمبولینس سینٹرل اسپتال کی دو منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔ عملے نے دروازے کو کھول کر اسٹریچر پر بندھے بیگم رانا کے بے سدھ وجود کو احتیاط کے ساتھ نیچے اتارا اور عمارت کے اندر لے گئے۔ رانا صاحب ان کے پیچھے تھے تاہم ہاشمی صاحب بہ آہستگی وہاں سے کھسک گئے۔ انہیں صدر تک کے لیے لفٹ درکار تھی۔ کوئی بھی گاڑی والا لفٹ دینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ تب وہ قریبی محلے میں کھڑی ایمبولینس کی طرف چلے آئے۔ بیگم رانا کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا

تھا اور وہ عالم مدہوشی میں دنیا و مافیہا سے بے گانہ تھیں۔ دوران سفر ان کی بیماری پر گفت و شنید کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہاشمی صاحب بلڈ پریشر کی بیماری پر نہایت تفصیل کے ساتھ لیکچر دیتے رہے اور رانا صاحب احسان بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ ہاشمی صاحب کا یوں پُرخلوص انداز میں اسپتال تک چلے آنا ان کی نگاہ میں عام بات نہیں تھی۔ نفسانفسی کے اس دور میں محبت اور خلوص برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم اسپتال میں جم غفیر کے درمیان وہ ہاشمی صاحب کو فرار ہوتے دیکھ نہیں سکے۔ سینٹرل اسپتال کی عمارت سے کچھ آگے ریلوے کا پل بنا تھا۔ اسے عبور کرتے ہوئے ہاشمی صاحب نے دل کو تسلی دی۔ بلڈ پریشر کی بیماری جان لیوا نہیں ہوتی۔ مختصر علاج سے بیگم رانا کو افاقہ ہو جائے گا اس کے لیے دو بندوں کا اسپتال میں جانا کچھ خاص معنی نہیں رکھتا۔ ایک پنتھ دو کاج کے مترادف انہوں نے رانا صاحب کو سہارا دینے کے لیے اسپتال تک ساتھ دیا اور اسپتال سے آگے کا سفر پیدل طے کر کے بس کی خواری اور کرائے کی بچت کر لی۔

ریلوے کی سیڑھیاں اتر کر وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے استعمال شدہ اشیاء کی خرید و فروخت والے بازار میں داخل ہو گئے۔ انہیں ایک مضبوط اور پائیدار بیگ چاہیے تھا جو نا صرف بچت کے لحاظ سے معقول ہو بلکہ اس میں سامان بھی زیادہ آتا ہو۔ قابل سکون بات یہ تھی کہ مارکیٹ کے اوپر ترپال کی چھت تھی۔ اس کی وجہ سے یہاں حبس بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ وہاں مارکیٹ کا اندرونی حصہ سورج کی تباہ کاریوں سے بھی کافی حد تک محفوظ تھا۔ دکانداروں نے پنکھے اور ایئر کولر لگائے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ان کی جسمانی کیفیت اعتدال پر آنے لگی اور وہ مستعدی کے ساتھ بیگ کی تلاش میں مگن ہو گئے۔ انہیں کئی بیگ پسند آئے لیکن قیمت مناسب نہ ہونے کی وجہ سے سودا نہ بننے پایا۔ جو مناسب قیمت کے تھے، ان کا معیار قابل تسلی نہیں تھا۔ تمام مارکیٹ چھان مارنے کے بعد آخر کار وہ ایک ایسا بیگ تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے جس کی نہ صرف قیمت مناسب تھی بلکہ وہ نہایت مضبوط اور قابل ستائش بھی تھا۔ ہاشمی صاحب نے بیگ میں وہ نقص تلاش کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے اسے استعمال شدہ اشیاء کی مارکیٹ میں فروخت کیا گیا تھا۔ جلد ہی انہوں نے اسے تلاش کر لیا۔ یہ بیگ کی نشست پر چند بدنما داغ تھے، ڈیٹرجنٹ پاؤڈر سے دھونے کے باوجود بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی داڑھی کو کھجاتے ہوئے داغوں کا بغور معائنہ کیا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''شاید میرے لیے اس کی خریداری ممکن نہیں۔ دیار غیر میں جب میں ان بدنما داغوں کے ساتھ ملک کی نمایندگی کروں گا۔ تب میرے علاوہ ملک کی عزت پر بھی حرف آئے گا۔''

دکاندار نے حیرت بھری نگاہوں سے ہاشمی صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر گویا ہوا۔ ''چند ماہ قبل جس غیر ملکی ٹورسٹ نے اسے میرے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ بیگ لے کر آدھی دنیا گھوم چکا ہے۔ اس کی عزت پر تو کوئی حرف نہیں آیا۔ نہ جانے آپ کو کیوں یہ خدشہ لاحق ہو رہا ہے۔''

ہاشمی صاحب نے چونکتے ہوئے دکاندار کی طرف دیکھا، پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''اچھا ہوا میاں کہ تم نے اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیا کہ بیگ آدھی دنیا کا سفر کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی قیمت تو اور بھی کم ہونا چاہیے۔ اب تو سودا بالکل ہی ختم سمجھو۔'' انہوں نے دکان سے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

دکاندار نے پوچھا۔ ''آپ اپنی قیمت خرید تو بتائیے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں رعایت کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ہاشمی صاحب نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اپنی جیب کے مطابق اسے قیمت بتا دی۔

ہر چند کہ یہ بہت کم تھی تاہم اس دن کے لیے وہ دکاندار کے پہلے گاہک تھے، اس لیے چند منٹوں کی تکرار کے بعد سودا طے پا گیا اور بیگ ان کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے دکاندار نے انہیں یقین دلایا کہ اگر وہ بیرونِ ملک سے واپسی کے بعد بیگ واپس کرنے کے لیے اس کے پاس لائیں گے تو وہ بہ خوشی واپس لے لے گا۔ ہاشمی صاحب نے قیمت ادا کی اور بیگ اٹھا کر دکان سے باہر آ گئے۔

مارکیٹ سے باہر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ پیدل چلنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ انہوں نے صدر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بیگ کا وزن زیادہ نہیں تھا لیکن کڑکتی دھوپ میں اسے اٹھا کر چلنا ان کے لیے مشکل تھا۔ تھک ہار کر وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ گاڑیوں کا ایک طوفان تھا جو مخالف سمت سے امڈتا چلا آ رہا تھا۔ سڑک کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ انہیں سڑک کے دوسری طرف جانے کی حاجت بھی نہیں تھی۔ وہ صدر تک لفٹ لینا چاہتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بڑھتی ہوئی عمر کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی گاڑی والا انہیں لفٹ دے دیا کرتا تھا

لیکن آج وہ سب بھی شاید گرمی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کتنی ہی گاڑیاں تیز رفتاری کے ساتھ ان کے کمزور وجود کا مذاق اڑاتی ہوئی گزر گئیں لیکن انہوں نے رکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ زبان سوکھ کر کانٹا بننے لگی۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ انہیں سورج کی ناقابل برداشت تپش کی بدولت اپنا دماغ کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یکے بعد دیگرے تین گاڑیوں کے بریکوں کی آوازیں انہیں سنائی دیں۔ انہوں نے کن انکھیوں سے سامنے کی طرف دیکھا۔ دو گاڑیاں فٹ پاتھ کے قریب کھڑی تھیں اور چار افراد ان میں سے نکل کر ہاشمی صاحب کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے نڈھال ہوتے جسم کو خرید کردہ بیگ کے اوپر گرا دیا۔ چاروں افراد ان کے قریب آ گئے۔ انہوں نے مل کر ہاشمی صاحب کو ایک گاڑی میں منتقل کر دیا۔ اے سی کی فرحت بخش ٹھنڈک نے ان کے جسم کو آسودہ کیا اور تیزی کے ساتھ بہتا ہوا پسینا خشک ہونے لگا، دو افراد ان پر جھکے ہوئے ان کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ انہوں نے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا:

''میرا شوگر لیول گرتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ پینے کو مل جائے تو تمام زندگی دعائیں دیتا رہوں گا۔'' ان میں سے ایک قریبی کھوکھے کی طرف چلا گیا اور دوسرے نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا:

''کہاں جائیے گا؟''

''صدر..... تاہم اگر آپ اس طرف نہ جا رہے ہوں تو مجھے قریبی چوک پر اتار دیجیے گا۔ میں وہاں سے آگے پیدل چلا جاؤں گا۔'' آدمی بولا۔

''اتفاق سے ہم صدر ہی جا رہے ہیں۔ آپ کو راستے میں جہاں کہیں گے وہیں اتار دیں گے۔'' دوسرا آدمی کوک کی بوتل لے آیا۔ انہوں نے ایک ہی گھونٹ میں بوتل ختم کر کے واپس اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ پہلے آدمی نے خرید کردہ بیگ ہاشمی صاحب کے حوالے کیا اور دوسرے آدمی کے واپس آنے کے فوراً بعد گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔ ہاشمی صاحب نے بات چیت کو بڑھانے کی نیت سے کہا:

''آج خلاف معمول گرمی بہت زیادہ ہے۔ میں ایسے عالم میں عموماً ٹیکسی استعمال کرتا ہوں لیکن بیگ کی خریداری کے دوران دکاندار نے ایسی چڑی اڑیڑی کہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی رہنے نہ پائی۔ صدر میں ہمارے محکمے کا مخصوص بینک ہے۔ میں رقم نکالنے کے لیے وہاں جا رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ''کون سے محکمے میں کام کرتے ہیں؟''

''ہیں نہیں، تھا۔ دو سال قبل میونسپل کارپوریشن سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ پنشن میں اچھی خاصی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ آگے پیچھے فضول خرچی کرنے والا کوئی ہے نہیں۔ زیادہ رقم تو پس انداز کر لیتا ہوں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔ ''شادی کیوں نہیں کی۔ بیوی اور بچے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں۔''

''شادی تو میری جوانی میں ہی کر دی گئی تھی تاہم بیوی بڑھاپے تک ساتھ نہ نبھا سکی اور دوران سفر داغ مفارقت دے گئی۔ بچے پینتیس سالہ زندگی کے دوران ہوئے ہی نہیں۔''

گاڑی نے موڑ کاٹا اور صدر میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ والے نوجوان نے پوچھا۔ ''کہاں پر اتریں گے؟ صدر تو آ گیا۔''

ہاشمی صاحب نے بتایا۔ ''یونین پلازا کے نیچے بینک ہے مجھے پنشن نکلوانے میں پندرہ منٹ لگیں گے۔ اگر آپ دونوں دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔''

دوسرا نوجوان بولا۔ ''پھر کبھی سہی تاہم آپ کی رہائش اگر قریب ہے تو ہم آپ کو وہاں چھوڑ سکتے ہیں، گرمی میں کہاں خوار ہوتے پھریں گے۔''

''میں آپ دونوں کو مزید زحمت نہیں دوں گا اگر میزبانی کا شرف دینے کے لیے آمادہ ہیں تو مجھے آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی ہو گی۔''

''ہمیں صدر میں کچھ زیادہ کام نہیں ہے اگر آپ جلدی فارغ ہو جاتے ہیں تو ہم آپ کو رہائش گاہ پر اتار دیں گے۔ تاہم کھانے کا وعدہ نہیں کر سکتے۔ ایک کپ چائے کے لیے آپ کو پھر کبھی زحمت دیں گے۔'' پہلا شخص بولا۔

ہاشمی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور سڑک کو پار کر کے یونین پلازا کے اندر آ گئے۔

وہ دل میں شکر ادا کر رہے تھے کہ ان دونوں نے ان کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اگر کر بھی لیتے تب انہیں گزشتہ رات کی دال روٹی پر ٹرخانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ بینک میں رش بہت زیادہ تھا۔ پنشن کی رقم نکالنے کے بعد انہوں نے ڈپازٹ کی ہوئی رقم پر سود کی رقم حاصل کی اور اس سے گیس، بجلی کے بل ادا کیے۔ ہر چند کہ وہ سود لینے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ خدا سے جنگ کے مترادف تھا۔ تاہم وہ اسے اپنی ذات پر استعمال

کرنے کی بجائے حکومت سے ہاتھا پائی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ گورنمنٹ سے سود لینے کے بعد وہ ٹیکسوں کی ادائیگی سود کی صورت میں واپس کرتے تھے۔ بینک کی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے قریب ہی واقع ٹورزم کے آفس کا رخ کیا اور بیرون ملک واقع چند شہروں کی تفصیل بمعہ ہوٹلوں سے متعلق کرائے، کھانے پینے کے اخراجات کی رقم کا تخمینہ حاصل کرنے کے بعد ان ممالک سے متعلق چند پمفلٹ ہاتھ میں تھامے باہر نکل آئے۔ یونین پلازا کے سامنے دونوں افراد ان کے منتظر تھے۔ ان کے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ آگے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

ملتانی محلہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی پکی گلیوں پر مشتمل آبادی تھی۔ بڑی گاڑیاں اندر جانے کے قابل نہیں تھیں۔ اس لیے ان دونوں نے ہاشمی صاحب کو ذیلی سڑک پر اتار دیا اور وہ سفری بیگ سنبھالے گلیوں سے گزرتے ہوئے گھر کی طرف آ گئے۔ محلے کے چند افراد گیس اور بجلی کے بل ہاتھوں میں تھامے ان کے منتظر تھے۔ انہوں نے بل ان کے ہاتھوں سے لیے اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلا کمرا سیٹنگ روم اور دوسرا بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ باتھ روم اور کچن کمروں سے منسلک تھے۔ تاہم ان کے استعمال کی نوبت کم کم ہی آتی تھی۔ وہ ہاشمی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور کے مترادف صرف لوگوں پر اثر ڈالنے کے لیے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے سفری بیگ اور پمفلٹوں کو سالخوردہ الماری کے اندر رکھا اور پنشن کی رقم کا معائنہ کرنے لگے۔ اس دفعہ رقم پچھلے ماہ کی نسبت کچھ کم تھی۔ گورنمنٹ نے چند ٹیکس لگا کر اس میں تخفیف کر دی تھی۔ ان کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم انہوں نے ان پر قابو پا لیا۔ وہ ٹیکسوں کی تلافی کے طور پر محلے والوں کے بلوں سے حاصل ہونے والے منافع میں زیادتی کر سکتے تھے۔ ان کے پاس معقول جواز موجود تھا۔ وہ سامان کی پیکنگ میں مصروف ہو گئے۔ تاہم دماغ مستعدی کے ساتھ چلتا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں بیرون ملک سفر کے لیے خطیر رقم درکار تھی۔ پنشن سے حاصل ہونے والی رقم مناسب تھی۔ تاہم اخراجات کی مد میں خرچ ہونے والی رقم وٹل انداز ہو رہی تھی۔ اگر کھانے پینے پر خرچ کے علاوہ بل اور مکان کے کرائے سب کو ٹیکس ختم کر دیا جاتا تب وہ رقم کا بندوبست بہ خوبی کر سکتے تھے۔ مکان کا کرایہ اور بل ادا کرنے کے لیے انہوں نے ریٹائرمنٹ کی رقم کو بینک میں رکھا اور سود سے حاصل ہونے والی رقم سے بلوں اور مکان کے کرائے کی ادائیگی شروع کر دی۔ ملتانی محلے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد گیس اور بجلی کے بلوں کی بے وقت آمد سے پریشان تھے۔ یہ بل عموماً مہینے کے آخری دنوں میں نازل ہوا کرتے تھے۔ ان ایام کے دوران ملازمت پیشہ افراد کے پاس بلوں کی ادائیگی کے لیے رقم نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ ہاشمی صاحب نے ان کے سامنے تجویز رکھتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا کہ اگر وہ محلے والوں کے بجلی اور گیس کے بل اپنی پنشن سے جمع کروا دیں تب مہینے کی تنخواہ لینے کے بعد فی گھرانا پچاس روپے کے عوض انہیں محدود معاوضہ بہ آسانی دے سکتا ہے۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ پچاس روپے میں نہ صرف بل جمع کروانے کے جھنجٹ سے آزادی بلکہ اس بات کی پریشانی سے بھی نجات تھی کہ آخری تاریخوں میں بل ادائیگی کے لیے رقم کے حصول کے لیے کسی کی منت سماجت کی جائے۔ اہل محلہ نے فوراً ہامی بھر لی۔ محلے میں کل ملا کر پچیس کے قریب گھرانے تھے۔ ہاشمی صاحب کو بیٹھے بیٹھے ساڑھے بارہ سو کی ماہانہ آمدنی ہونے لگی۔ انہیں اس رقم سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ ان کا مقصد تو کھانے کا حصول تھا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے اہل محلہ سے درخواست کی کہ اگر تین وقت کا کھانا ان کے گھر بھجوا دیا جائے تو وہ تمام زندگی ان کے احسان مند رہیں گے۔ بیوی کی وفات کے بعد کھانے پینے کے حصول کے لیے انہیں نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ محلے والے اس بات سے آگاہ تھے۔ تاہم اس کے باوجود بھی ان کے چہروں پر بے چینی کے تاثرات ابھرنے لگے۔

ہاشمی صاحب نے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کھانے پینے میں اہتمام کے طور پر مرغی، گوشت یا پھر نہاری، بائے کی ضرورت نہیں۔ سوکھی روٹی، دال سبزی جو بھی تمہارے گھر میں پکا ہو وہ بھجوا دینا۔ میں گلہ نہیں کروں گا۔ محلے میں پچیس گھر آباد ہیں۔ ہر گھرانے کی دوبارہ باری پچیس دنوں کے بعد آئے گی۔“ محلے والوں کے چہروں پر اطمینان کے تاثرات پیدا ہوئے اور انہوں نے ہامی بھر لی۔

ہاشمی صاحب کے تمام اخراجات پر خرچ ہونے والی رقم محفوظ ہو گئی اور وہ پنشن کو بینک میں جمع کرنے لگے۔ مہینے کے آخری دنوں میں وہ ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر گیس اور بجلی کے بل وصول کرنے کے بعد قریبی بینک میں جمع کرواتے اور پہلی

تاریخ کو رسید ہر گھرانے کے سامنے پیش کرنے کے بعد اپنی رقم کے علاوہ پچاس روپے معاوضہ وصول کرتے۔ ساڑھے بارہ سو کی اس اضافی رقم کو وہ نہانے دھونے، کپڑے استری کروانے اور دیگر اخراجات پر خرچ کرتے تھے۔ اس رات انہوں نے تمام گھرانوں کی وصول کردہ رقم میں دس روپے فی گھرانے کے حساب سے اضافہ کردیا۔ محلے والوں کو جب اضافی رقم کے متعلق معلوم ہوا تب وہ سراپا احتجاج بن کر ہاشمی صاحب کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ایک رہائشی تیز لہجے میں بولا۔ "یہ بہت زیادہ ہے۔ مجھے تنخواہ پچیس تاریخ کو مل جاتی ہے۔ بچے گھر میں فارغ ہوتے ہیں۔ وہ بل بہ آسانی جمع کروا سکتے ہیں۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔ ساٹھ روپے فضول میں گنوانے کی۔"

دوسرا رہائشی بولا۔ "میرے گھر کا بل پانچ چھ سو روپے سے زیادہ نہیں آتا۔ اتنی سی رقم کے لیے ساٹھ روپے معاوضہ کہاں کا انصاف ہے۔"

تیسرا بولا۔ "ساٹھ روپے فی بل کا معاوضہ گورنمنٹ کے عائد کردہ بجلی گیس پر لگنے والے ٹیکسوں سے بھی بہت زیادہ ہے اگر میں معاوضہ دینے کی بجائے اس رقم سے گورنمنٹ کے ٹیکسوں کی ادائیگی کروں تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوگا۔"

ہاشمی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ان ٹیکسوں کی بھرمار نے ہی تو متوسط طبقے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ میری پنشن گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں، میں محلے کے فی گھرانے سے پچاس روپے وصول کر رہا ہوں۔ پچیس گھرانوں کے بلوں کی ادائیگی کے بعد مجھے ساڑھے بارہ سو روپے حاصل ہوتے ہیں۔ بسوں میں آنے جانے کا خرچا مجھے جیب سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اصولاً مجھے فی گھرانا سو روپے وصول کرنا چاہیے۔ پچیس سو کی ماہانہ آمدنی میرے لیے تسلی بخش ہوگی۔ تاہم میں تم سب کے گھریلو حالات سے بہت حد تک آگاہی رکھتا ہوں اس لیے سو روپے وصول کرنا میرے خیال میں تم سب پر ظلم ہوگا۔"

میرے رویے کی لچک کو محسوس کرتے ہوئے تمہیں معاوضے میں اضافے کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ محلے والوں کے ماتھوں پر سوچ کے تاثرات پیدا ہوئے۔ ہاشمی کی باتوں میں صداقت تھی۔ کتنی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ حالات کی تنگی کی وجہ سے انہوں نے بلوں کی رقم ہاشمی صاحب کو موجودہ مہینے میں دینے سے صاف انکار کیا تھا۔ ان کے ماتھے پر رتی برابر بھی بل نہیں پڑے تھے اور انہوں نے اگلے ماہ رقم کی ادائیگی کا تقاضا کرتے ہوئے اس ماہ بلوں کی رقم کو چھوڑ دیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر ہاشمی صاحب ضرب لگاتے ہوئے بولے۔ "میں پرسوں کی فلائٹ سے عمرے کے لیے سعودی عرب جانے والا ہوں۔ مجھے فریضے کی ادائیگی کے لیے بلوں کے کام کو مختصر وقت کے لیے ملتوی کرنا ہوگا۔ دس روپے فی بل میں اضافہ اس مہینے کی حد تک محدود ہے۔ عمرے سے واپس آنے کے بعد حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید بات چیت ہوگی۔ محلے والوں کے چہروں پر عقیدت و تحسین کے تاثرات پیدا ہوئے اور چند لمحوں کی غور و فکر کے بعد آخر کار اہل محلہ کی متفقہ رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوں کے معاوضے میں دس روپے کے حساب سے اضافہ کردیا گیا اور محلے کے رہائشی اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

☆---☆

دوسرے دن ہاشمی صاحب نے پچاس کے قریب بلوں کی رقم کو نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے بیگ میں منتقل کیا اور اضافی رقم کو واسکٹ کی اندرونی جیب میں چھپانے کے بعد گھر سے باہر نکل کر قریبی بس اسٹاپ پر آ گئے۔ آسمان گہرے بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ تاہم ہوا بند ہونے کی وجہ سے ماحول پر حبس طاری تھا۔ بس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہاشمی صاحب کی عمر کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک نوجوان نے اپنی سیٹ انہیں عنایت کردی۔ بس آگے روانہ ہوگئی۔ لوگ اسٹاپ پر چڑھتے اور اترتے رہے۔ مطلوبہ اسٹاپ سے چند لمحے پہلے انہوں نے سیٹ کو چھوڑ دیا اور دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہوگئے۔ کنڈیکٹر نے ان سے کرائے کے متعلق دریافت کیا۔ ہاشمی صاحب نے کرتے کی سائیڈ والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ان کا پورا ہاتھ جیب کے نچلے حصے سے باہر آ گیا۔ انہوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کنڈیکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "ہر روز متعدد افراد کا رونا یہی ہوتا ہے۔ کسی کی جیب کٹ گئی اور کسی کا بٹوہ بھیڑ میں کھو گیا۔ میں تو کنڈیکٹری کے کام سے تنگ آ گیا ہوں۔"

دو تین مسافروں نے کنڈیکٹر کو تسلیہ کرتے ہوئے اتنی سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرنے کی تلقین کی۔ غصے میں بھرا ہوا کنڈیکٹر ان تینوں پر الٹ پڑا۔ "اگر تم تینوں کو اس سے اتنی ہمدردی ہے تو پھر اس کا کرایہ تم ادا کیوں نہیں کردیتے۔"

معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے ان میں سے ایک نے کرایہ ادا کردیا۔ ہاشمی صاحب اسٹاپ پر اتر کر قریبی بینک کی طرف آ گئے۔ کیشیئر کے ساتھ ان کی جان پہچان تھی۔ رسمی بات چیت کے بعد اس نے نہ صرف پچاس بل وصول کرنے کے بعد رسید ان کے ہاتھوں میں تھمائی بلکہ چائے پلانے کے بعد انہیں

رخصت کیا۔ بینک سے متصل لنڈا بازار تھا۔ انہیں بیرونِ ملک سفر کے لیے ملبوسات درکار تھے۔ وہ بازار میں آگئے۔ دکانداروں سے سودے بازی کرتے ہوئے انہیں وقت کا پتا ہی نہیں چلا کہ دو گھنٹے کیسے گزر گئے۔ جب وہ بازار سے باہر آئے تب تھیلوں میں دو کپڑوں کے جوڑے تھے۔ اس سے زیادہ وہ ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ ان جوڑوں کی کوالٹی کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ استعمال شدہ ہیں۔ واپسی کے سفر کے لیے انہوں نے دوبارہ بس کا انتخاب کیا اور بس اسٹاپ پر اترنے سے پہلے واویلا مچا کر مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پھٹی ہوئی جیب دکھائی۔ اس دفعہ کنڈیکٹر شریف اور نرم دل واقع ہوا۔ اس نے نا صرف ٹکٹ معاف کردیا بلکہ اپنی جیب سے پچاس کا نوٹ علیحدہ دیا تاکہ اسٹاپ پر اترنے کے بعد وہ رکشے میں گھر جاسکیں۔ ہاشمی صاحب نے اسے دعائیں دیں اور بس سے اترنے کے بعد گھر آگئے۔ شام کو بلوں کی رسیدیں انہوں نے محلے والوں کے حوالے کیں اور اپنی رقم ایڈوانس میں وصول کرنے کے بعد کمرے میں آگئے۔ آخری دن کا اختتام ہوا تاہم تیاری ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے پلنگ کے نیچے سے بریف کیس باہر نکالا اور دوسرے دن والی روانگی کے ٹکٹ کا معائنہ کرنے لگے۔ فلائٹ صبح کے آٹھ بجے تھی۔ انہیں سات بجے تک گھر سے نکل جانا چاہیے تھا۔ پاسپورٹ اور ٹریولر چیک انہوں نے کپڑوں کے نیچے پہنی ہوئی بنیان کی جیب میں منتقل کیے۔ ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، نیل کٹر اور قینچی جیسے مختصر سامان کو شیونگ باکس میں رکھنے کے بعد شیونگ کٹ کو سفری بیگ کے اندر رکھ دیا۔ بیرونِ ملک پہنچنے کے بعد ان کا ارادہ داڑھی کو صاف کردینے کا تھا۔ جوتوں کا جوڑا وہی استعمال ہونا تھا جو وہ پہن کر جانے والے تھے۔ ان کی پنشن بینک میں ہر ماہ جمع ہونے کے بعد محفوظ رہ سکتی تھی۔ واپس آنے کے بعد انہیں یہ رقم یکمشت مل جاتی اور وہ دوبارہ روزمرہ معمولات کا آغاز کرسکتے تھے۔ سامان پیک کرنے کے بعد انہوں نے سفری بیگ کو بیرونی دروازے کے پاس رکھ دیا۔ رات کا کھانا ہمسایوں کے گھر سے آیا۔ یہ ان کا مقامی محلے میں آخری کھانا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے دوبارہ دن کے معمولات پر نظر ثانی کی۔ مکان کا کرایہ وہ مخصوص ماہ تک کے لیے ایڈوانس جمع کرواچکے تھے۔ بجلی اور گیس کے بلوں کی ادائیگی کے لیے انہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ بیرونِ ملک سے واپسی کے بعد جمع ہونے والی پنشن کی رقم سے بلوں کی ادائیگی اور مکان کرائے کی تلافی بہ آسانی ہوسکتی تھی۔ ٹریول چیک کی صورت میں انہیں دورانِ سفر رقم کی وجہ سے پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔ یہ ان کی رہائش اور کھانے پینے کے اخراجات کے لیے کافی تھے۔ کمی و بیشی کی صورت میں انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر بینک کیشیئر کا نمبر محفوظ کرلیا تھا۔ وہ اس سے مزید رقم بھجوانے کی درخواست کرسکتے تھے۔ سب معمولات اور تفصیلات پر گہری تنقید بھری نگاہ دوڑانے کے بعد انہوں نے مطمئن انداز میں اپنے بستر کا رخ کیا۔ دوسرے دن کے لیے تازہ دم ہوجانے کے لیے جلدی سونا نہایت ضروری تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی کمرا ان کے خراٹوں سے گونجنے لگا۔

☆......☆

صبح شمسی صاحب نے فجر کی نماز کے بعد ہاشمی صاحب سے الوداعی ملاقات کی خاطر ان کے مکان کا رخ کیا اور دس منٹ تک دستک دیتے رہنے کے بعد انہوں نے پریشان ہوکر اہل محلہ کو جمع کرنا شروع کردیا۔ کچھ ہی دیر میں تمام محلے والے ہاشمی صاحب کے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ چند لڑکوں نے مل کر دروازے کو توڑ دیا۔ محلے کے کچھ افراد اندر داخل ہوئے۔ دروازے کے پاس سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔ ہاشمی صاحب سٹنگ روم سے متصل بیڈ روم میں پلنگ پر چت پڑے تھے۔ ان کے منہ اور ناک سے خون نکل کر بستر کی چادر کو رنگین کررہا تھا۔ چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات تھے۔ آنکھیں پھٹ کر حلقوں سے باہر نکلنے کی تیاری کررہی تھیں۔ پلنگ کی چادر شکنوں سے بھری تھی۔ موت سے قبل انہوں نے احتجاج کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی جسمانی کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ دل فشار خون کی بدولت کسی پہر پھٹ گیا تھا۔ ایسی صورت میں مردے کو زیادہ دیر گھر میں رکھنا بہتر نہیں تھا۔ اسے فوری تدفین کی ضرورت تھی۔ شمسی صاحب نے افسردہ چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کردیا اور محلے والوں کے ساتھ تدفین کا انتظام کرنے کے لیے گھر کی طرف چل دیے۔ محلے کی مسجد سے آٹھ بجے جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ محلے کے تمام مردوں نے جنازے میں شرکت کی اور سوا آٹھ بجے کے قریب جب اہل محلہ جنازے کی چارپائی کو کاندھا دیے مسجد سے باہر نمودار ہوئے تو بیرون ملک جانے والا وہ جہاز سر سے گزر رہا تھا جس میں ہاشمی صاحب کی سیٹ مختص تھی۔ تاہم وہ بیرونِ ملک جانے سے قاصر تھے۔ ان کا سفرِ آخرت شروع ہوگیا تھا۔

++

رانگ نمبر

محترمہ عذرا رسول
سلامتی!
یہ روداد نائلہ کی ہے جسے میں نے بالکل کہانی کا رنگ دے دیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔ ان چھوٹی چھوٹی بہنوں کے لیے جنہیں آیندہ دو چار سال میں عملی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ انہیں یہ روداد ضرور پڑھنا چاہیے۔

عنایشہ چودھری
(لاہور)

رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ اکثر گھروں کی بتیاں بھی گل ہو چکی تھیں کہیں کہیں مرکزی دروازوں پر لگی ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز کا یہ وہ دور تھا جب لوڈشیڈنگ کا جن بوتل سے مکمل باہر نہیں آیا تھا۔ بجلی کے نرخوں میں ہوشربا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ رات گئے جاگتے رہنا ''اسٹیٹس سمبل'' بھی نہ بنا تھا، اس لیے دس بجے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کو ہی ترجیح دی جاتی تھی۔ محلہ قصوریاں بھی ایسا ہی ایک علاقہ تھا جہاں عشاء کی نماز کے بعد گلیاں سنسان ہو جاتی تھیں۔ اسی محلے میں وہ ہلکے سبز رنگ کے دروازے والا گھر تھا جو نیم خوابیدہ حالت میں تھا

لیکن وہاں ایک فرد ایسا بھی تھا جس کی آنکھوں میں نیند کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ وہ چلتے پیروں کی بلی کی طرح پورے گھر میں گھوم رہی تھی۔ وہ نائلہ تھی۔ بیس سالہ نائلہ کھلتی ہوئی گندمی رنگت' لمبے بالوں اور متناسب سراپا کی مالک تھی۔ اس کے چہرے پر سادگی' وقار اور بھولپن کا ایک انوکھا امتزاج تھا۔ شفاف آنکھیں دیکھ کر پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا کہ وہ اپنے جذبات پوشیدہ رکھنے کا ہنر نہیں جانتی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں اندیشوں' واہموں' مایوسی اور افسردگی کا ایک واضح جال تنا تھا۔

''اللہ جی!! پلیز! آج سب مشکلات حل کردیں۔ میں شکرانے کی نفل ادا کروں گی۔'' وہ دل ہی دل میں گڑگڑائی۔ تناؤ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آنکھوں کی نمی آنسو بن کر بہنے لگی۔

''نائلہ! باہر کا دروازہ دیکھ لیا تھا کہ نہیں؟'' ایک کرخت سی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''جی چچی جان! دیکھ لیا تھا۔ اچھی طرح لاک کرنے کے بعد کنڈی بھی لگا دی تھی۔'' وہ لہجے کو غنودہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''سو جاؤ اب تم بھی۔ کتابیں کھول کر نہ بیٹھی رہنا۔''

''جی اچھا! بس تھوڑی دیر تک سو جاؤں گی۔ ایک ٹیسٹ کی تیاری کرلوں۔''

''پڑھ لکھ کر جانے اس نے کون سی افسری کرنی ہے۔'' ان کی بڑبڑاہٹ اس قدر واضح تھی کہ نائلہ کی سماعتیں گھائل ہوگئیں۔

''اپنا خبرنامہ کمرے میں کیوں شروع کردیا ہے؟ جو بات کرنی ہے باہر جا کر کیوں نہیں کرلیتیں؟'' چچا جان کی اس بیزار آواز نے نائلہ کے اعصاب پُرسکون کردیئے۔ اس فقرے کا مطلب تھا کہ اب سوال جواب کا یہ دور ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد واقعی خاموشی چھا گئی۔ نائلہ نے دس منٹ مزید انتظار کیا اور دبے پاؤں چچا چچی کے بند کمرے کے باہر آ کھڑی ہوئی۔ دروازے کے عقب میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ تھی۔ چچا ریاض تو یوں بھی نیند کے متوالے تھے۔ وہ ایک پل میں ہی مدہوش ہو جاتے تھے۔ چچی عطیہ کو دو روز سے نزلہ اور کھانسی کی شکایت تھی۔ انہوں نے کھانسی کا شربت پی رکھا تھا اس لیے ان کی جانب سے بھی آج کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرے کمرے میں چودہ سالہ حسن اور حسین سو رہے تھے۔ وہ دونوں جڑواں تھے اور جب سے نہم کلاس میں آئے تھے پڑھائی کے معاملے میں غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوگئے تھے۔ صبح اسکول جانے کے بعد ایک اکیڈمی میں جاتے اور واپسی پر کچھ اسباق دہرا کر تھکے ماندے سو جاتے۔ لہٰذا ان کی جانب سے بھی کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ آزادی اور آنے والے لمحات کی سرشاری نے اس کے جسم میں میٹھی میٹھی سی بے چینی پیدا کردی تھی۔ دل کی دھڑکن ایک عجیب لے پر رقص کرنے لگی۔ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں ایک صوفے پر اس کا کالج بیگ اور کتابیں بکھری تھیں۔ بیگ سے نیل کٹر نکال کر اس نے چور نظروں سے دروازے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ اس سہ نشستی صوفہ کے پاس تپائی پر کریم رنگ کا ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ نائلہ نے پیار بھری نظروں سے اس جادوئی آلے کو دیکھا پھر لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھالیا اور نمبر ملانے لگی۔

دوسری جانب بجتی گھنٹی کی آواز حواس کے لیے خمار ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے ریسیور ایک ہاتھ سے دوسری طرف منتقل کرلیا۔ تیسری گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو!'' ایک گمبھیر آواز نے سماعتوں کو چھو کر دل و جان کو سکون کا پروانہ بخشا۔

''السلام علیکم!'' وہ دھیرے سے بولی۔

''وعلیکم السلام! کدھر غائب تھیں۔ کب سے ویٹ کر رہا تھا تمہاری کال کا۔''

''سب کے سونے پر ہی کال کرنی تھی ناں۔'' اس نے افسردگی سے اپنی مجبوری بتائی جو مقابل پہلے ہی بخوبی جانتا تھا۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' وہ بوجھل انداز میں بولا۔

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔''

''تمہاری آواز سن لی ہے ناں۔ اب بالکل اوکے سمجھو۔''

''اب اوکے سمجھوں یعنی پہلے کوئی پرابلم تھی۔'' نائلہ کو تشویش ہوئی۔

''ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولا۔

''کیا ہوا تھا مان؟ سچ بتائیے پلیز! مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔''

''تم سے پہلے کوئی جھوٹ بولا ہے جو اب بولوں گا؟'' عمران کے پیار بھرے لہجہ نے اس کا بدن سنسنا دیا۔

''میں جانتی ہوں۔ پر بتائیے ناں کیا ہوا تھا؟''

''سر میں درد تھا۔'' وہ مختصراً کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''سر میں درد بلاوجہ تو نہیں ہوگا۔ کوئی ٹینشن لی ہوگی۔'' وہ بے تاب ہوئی۔

''نہیں! ٹینشن تو نہیں لی۔ بس امی کی ڈیتھ کے بعد بہت اکیلا ہوگیا ہوں۔ جاب سے گھر آکر بس دیواروں کو دیکھتا ہوں اور وقت گزر جاتا ہے۔ کھانا بھی کبھی پکالیا' کبھی ہوٹل سے لے آتا ہوں۔''

''آپی چلی گئی ہیں کیا؟'' نائلہ نے اس کی بہن کا ذکر کیا۔

''ہاں! وہ تو پرسوں کی ٹرین سے ہی چلی گئی تھیں۔ ان کا اپنا بھی گھر ہے آخر۔'' عمران کے بتانے پر نائلہ کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ عمران کی والدہ کا انتقال دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ وہ ایک با اخلاق اور ہمدرد خاتون تھیں۔ نائلہ سے ان کی ملاقات صرف ایک ہی بار ہوئی تھی اور وہ اس قلیل وقت میں ہی ان کی مداح ہو کر رہ گئی۔

''کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہوگئیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہیں! بس امی جان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' نائلہ کی آواز بھرا گئی۔

''اچھا! مجھے لگا شاید ان کے بیٹے کی تنہائی دور کرنے کا طریقہ سوچ رہی ہو۔'' وہ پژمردگی سے بولا۔

''آپ کی تنہائی اور خواہشات کا احساس مجھے نہیں تو اور کسے ہوگا؟'' نائلہ مزید افسردہ ہوئی۔

''صرف احساس نہیں نیلو! اس کا کوئی حل بھی تلاشنا ہوگا۔'' عمران کے لہجے میں ایسی سنجیدگی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ! کچھ سوچنا ہی ہوگا۔'' دروازے کی سمت آہٹ محسوس کر کے وہ بے دھیانی سے بولی لیکن وہاں ایک بلی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''میں صائمہ بھابی کو بھیجوں گا تمہارے گھر۔''

''وہ کیوں بھلا؟'' نائلہ ذہنی طور پر بے حد الجھی ہوئی تھی۔ عمران یہ جواب سن کر یکدم بھڑک گیا۔

''کیوں؟ یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیوں؟''

''پلیز مان! کول ڈاؤن! اتنا غصہ کیوں کر رہے ہیں آخر؟'' اس نے اپنے مخصوص دلار بھرے انداز میں تسلی دینی چاہی لیکن آج ہر معاملہ اور کوشش برعکس ثابت ہو رہی تھی۔

''یہ بھی اب میں تمہیں بتاؤں کہ کیوں غصہ کر رہا ہوں؟ میں غصہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اپنی زندگی کے بہترین سال دونوں بہنوں کی شادی کے لیے کمیٹیاں ڈالتے گزار دیئے۔ غصہ اس لیے کر رہا ہوں کہ میری والدہ کو مجھ سے زیادہ اپنی بیٹیوں کی جلد از جلد شادی کر دینے کی فکر تھی۔ غصہ اس لیے کر رہا ہوں کہ میری عمر کے لڑکے دو دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں' طنز کرتے ہیں کہ تیس سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک کنوارہ کیوں ہوں؟ انہیں کیا بتاؤں کہ پہلے ذمے داریوں کا بوجھ تھا اور اب پچھلے ایک سال سے ایک ایسی لڑکی سے کمیٹڈ ہوں جو اپنے چچا چچی کے گھر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وہ شادی کے لیے میری فرسٹ چوائس ہے۔ اس فلرٹ دور میں بھی میں اس سے محبت کر بیٹھا ہوں۔ اپنی والدہ کو رشتہ لینے بھی بھیج دیا اور جواب یہ ملا کہ وہ برادری سے باہر شادیاں نہیں کرتے۔ ہاں! میں غصہ کر رہا ہوں کیونکہ میری والدہ کا دو ماہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ میری بہنیں اپنے واپس لاہور جا چکی ہیں۔ وہ مجھے شادی کے لیے زبردست فورس کر رہی ہیں۔ اپنے مشترکہ سسرال میں رشتہ بھی ڈھونڈ چکی ہیں اور ایک میں گدھا' بے وقوف ہوں جو تمہارے ترلے منتیں کر رہا ہوں کہ میرا گھر بسانے کے لیے دوست کی بیوی کو بھیجوں گا۔ وہ تمہاری فیملی سے ہاتھ مانگے گی۔'' عمران بات کرتے ہوئے ہانپ گیا۔

''آئی ایم سوری مان! میں آپ کی فیلنگز ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آئی لو یو..... آئی رئیلی لو یو..... میں بھی آپ کے سوا کسی اور کا تصور نہیں کر سکتی۔'' نائلہ نے ریسیور کو بوسہ دیا۔ یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوا کرتا تھا۔

''محبت کرتی ہو تو بزدلی کیوں ظاہر کرتی ہو؟ جب میں نے امی کو بھیجنا تھا اس وقت بھی تمہیں عجیب ہی خوف لاحق تھے۔ اب بھی وہی حال ہے۔'' اس نے جوابی بوسے کے بغیر سختی سے کہا۔

''اچھا ناں! سوری پلیز۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

''دیکھو نائلہ فیاض! میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں۔ کلیئر بات کروں گا۔ بندہ بشر ہوں تو تنہائی ستاتی ہے۔ فطری تقاضے بھی تنگ کرتے ہیں۔ آج تک بہت صاف ستھری زندگی بسر کی ہے۔ آئندہ بھی ایسے ہی رہنا چاہتا ہوں۔ تم آج مجھے دو ٹوک بتا ہی دو۔ میرے لیے اپنے گھر میں کوئی اسٹینڈ لے سکتی ہو کہ نہیں؟''

''میں آپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں مان! آپ کے بغیر میری زندگی میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر ریسیور کو کئی بوسے دیئے۔

ان لمحات میں عمران ہمیشہ پگھل جایا کرتا تھا لیکن اس روز کچھ بھی معمول کے مطابق نہ تھا۔

''جان دے سکتی ہو۔ حرام موت گلے لگا سکتی ہو لیکن اپنا حق مانگنے کے لیے' اپنی خوشی چھیننے کے لیے گھر والوں کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ ویری گڈ!'' وہ بھڑک گیا۔

''تمہاری یہ بزدلی مجھے کھو بیٹھے گی نائلہ! بہت پچھتاؤ گی تم! بہت پچھتاؤ گی!'' اس نے غصے میں فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے ساکت بیٹھی رہی۔ ان کے ایک سالہ رشتے میں عمران پہلی بار اتنے غصے میں آیا تھا۔ نائلہ کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے تو نمبر دوبارہ ملا لیا۔

''آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔ کچھ دیر بعد کوشش کیجیے۔ شکریہ۔'' اس شستہ آواز نے اسے مزید ہولا دیا۔ ایسا پہلے تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بار بار نمبر ملا کر ہلکان ہوتی رہی لیکن عمران نے اپنا موبائل آن کر کے ہی نہ دیا۔ اس کا پی ٹی سی ایل فون کچھ ہفتوں سے خراب تھا اس لیے وہاں رابطہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ شدید بے بسی محسوس کرنے لگی۔ پھر کتابیں سمیٹ کر صوفے پر ہی لیٹ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔

☆.....☆

نائلہ فیاض مقامی کالج میں فورتھ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس کی زندگی ہزاروں لڑکیوں جیسی ہی تھی۔ عام' بے کیف' بوجھل اور آزمائش سے بھرپور۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ انیس سال کی عمر تک ان کی ہتھیلی کا چھالا بنی رہی۔ اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پوری کر دی جاتی۔ توجہ' محبت اور دلار کی کہیں کوئی کمی نہ تھی۔ پھر ایک حادثے نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ موٹر سائیکل اور ٹرک کے تصادم میں اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ چچا ریاض اشکبار آنکھوں سے اسے اپنے گھر لے آئے۔ چچی عطیہ کا رویہ البتہ سپاٹ تھا۔ انہیں اپنے جذبات کا اظہار نہیں آتا تھا۔ نائلہ اپنے ذہن میں ہزاروں خدشات لیے یہاں آئی تھی اور وقت کے ساتھ سبھی عملی شکل میں سامنے آتے گئے۔ چچی نے اسے بڑے منظم انداز میں صفائی ستھرائی' کچن اور کپڑے دھونے کی ذمے داری سونپ دی۔ نائلہ نے اپنی سابقہ زندگی میں کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا۔ اس قدر کام سے بوکھلا کر رہ گئی۔ وہ اپنے ذہن کو مثبت دھارے پر رکھ کر یہ بھی سوچتی کہ چچی یہ سب اسی کی بھلائی کے لیے کر رہی ہے۔ اسے ان کاموں کا عادی ہونا چاہیے لیکن اپنی تنہائی کا کیا کرتی؟ کالج کی سہیلیاں وہیں تک محدود رکھنے کا حکم تھا۔ والدین کی طرح کوئی بھی توجہ' ستائش اور محبت دے نہیں سکتا۔ وہ اس تنہائی اور جذباتیت کے مدار میں بھٹکتی ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتی رہی کہ اچانک اس کی زندگی میں عمران کی آمد ہوئی۔

عمران سے اس کا تعارف اکیسویں صدی کے آغاز کی مشہور زمانہ گیم 'رانگ نمبر' سے ہوا تھا۔ اس روز اہلِ خانہ کو کسی عزیز کی شادی پر جانا تھا۔ گھر میں صرف ایک ہی بائیک تھی۔ حسن اپنے اور حسین کے لیے کسی دوست سے موٹر سائیکل ادھار لے آیا۔ نائلہ کو جگہ کی کمی کے باعث گھر پر ہی رہنا تھا۔ ان کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔ بجلی کی کڑک اسے ہولا رہی تھی۔ احساس محرومی و تنہائی کا ناگ شدت سے اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ مرحوم والدین کو یاد کرتے ہوئے وہ بے اختیار رونے لگی۔ اسی اثناء میں ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

''کیا میں مجاہد صاحب سے بات کر سکتا ہوں؟'' اس کی ہیلو کے جواب میں ایک گمبھیر' شائستہ اور نرم آواز آئی۔

''جی نہیں! رانگ نمبر۔'' وہ دھیرے سے کہہ کر فون رکھنے لگی۔

''اوہو! لیکن انہوں نے مجھے یہی نمبر دیا تھا۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام تھا۔''

''میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہاں کوئی مجاہد نہیں رہتا۔'' نائلہ جھنجلائی۔

''اوہ نو! میں اب ان کا نمبر کیسے تلاش کروں؟'' وہ خاصہ پریشان تھا۔

''مسجد میں اعلان کروا دیجیے یا ٹی وی پر اشتہار دے دیجیے۔'' نائلہ نے بلا ارادہ کہا۔

''اے واؤ! آپ کی سینس آف ہیومر تو بہت لاجواب ہے۔'' اس کی ستائش پر نائلہ کا دل زور سے دھڑکا۔

''میں خود بھی بہت لاجواب ہوں۔'' وہ ایک بار پھر بے اختیار کہہ گئی۔ کالج میں لڑکیوں کی چٹخارے دار گفتگو سے اسے ایسے کئی فقرے ذہن نشین ہو چکے تھے۔ جن میں سے ایک اس نے روانی میں استعمال کر دیا۔

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ آپ کے لہجہ کا وقار اور بات چیت کا رکھ رکھاؤ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ آپ بہت اسپیشل لڑکی ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر سراہا۔

''اتنی سی دیر میں یہ اندازہ بھی ہو گیا آپ کو؟'' نائلہ دھیرے سے ہنسی۔ اسے دوسراہٹ کا احساس بات برائے بات کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

''ہم لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں محترمہ!''

''باتیں خوب بنانی آتی ہیں آپ کو۔''

''دوسرے لفظوں میں آپ شاید یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ میں کافی فلرٹ ہوں۔ اس لیے فلرٹ گفتگو کرنی آتی ہے مجھے۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''نن..... نہیں..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' نائلہ گڑبڑا گئی۔

''آپ کی احتیاط اور سوچ مجھے اچھی لگی محترمہ! کسی بھی لڑکی کو ایسے ہی آؤٹ اسپوکن ہونا چاہیے۔'' اس نے غیر محسوس طریقہ سے پینترا بدلا تھا۔ ستائش اور اپنائیت کی حدت نائلہ کا دل گداز کر رہی تھی۔ بارش' تنہائی' افسردگی اور احساس محرومی بات جاری رکھنے کے لیے مائل کیے ہوئے تھی۔

''یہ کیا محترمہ محترمہ لگا رکھی ہے۔ میں کوئی بوڑھی عورت تو نہیں ہوں۔'' نائلہ نے منہ بنایا۔

''میں جانتا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ کی عمر بیس سال سے بھی کم ہے۔ آپ بہت انوسنٹ' سوفٹ نیچر اور گریس فل لیڈی ہیں۔'' اس کے اندازے نے نائلہ کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔

''بائی دی وے! میرا نام عمران ہے۔''

''عمران خان یا عمران ہاشمی؟'' وہ برجستہ بولی۔

''دونوں ہی نہیں محترمہ!'' وہ محظوظ ہوا۔ ''عام سا بندہ ہوں۔ عمران بیگ میرا نام ہے۔ اب آپ بھی کچھ عرض کیجیے۔''

''نائلہ!'' وہ یکدم کہہ کر خاموش ہوئی اور اپنے آپ کو کوسنے لگی کہ کوئی بھی فرضی نام کیوں نہ بتا دیا۔

''آپ کی یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ یہی آپ کا اصل نام ہے اور اب آپ گلٹی فیل کر رہی ہیں کہ جھوٹ کیوں نہیں بولا۔ ایم آئی رائٹ؟'' اس کے ایک اور کامل اندازے پر نائلہ کا منہ کھل گیا۔

''منہ بند کر لیجیے اب۔ یہ نہ ہو کہ مکھی چلی جائے اندر۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ کوئی جن بھوت تو نہیں ہیں؟'' نائلہ خفت سے کہنے لگی۔

''میں تو جن بھوت نہیں ہوں لیکن آپ سچ میں بہت اسپیشل لڑکی ہیں نائلہ۔ مجھ سے دوستی کریں گی۔'' اس کی فرمائش نے اسے ساکت کر دیا۔

''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''میں اس مختصر سی گفتگو میں ہی جان گیا ہوں۔ مجھے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی زندگی صرف اسکول اور کالج سے گھر تک ہی محدود رہی ہوگی۔'' اس کے لہجہ کی اپنائیت نائلہ کی دھڑکنیں بے ترتیب کرنے لگیں۔ وہ ایک مقناطیسی رو میں بہتی چلی گئی۔ اس روز انہوں نے ڈیڑھ گھنٹا گفتگو کی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر بہت بے معنی تھیں لیکن ان کے لیے بہت خاص الخاص۔ تعلیم' اپنے تعلیمی ادارے' گھر' اہل خانہ کا تعارف' دن بھر کے معمولات اور مشاغل۔ جب نائلہ بولتی تو عمران دلچسپی بھری خاموشی سے سنتا اور جب عمران آغاز کرتا تو نائلہ سراپا سماعت بن جاتی۔ نائلہ اپنی ساری افسردگی اور تنہائی بھول گئی تھی۔ اس کے لیے کائنات صرف اس فون کال اور ریسیور تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تین گھنٹے کی اس گفتگو سے بھی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔

''سچ نائلہ! میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم اسی طرح بولتی رہو اور میں سنتا رہوں لیکن صبح جاب پر جانے کی بھی مجبوری ہے۔'' اس کے انداز تخاطب سے نائلہ کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑکا اور ہوش و حواس مخمور کر گیا۔

''میں کل رات گیارہ بجے فون کروں گا۔ آپ بات کریں گی ناں مجھ سے؟'' اس نے التجا کی۔

''کل نہیں، پرسوں کر لیجیے گا۔ گھر والے ولیمے کے فنکشن پر گئے ہوں گے۔'' اس کی فرمائش پر عمران نے سر تسلیم خم کر دیا۔

''اپنا خیال رکھنا! فی امان اللہ۔'' اپنائیت بھرا یہ لہجہ اسے پل بھر میں ہی معتبر کر گیا۔

اگلے دو دن کا انتظار بہت کٹھن تھا۔ اس نے ابھی سے گھڑیاں گننی شروع کر دیں۔ ہر گزرتا لمحہ ایک عجیب سنسنی اور خمار میں گرفتار کرتا رہا۔ گیارہ بجنے تک وہ جانے کتنی صدیوں کی طویل مسافت طے کر چکی تھی۔ مقررہ دن پر عمران نے ساڑھے دس بجے ہی فون کر دیا۔ اس روز بھی دو گھنٹے گفتگو ہوتی رہی۔ اہل خانہ کے آنے کا وقت نائلہ کو افسردہ کرنے لگا۔

''کیا تمہارا دل فون بند کرنے کو چاہ رہا ہے؟''

عمران نے الوداعی کلمات کے جواب میں پوچھا۔
''سچ کہوں یا جھوٹ؟'' وہ دلار سے بولی۔
''ہمارے اس رشتے کی بنیاد صرف سچائی ہے نائلہ! وعدہ کرو مجھ سے کہ ہم دونوں میں کبھی جھوٹ' راز یا پردہ داری نہیں آئے گی۔''
''وعدہ، پکا وعدہ!'' وہ سرشاری سے بولی۔ یہ عہد ان کی زندگی کا پہلا غیر تحریری معاہدہ تھا۔ عمران نے اسے فون کا رنگر کم کرنے کا طریقہ سمجھایا اور ہفتے میں تین دن فون سننے کا وعدہ لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔ نائلہ خمار کی ایک نئی انتہا پر تھی۔ وہ عمران کے سحر میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکی تھی۔ اس رات بھی وہ عمران کی باتوں اور جوابات کو دہراتے' یاد کرتے مسکراتی رہی۔ کسی کام میں دل لگ کے ہی نہ دیتا۔ دو ہی روز میں وہ اس قدر اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ اس کے سوا کچھ بھی بھائی ہی نہ دیتا۔ اگلا ایک ماہ اسی آنکھ مچولی میں گزر گیا۔ دوسرے ماہ عمران کے اصرار پر نائلہ نے اسے کالج کے گیٹ پر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس ادھوری ملاقات نے تشنگی مزید بڑھا دی۔ نائلہ کو گندمی رنگت اور شفاف آنکھوں کا مالک وہ لڑکا بہت اچھا لگا۔ دوسری جانب عمران بھی اس کی سادگی و خوبصورتی سے گھائل ہو چکا تھا۔ اگلی ہر فون کال میں وہ اس طرح ٹوٹ کر تعریف کرتا کہ نائلہ کا دماغ ساتویں آسمان تک جا پہنچتا۔ اگلی کال تک وہ اپنی ذات میں انہی باتوں' وعدوں اور راز و نیاز کو پھر سے اجاگر کر لیتی۔ فون کا لڑکا یہ سلسلہ بہت محفوظ طریقے سے جاری رہا۔ نائلہ اپنا دل کھول کر عمران کے سامنے رکھ دیتی اور وہ بہت خلوص و محبت سے ان زخموں کی مسیحائی کرتا۔ جب عمران اپنے مسائل بتاتا تو نائلہ کے دل و دماغ میں جانے کیسے بھرپور متانت و سمجھداری در آتی۔ وہ بھی اسے صائب مشورے دے کر اس کی بھرپور اخلاقی حوصلہ افزائی کرتی۔ ہر نماز کے بعد اس کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگتی۔ کبھی وہ روٹھتی تو عمران پل بھر میں اس کی خفگی دور کر دیتا اور جب وہ ناراض ہوتا تو نائلہ اپنے مخصوص انداز میں اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا کرتی تھی۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس رشتے کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے لیے فی الوقت یہی بات سب سے اہم تھی کہ اس کی ذات کسی کے لیے بے حد اہم ہے۔ کوئی اسے بھرپور توجہ اور ستائش فراہم کرتا ہے۔ اس آنکھ مچولی میں وہ وقت بھی چلا آیا جب عمران کی دونوں بہنوں کی شادی لاہور کے ایک خاندان کے دو بھائیوں سے طے پا گئی۔
''سچ نیلو! تم میرے لیے بہت لکی ہو۔ یہ شادیاں میری زندگی کا ایک بہت بڑا خواب تھیں۔'' وہ بے حد و حساب خوش تھا۔
''اللہ پاک آپ کے سب خواب پورے کرے! کاش میں بھی کسی طرح اس شادی میں شریک ہو سکتی۔'' اس کی حسرت پر وہ خاموش ہو گیا۔
''میں کچھ روز فون نہیں کر سکوں گا۔ گھر میں مہمان اور کام بہت ہیں۔ تم بس اپنا بہت سا خیال رکھنا۔'' اس نے الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔ نائلہ شب و روز اس کی ذمے داریوں کی خوش اسلوبی سے فراغت کی دعائیں کیا کرتی۔ وہ عادتاً ہر رات فون کے پاس بیٹھ کر لاشعوری طور پر گھنٹی بجنے کا انتظار کرتی تھی۔ ایک ہفتے بعد اس کی وحشت ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ اسے اپنے وجود میں کسی بیکراں صحرا کا احساس ہونے لگا تھا۔ تشنہ لبی اس قدر بڑھی کہ وہ کالج جاتے ہوئے ایک پی سی او میں گئی اور بے اختیار عمران کا موبائل نمبر ملا لیا۔ اسے یہ فون میڈیکل کمپنی کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ تیسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔
''ہیلو! کون ہے بھئی؟'' اس کی مصروف آواز سماعت میں پڑتے ہی نائلہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ عقب میں ٹریفک کا بے پناہ شور تھا۔
''میں بات کر رہی ہوں۔'' اس کی آواز بھی نم تھی۔
''کون؟ نائلہ؟ یہ واقعی تم ہو کیا؟ کہاں سے بول رہی ہو؟'' وہ شدید حیران تھا۔
''پی سی او سے۔''
''یہ رسک لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنے مرد ہوتے ہیں وہاں۔''
''میں آپ کو بہت مس کر رہی تھی! آج دل نے مجبور کیا تو یہاں چلی آئی۔'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔
''مس تو میں بھی تمہیں بہت کر رہا ہوں نیلو! اتنے دن ہو گئے بات کیے ہوئے۔ ایسا لگتا ہے میرے وجود کا کوئی حصہ کھو گیا ہے۔'' عمران بھی جذبوں سے بوجھل لہجہ میں بولا۔ ''میری ایک بات مانو گی؟''
''آج تک آپ کی کوئی بات ٹالی بھی ہے کیا؟''
''آج کالج مت جاؤ پلیز! میں بس دس منٹ کا ایک کام نمٹا کر نیشنل پارک آؤں گا۔ تم بھی وہاں چلی آؤ۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ پلیز۔'' اس کے جذبوں نے نائلہ کو

ہامی بھرنے پر مائل کرلیا۔ اگلے بیس منٹ بعد وہ نیشنل پارک کے ایک الگ تھلگ بنچ پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ نائلہ کے وجود کا ہر مسام پسینا اگل رہا تھا۔ عمران کے کپڑوں سے اٹھتی پرفیوم کی ہلکی سی خوشبو اس کی قربت کا احساس اور اپنائیت بھرا انداز اسے سنسنی میں مبتلا کررہا تھا۔ اسی اثناء میں عمران نے اپنی جیب سے ایک کالنگ کارڈ نکالا اور اس کے سامنے کردیا۔

''آئندہ کبھی کسی پی سی او کا رخ نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی غیر مرد کی نظر چھوئے اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو اس سے فون کرلینا۔ او کے؟''

''لیکن فون تو لاکڈ ہوتا ہے۔ اس کا کیا کروں؟'' نائلہ کی یاددہانی پر اس نے قفل کی تفصیل پوچھی اور اسے نیل کٹر کے استعمال کا طریقہ سمجھا دیا۔

''اب تمہارے ذہن میں یقیناً یہ سوال اٹھ رہا ہوگا کہ میں نے اتنی ایمرجنسی میں تمہیں یہاں کیوں بلوایا ہے؟'' عمران مسکرایا اور اس کا کوئی بھی جواب سننے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''مجھ سے شادی کروگی نیلو؟'' نائلہ اس کی پیشکش پر ساکت رہ گئی۔

''کیا میں نے بہت مشکل سوال کردیا ہے؟'' وہ افسردہ ہوا۔ ''اللہ کے کرم سے بہنوں کے فرائض پورے کرتے ہی اپنا گھر بھی بسالوں گا۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی لڑکی ہی نہیں اگر تمہیں میرا ساتھ منظور نہیں تو میں خاموشی سے ابھی اور اسی وقت تمہاری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تم کبھی جان ہی نہ پاؤ گی کہ عمران نامی کوئی شخص تھا بھی کہ نہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بولو! اب فیصلہ تمہارا ہے۔ میں دوستی اور پسندیدگی کی سرحد سے بہت آگے بڑھ چکا ہوں۔ کیا تمہیں میری محبت اور ساتھ قبول ہے؟''

''ہاں! قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔'' نائلہ کے ہونٹ کانپ گئے۔ آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے تھے۔

''بس! ان آنسوؤں کو اب الوداع کہہ دو۔ میں تمہیں ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے نائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ کسی محفوظ حصار میں آگئی ہے۔ اس نے بے اختیار اپنا سر عمران کے شانے پر رکھ دیا۔

''میں ان شادیوں سے فری ہوتے ہی امی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔'' عمران نے اس کے بال نرمی سے چھوئے۔

''اگر گھر میں کسی کو علم ہوگیا کہ ہمارا کوئی افیئر ہے تو طوفان آجائے گا۔'' اس نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ہم آؤٹ آف کاسٹ شادیاں نہیں کرتے۔''

''اول تو ایسا کچھ ظاہر ہی نہیں ہوگا۔ میں امی کو اچھی طرح سمجھادوں گا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے درمیان کوئی افیئر نہیں ہے۔ افیئر زفلرٹ لوگوں کا کام ہے۔ ہمارا ایک صاف ستھرا، خالص اور بے ریا رشتہ ہے۔ اسے ایسے تھرڈ کلاس الفاظ سے آلودہ نہ کرو۔ کاسٹ کا ایشو بھی دیکھ لیں گے بعد میں۔'' وہ اس کی آنکھوں اور رخسار پر دھیرے سے انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے انداز گفتگو اور عملی اظہار محبت نے نائلہ کو ہوش وحواس سے بیگانہ کردیا۔ آدھے گھنٹے کی وہ ملاقات کالج ٹائم تک برقرار رہی۔ واپسی کا سفر بہت مشکل تھا۔ نائلہ کے قدم منوں بھاری ہورہے تھے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کالج بنک کیا تھا۔ دل میں ہزاروں خدشات لیے جب وہ گھر پہنچی تو معمولات کو جوں کا توں پاکر سکون کا سانس لیا۔ عمران نے اپنا قول اگلے ڈیڑھ ماہ بعد نبھادیا۔ اس کی والدہ نے بہت سبھاؤ سے اپنا سوال پیش کیا کہ کس وچولن نے انہیں اس گھر میں نائلہ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے بیٹے کے لیے وہی لڑکی مناسب جوڑ ہے۔ انہوں نے جس تہذیب وشائستگی سے اپنا مطالبہ پیش کیا چچا اور چچی نے بھی اتنی ہی ندامت وانکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذات برادری کی مجبوری بتا کر واضح معذرت کرلی۔ نتیجتاً رخسانہ اخلاقیات کے تقاضے نبھاتی بچی کے اچھے نصیب اور خوشیوں بھرے مستقبل کی دعائیں دے کر رخصت ہوگئیں۔ نائلہ کے دل میں اس انکار کا دکھ اور اپنے دل میں چھپے چور کے پکڑے جانے کے خوف کا تناسب یکساں تھا۔ اب جانے یہ خوش قسمتی تھی، نائلہ کے ماضی کا بے داغ رویہ یا ذات وکردار کا بھولپن۔ اس کے گھر میں کسی کو ان دونوں کی باہمی دلچسپی کا علم نہ ہوسکا۔ اس رات فون پر عمران بہت پریشان تھا۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمارے ہاں آؤٹ آف کاسٹ شادی نہیں کی جاتی۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''انسان ہمت کرے تو سب کچھ ممکن ہوجایا کرتا ہے۔ تمہیں خود بھی تھوڑی کوشش کرنی ہوگی۔ اپنے گھر والوں کی ذہنی ٹیوننگ کرو۔'' عمران کی اس بات پر وہ خاموش رہ گئی۔

''مجھے اللہ پر پورا بھروسا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی رستہ ضرور نکال دے گا۔'' اس نے بات ٹالی۔ ''اچھا! مجھے یہ تو

بتایئے کہ آپ کی امی کو کیسی لگی میں؟ چائے میں ہی لے کر گئی تھی ان کے لیے۔"

"امی تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں کہ تم نے ایسی ہیرا لڑکی تلاش کر کے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔" عمران کی بات پر ان کے راز و نیاز' عہد و پیمان اور خوابوں کے جگنوؤں کا تعاقب ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ رخسانہ کی دوبارہ آمد ممکن ہی نہ ہو سکی۔ طبیعت کی خرابی' معدہ میں درد اور بخار کینسر میں تبدیل ہو کر کچھ ہی ماہ میں موت کا ہرکارہ بن گیا۔ وہ وقت عمران کے لیے بہت کٹھن تھا۔ نائلہ نے اسے ہر طرح سے جذباتی و اخلاقی سہارا فراہم کیے رکھا۔ اس دوران وہ ایک بار پھر نیشنل پارک میں چند گھنٹوں کے لیے مل کر جذباتی سیراب ہو گئے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اب اس کا یوں ردِعمل سامنے آ گیا۔

صوفے پر لیٹی نائلہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ "ٹھیک ہے! کرتا رہے غصہ۔ میں بھی دوبارہ فون نہیں کروں گی۔ اسے ذرا احساس نہیں ہے کہ میں یہاں کیسے رہتی ہوں' کن حالات کا شکار رہوں۔ اب وہ خود ہی رابطہ کرے گا۔ میں بالکل بات نہیں کروں گی۔ بالکل بھی نہیں۔" اس نے خود کو یقین دہانی کرائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆.....☆

نائلہ اپنے اس عزم پر مکمل غصہ سے دو دن قائم رہی۔ تیسرے روز ان جذبات میں تشویش کا پہلا رخنہ برآمد ہوا۔

"اتنی بھی کیا بے مروتی۔ اسے ایک پل کے لیے بھی میری یاد نہیں آئی کیا؟ میں ہی بے وقوف ہوں جو اس کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ بس! ٹھیک ہے۔ میں بھی اسے یاد نہیں کروں گی۔" اس وعدہ کے بعد بھی وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ اگلے تین روز بعد یہ عالم تھا کہ بات بے بات آنکھیں بھیگ جاتیں' آنسوؤں اور یاد کا دھواں دل گداز کیے رکھتا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ محبت میں بہت طویل سفر طے کر چکی ہے۔ اسے عمران کی عادت ہو گئی تھی اور محبت عادت بن کر زیادہ مہلک ثابت ہوا کرتی ہے۔ دسویں روز تک وہ ہر نماز میں آنسو بہاتی اس سے رابطہ کی کوشش میں کامیابی کی دعائیں کرتی رہی۔ بارہویں روز صبح اٹھتے ہی یکدم خیال آیا کہ وہ عمران کے دوست ذکی کو بھی تو فون کر سکتی ہے۔ اس خیال نے اس کے وجود میں نئی توانائی پیدا کر دی۔ کچھ عرصہ پہلے عمران کے پی ٹی سی ایل کی خرابی اور موبائل اسپیکر میں مسئلہ کی وجہ سے ذکی کے نمبر سے بات کی تھی۔ نمبر اب بھی نائلہ کو ذہن نشین تھا۔ اس کے لیے صبر کرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ 'وٹامن عمران' کی شدید کمی نے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت مفلوج کر دی تھی۔ وہ ابلخانہ کے سو جانے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی اس لیے کالج جاتے ہوئے ایک بار پھر پی سی او کا رخ کر لیا۔ ذکی نے دوسری ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا۔ تعارف اور رسمی علیک سلیک کے دوران نائلہ کا دل زور و شور سے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

"اچھا ہوا آپ نے خود ہی فون کر لیا۔ ورنہ میں صائمہ کے توسط آپ کے پی ٹی سی ایل پر رابطہ کرنے ہی والا تھا۔ صرف ایک اخلاقی تقاضا نبھانا تھا مجھے۔" ذکی کا لہجہ گمبھیر اور کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ عمران کہاں ہے؟ اس کا موبائل کیوں بند ہے؟" وہ مزید دہشت زدہ ہوئی۔

"آپ دونوں کا یہ جھگڑا ختم نہ ہوا تو پھر کچھ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔" ذکی نے اس کے سارے سوال نظر انداز کر دیے۔

"جھگڑا نہیں۔ وہ تو بس یونہی ناراض۔" نائلہ گڑبڑا گئی۔

"دیکھیے نائلہ بہن! مجھ سے آپ دونوں کا کوئی بھی معاملہ پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ رخسانہ خالہ کو شادی کے لیے کنوینس کرنے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ عمران میرے لیے سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہے۔"

"مجھے علم ہے..... سب علم ہے۔" عمران کا نام سنتے ہی وہ آبدیدہ ہونے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کائنات کے ہر منظر پر صرف اسی کا چہرہ دکھائی دے اور اسی کی آواز سماعتوں کی تشنگی دور کرتی رہے۔

"اچھی بات ہے۔ تو یہ بھی جان لیجیے کہ آپ سے رابطے کے بعد میں نے اسے زندگی میں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ بچپن کا دوست ہے وہ میرا۔ اس کی زندگی کے ہر ایک پل سے واقف ہوں۔ اظہارِ محبت اور شادی کا فیصلہ اس نے آپ سے پہلے مجھے بتایا تھا۔ ایسے مخلص انسان کی بے قدری اور اس کے جذبات سے کھیل کر آپ کو کیا ملے گا؟"

"میں اس کے جذبات سے بالکل نہیں کھیل رہی۔ اللہ کی قسم! میں تو خود اس سے رابطہ کی کوششوں میں ہلکان ہو رہی ہوں۔ مجھے میرے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم!" وہ رونے لگی۔

''تو پھر اس سے شادی کا سوال سن کر خوفزدہ کیوں ہو جاتی ہیں؟ میں نے آج تک لڑکیوں کو ہی شادی کے لیے لڑکوں کے پیچھے خوار ہوتے دیکھا ہے۔ یہاں گنگا ہی الٹی بہہ رہی ہے۔ وہ لڑکا ہو کر آپ کا منتظر ہے لیکن کب تک؟ آخر کب تک برداشت کرے گا؟'' ذکی کا انداز جارحانہ ہو گیا۔

''آپ میری کسی بھی طرح اس سے ایک بار بات کروا دیں۔ میں اسے منا لوں گی۔''

''وہ روٹھنے منانے کی حدود سے بہت آگے جا چکا ہے۔ آپ کو تو علم بھی نہ ہو گا کہ وہ ایک ہفتہ لاہور رہ کر آیا ہے۔ اس کے بہنوئی نے وہاں کوئی جاب دلوانی ہے۔ آج چوبیس تاریخ ہے۔ یکم تک نوکری، وہ گھر چھوڑ کر لاہور چلا جائے گا۔ پیکنگ بھی شروع کر رکھی ہے اس نے۔''

''وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ کیسے؟'' ذکی کے انکشاف نے اس کے وجود میں زلزلہ برپا کر دیا۔

''ویسے ہی جیسے آپ اس کا شادی کا مطالبہ ہر بار اگنور کر دیتی ہیں۔ اپنی فیملی سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ معاف کیجیے گا میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ عمران سے شادی کرنے کے لیے اسٹینڈ لینے میں آپ کے پاؤں میں کوئی زنجیر ہی نہیں۔ اگر والدین ہوتے تو ان کا اخلاقی دباؤ ایک الگ بات تھی۔ چچا چچی جیسے رشتوں سے خائف رہنا سمجھ سے باہر ہے۔'' ذکی ضرورت سے زیادہ ہی صاف گو تھا۔

''میری اس سے ایک بار بات کروا دیں پلیز! آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔'' نائلہ بلک اٹھی۔

''آپ سے پہلے وہ مجھے ایسا نہ کرنے کی قسم دے چکا ہے۔ سوری۔'' ذکی کے دوٹوک جواب پر نائلہ کو زمین و آسمان گھومتے دکھائی دینے لگے۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج کر اڑتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسو صاف کرتے کال کے یونٹس کی ادائیگی کی اور پل بھر میں ہی ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔

☆.....☆

عین اسی وقت عمران اپنے فلیٹ میں فریج کا دروازہ کھولے ناشتا بنانے کے تصور سے ہی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی طبیعت کافی پژمردہ تھی۔ گزشتہ کچھ دنوں میں کیے جانے والے مشکل فیصلوں نے اعصابی طور پر بے حد منتشر کر رکھا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد احساس تنہائی بے حد بڑھ گیا تھا۔ نائلہ کی جانب سے مایوس کن ردِعمل کے بعد وہ دل برداشتہ ہو کر لاہور چلا گیا۔ بہنوئی کی جانب سے اچھی جاب اور کسی چھوٹے موٹے فلیٹ کے انتظام کی پیشکش تھی۔ نائلہ کا تصور ذہن میں آتے ہی اس کا غصہ ایک بار پھر عود آیا۔ اپنے جذبات کی بے قدری کا خیال اور انا پر لگی چوٹ کسی بھی جذبہ سے بہت بلند تھی۔

عمران نے اپنے والد کی وفات کے بعد بہت کٹھن زندگی گزاری تھی۔ عمر کے جس دور میں لڑکے فٹبال اور کرکٹ کھیل کر لطف اندوز ہوتے ہیں وہ شہر کی مصروف شاہراہوں پر گاڑیوں کے شیشے صاف کر کے اسکول فیس پوری کیا کرتا تھا۔ محنت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس سے

کتاب الھند

اس شہرۂ آفاق کتاب کا پورا نام ''تحقیق کتاب الہند من مقولہ مقبولہ فی العقل او مرذولہ'' ہے۔ اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے سال ہا سال تک البیرونی نے پنجاب میں مشہور ہندو مراکز کی سیاحت کا، اور سنسکرت جیسی مشکل زبان سیکھ کر اس کے قدیم لیٹریچر کو براہ راست خود پڑھا۔ پھر ہر قسم کی مذہبی، تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی معلومات کو جو اہل ہند کے بارے میں حاصل ہو سکیں اس کتاب کے اوراق میں قلم بند کر دیا۔ البیرونی اگرچہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اہل ہند سے بالکل جدا مذہب رکھتا تھا لیکن اپنی کتاب میں اس نے ہندوؤں کے خیالات کا کہیں مذاق نہیں اڑایا اور نہ ان کے مذہب اور رسوم و عبادات کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے کیونکہ اس کے قول کے مطابق یہ باتیں ایک محقق کی شان سے بعید ہیں۔ اس نے اہل ہند کی داستان اپنے قلم سے عربی زبان میں اس مفہوم کے ساتھ بیان کر دی ہے جیسی ہندو عالم سنسکرت زبان میں اپنے اہل مذہب کے سامنے خود بیان کرتے ہیں۔ البیرونی پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں کے پرانے اور دیگر مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا، رامائن، مہا بھارت اور منوسمرتی وغیرہ کے اقتباسات کو عربی زبان میں ڈھال کر کتاب الہند میں پیش کیا اور اس طرح ہندوؤں کے قدیم ادبیات کو مسلمانوں سے خصوصاً علما کو عموماً متعارف کرایا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراسٹی کراچی

کبھی بھی جی تو نہ چرایا لیکن فطری جذبات تو اپنی جگہ مسلم تھے۔ گھر میں والدہ اور بہنوں کی ذمے داریاں مکمل کرتے ہوئے اس کا دل چاہتا کہ کوئی تو ایسا ہو جو اس کی تشنہ لبی دور کر سکے۔ اسے اپنی زندگی میں صنف نازک کی طلب تھی۔ سونی زندگی میں جذبوں کی نرماہٹ' اپنائیت کی حدت اور چاہت کی گرمجوشی درکار تھی۔ اس نے وقتاً فوقتاً کافی لڑکیوں سے دوستانہ اور رومانوی تعلقات بھی استوار کیے تھے لیکن کوئی بھی بیل منڈھے نہ چڑھی۔ انہیں مادی فوائد درکار تھے۔ منہ پھاڑ کر مہنگے تحائف کا مطالبہ کرتیں اور فرمائش پوری نہ ہونے پر نخرے ساتویں آسمان پر جا پہنچتے۔ اس کے بعد بہت جلد رابطہ ختم ہونے کی نوبت آجاتی۔ صنف نازک سے اس بات چیت کے بعد کسی پُرخلوص رشتے کی طلب شدید تر ہوگئی۔ یہی وہ وقت تھا جب دانستہ طور پر ملائے گئے 'رانگ نمبر' نے نائلہ سے ملاقات کروادی۔ اس سے پہلی بار گفتگو کے دوران ہی عمران کا وجدان بھانپ گیا تھا کہ وہ بہت مختلف لڑکی ہے اور ہوا بھی یہی۔ نائلہ لڑکیوں کے ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جو موجودہ وقت میں ناپید ہو رہا تھا۔ سادگی' وقار' بے ساختگی اور خلوص کا ایسا ملاپ عمران نے کم از کم اپنی زندگی میں کہیں دیکھا نہ سنا تھا۔ اس کی مردم شناسی نے یہ بھی فوراً بھانپ لیا کہ وہ احساسِ محرومی اور تشنگی کا شکار ہے' توجہ و ستائش کی طالب ہے۔ ان کی دوستی حسبِ فطرت بہت جلد محبت میں تبدیل ہوگئی۔ عمران کسی ایسی لڑکی کو ہی شریکِ حیات بنانا چاہتا تھا جو اطاعت گزار' پُرخلوص اور وفادار ہو۔ نائلہ کے خاندان کی جانب سے انکار غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس کا نفسیاتی خوف عمران کو تاؤ دلا دیتا۔ اس کے ذہن میں ذکی اور صائمہ کی شادی بھی نقش تھی۔ انہوں نے اپنے خاندانوں سے بغاوت کے بعد شادی کی تھی۔ اولاد کی محرومی یا چھوٹے موٹے جھگڑے تو زندگی کا ایک حصہ ہی تھے۔ صائمہ بہرصورت ذکی کا ساتھ دیتی تھی۔ عمران کے دل و دماغ میں بھی کہیں نہ کہیں ایک ایسی ہی لڑکی کی طلب تھی جو اس کے لیے اپنے خاندان کے سامنے کھڑی ہو جانے پر تیار ہو جائے۔ اس کے برعکس نائلہ ایک دبو لڑکی تھی۔ عمران کے لیے یہ ردِعمل بھی غیر متوقع نہ تھا۔ نائلہ جیسی لڑکی سے ایسے ہی اوصاف کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ باوفا' پُرخلوص' سادہ مزاج اور بامروت لڑکی کی سب سے بڑی خامی اس کی بزدلی اور قوتِ فیصلہ میں کمزوری ہی ہوا کرتی ہے۔ عمران کو یقین تھا کہ اس کی محبت نائلہ کی یہ کمزوریاں دور کر دے گی اور وہ بھی صائمہ کی طرح اپنے حق کے لیے دبنگ بن جائے گی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ عمران کی انا پر لگنے والی ضرب بڑی زوردار تھی۔ اسی ضرب کی بلبلاہٹ نے اسے انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس شہر میں مٹی کی دو ڈھیریوں کے سوا کچھ بھی نہ رکھا تھا۔ لاہور میں مستقبل تابناک تھا۔ اس کی بہنیں بھی یہی چاہتی تھیں کہ وہاں منتقلی کے بعد شادی کروادی جائے۔ عمران نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کرلیا اور نوکری سے استعفیٰ کے ساتھ کرائے کا یہ فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھی دے دیا۔ فرنیچر اور دیگر اہم سامان ذکی نے اٹھوا کر بعد ازاں اسے لاہور بھجوانا تھا۔

انہی خیالات میں غلطاں اس نے ڈبل روٹی اور انڈے کچن میں لاکر رکھے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بیزاری سے لاک کھولا اور سامنے نائلہ کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

''تم..... یہاں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔ نائلہ خاموشی سے اس کے چہرے کا طواف کرتی رہی۔ اسی لمحہ سامنے والے فلیٹ میں دروازے پر ہونے والی کھٹ پٹ نے عمران کو چونکا دیا۔ اس نے نائلہ کی کلائی تھامی اور اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔

''کیوں آئی ہو تم یہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ اردگرد رہنے والے لوگ کیا تاثر لیں گے؟'' وہ دبی آواز میں چلایا۔ نائلہ کی سماعت مفلوج تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ایک جانب کھلے اٹیچی کیس کو دیکھ رہی تھی جس میں عمران کے کپڑے پیکنگ کی صورت میں موجود تھے۔

''اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار بھی میرا خیال نہیں آیا؟'' وہ صدمہ سے چور تھی۔

''میں نے اب اپنے لیے جینا سیکھ لیا ہے، جب کسی کو میری کوئی پرواہ نہیں تو میں کیوں انسلٹ کرواتا رہوں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ نائلہ کا ذہن بند ہونے لگا تھا۔

''میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔''

''تم مجھے روکنے کا ہر حق کھو چکی ہو۔'' وہ بے نیازی سے کہتا اپنا ناشتا بنانے چل دیا۔ نائلہ کے لیے ضبط مشکل ہوگیا۔ وہ بے اختیار پلٹی اور عمران کو عقب سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''نہیں! میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔'' اس پیش قدمی نے عمران کو ساکت کر دیا۔ نائلہ کے بدن کی

حدت اور تری اس کی بے نیازی کو پاش پاش کرنے لگی تھی۔
''رہنے دو نائلہ! یہ محبت' وفا اور شادی جیسے فیصلے تمہارے بس کا روگ نہیں، جاؤ! اپنے گھر لوٹ جاؤ۔''
''اپنی وفا ثابت کرنے ہی تو آئی ہوں۔'' اس کے آنسو عمران کی شرٹ بھگونے لگے۔ اس سیال نے اس کا وجود بھسم کر دیا تھا۔ وہ پلٹ کر کچھ لمحوں کے لیے اسے دیکھتا رہا۔ نائلہ خود سپردگی کے عالم میں اس کی بازوؤں میں سما گئی۔
''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا نیلو!'' وہ بے بسی سے بولا۔
''آپ چلے جاتے تو کیا کرتی میں؟'' اس نے عمران کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آمادگی سے وہ سرتاپا وحشت میں مبتلا ہو گیا۔ پل بھر میں ہی ایک طوفان دونوں کو اپنی طاقتور لہروں میں بہالے گیا۔
''مجھ سے شادی کرو گے ناں مان؟'' جذبات کی شوریدہ سری تھمتے ہی نائلہ نے اضطراب سے اپنی انگلیاں مسلیں۔
''ہاں! لیکن اب تمہیں میرے طریقے پر چلنا ہوگا۔'' عمران کا انداز یکدم ہی حاکمانہ ہو گیا۔ نائلہ جانتی تھی کہ اس کی دوشیزگی کا مالک بن جانے کے بعد وہ اس سے ہر بات منوالے گا لیکن اس سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ وہ اسے کھونا ہی نہیں چاہتی تھی اسی لیے اتنی بڑی قیمت ادا کر کے اسے روک لیا تھا۔
''صائمہ بھابی کو تمہارے گھر بھیجنے اور تمہارے اسٹینڈ لینے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ لاہور میں میری شادی کی بات چل نکلی ہے۔''
''تو پھر کیا کریں گے ہم؟'' نائلہ متوحش ہوئی۔ اب تو کسی اور سے شادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔
''کورٹ میرج! ہم کچھ ہی دنوں میں کورٹ میرج کر لیں گے۔ اس کے بعد تم قانونی طور پر میری بیوی بن جاؤ گی۔ کچھ عرصہ تم یہیں اپنے گھر میں رہنا۔ وہاں حالات بہتر ہوتے ہی میں تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔ گھر والوں کو میں خود ہی ہینڈل کر لوں گا۔ اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے دلائل پر نائلہ سرشار ہو گئی۔ اسے یہ راستہ حقیقتاً بہت محفوظ نظر آیا تھا۔
مقررہ دن پر وہ کالج جانے کی بجائے عدالت میں کاغذی کارروائی کے بعد عمران کی زوجیت میں آ گئی۔ وہ اسے واپس اپنے فلیٹ میں لے آیا جہاں بھرپور رومانوی اور ازدواجی وقت گزارنے کے بعد واپسی کا وقت آیا تو نائلہ رو رو کر نڈھال ہونے لگی۔
''میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی مان؟''
''تھوڑی سی ہمت تو کرنی ہی ہوگی نیلو! بس کچھ وقت کی بات ہے، پھر ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔''
''اگر اس دوران کچھ ہو گیا تو؟ گھر میں کوئی مسئلہ ہو گیا تو؟'' اس کا فطری خوف ابھرا۔
''تو بے فکر ہو کر ذکی اور صائمہ کے پاس چلی جانا۔ وہ تم پر کوئی آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔''
''آپ واپس تو آئیں گے ناں؟'' وہ اب بھی بے یقین تھی۔
''نہیں! اب تم میرے پاس آؤ گی۔ میرا یہاں آنا اور پھر تمہارا غائب ہونا مناسب نہیں ہوگا۔ میں کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا۔'' عمران ضرورت سے زیادہ محتاط تھا۔ اس نے نائلہ کو ایک بوسیدہ سا موبائل فون تھما دیا۔
''آج کل رات دس بجے کے بعد موبائل کال پیکیج سستے ہو گئے ہیں۔ اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اچھے برے وقت میں کام آئے گا۔'' اس کی پیار بھری احتیاط نے نائلہ کا مان مزید بڑھا دیا۔ کالج کی چھٹی کے وقت وہ بہت سے عہد و پیمان لیے واپس آ گئی۔ اگلے روز عمران لاہور روانہ ہو گیا اور نائلہ انتظار کی سولی پر اذیت میں شب و روز گزارنے لگی۔

☆.....☆

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' عمران کا سخت اور بے یقین لہجہ سن کر نائلہ کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ اسے لاہور روانہ ہوئے دو ماہ بیت چکے تھے۔
''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ یہ جو بھی ہوا ہے ہماری جذباتیت سے ہی ہوا ہے۔ اسی بات کا ڈر تھا مجھے۔'' نائلہ نے روتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ روز پہلے ہی امتحانات سے فارغ ہو کر شدت سے لاہور روانگی کی منتظر تھی کہ عمران کے ساتھ گزارے گئے دو روز کا نتیجہ سامنے آنے سے حواس باختہ ہو گئی۔
''یہ کیا مصیبت ہے بھئی؟'' عمران کی جھنجلاہٹ نے اسے صدمے میں مبتلا کر دیا۔
''آپ ہماری محبت کی اس نشانی کو مصیبت کہہ رہے ہیں۔'' وہ تڑپ اٹھی۔
''اچھا! تو پھر انجوائے کرو ناں اس سچویشن کو۔ گھبرا کیوں رہی ہو؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ چچی جان کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔''
اس کی بات پر عمران نے سر پکڑ لیا۔ وہ لاہور میں بہت سی مشکلات کا شکار تھا۔ شادی سے انکار کرنے پر دونوں بہنوئیوں نے تو آنکھیں ماتھے پر رکھی ہی تھیں' بہنوں کا رویہ بھی یکسر تبدیل ہو گیا۔ ان کے لیے شوہروں کی بات رد کرنا گناہ عظیم تھا۔ نوکری اور رہائش کی ذمے داری بھی اسے اب خود ہی کسی نہ کسی طرح پوری کرنی تھی۔ اس موقع پر نائلہ کی کوئی بھی بے وقوفی یا غلطی اس پر زنا بالجبر' اغواء بالجبر اور کوئی بھی سنگین مقدمہ بنا سکتی تھی۔

''میں ذکی سے کہہ کر صائمہ کو تمہارے گھر بھجواتا ہوں۔ وہ تمہیں اس مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل بتا دے گی۔''

''مجھے اپنے پاس بلوالیں مان! میرا دل نہیں لگتا یہاں۔'' وہ پھر رو دی۔

''بلوالوں گا اور اب فون بند کرو۔ بیلنس بچا کر رکھو۔ میرے پاس کارڈ لوڈ کروا کر دینے کے پیسے نہیں ہیں اس وقت۔'' عمران شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

اگلے روز دوپہر کو صائمہ اس کے کالج کی ایک سہیلی کا روپ لیے میلاد میں شرکت کی دعوت لیے گھر چلی آئی۔ دبلی پتلی' چھریرے جسم کی مالک صائمہ بہ آسانی کالج گرل کا تاثر دے رہی تھی۔ چچی اس کی آمد پر جز بز تو ہوئیں لیکن اس کی شائستگی اور وقار سے مزید کوئی بات نہ کر سکیں۔ اس نے چچی کی نظر بچا کر نائلہ کو چند ادویات دیں اور سب اہلخانہ کو میلاد میں آنے کی تلقین کرتی رخصت ہو گئی۔ ادویات کے استعمال کے بعد مشکل آسان ہوئی تو چچی کے رویے میں بھی قدرے بہتری آ گئی لیکن وہ اب بھی اکثر اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے ہی دیکھا کرتیں۔ نائلہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا پائی تھی۔ وہ بہت دشواری سے اپنا رویہ متوازن رکھے ہوئے تھی۔ اس کشمکش میں بالآخر وہ دن بھی چلا آیا جب ایک رات خاموشی سے اپنے کاغذات' شناختی کارڈ' کپڑے اور مرحومہ والدہ کا سب زیور بیگ میں رکھے گھر سے نکل آئی۔ اس کے قدموں میں لغزش گھر سے نکلنے کی وجہ سے نہیں بلکہ عمران سے ایک طویل جدائی کے بعد ملنے کی سرشاری سے تھی۔ پچھلی سڑک پر ذکی اور صائمہ ایک گاڑی میں اس کے منتظر تھے۔ وہ اسے لیے بس اسٹیشن چلے آئے جہاں اگلے پندرہ منٹ بعد ایک فلائنگ کوچ لاہور کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''بھائی! میں آپ دونوں کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نہ ہوتے تو شاید.....'' وہ جذباتی ہو گئی۔

''نصیب کا لکھا ہر صورت میں پورا ہو کر رہتا ہے۔ تم دونوں کا نصیب مل کر ہی رہنا تھا۔ ہم تو محض ایک ذریعہ بنے ہیں۔'' صائمہ نے اسے تھپکی دی۔ ''عمران میرا سگا دیور نہیں ہے لیکن میں نے اسے ہمیشہ اپنے بھائی کی طرح ہی سمجھا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں سدا خوش رہو۔'' اس کی دعائیں اور نیک خواہشات لیے وہ اگلے اڑھائی گھنٹے میں لاہور کے 'نیازی بس اڈے' پر موجود تھی۔ عمران کو دیکھ کر اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ وہ کچھ کمزور اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''آؤ! اپنے گھر چلیں۔'' اس نے استحقاق سے کہا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' نائلہ نے اپنی روایتی تشویش سے پوچھا۔

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔ بس کام کا کچھ بوجھ ہے۔'' وہ نڈھال تھا۔

''اب میں آ گئی ہوں ناں۔ سب بوجھ بانٹ لوں گی۔'' اس کے پُرخلوص انداز پر عمران نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا بیگ تھام لیا۔ سامنے دو رویہ سڑک تھی جہاں رات کے آخری پہر بھی ٹرک اور ٹرالیاں رواں دواں تھے۔ پرائیویٹ ٹیکسیاں اور کچھ رکشے بھی نظر آ رہے تھے۔ نائلہ کے اندازوں کے برعکس وہ پیدل ہی ایک جانب چل پڑا۔ نائلہ بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چل دی۔ دو رویہ سڑک پار کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پر آئے جہاں ایک اور بس اسٹیشن موجود تھا۔ رونق' روشنیاں اور کھانے پینے کے اسٹالز دیکھ کر نائلہ حیران ہو رہی تھی۔ عمران بائیں جانب ایک بغلی گلی میں مڑا تو وہ محل وقوع کے اس تضاد پر الجھ سی گئی۔ اس پُررونق سڑک کے بعد گلی میں بالکل خاموشی اور سناٹا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی دودھیا روشنی میں نظر آتے مکانوں کے دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کم تعلیم یافتہ اور درمیانے طبقے کا رہائشی علاقہ ہے۔ اس گلی کا اختتام بھی ایک اور ذیلی گلی پر ہوا۔ اسی طرح کی مزید دو گلیاں پار کر کے وہ ایک چوبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں مکانوں کی خستہ ترین حالت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی تعمیر کو چار سے پانچ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ عمران نے بیگ اسے تھمایا اور جیب سے ایک چابی نکال کر زنگ خوردہ تالا کھول کر اندر بڑھ گیا۔ گھر میں تاریکی کا راج تھا۔ عمران ایک تنگ سی دیوڑھی میں آگے بڑھا اور بائیں جانب دیوار پر لگے سوئچ بورڈ پر کوئی بٹن دبا کر دیوڑھی روشن کر دی۔ روشنی ہوتے ہی

نائلہ کی پہلی نظر ایک بوسیدہ پردے پر پڑی جس کے عقب میں بیت الخلاء کی بدبو سے اس کا دل متلانے لگا۔ صحن کی اکلوتی روشنی آسمان سے سولہویں رات کے چاند کی مرہون منت تھی۔ عمران نے دروازہ بند کر کے ڈیوڑھی کی روشنی بند کردی اور کمرے کے دروازے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اندر ایک ٹیوب لائٹ روشن ہوگئی۔ کمرے کی دیواریں پلستر سے عاری تھیں۔ یہاں عمران کے سابقہ فلیٹ والا فرنیچر ہی موجود تھا۔ نائلہ نے بیگ ایک جانب رکھ کر خود کو چادر سے آزاد کردیا۔

''باہر اتنا اندھیرا لگ رہا ہے۔ روشنی ہی رہنے دیتے۔ گھر میں اندھیرا اچھا نہیں ہوتا۔''

''بجلی کا بل کون دے گا بھئی؟ میرا باپ یا تمہارا؟ دونوں ہی قبروں میں سکون سے سوئے پڑے ہیں اور ہم یہاں اس دنیا کے جنجال برداشت کر رہے ہیں۔'' عمران کے تلخ اور بوجھل انداز نے نائلہ کا دماغ سن کردیا۔ وہ اس قدر بدلحاظ تو کبھی بھی نہ رہا تھا۔

''لیٹنے سے پہلے لائٹ آف کردینا۔'' اس نے بستر پر بکھرا کھیس اٹھایا اور سر تک تانے کروٹ بدل کر سو گیا۔ نائلہ اس کے ہر ایک انداز سے حیران در حیران تھی۔ اسے یہاں آمد سے پہلے یہی گمان تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں ٹوٹ کر جذبات کا عملی اظہار کرے گا۔ نائلہ کو بتائے گا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ہر لمحہ اسے یاد کرتا تھا۔ اپنے افسردہ دنوں' ہجر کی راتوں اور بے قرار رتوں کا ذکر کر کے نائلہ کی اہمیت ظاہر کرے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ دل مسوس کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی ذہنی رو پہلی بار اس گھر کی طرف منتقل ہوئی جسے وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ افسردگی کی ایک ہلکی سی لہر دل و دماغ میں سرائیت کر گئی۔

''فجر کا ٹائم ہوگیا ہے۔ اس وقت تک اٹھ گئے ہوں گے سب۔ مجھے ڈرائنگ روم میں سوتا نہ پا کر کیا سوچا ہوگا؟ کہاں تلاش کیا ہوگا؟'' اس نے سوچا۔ ''خیر ڈھونڈتے رہیں۔ مجھے کیا؟ میں نے اپنی محبت پالی ہے۔ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔'' ایک اور سوچ نے اسے سرشار کیا۔ وہ اس بوسیدہ چار دیواری کو محبت بھری نظروں سے نہارتی رہی۔ اگلی صبح عمران روکھے پھیکے انداز میں اپنے کام پر روانہ ہوگیا۔ واپسی پر البتہ مزاج قدرے خوشگوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں نان اور تکے تھے۔

''فریحہ اور شازیہ کیسی ہیں؟'' نائلہ نے کھانے کے دوران پوچھا۔

''اپنے شوہروں کی غلامی کرتے ہوئے بہت خوش ہیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ اسے بہنوئیوں کے رویے کا دکھ ہرگز نہیں تھا۔ افسوس محض اس بات کا تھا کہ بہنوں نے اس کے جذبات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ان دونوں کی شادیوں کے بعد کم از کم تین سال تک اپنے لیے کچھ بھی خرچ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اپنی شادی کے لیے مہندی' ولیمہ اور بری کے لوازمات بنانے کے لیے اتنی جلدی رقم اکٹھی کرنی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر نائلہ سے کورٹ میرج کا فیصلہ کیا تھا۔ شادی کا خرچ بچنے کے ساتھ نائلہ کی عادات بھی بہت مددگار رہتیں۔ اس نے گزشتہ ایک سال میں چند کالنگ کارڈز کے سوا کچھ بھی طلب نہیں کیا تھا۔ ایسی لڑکی کو ہاتھ سے جانے دینا حماقت ہی ہوتی لیکن وہ دونوں اس نکتے کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تین سال منگنی کے بعد فیکٹری کی نوکری سے شادی کی تیاریاں ہوجائیں گی۔ کچھ نہ کچھ امداد طارق اور طیب بھی کردیتے۔ اسی مقام پر عمران خود کو شدید بے بس پاتا۔ وہ اب صنف نازک سے دور رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ نتیجتاً ان کے تعلقات بہت بری طرح متاثر ہوئے تھے۔

''کیا ہوا؟ کن خیالوں میں گم ہیں؟'' نائلہ نے چونکایا۔

''کچھ نہیں! تم آج وہی کپڑے پہن لو جو شادی کے روز پہنے تھے۔'' شوہر کی فرمائش نے اس کی نظریں جھکا دیں۔ اس کے بعد عمران کا یہ رویہ ایک معمول بن گیا۔ اس کے مزاج میں دھوپ چھاؤں کا عالم تھا۔ انداز محبت کی گرمجوشی بھی پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ وہ صرف میکانکی انداز میں اپنے حقوق وصول کر کے برف کے مجسمے میں ڈھل جایا کرتا۔ معمولی سے ہوٹل کی نوکری اسے مزید بیزار اور چڑچڑا بنا رہی تھی۔ نائلہ اس کے مزاج کی یہ تبدیلیاں دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ کچھ روز بعد اس نے عمران سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''آپ نے بتایا تھا کہ ذکی بھائی کے کسی دوست نے اچھی سی نوکری دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا بنا اس کا؟''

''وہی جو ہمیشہ بنتا آیا ہے۔ میری ٹھنڈی قسمت کوئی بھی کام مکمل ہونے ہی کب دیتی ہے۔''

''ایسا تو مت کہیں ناں۔ آخر میں بھی تو اسی قسمت کے توسط آپ کی زندگی میں آئی ہوں۔'' وہ دلار سے بولی۔

''ہاں! سوچتا ہوں کہ تمہاری زندگی بھی میری وجہ سے مشکل ہوگئی ہے۔'' عمران بے حد مایوس ہو چکا تھا۔

''ایسا مت سوچیں مان! میں آپ کے ساتھ خوش ہوں۔ بہت خوش۔'' وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر کہنے لگی۔

''اس جاب میں آخر کیا دشواری ہے؟''

''ذکی کے دوست نے جس بندے کو بیچ میں ڈالا ہے وہ پچاس ہزار روپے کمیشن مانگ رہا ہے۔ کہاں سے لاؤں میں اتنے پیسے؟ سوچتا ہوں خوامخواہ جذبات میں آکر اپنا شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہاں کم از کم اتنی مہنگائی تو نہیں تھی۔ اس جاب سے سیلری بھی اچھی مل جاتی تھی۔'' اس کی مایوسی نے نائلہ کو بھی افسردہ کردیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اٹھی اور اپنے بیگ سے سارا زیور لاکر اسے تھما دیا۔

''آپ کی ہر پریشانی میری ہے مان! ہم دکھ اور سکھ کے ساتھی ہیں۔ اچھا وقت بسر کیا تو اب مشکل وقت بھی مل کر کاٹ لیں گے۔ آپ کو امی جان کی قسم! یہ زیور مجھے واپس نہیں کریں گے۔''

اس کے خلوص اور اصرار نے عمران کو بے بس کردیا۔ زیور کی فروخت نے تمام مسائل حل کردیئے۔ نوکری تبدیل ہوتے ہی عمران کے معمولات اور رویہ بھی بہتر ہونے لگا۔ اب وہ شام کے بعد اسے کہیں نہ کہیں گھمانے بھی لے جایا کرتا۔ نائلہ کے لیے ہر دن عید اور ہر رات شب برأت سی تھی۔ دن کے اوقات میں چند ایک محلہ دار خواتین سے میل ملاقات ہوجاتی تو وقت اور اچھا گزر جاتا۔ اس نے اپنے بارے میں اکثر باتیں فرضی ہی بتا رکھی تھیں۔ چار ماہ بعد قدرت کی جانب سے گود ہری ہونے کی نوید مل گئی۔ نائلہ کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے۔ عمران اس کی حالت' باتیں اور معصومانہ جوش دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ اس خوشگوار ماحول میں تین ماہ بعد تبدیلی اس وقت آئی جب نائلہ نے شوہر کو ایک بزرگ محلہ دار عورت سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔

''آپ کو پتا ہے مان؟ کوثر خالہ کافی عرصہ لیڈی وائف کا کام بھی کرچکی ہیں۔ وہ میری جسمانی حالت اور آثار دیکھ کر کہہ رہی تھیں کہ 'بے بی گرل' آئے گی۔ اس کی بات سن کر عمران کو زوردار جھٹکا لگا۔ ایک لڑکی کا تصور ہی اس کے لیے بہت ہولناک تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔

''مجھے بیٹا چاہیے۔ اپنا وارث۔ اپنا محفوظ مستقبل۔ سمجھیں تم؟'' وہ حلق کے بل چلایا۔

''بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے مان انعمتوں کا حساب دینا پڑتا ہے۔ رحمتوں کا نہیں۔''

''مجھے زیادہ سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹی ہونے کا مطلب ہے کہ ایک طویل مدت تک اس کے لیے کما کما کر پیسے اکٹھے کروں اور شادی کروا کے اپنے ہاتھ کٹوا دوں۔ بعد میں وہ بھی اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے مجھے مکھن سے بال کی طرح نکال پھینکے۔'' نائلہ سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ اپنی بہنوں کی طرف ہے۔ ان کی بے اعتنائی اور ہٹ دھرمی عمران کی زندگی کا ناسور بننے لگی تھی۔ وہ لاکھ ان سے بے نیازی اور لاتعلقی کے دعوے کرتا لیکن گوشت سے ناخن کتنی دیر جدا رہ سکتے تھے۔ عمر بھر ان کے لیے قربانیاں دینے کے بعد ایسا رویہ دیکھنا ذہنی جوار بھاٹے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ نائلہ اسے سمجھانے کے لیے الفاظ تول ہی رہی تھی کہ اگلے جملے نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیئے۔

''یہ نہ ہوا تو خود ہی کسی کے ساتھ رات کے اندھیرے میں فرار ہوجائے گی۔ پہلے یاریاں لگائے گی' پھر اس کے لیے اپنا جسم تک پیش کردے گی۔'' عمران کا ہر ایک انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ ''بیٹی ہونے کا مطلب ہے کہ مجھے اپنے ہی گھر میں قید ہونا پڑے گا۔ پی ٹی سی ایل کنکشن تو میں اب ساری زندگی نہیں لوں گا۔ موبائل بھی بچانا پڑے گا۔'' وہ کف اڑانے لگا۔ اس کی پیشانی پر ایک نیلی رگ ابھر آئی تھی۔

''اور بیٹا ہونے کی صورت میں اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بھی باپ کی طرح رانگ نمبر نہیں ملاتا پھرے گا۔'' نائلہ اپنے الفاظ پر ضبط نہ رکھ سکی۔

''بکواس کرتی ہے میرے سامنے۔ زبان چلاتی ہے۔ تیری اولاد ہوگی تو ایسی ہی تربیت ہوگی اس کی۔'' عمران نے اسے زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ نائلہ کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں جیسی کیفیت تھی۔ وہ یکدم عرش سے فرش پر آگری تھی۔

''میں کسی ڈاکٹر کا پتا کرتا ہوں۔ کل ہی اس سے جان چھڑواؤ۔''

''نہیں! میں دوبارہ یہ قتل نہیں کروں گی۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''نہیں کرے گی تو میرے گھر میں تیری کوئی جگہ نہیں۔ میں صبح ڈاکٹر کی بجائے وکیل سے مل کر طلاق کے کاغذات تیار کروالوں گا۔'' اس نے طیش میں نائلہ کو دھکا دیا اور باہر نکل گیا۔ وہ پیٹ کے بل صوفے کی ہتھی سے جا ٹکرائی۔

''میں یہ قتل نہیں کروں گی۔'' وہ اذیت سے بڑبڑائی۔

اسی لمحہ درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ وہ شدت کرب سے دہری ہوگئی۔ فرش پر بہتے سیال سے اندازہ ہوا کہ قتل تو ہو چکا تھا لیکن یہ صرف ایک ہی قتل نہ تھا۔ آج نائلہ کا اعتبار' بھروسا' عزت نفس اور وجود بھی دم توڑ گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں بے سدھ پڑی رہی۔ اس کی خوش قسمتی یہ رہی کہ کوثر نامی وہ لمدوائف اسے اپنے گھر پکائی گئی کڑھی چاول چکھانے چلی آئی۔ دروازہ کھلا ہونے کے باعث اسے اندر آنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نائلہ کی حالت دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس نے اپنے تمام تر تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

☆......☆

''بس کر دے دھیے! کیوں رو رہی ہے اتنا؟ اللہ کا مال تھا۔ اس نے دیا اور واپس بھی لے لیا۔ اللہ اور بھی دے ہی دے گا۔ تو نہ رو میری دھی!'' کوثر نے بلکتی ہوئی نائلہ کا سر تھپکا۔ وہ اس وقت 'منشی اسپتال' میں موجود تھیں۔ سالن دینے کے لیے آنے والی کوثر نے حتی الامکان طبی امداد دے کر اسے اپنی بیٹی کی مدد سے ہمسایہ ہی کے رکشے میں منتقل کیا اور اس قریبی ترین اسپتال میں لے آئی۔ ڈاکٹروں کی بھرپور کوششوں سے اس کی جان بچاتے صبح ہو گئی تھی۔ کوثر اسی وقت سے نائلہ کے پاس ہی تھی۔ دوپہر سے پہلے ہوش آتے ہی احساس زیاں نے نائلہ کو بے حال کر دیا۔

''عمران کہاں ہے خالہ؟ وہ نہیں آیا کیا؟'' نائلہ کو اسی ستمگر کی یاد آئی۔

''صبح کلثوم کو ملا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ نئی نوکری ہے۔ چھٹی ملنی مشکل ہے۔ شام کو آؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' کوثر کے جواب نے اس کے آنسوؤں میں مزید طغیانی پیدا کر دی۔

''صبر کر دھیے!'' اس نے پچکارا۔

''نہیں ہوتا صبر۔ کیا کروں میں؟ یہ اللہ کا مال تو تھا لیکن چھینا اس کے بندے نے ہے۔ نہیں ہو رہا صبر۔''

''تو اپنے ماں پیو کو یہاں بلوا لے۔ ایسے وقت میں ماں کا سہارا اور ساتھ بڑا ضروری ہوتا ہے۔ تو مجھے ان کا کوئی فون نمبر یا اتا پتا دے۔ میں اطلاع کر دیتی ہوں انہیں۔''

''قبروں میں رہتے ہیں وہ۔ وہاں کوئی فون ہوتا تو آج میں یہ دن نہ دیکھ رہی ہوتی۔'' نائلہ تلخی سے بولی۔

''پسند کی شادی کر کے آئی ہے ناں تو؟'' کوثر چونکی۔

نائلہ نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مرجانیے! کہیں گھر سے بھاگی تو نہیں تھی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ نائلہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ایک بار پھر سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''کون ہے تیرے والی وارثوں میں ماں باپ کے بعد؟''

''چچا چچی کے گھر رہ رہی تھی۔ ان سے بھی نہیں تو خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔'' نقاہت سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''تو نے لازما اپنی تنہائی اور اداسی کا سوچ کر کسی تحفظ کے لیے اس کا ہاتھ تھاما ہوگا۔'' کوثر نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ''تیری عقل کو کیس توپوں کی سلامی دینے کو دل کر رہا ہے۔''

''ان توپوں کے آگے مجھے بھی باندھ لینا خالہ! شاید اسی طرح دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔''

''اب آنسو بہانے کا کیا فائدہ؟ تیری عقل اس وقت کام نہیں کی کہ مرد تو خود اتنا کمزور ہوتا ہے کہ سہارے کے لیے عورت کا محتاج رہتا ہے۔ وہ خود سے کسی کو کیا سہارا دے گا؟''

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو خالہ! شوہر ہی تو سب سے مضبوط سہارا ہوا کرتا ہے۔ اسی کے دم سے تو ساری بہاریں ہوا کرتی ہیں۔''

''نی میری جھلی دھیے! کیسی مضبوطی اور کون سا سہارا؟ یہ میرا چٹا چھاتا دیکھ رہی ہے ناں؟'' اس نے اپنے سفید بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ برف کی سفیدی نہیں ہے۔ ایک عمر گزاری ہے اور اب اندازہ ہوا ہے کہ عورت کو کمزور کہنے والا خود کتنا کمزور ہوتا ہے۔ جب بیٹا ہوتا ہے تو ماں کی توجہ کا محتاج رہتا ہے۔ باپ بنتا ہے تو اس کی ساری مردانگی' انا اور اکڑ فوں بیٹی کی حیا اور مضبوط کردار کے سہارے ٹکی ہوتی ہے۔ بھائی بنتا ہے تو بھی اس دنیا کے سامنے مضبوط رہنے اور سر اٹھا کر جینے کے لیے بہن کے کردار کی مضبوطی چاہیے ہوتی ہے اور پھر جب شوہر بن جائے تو بیوی کی مضبوطی کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ اسے اپنی مردانی بھوک پوری کرنی ہوتی ہے' اپنا خیال رکھوانا ہوتا ہے' اپنی کمائی تھما کر گھر اور بچوں کو سنبھلوانا ہوتا ہے۔ جھلیے! مرد کہاں مضبوط ہوتا ہے؟ مضبوط تو عورت کو بننا پڑتا ہے۔ وہ کمزور عورت سے چڑ کھاتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں اسے عورت کی ذمے داریاں بھی نبھانی پڑ جاتی ہیں۔''

''لیکن خالہ! میں نے تو سنا تھا کہ مرد کو مضبوط عورتیں پسند ہوتی ہیں۔'' نائلہ الجھی۔

''ہاں! ہوتی ہیں ناں! کیوں نہیں ہوتیں۔ وہ انہیں فتح کرنے کے لیے پسند کرتا ہے تاکہ اپنی مردانگی کا جھنڈا گاڑ سکے۔ مجھے معلوم ہے کہ تجھے میری باتیں الجھا رہی ہوں گی۔ تو بس اتنا جان لے کہ یہ مرد کبھی کسی سے محبت نہیں کرسکتا۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ باپ ہوگا تو اولاد کی فرمانبرداری مانگے گا۔ بھائی ہوگا تو بہن کی جی حضوری اور شوہر ہوگا تو بیوی کی وفا اور تابعداری۔ یہ صرف اپنے جوگا ہوتا ہے کملیے! ہم عورتوں کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ اسے اپنی محبت اور اس کی اہمیت کا یقین دلاتی رہیں۔ تیری یہی غلطی کم نہ تھی اور تو نے بھاگ کر شادی کرڈالی۔''

''میں نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کیا تھا خالہ! یہ میرا حق تھا۔ اپنا حق ہی تو حاصل کیا تھا۔ مذہب اور قانون اجازت دیتا ہے مجھے۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''مذہب میں کوئی ایک ایسی تھاں بتا دے جہاں یہ لکھا ہو کہ اپنی پسند کے لیے ماں باپ یا والی وارثوں کے خلاف جا کر شادی کی جاسکتی ہے۔'' کوثر کے اس سوال پر وہ گنگ رہ گئی۔

''مذہب کہتا تو ہے کہ لڑکی سے اس کی پسند پوچھی جائے' اس کی مرضی سے شادی کروائی جائے۔'' وہ جز بز ہوئی۔

''ہاں! یہی کہتا ہے لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ لڑکی کو عدالتوں میں جانے کی اجازت ہے۔'' وہ سیدھی سادی ان پڑھ دکھائی دینے والی عورت نائلہ کی ہر دلیل بہت اطمینان سے رد کرتی جارہی تھی۔

''ساری دنیا کرتی ہے خالہ! یہ کوئی غلط کام نہیں ہے۔ قانون ہمیں اجازت دیتا ہے۔''

''یعنی تیرے لیے مذہب سے بڑا قانون ہے۔'' کوثر نے گہری سانس لی۔ ''دیکھ دھیے! میں کوئی عالم' فاضل' مفتی یا وکیل نہیں ہوں۔ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی کتاب کو جانتی اور مانتی ہوں اور وہاں صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ نکاح میں ولی اور سرپرست کی اجازت و موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ تو نے ایک بار بھی اپنے گھر والوں کو بتایا کہ تیری پسند کو ایک نظر دیکھ لیں؟''

''نہیں! میں ڈرتی تھی کہ وہ مجھ پر کالج آنے جانے کی پابندی لگا دیں گے۔ ایک کالج ہی تو اس قید خانہ سے چند گھنٹے آزادی کا ذریعہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے مرحوم والدین کی تربیت پر انگلی اٹھائیں گے۔ یہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہونا تھا اس لیے معاملہ کو ٹالتی رہی۔'' اس نے پہلی بار سچائی کا سامنا کیا۔

''شاباشے! اس سے اکیلے میں ملی بھی ہوگی۔ شیطان کے بہکاوے میں بھی آئے ہوں گے دونوں۔ پھر جب پانی سر سے اوپر گیا ہوگا تو عدالت پہنچ گئے ہوں گے۔ وہاں کوئی مولوی ہوگا نہ ہی چار کلموں اور خطبے کی برکت۔ رشتے داروں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوں گے نہ ہی قرآن کے سائے تلے رخصتی۔''

''ایسا ہی ہوا تھا خالہ! ایسا ہی ہوا تھا۔'' نائلہ بلکنے لگی۔

''اب کیوں روتی ہے؟ اللہ کے بتائے گئے طریقے کو تو خود رد کر کے آئی ہے۔ اب اگر میاں تجھ پہ اعتبار نہیں کرتا' بیزار ہوگیا ہے' لڑتا جھگڑتا ہے تو یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ تم دونوں کے رشتے کی بنیاد ہی وہ ناس پیٹا کیا لفظ ہے۔ ہاں 'رانگ نمبر'۔ بے برکتی تو خود مول لی تو نے۔ پکے کا مان بھی نہیں رہنے دیا۔''

''میں تھک گئی ہوں خالہ! بہت تھک گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ عمران کہیں کھو ہی گیا ہے جسے میں جانتی تھی۔ یہ تو کوئی اجنبی ہے۔ رات ہوتی ہے تو اپنی مرضی سے طلب پوری کر کے دھتکار دیتا ہے۔ میری تو کوئی مرضی اور خوشی ہی نہیں۔ جب میرا دل قربت چاہتا ہے تو منہ پھیر کر سو یا رہتا ہے۔ جب میں نہ چاہوں تو اپنی ہر مرضی پوری کر کے ہی دم لیتا ہے۔ کیا کروں میں خالہ؟ بہت تھک گئی ہوں۔'' اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔

''کرنا کیا ہے؟ بس روتی رہ۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلاتی رہ۔ تھک جائے تو پھر رو لے اور پھر سے اسے یقین دلانے کا سفر شروع کردے۔''

''ایک خلقت کورٹ میرج کرتی ہے خالہ! خوش بھی رہتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' وہ اپنے بال نوچنے لگی۔

''تجھے کس نے کہا ہے کہ سب خوش رہتے ہیں۔ کسی کو اولاد کی کمی مارتی ہے' کسی کو رزق کی تنگی رہتی ہے' کوئی پابندیوں اور گھٹن میں زندگی جیتا ہے تو کوئی میرے گھر والے کی طرح ایک ہی ہفتہ بعد خاندان کے دباؤ میں طلاق دے جاتا ہے۔ خوش کوئی بھی نہیں رہتا میری بچی! کوئی رہ ہی نہیں سکتا۔ ماں باپ کا دل دکھا کر' اللہ اور اس کے رسولؐ کی کتاب رد کر کوئی خوش رہے بھی تو کیسے؟'' کوثر کے انکشاف

نے نائلہ کو بالکل گنگ کر دیا۔ ان کے درمیان گہری خاموشی حائل ہوگئی۔ شام کو اسپتال سے چھٹی ہوئی تو کوثر نے ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اسے عمران کے ساتھ گھر بھیج دیا جہاں اسی کی پیش گوئی کے مطابق ایک ہی مدار میں سفر کا آغاز ہوگیا۔

☆.....☆

اگلے چھ ماہ اسی اذیت میں بیت گئے۔ نائلہ کی ہر ممکن کوشش کے باوجود عمران کی وہ گرمجوشی اور محبت واپس آ کے ہی نہ دی۔ آغاز میں وہ ہر روز صاف ستھرے کپڑے پہن کر ہلکا پھلکا میک اپ کیا کرتی۔

''اپنے باپ کے ولیمہ پر جانا ہے جو اتنا تیار ہو کر بیٹھی ہوئی ہو؟'' وہ سرد مہری سے کہتا۔

''میں آپ کے لیے تیار ہوتی ہوں مان!'' نائلہ زچ ہو جاتی۔

''سامنے والے گھر میں نیا کرائے دار آیا ہوا ہے۔ عامر بٹ۔ سنا ہے کافی چٹا گورا ہے۔ اسے تو پھانسنے کا ارادہ نہیں ہے؟'' عمران کے زہریلے الفاظ اسے کچھ بھی بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑتے۔ وہ کسی بھی حال میں خوش نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ کھانے پینے اور گھریلو معاملات کی تنظیم سے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ نائلہ کے ذہن میں اکثر یہ سوال اٹھتا کہ چچی نے اسے ان کاموں میں نہ الجھایا ہوتا تو وہ کیا کرتی؟

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ موسم کافی سرد ہو چلا تھا۔ نائلہ کو سردیوں کے چند کپڑے خریدنے تھے۔ کوثر خالہ ان دنوں شہر سے باہر تھی۔ مجبوراً عمران کو ہی اسے بازار لے کر جانا پڑا۔ یتیم خانہ بازار پیدل مسافت پر تھا۔ نائلہ کے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ عمران اسے اپنی مرضی کے رنگ خرید کر دے لیکن وہ کچھ الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مزاج بھانپ کر نائلہ نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ واپسی پر 'رہبر ٹریولز' کراس کرتے ہوئے ان کی بائیک کے سامنے ایک قلی آ گیا۔

''ابے اندھا ہوگیا ہے سالے! دیکھ کر نہیں چل سکتا کیا؟'' عمران بھڑک اٹھا۔

''تمیز سے بات کرو صاحب! تمہارا اپنا دھیان پتا نہیں کدھر ہے۔'' قلی نے بھی دو بدو جواب دیا۔ جھگڑا مزید بڑھنے سے قبل وہاں موجود لوگوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کروایا۔ اسی لمحہ عمران کی نظر فیول میٹر پر پڑی اور وہ مزید جھنجلا کر رہ گیا۔

''لعنت ہے یار! اسے بھی ابھی ختم ہونا تھا۔'' وہ بائیک سے اتر آیا۔

''اترآؤ مہارانی صاحبہ نیچے! تمہارے لیے اب کوئی اڑن کھٹولا منگواؤں کیا؟'' وہ چلایا۔ نائلہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ ان کی گلی کے آغاز پر چراغ دین کی بیٹی کی برأت کے سلسلے میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔ مخالف سمت سے آتے ہوئے عمران کا مزاج مزید ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔ وہ رات بھی ندی کے دو کناروں کی طرح الگ ہی گزری تھی۔

اگلے روز عمران آٹھ بجے ہی کہیں غائب ہوگیا۔ نائلہ بے دلی سے کام نمٹانے لگی۔ اس کی طبیعت بہت بوجھل تھی۔ بس اسٹیشن جیسے مصروف مقام پر اپنی تذلیل اور لوگوں کا تمسخر یاد کر کے آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ نو بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ نائلہ نے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکانا بھی بھول گئی۔

''حسین..... تم یہاں؟'' اس کا دل پھڑپھڑانے لگا۔ وجود میں یکدم ہی کچھ پگھل کر دل کو گداز کر گیا تھا۔ حسین کا قد پہلے سے زیادہ لمبا اور صحت کافی کمزور ہوگئی تھی۔ اس نے ہلکی سی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔

''تم سے یہی اُمید تھی مجھے۔ پکا یقین تھا کہ پہچان ہی نہیں پاؤ گی کہ میں حسین نہیں حسن ہوں۔ تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ حسین کی آنکھ کے پاس ایک تل ہے اور میرا نہیں ہے۔'' اس کے جارحانہ انداز پر شرمندہ ہوگئی۔

''اندر آؤ ناں حسن! گھر میں سب کیسے ہیں؟'' نائلہ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اپنے دل میں چچا زاد کے لیے ایک عجیب سی محبت و کشش محسوس ہو رہی تھی۔

''ہاں! اندر تو ضرور آؤں گا۔ یہی دیکھنے تو آیا ہوں کہ پبلک پلیس پر تمہیں کتوں کی طرح ذلیل کرنے والے نے کون سے محل کی رانی بنا کر رکھا ہوا ہے۔'' اس کے انداز پر نائلہ احساس توہین سے سن ہوگئی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ میں بے حد خوش ہوں۔'' اس نے فخر سے گردن اکڑائی۔ ''تم سناؤ! گھر میں سب کیسے ہیں؟''

''گھر..... کون سا گھر؟ وہ تو ایک سرائے تھا جہاں تم اپنے ماں باپ کے ساتھ وقتی طور پر رہنے آئی تھی۔ ہم تمہیں اپنے غم سے نکلنے کی اسپیس دینے کی غلطی کرتے رہے، تم ہم سے جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچتی رہیں۔ میری ماں پرائی

اولاد کی ذمے داری لینے سے گھبراتی تھی لیکن میرے باپ نے کہا کہ نہیں! وہ میرا خون ہے۔ ہمارا ہی ہے گا۔ اسے تھوڑا وقت چاہیے بس۔ ہاں! میری ماں نے غلطی کی کہ تمہیں زیادہ وقت نہ دیا۔ ہم دونوں بھائیوں نے بھی غلطی کی کہ تمہیں وقت دینے کی بجائے پڑھائی اور پھر کھیل کود میں لگے رہے۔ ہم بھی نے غلطیاں کیں لیکن اتنی بڑی سزا دے ڈالی تم نے۔" اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

"حسن! میری بات تو سنو۔ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دو۔" وہ گڑگڑائی۔

"کیا موقع دوں؟ کیسے بھول جاؤں کہ تمہاری اس حرکت نے ہمارے باپ کو ہارٹ اٹیک نے ایک ہفتہ آئی سی یو کے بعد قبر میں پہنچا دیا۔ اسے یہ غم کھا گیا کہ بڑے بھائی کی سونپی گئی امانت کی حفاظت نہ کر سکا۔ میری ماں اسی صدمہ سے دو مہینے بعد ہمیں چھوڑ گئی۔ یتیم ہو گئے ہم۔ تمہاری وجہ سے مکان بیچنا پڑا۔ پیسے بینک میں رکھوا کر پڑھائی کے لیے ہاسٹل شفٹ ہونا پڑا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ تم ایک ڈائن کی طرح ہمارا سب کچھ کھا گئیں۔ ہم دونوں بھائیوں نے تمہیں بڑی بددعائیں دی ہیں اور آج تمہیں ان حالوں میں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا میرا۔ کاش! اپنے دوست کے ساتھ میری طرح اس کے ماموں کا پرسہ دینے حسین بھی چلا آتا۔ وہ بھی اپنی 'دعاؤں' کو پورا ہوتے دیکھ لیتا۔"

"حسن! میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میری بات تو سن لو ایک بار۔ مجھے چچا چچی کا بہت افسوس ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے ایسا کب کہا کہ تمہارا کوئی قصور تھا؟" حسن نے گھن کھاتے ہوئے ہاتھ چھڑوایا۔ "ساری غلطیاں اپنے کھاتے میں ڈال تو لی ہیں ہم نے اور میرے ماں باپ کا افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس بس اپنی حالت پر کرو اور ساری زندگی کرتی رہنا۔" اس نے نائلہ کے چہرے پر تھوکا اور تیز تیز قدموں سے چلتا دروازے سے بائیں طرف مڑ گیا۔ نائلہ بھربھری مٹی کی طرح صحن میں ہی ڈھیر ہو گئی۔ اسے اپنے وجود پر ایک قیامت گزرتی محسوس ہو رہی تھی لیکن اصل قیامت تو دروازے کے دائیں جانب سے داخل ہوئی تھی۔

☆.....☆

عمران اس روز صبح ہی بائیک ٹھیک کروانے چلا گیا تھا۔ بائیک کی حالت پہلے ہی کافی خستہ تھی۔ یہ اس کے والد کے زمانے سے ہی اس کے زیر استعمال تھی۔ عمران کے پاس نئی خریدنے کے وسائل ہی نہ تھے۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ پسندیدہ لڑکی سے شادی کر لینے کے بعد بھی ایسی کیفیات اس کے لیے بالکل ناقابل فہم تھیں۔ اسے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ وہ نائلہ پر اعتبار کیوں نہیں کر پاتا۔ اس کے دل و دماغ میں خلش کسی بھی طور چین لینے ہی نہ دیتی۔ دوسری جانب بہنوں کی رکھائی اور بے رخی بھی مزید تناؤ میں مبتلا کیے رکھتی۔ اسے علم تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا برتاؤ کر رہی ہیں تاکہ عمران کسی بھی طرح اعصابی طور پر منتشر ہو کر ان کا فیصلہ تسلیم کر لے اور حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ذات کی کشمکش کو کسی ایک کنارے پر لا کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن نائلہ کا وجود اور اب تک کی قربانیاں اخلاقی دباؤ میں مبتلا کر دیتیں۔ انہی خیالات میں الجھا وہ گھر کی طرف چلا آیا۔ گلی کے دائیں جانب لگے ٹینٹ گزشتہ رات برأت روانہ ہوتے ہی اتر گئے تھے۔ وہ ابھی گلی کے کونے میں ہی تھا کہ گھر سے ایک لمبے اور دبلے پتلے لڑکے کو نکل کر دیوار کے ساتھ کھڑی بائیک پر موجود ایک اور لڑکے کے ساتھ روانہ ہوتے دیکھا۔ وہ خاصی عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ عمران کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے تیزی سے قدم اٹھانے کے باوجود وہ لڑکا گلی کا موڑ مڑ چکا تھا۔ عمران غصہ سے آگ بگولا گھر میں آیا تو نائلہ ساکت و صامت صحن میں بیٹھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ مزید تناؤ میں آ گیا۔

"تو یہ گل کھلائے جاتے ہیں میرے پیچھے؟ کس کس یار کو بلاتی ہو یہاں؟ کہاں ہیں وہ موبائل فون جوان سے رابطوں کے لیے چھپا کر رکھے ہوئے ہیں؟ بتا! اور کتنوں سے چکر چل رہا ہے تیرا؟ کس کس کو اپنے بستر پر لے جاتی ہے میرے کام پر جانے کے بعد؟" عمران نے اس کے بال جکڑ لیے۔

"وہ چلا گیا؟ میرا حسن چلا گیا کیا؟ میں نے ابھی حسین سے بھی ملنا تھا۔ اسے بلواؤ کسی بھی طرح۔ اسے یہاں لے کر آؤ۔" نائلہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ حسن کے الفاظ و انداز نے اس پر ہسٹریا طاری کیا ہوا تھا۔ عمران اس کی زبان سے دو غیر مردوں کا ذکر سن کر اسے بے دریغ پیٹنے لگا۔ نائلہ پر بھی وحشت سوار ہو گئی۔ اس نے جھکائی دے کر پہلو بدلا اور اپنی بھرپور قوت سے عمران کی بائیں کلائی کو دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالا۔ اس پر گھونسے، ٹھوکریں اور

تھپڑ کچھ بھی اثر نہ کر رہا تھا۔ عمران نے اپنی بھرپور قوت سے اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

''کاش! میں نے رانگ نمبر کہہ کر وہ کال کاٹ دی ہوتی۔ کیوں چلی میں آئی یہاں؟ کیوں اندھی ہوگئی تھی میں؟'' بین کرتے ہوئے اس کا لہو آلود منہ بہت بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔

''تو اب واپس چلی جا! جس مرضی کے ساتھ منہ کالا کرتی رہ جا کے۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں..... طلاق دیتا ہوں۔'' عمران کے ان الفاظ نے اس کا ذہن الٹا دیا۔ کانوں میں تیز سیٹیاں گونجتی سنائی دے رہی تھیں۔

''پکے کا بھرم ہو تو مرد کوئی بھی انیس بیس کرتے ایک بار سوچتا ضرور ہے۔'' خالہ کوثر کی آواز بہت بھاری اور سست رفتاری سے ذہن میں گونجی۔

''تم میری غیرت ہو نیلو! اس دنیا میں تمہیں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا۔'' نیشنل پارک میں بیٹھے عمران کا فقرہ بھی اسی بھاری اور سست رفتار انداز سے ذہن نے دہرایا۔

''نائلہ پتر! تجھے جتنا پڑھنا ہے پڑھتی رہنا۔ تیری چاچی تو کملی ہے۔ کہتی ہے کسی اچھی جگہ تیرا رشتہ کردوں۔ پر میں کہتا ہوں کہ ابھی تو بہت سا پڑھ لے۔ اعتماد سے لوگوں میں آنا جانا سیکھے۔ بہت ترقی کرے۔'' چاچا جان کا ایک بھولا بسرا جملہ ذہن میں اجاگر ہوتے ہی حسن کا تصور زندہ ہوگیا۔

''تم ڈائن ہو۔ ہمارے گھر کی خوشیاں کھا گئیں۔ ہمارے ماں باپ کھا گئیں۔''

''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' عمران کی آواز ہر ایک بازگشت پر حاوی ہوگئی۔ نائلہ نے ایک زوردار چیخ ماری اور تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا ذہن دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ وہ بیک وقت اس ابر آلود تنہا رات اور اس موجودہ وقت میں طلاق کا داغ پیشانی پر سجائے کھڑی تھی۔ اس نے صحن سے ٹوٹی ہوئی چارپائی کا ایک پایہ اٹھایا اور اپنا بازو سہلاتے عمران کے سر پر دے مارا۔ اسی لمحہ دماغ میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی بازگشت سنائی دی۔

''میں مجاہد صاحب سے بات کرسکتا ہوں کیا؟''

''سوری! رانگ نمبر۔'' نائلہ نے برآواز بلند کہا اور ایک بار پھر عمران کے سر پر بھرپور قوت سے ضرب ماری۔ لہو نے اس کا چہرہ رنگین کردیا۔ ''سوری! رانگ نمبر۔'' وہ بارہا کہتی اسے ضربات لگاتی رہی۔ عمران کی کربناک دھاڑوں نے سب سے پہلے سامنے والے گھر میں عامر بٹ کو متوجہ کیا۔ دیگر ہمسایوں کے اکٹھے ہونے تک صحن میں عمران کی لاش اور نائلہ کی وحشت ناک چیخوں کے سوا کچھ بھی نہ بچا تھا۔

☆.....☆

عامر بٹ تھانہ نواں کوٹ میں اپنے افسر کے سامنے موجود تھا۔

''سر جی! کوئی مشکل کیس نہیں ہے۔ یہ جوڑا کچھ عرصہ پہلے ہی بھاگ کر شادی کر کے یہاں آیا تھا۔ لڑکی دو نمبر ہی تھی جی۔ کل میں نے خود اسے صحن میں ایک لڑکے کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات کرتے دیکھا تھا۔ اسی وقت شوہر بھی چلا آیا۔ لڑکا تو بھاگ گیا لیکن ان دونوں کا جھگڑا زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے شوہر کو قتل کردیا ہے اور اب پاگل پنے کی نوٹنکیاں کرتی پھر رہی ہے۔'' عامر نے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔

''مقتول کی بہنیں اور بہنوئی اس مقدمہ کی پیروی کر کے ملزمہ کو سخت سزا دلوانا چاہتے ہیں۔ اسے سخت تفتیش سے گزارو۔ مجھے ملزمہ کا اقبال جرم چاہیے۔'' بلال غوری نے اسے سختی سے کہا۔ اس کے بعد نائلہ پر جسمانی تشدد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

''ہاں بھئی؟ کہاں بھگایا تھا تو نے اپنے یار کو؟ کیوں قتل کیا اپنے خصم کو؟'' اس سے پوچھا جاتا۔

''سوری! رانگ نمبر۔'' نائلہ میکانکی انداز میں دہرانے لگتی۔ اگلے دو ہفتوں تک تھانے کے بدعنوان اہلکاروں کی ہوس کا نشانہ بنتی نائلہ عدالت میں پہنچی تو وہاں بھی یہی سہ حرفی الفاظ دہراتی رہی۔ عدالت نے اس کا مکمل ذہنی معائنہ کروا کے ذہنی امراض کے اسپتال میں پہنچانے کا فیصلہ سنا دیا۔

''میڈم جی! میڈم جی! وہ بیڈ نمبر سترہ کی رانگ نمبر پیشنٹ کو پھر سے دورہ پڑ گیا ہے جی! وہ اپنا سر زور زور سے بیڈ سے ٹکرا رہی ہے۔'' نائلہ کی کئی سال میں مکمل سننے والی اس کہانی کو صفحات میں قید کر کے میں نے اپنا قلم بند کیا ہی تھا کہ بتول بھاگتی ہوئی میرے پاس چلی آئی۔

''تم انجکشن تیار کرواؤ۔ میں دیکھ لوں گی اسے۔'' میں نے اس کی داستان حیات کے صفحات ایک دراز میں رکھ دیئے اور اس کے رانگ نمبر ذہنی دورے کو پرسکون کرنے چل دی۔

خبط الحواس

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہی ہوں جس کا عکس ہمارے معاشرے میں جابجا نظر آئے گا۔ ایسی خواتین سے ہمارا معاشرہ بھرا پڑا ہے۔ اپنی بے وقوفی سے ایسی ہی عورتوں نے معاشرے کو گندا کردیا ہے۔ ہمارا معاشرہ جو مثالی تھا وہ اب ملغوبہ بن چکا ہے عجیب و غریب رسموں، مطالبوں کا۔ ایسی عورتوں کو میں خبط الحواس کہتی ہوں کہ یہی لوگ جڑ ہیں اس بگاڑ کا۔

آسیہ مظہر چودھری

''دنیا میں تم واحد ماں ہو جو اپنی ہی بچی کے لیے آئے ہر رشتے کو رد کر رہی ہو۔'' مراد صاحب کے صبر کا پیمانہ آج لبریز ہو گیا تھا۔ وہ عشرت بیگم پر بھڑک اٹھے تھے۔

''کچھ غلط نہیں کر رہی مراد صاحب، اپنی بچی کے اچھے مستقبل کے لیے ہی یہ سب کر رہی ہوں۔ آخر دشمن تھوڑی ہوں میں اس کی۔'' عشرت نے جواباً کہا۔

''دشمن ہوتی تو اچھا ہوتا، پر ممتا کی آڑ لے کر جو کچھ تم اس کے ساتھ کر رہی ہو وہ اس کی زندگی کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہی ہے۔'' مراد صاحب عشرت بیگم کی اس لاتعلقی پر افسوس زدہ تھے۔

''عورتوں کے معاملات میں آپ دخل اندازی مت کریں، ہو جائے گا رشتہ اور دیکھنا کیسا ہیرا لڑکا ڈھونڈتی ہوں میں اپنی وردہ کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے عشرت بیگم کی آنکھوں میں اک چمک تھی، ان کا چہرہ عجیب سے تاثرات کی عکاسی کر رہا تھا۔ مراد صاحب نے ان کی باتوں پر سر تھام لیا تھا کیونکہ عشرت بیگم کو اس موضوع پر قائل کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔

☆.....☆

''یار! پتا ہے ادیبہ کا دو دن پہلے نکاح ہوا ہے۔'' فون کی دوسری جانب سے اس کی سہیلی آمنہ نے اپنے تئیں اسے خوش خبری سنائی تھی لیکن یہ سنتے ہی وردہ کے چہرے کے تاثرات سخت اور عجیب سے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں یکدم سرخی مائل ہونے لگی تھیں۔

''ہیلو، وردہ کہاں گم ہو گئیں؟'' آمنہ نے اس کی جانب سے خاموشی پا کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''ہوں، ہاں، کچھ نہیں، اوکے، آمنہ میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔ امی آوازیں لگا رہی ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر فوراً کال کاٹ دی۔

''شادی نہیں ہو گی۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے وردہ کے چہرے پر خوفناک حد تک کی جنونیت چھلک رہی تھی۔ اس نے فون کو غصے سے گھورتے ہوئے نیچے زمین پر دے مارا تھا۔

☆.....☆

''ارے میاں! ہمیں تمہاری بیگم کی سمجھ نہیں آئی، کیسی الٹی کھوپڑی ہے، میرے ہر لائے رشتے کو یہ ہاتھوں ہاتھ دھتکار رہی ہے۔'' بوا نے اپنے پندرہویں لائے رشتے کو بھی بغیر کسی وجہ کے مسترد کرتے دیکھا تو مراد صاحب پر چڑھ دوڑیں۔

''بوا! میں کیا کر سکتا ہوں۔'' مراد صاحب بے بسی سے گویا ہوئے تھے۔

''ارے میاں! تم مرد ہو اس گھر کے، تم کیوں دبکے بیٹھے ہو، لگاؤ دو، عقل ٹھکانے آ جائے گی۔'' بوا نے یہ کہتے ہوئے دانت پیسے جیسے عشرت بیگم کو ساتھ میں کچا چبا رہی ہوں۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں بوا، میں نے اس کم عقل عورت کو نہیں سمجھایا ہو گا، ہزار طریقوں، ہزار دلیلوں سے سمجھا چکا ہوں، پر وہ آدھے دماغ کی عورت خدشے پالے بیٹھی ہے۔'' مراد صاحب بولے تو بوا چونکیں۔

''بھیا! کیسے خدشے؟'' بوا نے اب کے اپنا سر کچھ اور آگے سرکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بوا کیا بتاؤں، اس کم عقل عورت کے دل میں جانے کس نے یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ وردہ کے لیے ایسا رشتہ تلاش کرے، جو وردہ کے نام بنگلا کر دے، عشرت کی ڈیمانڈ کے مطابق سونا چڑھائے اور حق مہر بھی ان کی شرط کا دے۔'' مراد صاحب نے دلی تھیلے سے باہر نکال دی۔

''اوئی نوج، یہ کیسی کفرانہ حرکت ہے، کوٹھی، بنگلے، زیور سے کبھی مستقبل محفوظ ہوا ہے؟ ہر لڑکی اپنی قسمت ساتھ لاتی ہے۔'' بوا یہ کہہ کر استغفار کی صورت کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔

''یہی نہیں بوا، اب وردہ بھی نفسیاتی مریض بنتی جا رہی ہے۔ جہاں کسی اور کی شادی کی خبر سنتی ہے، چیخنے چلانے لگتی ہے۔ عشرت بیگم کی احمقانہ سوچ نے میری بیٹی کی زندگی کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔'' مراد صاحب اپنے اندر کی ساری بے چینی بیان کر گئے تھے اور اب شرمندہ سے نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔

''مراد بچے تم پریشان نہ ہو، اللہ بہتر کرے گا اور اس عشرت کو تو میں ایسا سیدھا کرتی ہوں کہ آئندہ ایسی کفرانہ سوچیں اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔'' بوا نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر چند باتوں کے بعد گھر جانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆

''سلمیٰ! تم اس دن کسی لڑکے کا بتا رہی تھیں شاید اپنی بھابی کے بیٹے کا ذکر کر رہی تھیں تم؟'' عشرت بیگم آج اپنی سہیلی سلمیٰ کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ مقصد وہی لڑکا ڈھونڈنا تھا۔

''ہاں عشرت، میری بھابی آج کل اس کے لیے لڑکیاں تلاش کر رہی ہیں، تو میں نے بھابی سے وردہ بچی کا ذکر بھی کیا تھا۔'' وہ تفصیل سے بتانے لگی تھیں۔

''اچھا پھر کیا کہا انہوں نے؟'' عشرت بیگم گویا ہوئیں۔

''لڑکا ابھی دبئی میں ہے، اس کے واپس آنے پر ہی باقاعدہ کچھ ہو گا۔''

''بس سلمیٰ، تم میری وردہ کی یہاں بات پکی کروا دو۔''

''ہاں عشرت! میری تو پوری کوشش ہے کہ اپنی وردہ کا یہاں رشتہ ہو جائے۔ باقی جو نصیب وردہ کے۔'' سلمیٰ جواباً بولیں۔

''اچھا، تم بیٹھو میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' سلمیٰ یہ کہہ کر کچن کی جانب چلی گئی تھیں۔ جبکہ عشرت بیگم تالے قہم

باتے دل میں بُن رہی تھیں کہ اگر لڑکا میری ڈیمانڈ کا نکل آئے تو سونے پر سہاگا ہو جائے۔ انہوں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے سوچا تھا۔

☆.....☆

اگلے ہی دن بوا کڑے تیور لیے عشرت بیگم کے گھر تشریف لائی تھیں۔ عشرت بیگم لاؤنج میں بیٹھیں ٹی وی پر کوئی مارننگ شو دیکھ رہی تھیں۔ بوا کو یوں اچانک دیکھ کر چونک گئیں۔

''ارے بوا! آپ؟ وہ بھی اتنی صبح؟'' عشرت بیگم نے سامنے میز سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز کو میوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اے بی بی! یہ صبح نہیں، دوپہر ہے۔ یہ تم انگریزوں کی صبح ہے جو یوں نحوستوں کی طرح پیر پسارے پڑے ہو۔'' بوا نے جواباً کاٹ کھانے والے انداز میں جواب دیا تو عشرت بیگم کھسیا کر رہ گئیں۔

''وہ بوا بس رات کو کمر میں شدید درد تھا، اس لیے آنکھ لیٹ کھلی۔''

''جس گھر میں اللہ رسول کا نام نہ لیا جائے، وہاں کمر کا درد ہی مار مارے گا۔'' بوا تو آج بھگو بھگو کر مارنے کا ارادہ کر کے آئی تھیں۔ عشرت بیگم نے مزید بحث نہ کرنے میں ہی عافیت جانی اور کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بوا! آپ بیٹھیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''بس رہنے دو چائے وائے، میں تم سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔''

''جی بوا بولیں!'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی تھیں۔

''یہ تم نے کیا پچھلے ایک سال سے شوشہ چھوڑا ہوا ہے۔'' بوا نے خطرناک تیور لیے اسے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کون سا شوشہ؟'' وہ نا سمجھی کے تاثرات چہرے پر سجائے الٹا ان سے سوال کرنے لگیں۔

''اے بی بی! میری زندگی میں تم جیسی بہت آئیں اور گئیں، خیر اگر پھر بھی تمہاری عقل شریف پر پردے پڑ چکے ہیں تو میں تمہارا کارنامہ من و عن دوبارہ سنائے دیتی ہوں۔'' بوا نے یہ کہہ کر بیٹھے بیٹھے ہی اپنے بھاری بھرکم وجود کو برقعے کی قید سے آزاد کیا اور پھیل کر بیٹھ گئیں۔

''قسم سے بوا آپ کی کوئی بھی بات میرے پلے نہیں پڑی۔''

''عشرت بیگم! تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ تم کسی کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کرو۔ تمہارا ضمیر تمہیں ذرا ملامت نہیں کرتا جو کچھ تم کر رہی ہو اور کر بھی کس کے ساتھ رہی ہو، اپنی سگی بیٹی کے ساتھ۔'' بوا کا دبنگ لہجہ یہ کہتے ہوئے آخر میں تاسف زدہ ہو گیا تھا۔

''اوہ، اچھا! تو یہ ساری آگ مراد صاحب کی لگائی ہوئی ہے۔'' عشرت بیگم نے ساری کہانی سن کر اصل قصوروار کو جالیا تھا۔

''یہ آگ تم لگا رہی ہو عشرت، وردہ بٹیا کی زندگی میں محض ایک معمولی بات کو بنیاد بنا کر جس کا نہ کسی معاشرے میں کوئی تصور ہے اور نہ مذہب میں۔'' بوا نے اسے سمجھایا تھا۔

''بوا! میں وردہ کی ماں ہوں اور کوئی بھی ماں اپنی اولاد کے لیے برا نہیں چاہتی، میں جو کچھ کر رہی ہوں وردہ کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ میں یہی چاہتی ہوں بوا کہ میری بیٹی ہمیشہ خوش رہے، جس کو میں اپنی بیٹی سونپوں وہ اسے ہمیشہ خوش و خرم رکھنے کی گارنٹی دے۔ کیا میں یہ غلط کر رہی ہوں، بتایئے بوا؟'' اس نے اب کہ آبدیدہ لہجے میں پوچھا تو بوا اس کی سوچ پر اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گئیں۔

''اچھا، تو تمہاری خوش و خرم رکھنے کی گارنٹی یہ بنگلا اور سونا ہے؟'' بوا نے تیکھے انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال پوچھا تھا۔

''ہاں، تو بوا اس میں غلط کیا ہے، ہر لڑکی کی ماں چاہتی ہے اس کی بیٹی جس گھر میں جائے خوش و خرم زندگی گزارے اس کی سیکیورٹی کے لیے ہی سب کچھ کر رہی ہوں، تاکہ کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو کم از کم میری بیٹی کے پاس زندگی بہتر گزارنے کا کچھ سامان تو ہو، اور ویسے بھی جو یہ شرائط پوری کرے گا وہ میری بیٹی سے دب کر رہے گا۔'' عشرت بیگم نے اپنی تئیں چالاکی دکھاتے ہوئے بوا کے گوش گزار کیا۔

''واہ عشرت بیگم کیا دور کی کوڑی لائی ہو، داد دینی پڑے گی تمہاری اس لعنتی سوچ کی، بیڑہ غرق ہو ایسی سوچ رکھنے والوں کا جنہوں نے شادی اور رشتوں کو کاروبار بنا لیا ہے، ارے اس معاشرے میں تو لڑکے والے بدنام تھے کہ جہیز... مانگا کرتے ہیں، پر مجھے آج پتا چلا کہ بھیا اب زمانہ اپ ٹو ڈیٹ ہو چکا ہے۔ اب لڑکی والے بھی اس لعنت میں حصہ دار بن چکے ہیں، معاشرہ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے تباہی کے گڑھے پر آ پہنچا ہے، مجھے تمہاری نیت کا نہیں پتا عشرت کیونکہ نیت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر میں یہی کہوں گی اور دو

لوگ کہیں گی کہ تمہارا یہ طریقہ غلط ہے۔ اگر جہیز دینے اور لینے سے بیٹیاں خوش ہوتیں تو بڑے، بڑے بادشاہوں کی بیٹیاں بھی صدا خوش رہتیں، بوا نے افسوس بھری آہ کی آواز نکالی۔

''بس آج کے زمانے کا یہی دستور ہے۔'' عشرت بیگم نے سر جھکا تھا۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہاری اس سوچ کی وجہ سے وردہ بٹیا ذہنی مریض بنتی جا رہی ہے۔ کیوں تم ایک ماں ہو کر اپنی بیٹی کی حالت کو نہیں سمجھ رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیوں بلاوجہ کی سوچ کو بنیاد بنا کر اپنی بیٹی کی زندگی کو بربادی کے دہانے پر لا رہی ہو۔'' بوا نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔

''بوا! گستاخی معاف، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ میری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ اس معاملے میں نہ پڑیں، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، میں بہتر جانتی ہوں، میری بیٹی کے لیے کیا صحیح ہے کیا غلط۔ اگر آپ کے پاس کوئی ڈھنگ کا اچھا رشتہ ہے تو سو بسم اللہ ورنہ آپ کا راستہ اور، ہمارا اور۔'' عشرت بیگم نے بات ہی ختم کر ڈالی تھی۔

بوا نے جواباً تاسف سے سر جھکا تھا۔ ''عشرت بیگم! مجھے یہ دکھ نہیں ہے کہ تم نے مجھ سے ایسا لہجہ اختیار کیا۔ اس سب سے بڑھ کر، سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ تم اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کر دو گی۔ تمہارے جیسی مائیں اولاد کے لیے خود گڑھا کھودتی ہیں۔ ان کو تو گراتی ہی ہیں، لیکن ساتھ میں خود بھی گر جاتی ہیں۔ میری بس یہی دعا ہے اللہ تمہیں ہدایت دے اور وردہ بٹیا کے نصیب اچھے کرے۔ باقی جیسی تم لوگوں کی نیت، ویسا ہی پھل پانا ہے تم لوگوں نے۔'' بوا نے یہ کہہ کر اپنا برقع اور پرس اٹھایا اور ایک افسوس بھری نگاہ عشرت بیگم پر ڈال کر باہر نکل گئی تھیں۔

''اف، شکر ہے جان چھوٹی..... رشتہ کوئی ڈھنگ کا لاتی نہیں، بس بھاشن دینے پر زور بندھا ہوا تھا اور یہ مراد صاحب کی تو میں اچھے سے خبر لیتی ہوں جو ہر آئے گئے کے ساتھ اپنا دکھڑا رونے بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس نے نخوت سے سر جھٹکا اور دوبارہ سے میوٹ کیے ٹی وی کو ان میوٹ کر کے مارننگ شو دیکھنے لگیں۔

☆.....☆

''حلال میں برکت ہے اور حرام میں ذلت، خوارگی..... اور نکاح کو تو اسی لیے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جائز قرار دیا ہے کیونکہ اللہ سے بہتر انسان کی فطرت کو کوئی اچھے سے نہیں جان سکتا کیونکہ انسان میں ''نفس'' ہے جو انسان کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ پل میں ہی انسان کو گناہوں کی دلدل میں ڈبو دیتا ہے اسی لیے اللہ نے انسان کے نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر کام میں ایک جائز طریقہ رکھا ہے اسی لیے نکاح جائز کاموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے اور جب جائز کام میں رکاوٹ ڈالی جائے تو ناجائز کام کی کشش پوری طاقت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یا تو اولاد برائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے یا گھر سے بھاگ جاتی ہے یا نفسیاتی مریض ہو کر خود کو نقصان پہنچا لیتی ہے اور پھر یہی والدین لوگوں کے سامنے بھی شرمسار ہوتے ہیں اور اللہ کے سامنے بھی..... تو ساری کہی بات کا نچوڑ یہی ہے کہ والدین کو چاہیے کہ جب اولاد شادی کے قابل ہو جائے تو اسے نکاح کے جائز رشتے میں باندھ دیا جائے، بغیر کسی جہیز یا ایسی کسی بھی خرافات کے مطالبے کے بغیر، اس یقین کے ساتھ کہ، رزق، خوشی، غمی، تنگدستی اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، اس نے ہر انسان کا رزق اور خوشیاں اس کے نصیب میں لکھ دی ہیں اور دنیا کی، کوئی طاقت ہم سے ہمارا نصیب نہیں چھین سکتی، تو، ایسی خرافات، میں پڑ کر اللہ، اور اس کے رسول کے گنہگار مت بنیے، یاد رکھیے جائز کام کا پھل نیکی ہے اور ناجائز کا ذلت اور پستی۔''

ٹی وی پر چلتے کسی مقرر کے اس بیان کو سن کر مراد صاحب اندر تک کانپ گئے تھے اور انہوں نے اللہ کے حضور سب کے لیے ہدایت کی دعا کی تھی۔

''مجھے عشرت کو روکنا ہوگا۔ میں اب اسے اس پاگل پن کی اور چھوٹ نہیں دے سکتا۔'' انہوں نے مصمم ارادہ کیا تھا کیونکہ اب وہ جانتے تھے انہوں نے کیا کرنا تھا۔

☆.....☆

''امی میں آپ کو ایک آسان حل بتاؤں؟'' عشرت بیگم وردہ کے کمرے میں اسے تیار ہونے کا کہنے آئی تھیں کیونکہ آج شام کو سلمیٰ نے اپنے بھائی بھابی کے ساتھ وردہ کو دیکھنے آنا تھا تو اس سب کے جواب میں اچانک وردہ بولی تھی۔

''کیا؟'' عشرت نے پوچھا۔

''میں کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہوں۔'' اور جواباً عشرت نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

''وردہ اتمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟ تمہاری ٹانگیں نہ توڑ کر رکھ دوں میں۔'' عشرت بیگم کا پارہ ہائی ہو چکا تھا۔

''اچھا ہے ناں روز روز کی جو ذلت و تکلیف میں سہتی ہوں، وہ ایک بار ہی سہہ لوں گی۔'' اس پر عشرت بیگم کے تھپڑ کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

''فضول گوئی مت کرو، زبان کھینچ کر رکھ دوں گی۔''

''امی! یہ فضول گوئی نہیں ہے، حقیقت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے آپ نے میری زندگی اجیرن بنا کر رکھی ہے، جو بھی رشتہ مجھے پسند کر کے جاتا ہے آپ اسے اپنی ڈیمانڈ نہ پوری کرنے پر ٹھکرا دیتی ہیں۔ امی آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ مادی چیزیں میری، خوشی، سکون سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور خدانخواستہ اگر ان سب چیزوں کے باوجود بھی میری ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہو پائی، تو کیا ان چیزوں کا اچار، ڈالوں گی؟ امی، انسان اپنی پوری زندگی ان بے جان مادی چیزوں کے سہارے نہیں گزار سکتا، کیوں اپنے ذہن میں یہ فتور پالے بیٹھی ہیں؟'' وردہ کے لہجے میں اتنی بے بسی اور لاچاری تھی کہ ایک پل کو عشرت بیگم کو اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''آپ جانتی ہیں میری ہم عمر سہیلیاں بیاہ کر دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔ امی آپ کیوں نہیں یہ سب سمجھتیں۔ اب میں ٹین ایج بچی نہیں رہی اگلے ماہ پورے ستائیس برس کی ہو جاؤں گی، کیوں میرے ساتھ ظلم کر رہی ہیں؟ ابھی میرے لیے اچھے گھروں سے رشتے آ رہے ہیں، مگر امی کب تک؟ جب عورت کی عمر ڈھل جائے تو اسے بیاہا مرد بھی مسترد کر دیتا ہے تو کیوں آپ ایک ماں ہو کر اپنی بیٹی کی فیلنگز کو نہیں سمجھ رہیں؟ ابو نے بھی یہی بات آپ کو سمجھانی چاہی مگر آپ نے ان کو بھی ناراض کر دیا، ابو الگ ٹینشن میں ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ عشرت بیگم جواباً سپاٹ چہرے کے ساتھ کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

''مجھے معاف کر دینا میری بچی! تمہارا باپ تمہارے لیے کچھ نہیں کر پا رہا۔ پتا نہیں تمہاری ماں کے دماغ میں یہ فتور کہاں سے آ گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے خاندان میں ایسی سوچ کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔'' عشرت کے کمرے سے نکل جانے کے بعد مراد وردہ کے پاس آئے تھے، انہوں نے کل رات اس سے کھل کر دو ٹوک بات کر لی تھی کیونکہ اب ان کے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ وردہ عشرت بیگم کو قائل کر سکتی تھی کیونکہ مراد صاحب سے تو وہ آج کل بات تک نہیں کر رہی تھیں۔

''ابو! مجھے معاف کر دیں، میں آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن رہی ہوں۔''

''نہیں میری بچی۔'' مراد صاحب نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں، پریشانی کا سبب نہیں، تمہاری ماں بھی تمہارے لیے اچھا ہی سوچ رہی ہے اپنی طرف سے مگر اس کم عقل عورت کو یہ نہیں علم کہ جو وہ سوچ رہی ہے وہ بیوقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر تم پریشان مت ہو، ان شاء اللہ سب اچھا ہوگا۔'' مراد صاحب نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے حوصلہ دیا۔

''ابو! آپ بہت اچھے ہیں۔'' وہ پھر رو دی تھی۔

''میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ سکتا ہوں بیٹے، ہم تمہارے فرض کی ادائیگی میں تاخیر کر کے اپنے اللہ کے گنہگار ہو رہے ہیں۔ والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کے باقی فرائض کی طرح شادی جیسے اہم فرض کی ادائیگی بھی احسن طریقے سے انجام دیں۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہوگا، تم پریشان مت ہو۔'' مراد صاحب نے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور اسے تیار ہونے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئے کیونکہ اس دفعہ انہوں نے پکا ارادہ باندھ لیا تھا کہ وہ گھر آئے اس رشتے کو واپس نہیں لوٹنے دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

☆.....☆

مہمان آ چکے تھے۔ لڑکا بھی والدین کے ساتھ آیا تھا۔ اچھے اور شریف لوگ تھے۔ مراد صاحب کو بہت پسند آئے تھے اور کیونکہ سلمیٰ کا خاندان تھا، دیکھا بھالا تھا اس لیے چھان بین کی بھی فکر نہیں تھی۔ عشرت بیگم بھی کافی خوش دکھائی دے رہی تھیں اور مراد صاحب کا رواں رواں دعا گو تھا کہ عشرت بیگم کو آج پرانا دورہ نہ پڑے اور یقین بھی تھا کہ وردہ سے ہوئی بحث کے بعد شاید عشرت بیگم اس بار اپنی پرانی عادت چھوڑ کر بیٹی انہیں سونپ دیں۔

''عشرت! وردہ بچی کو بلوا لو اب۔'' سلمیٰ بیگم اب اصل مدعے کی جانب لوٹی تھیں۔

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں، وردہ آتی ہوگی بس لیکن سلمیٰ.....'' اور عشرت بیگم کے اس ''لیکن'' پر مراد صاحب کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

''عشرت! تم جاؤ دیکھو وردہ کیوں نہیں آئی، شاید تمہارا انتظار کر رہی ہو۔'' مراد صاحب نے ڈوبتی کشتی

بچانے کی کوشش کرنی چاہی مگر عشرت بیگم نے ان کی بات ان سنی کر دی جیسے مراد صاحب کسی اور دیس کی زبان بول رہے ہوں۔

''سلمٰی! میں ایک بات کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔'' عشرت بیگم نے جہاں سے بات ختم کی تھی وہیں سے شروع کی تھی۔

''عشرت! میں تمہیں کہہ رہا ہوں نا کہ وردہ کو لے کر آؤ۔'' مراد صاحب کا لہجہ اب کے سخت اور دوٹوک تھا۔ ان کی آپس کی گفتگو دیکھ کر مہمان حیرانی اور تذبذب کا شکار ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

''واثق بیٹے! کیا، آپ، میری وردہ کے نام بنگلا اور ہماری مرضی، کا تعین کردہ حق مہر اس کے نام کر سکتے ہیں، مجھے، اپنی بیٹی کی سیکورٹی چاہیے؟'' عشرت بیگم نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بم پھوڑا۔ مراد صاحب غصے کی آخری حد کو ضبط کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے تھے۔

''یہ کیسی عجیب ڈیمانڈ ہے۔'' عشرت کا مطالبہ سن کر لڑکے کی ماں کچھ حیرانی سے بولی تھیں۔

''عجیب نہیں ہے بہن، میری بیٹی کی پوری زندگی کا سوال ہے اور ایک بیٹی کی ماں کے دل کو تو جانتی ہی ہوں گی آپ؟''

''جی بہن! میں بہتر سمجھتی ہوں کیونکہ میں خود ماشاء اللہ دو بیٹیوں کی ماں ہوں اور معذرت کے ساتھ مجھے آپ کا یہ مطالبہ کچھ عجیب سا لگا۔ ہم نے بھی اپنی بیٹیوں کی شادیاں کی ہیں۔ ہم نے تو ایسی کوئی سیکورٹی نہیں مانگی بھلا؟ اور معاف کیجئے گا بہن تعلق رشتہ چاہے کوئی بھی ہو بھروسے اور محبت کا ہوتا ہے نہ کہ کسی چیز کی گارنٹی دینے لینے سے مضبوط ہوتا ہے۔'' جہاں آرا نے کھل کر اور دو ٹوک بات کی تھی۔

''ہاں عشرت! تم یہ کیسی منطق لے کر بیٹھ گئیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ پہلے بھی تم اسی بات کو بنیاد بنا کر وردہ کے لیے آئے ہر رشتے کو رد کرتی رہی ہو۔'' سلمٰی بیگم کے لہجے میں بھی اب کہ تاسف تھا۔

''ٹھیک ہے تو آپ اگر میرا مطالبہ نہیں مان سکتے تو آپ لوگ جا سکتے ہیں، میری طرف سے انکار ہے۔'' عشرت بیگم نے بھی جواباً سفاکی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔

''عشرت!'' مراد صاحب جو کب سے ضبط کیے بیٹھے تھے، دھاڑ اٹھے۔ ''بس! بہت ہو گیا۔ آگے سے اگر ایک لفظ بھی تم نے منہ سے نکالا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' مراد صاحب کا لہجہ اتنا پتھریلا اور سفاک تھا کہ عشرت بیگم سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ ''تم نے زندگی اور رشتوں کو مذاق بنا ڈالا ہے۔ بس بہت ہو گیا تمہارا یہ گندا کھیل..... اب میں تمہیں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گا۔'' مراد صاحب نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی۔

''ابو!'' وردہ کی سرسراتی کانپتی آواز نے یکدم تمام نفوس کے دل دہلا دیئے تھے۔

''وردہ!'' مراد صاحب نے پکارا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر روتی ہوئی واپس اوپر کمرے کی جانب بھاگی تھی۔

''وردہ!'' مراد صاحب بھی جواباً اس کے پیچھے دوڑے تھے لیکن اب واقعی دیر ہو چکی تھی۔

☆.....☆

''ڈاکٹر صاحب! کیسی ہے میری بچی؟'' عشرت بیگم نے روتے ہوئے بے تابی سے پوچھا تھا۔

''مریض کی حالت کافی نازک ہے، زہر خون کی نالیوں میں پہنچ چکا ہے۔ بس آپ دعا کیجیے۔'' ڈاکٹر نے پیشہ دارانہ انداز میں تسلی دی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! میری بچی کو بچا لیجیے۔'' عشرت بیگم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے فریاد کر رہی تھیں۔

''حوصلہ کیجیے، اللہ سب بہتر کرے گا۔''

''کیوں جھوٹے آنسو بہا رہی ہو عشرت بیگم؟ تمہاری وجہ سے آج میری بچی موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ تمہاری سوچ نے میری بچی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔ کیسی بدبخت ماں ہو تم؟ اگر یہ پرائیویٹ اسپتال میرے دوست کا نہ ہوتا تو آج تم جیل میں ہوتیں سیدھے سیدھے پولیس کیس ہے یہ۔'' مراد صاحب نے انہیں کوسا تھا۔ وہ جواباً کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند ان کے پاؤں میں گر گئی تھیں۔

''مراد! مجھے معاف کر دیجیے، مجھے آج احساس ہوا ہے۔ بس وردہ ٹھیک ہو جائے میں آپ لوگوں کی زندگیوں سے دور چلی جاؤں گی۔ بس میری وردہ ٹھیک ہو جائے۔'' وہ رو رہی تھیں۔ مراد صاحب نے دکھ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

''دعا کرو عشرت! میری وردہ زندگی کی جانب لوٹ آئے، ورنہ میں کیا تمہیں میرا اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔''

مراد صاحب یہ کہہ کر رکے نہیں تھے جبکہ عشرت بیگم مسلسل اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہی تھیں۔

☆.....☆

اور دو دن تک زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے بالآخر وردہ زندگی کی جانب لوٹ آئی تھی۔ مراد صاحب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''ابو! کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہیں؟ بس! پچھلی سب باتوں کو بھول جائیں اور معافی تو مجھے مانگنی چاہیے اپنی اس غلطی کی۔''

''نہیں بیٹا، جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا مگر شکر ہے کہ اللہ نے میری عزت اور آنسوؤں کی لاج رکھ لی ورنہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر پاتا۔'' مراد صاحب پشیمانی بھرے انداز میں گویا ہوئے تھے۔

''ابو! اب بس کر دیں، آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، اور یہ امی کہاں ہیں؟'' اس نے اب کے عشرت بیگم کی بابت پوچھا۔

''باہر بیٹھی رو رہی ہے، اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہے، کہہ رہی ہے ہم سے دور چلی جائے گی۔''

''امی کا دماغ لگتا ہے پھر خراب ہو گیا ہے۔ آپ بلائیں امی کو۔'' اور پھر اگلے لمحے ہی عشرت بیگم وردہ کے گلے لگتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دو میری بچی! میں تمہارے حق میں اچھی ماں نہیں بن پائی، میرے خود ساختہ قائم کیے تعصب نے تمہیں آج اس حالت میں پہنچا دیا، میں کس منہ سے تم سے معافی مانگوں؟''

''اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو زندگی بھر میں خود کو معاف نہ کر پاتی۔''

''امی، پلیز! کہا نا میں نے اب سب باتوں کو بھول جائیں، مجھے اب کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔ مجھے آپ دونوں کے پاس رہنا ہے زندگی بھر.....'' اس نے عشرت بیگم کے بہتے آنسوؤں کو اپنی پوروں سے سمیٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا؟ بس میری وجہ سے جو سزا تم نے جھیلنی تھی جھیل لی اب اور نہیں اس بار میں اپنی سب غلطیوں کی تلافی کروں گی تاکہ میرے ضمیر پر جو بوجھ ہے وہ اتر سکے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اب کے مراد صاحب کی طرف دیکھا نگاہوں میں از حد شرمندگی تھی۔

''مراد ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے، حالانکہ میں جانتی ہوں میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔'' انھوں نے مراد صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

''وردہ نے تمہیں معاف کر دیا تو سمجھو میں نے بھی کر دیا۔'' مراد صاحب نے ہلکے سے مسکرا کر ان کی شرمندگی کے اثر کو زائل کرنا چاہا تھا۔

''مجھے ایک اور بات بھی کرنی ہے۔'' عشرت بیگم اب کے فیصلہ کن انداز میں ان دونوں باپ بیٹی کی جانب دیکھ کر اچانک بولی تھیں، ان باپ بیٹی نے ایک دوسرے کی جانب ناسمجھی سے دیکھا۔

''کیا؟''

''میں نے سلمی اور جہاں آراء سے ابھی کچھ دیر پہلے بات کی ہے، وہ نکاح کرنے یہیں آ رہے ہیں۔ میں نے ان سب سے معافی مانگ لی ہے۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان پر اچانک بم گرایا تھا۔

''یہاں اسپتال میں نکاح؟ اوہ نو۔'' وردہ تو یہ سن کر بھونچکی ہی رہ گئی تھی۔

''مت بھولو وردہ بیٹا یہ ابھی بھی پرانی عشرت ہے۔ بس صرف یہی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ یہ اب ذمے دار ماں اور اچھی بیوی بن گئی ہے۔'' مراد صاحب ہنستے ہوئے عشرت بیگم کو چھیڑنے لگے تھے۔ عشرت بیگم بھی روتے ہوئے ہنس دی تھیں۔

''اب یہ چھیڑ چھاڑ بعد میں کر لیجے گا مجھے گھر لے کر چلیے، تاکہ تیاری کر سکوں، اور مجھے بوا سے بھی معافی مانگنی ہے واپسی پر انھیں بھی ساتھ لیتے آئیں... اور وردہ تم آمنہ کو بلوا لو وہ تمہیں تیار کر دے گی۔'' وہ جلدی جلدی کہہ کر باہر نکل گئی تھیں، جواباً مراد صاحب اور وردہ نے ایک دوسرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔

خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو قسمت سنبھلنے کا دوسرا موقع دیتی ہے اور عشرت بیگم بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شمار ہو گئی تھیں مگر ضروری نہیں قسمت ہر انسان کو سنبھلنے کا دوسرا موقع دے تو ایسے وقت سے بچنے کے لیے اپنی سوچوں کو ایسی ''خبط الحواس'' کی جکڑی بیڑیوں سے آزاد کر دیجیے کیونکہ سبق اور عبرت میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

بھوک، روٹی، دوستی

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
ایک چھوٹی سی سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں۔ آج بھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ سومرو بھی ایک ایسا ہی بندہ ہے۔ ایسے ہی بندوں کی وجہ سے ہم آپ، سب کے سب سُکھ کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں، ورنہ تو یہ دنیا گناہوں کے بوجھ سے تباہی کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔

جرار احمد جعفری
(کراچی)

میں حسبِ معمول صبح سات بجے گھر سے نکلا۔ میرے ہاتھ میں رنگ کا خالی ڈبا تھا جس میں دو تین قسم کے برش تھے۔ رنگ مال کے ٹکڑے بھی تھے۔ اس وقت بیوی نے اخبار میں لپٹی دو چپاتیاں اور گڑ کی ڈلی رنگ والے ڈبے میں ہی رکھ دی تھی۔ میں نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔ "سکینہ! اللہ سائیں آج کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔ بس تم دعا کرتی رہنا۔ خدا حافظ۔"

سندھ کی گرمی وہ بھی شکار پور کی۔ آج صبح ہی سے لُو چل رہی تھی اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ مین بازار میں سڑک کے کنارے اور بھی مزدور دیہاڑی کے انتظار میں

بیٹھے تھے۔ میں بھی لائن میں بیٹھ گیا۔ قریب ہی میرا پرانا ساتھی بیٹھل بھی بیٹھا ہوا تھا۔

''آؤ آؤ ادا قمر علی۔ گھر میں سب ٹھیک ہے ناں، بھابی سکینہ کیسی ہے۔ نئے مہمان کے آنے میں اب کتنی دیر ہے۔'' بیٹھل نے میرے لیے جگہ بناتے ہوئے پوچھا۔

میں نے بیڑی سلگا کر کہا۔ ''یار! تمہاری بھابی مولا کے کرم سے بالکل ٹھیک ہے۔ زچگی میں ابھی سات مہینے ہیں سوچتا ہوں وقت پر کیا ہوگا یہاں تو پلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''فکر کیوں کرتے ہو ادا۔ اللہ سائیں نے چار سال کے بعد خوشی دی ہے تو حفاظت بھی وہی کرے گا۔''

''ہاں یہ تو ہے، بس مولا ہی کا بھروسا ہے۔'' میں نے بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اپنا یار سومرو دبئی سے دو سال بعد آیا ہے۔ آج شام اس نے پرانے دوستوں کو بلایا ہے۔ کھانا بھی ہوگا۔ اس کی کہانیاں سنیں گے تو بھی چلے گا نا؟''

''ہاں کیوں نہیں ادا۔'' بیٹھل نے سگریٹ سلگائی۔ ''اللہ سائیں اسے خوش رکھے۔ اس نے تمام پرانے دوستوں کو بلایا ہے ورنہ پیسا آنے کے بعد کون غریب یاروں کو پوچھتا ہے۔''

اسی اثناء میں ایک ڈبل کیبن گاڑی سامنے رکی۔ تمام مزدور اٹھ کر گاڑی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ سیٹھ کو نیو کھدوانی تھی۔ چار مزدور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ باقی سب واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ بیٹھل نے کہا۔ ''ادا اسے میں جانتا ہوں۔ یہ ٹھیکے دار جاکھرانی تھا۔ یہ تین پلازے بنوا رہا ہے۔ اس کے پاس کام لگتا رہتا ہے، رنگ روغن کا کام نکلے گا تو ہمیں ضرور بلوائے گا۔''

شام پانچ بجے ہم ٹھیے سے اٹھ گئے۔ میں پسینا پونچھتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو سکینہ شکل دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ آج بھی دیہاڑی نہیں لگی ہے۔ اس نے کہا۔ ''سائیں تم نلکے پر ہاتھ منہ دھولو۔ میں نے دو مٹھی چاول ابالے ہیں وہ لے کر آتی ہوں۔''

میں نے کاندھے پر پڑے بڑے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''سکینہ چاول رہنے دو، وہ تم شام کو کھا لینا۔ رات کو سومرو نے سب دوستوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ میں وہاں کھا لوں گا۔ بس تم میرے لیے گرم گرم چائے بنا دو اگر پتی چینی بچی ہو تو۔''

''ہاں تم بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' سکینہ اٹھ کر بغیر چھت کے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

مغرب کی نماز کے بعد میں گھر سے نکلا۔ بیٹھل کا گھر راستے میں تھا اسے بھی ساتھ لے لیا۔

سومرو کا گھر دو گلیوں کے بعد ہی تھا، دو منزلہ پکا، خوب صورت مکان تھا۔ سومرو دروازے پر ہی مل گیا۔ ہم گلے ملے پھر میں نے کہا۔ ''یار سومرو تیری بڑی مہربانی، تم نے پرانے غریب دوستوں کو یاد رکھا۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔''

''یار ایسی غیروں جیسی بات مت کر، ورنہ لڑائی ہو جائے گی۔ تم دونوں میرے بچپن کے یار ہو، تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ سب یار آ چکے ہیں بس تم دونوں کا انتظار تھا۔''

صحن میں دریاں بچھی تھیں ان پر سفید چاندنیاں اور اسی رنگ کے چھوٹے چھوٹے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ سب دوست اٹھ کر دونوں سے گلے ملے۔

''یار قمر تم تو بالکل عید کے چاند ہو گئے ہو۔ کبھی ملتے ہی نہیں ہو۔'' نبی بخش عرف بخشو نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار تیری شکایت بجا ہے بس یار روزگار کے جھمیلے فرصت ہی نہیں دیتے۔ کبھی دیہاڑی لگ جاتی ہے، کبھی خالی ہاتھ رہ جاتا ہوں، تو سنا تیرا کیا حال ہے؟''

''مولا کا کرم ہے، میرا پان سگریٹ اور ٹھنڈی بوتلوں کا کام خوب چل رہا ہے۔ اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔'' بخشو نے جواب دیا۔

سومرو نے کہا۔ ''یارو کیا موڈ ہے کھانا ابھی لگوا دوں یا پہلے گپ شپ چلے گی۔''

آفتاب چنا جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا۔ ''کھانا تو عشاء کی نماز کے بعد کھائیں گے۔ پہلے تمہاری دو سال کی کتھا سنیں گے۔ گپ شپ نہیں بالکل سچ اور کھرا سچ۔''

''جیسے تم لوگوں کی مرضی۔'' سومرو بولا۔ ''کراچی سے دبئی صرف دو گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ جب میں وہاں جہاز سے اترا تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ اجنبی ملک، اجنبی شہر، اجنبی زبان۔ اتنا بڑا ائرپورٹ کہ آدمی چلتے چلتے تھک جائے لیکن جب میں پاسپورٹ کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوا تو تمام ڈر خوف دور ہو گیا۔ وہاں ایک پاکستانی میرے نام کی تختی لیے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر معلوم کیا اور کہا میں ہی سومرو ہوں، پہلے تو وہ میرا ٹین کا بکس دیکھ کر بہت ہنسا کہنے لگا۔ ''یار! تم تو بالکل پینڈو معلوم ہوتے ہو، خیر کل میں تمہیں اچھا سا سوٹ کیس دلوا دوں گا۔ میرا نام جمشید ہے۔

میرا تعلق کراچی سے ہے آؤ میرے ساتھ۔"

باہر آکر میں نے اپنا بکسا اس کی کار کی ڈگی میں رکھا اور ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں اس نے کہا۔ "سومرو! میں بھی اسی کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ میرا کام ورکرز کا ریکارڈ رکھنا، ان کی مدد کرنا ہے۔ یہاں چوری چکاری نہیں ہوتی۔ کسی قسم کی مذہبی یا دوسری سیاست میں مت پڑنا۔ لڑکیوں کے چکر میں پڑو گے تو تم کچھ بھی سیونگ نہیں کر سکو گے۔ اپنا کام ایمانداری سے کرنا، باقی تم خود سمجھ دار ہو۔"

وہ مجھے لے کر ایک فلیٹ میں آیا۔ اس میں تین کمرے تھے۔ اٹیچ باتھ وغیرہ۔ ہر کمرے میں دو دو بستر لگے ہوئے تھے۔ "تو مسٹر سومرو یہ ہے تمہارا ٹھکانا۔ یہاں پانچ بندے اور ہیں، سب پاکستانی ہیں۔ سب نے کام بانٹے ہوئے ہیں۔ خرچا بھی سب مل کر دیتے ہیں۔ اس وقت سب کام پر گئے ہوئے ہیں۔ شام کو تمہاری سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ کل صبح ساڑھے سات بجے بالکل تیار رہنا۔ میں تمہیں کام والی جگہ لے جاؤں گا یعنی بقالا الکبیر۔ قریب ہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں تم نہاؤ دھوؤ، ٹی وی دیکھو، آرام کرو اور ہاں یہ سو درہم رکھ لو۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی مجھے لوٹا دینا خدا حافظ۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

"تو دوستو یہ تھا میرا پہلا دن دبئی میں۔ دوسرے دن سے میں نے بقالا میں کام شروع کر دیا۔ بقالا کو تم سمجھ لو جیسے کراچی میں بڑے بڑے سپر اسٹور ہوتے ہیں۔ یہ جو میرا مکان دیکھ رہے ہو ایسے دس مکانوں کو ملا لو تو چار منزلہ بقالا الکبیر بنے گا۔ یہاں کا جنرل مینیجر انڈین ہے۔ مدراس کا رہنے والا۔ بہت اچھی اردو بولتا ہے۔ میرے دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا کہ عربی بولی جاتی ہے کیسے کام چلے گا مگر یہاں معاملہ ہی عجیب تھا۔ بینکوں میں جاؤ، دکانوں میں جاؤ، ریسٹورنٹ میں جاؤ سب جگہ اردو بولنے والے پاکستانی اور انڈین مل جاتے ہیں۔ قصہ مختصر تمہارے بھائی نے دو مہینے میں اپنا رنگ جما لیا۔ جنرل مینیجر رمیش بابو تو مجھ سے بہت ہی خوش تھا۔"

"اب تھوڑا سا بریک۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر سومرو زنانے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے کچھ شاپنگ بیگ تھے۔ اس نے ایک ایک بیگ ہر ایک کو دیا۔ "یارو مجھے مبارک باد دو، تمہارے بھائی نے یہاں آتے ہوئے مدینہ شریف کی زیارت اور عمرے کی سعادت بھی حاصل کر لی ہے۔ اس بیگ میں مدینہ شریف کی کھجوریں اور آب زم زم کی شیشیاں ہیں۔"

سب کھڑے ہو گئے اور سب نے سومرو کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ اسی اثناء میں دو چھوٹی چھوٹی بچیاں دستر خوان لے کر آ گئیں اور بچھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کھانے کی قابیں آنے لگیں۔ ایک قاب میں خوشبو اڑاتے کباب، دوسری میں پراٹھے تھے۔ ایک بڑی ٹرے میں بھانپ اڑاتی مرغ بریانی تھی۔ سومرو نے کہا۔ "دوستو! تکلف مت کرنا چلو شروع ہو جاؤ۔"

سب نے اپنی اپنی پلیٹیں بھرنی شروع کر دیں۔ میں نے پہلا نوالا ہی منہ میں رکھا تھا کہ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دماغ میں گونج اٹھی۔ "میں یہاں کباب بریانی اڑا رہا ہوں، گھر میں میری بیوی بھوکی بیٹھی ہے۔"

سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے بعد قہوے کا دور چلا۔ آفتاب جتانے کہا۔ "سومرو تم نے دال روٹی والی روزی کا ذکر کر دیا۔ کچھ دو ٹانگوں والی روزی کا حال احوال سناؤ۔"

سب نے قہقہہ لگایا۔ سومرو نے کہا۔ "یار وہاں لڑکیاں بہت ہیں۔ یورپ اور روس سے چارٹر بھر بھر کر دبئی پیسے کمانے آتی ہیں لیکن یار اگر میں ان کے چکروں میں پڑ جاتا تو بچت کو بالکل بھول جاتا۔ اللہ سائیں نے مجھے دو بچیاں دی ہیں، آگے لڑکا بھی دے گا انشاء اللہ۔ مجھے اپنی بیٹیوں کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ میں نے دس دس گرام والی

Antiperspirants

پسینے اور اس کی بو سے بچنے کے لیے اکثر افراد ایسے deodorant کا استعمال کرتے ہیں جس سے پسینا آنا رک جاتا ہے لیکن متعدد تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان deodorant کا مسلسل استعمال جسم کے لیے متعدد مسائل پیدا کرتا ہے۔ ان میں جلد کے مسائل اور کینسر شامل ہیں۔ پسینا آنا ایک قدرتی عمل ہے اور یقیناً جب ہم اس عمل کو روکنے کی کوشش کریں گے تو اس کا نتیجہ مستقبل میں کئی مسائل کی صورت میں نکل سکتا ہے اس لیے deodorant کو بھی روی کی ٹوکری میں ہونا چاہیے۔

مرسلہ: ناصر حسین ناصر۔ حیدرآباد

گنیاں خریدی ہیں۔ گنیاں جسے ہم لوگ اشرفی کہتے ہیں۔ تمہیں دکھاتا ہوں کل بینک میں رکھوادوں گا۔"

سومرو نے جیب سے مخملی تھیلی نکالی اور ہتھیلی پر الٹ دی۔ ہتھیلی پر پانچ اشرفیاں روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ سب نے اٹھ کر اشرفیاں ہاتھ میں لے کر دیکھیں۔ سب بائیس قیراط کی تھیں۔ میں نے کہا۔ "واہ سومرو! یہ تم نے عقلمندی کا کام کیا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔"

یکا یک بجلی چلی گئی۔ سومرو نے اشرفیاں واپس تھیلی میں ڈالیں اور جنریٹر چلانے چلا گیا۔ جنریٹر اسٹارٹ ہوتے ہی چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ واپس آکر اس نے تھیلی دوبارہ نکالی اور اسے الٹیں۔ اشرفیاں دیکھتے ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "ارے یہ تو صرف تین ہیں دو کہاں گئیں۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے تسلی دی۔ "سومرو مت گھبراؤ مل جائیں گی۔ تیری حق حلال کی کمائی ہے۔ بس اللہ سائیں سے دعا کر۔"

"یار قمبر پریشان کیوں نہ ہوں۔ ایک گنی کی قیمت ایک لاکھ کے قریب ہے۔"

اب سب دوست کھڑے ہو گئے اور اشرفیاں تلاش کرنے لگے۔ سب تکیے ہٹا کر اور چادریں اٹھا کر جھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اشرفیاں کہیں نظر نہیں آئیں۔ آفتاب چنا نے کہا۔ "یار سومرو! جانے سے پہلے ہم سب کی اچھی طرح تلاشی لے لے تاکہ تیرا شبہ ہم پر نہ رہے۔"

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سوائے میرے سب نے اپنی اپنی جیبیں الٹ دیں اور ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

"یار تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔" سومرو نے کہا۔ "تم لوگ میرے بچپن کے دوست ہو، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"لیکن یہ قاعدے کی بات ہے۔" آفتاب چنا بولا۔ "جب ہم خوشی سے تلاشی دینے کے لیے تیار ہیں تو تجھے کیا اعتراض ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں میں نے قمبر علی کو کوئی چیز جیب میں چھپاتے ہوئے دیکھا تھا۔ قمبر تم بھی تلاشی دو۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "یارو! کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میری جیب میں اس کی اشرفیاں نہیں میری عزت ہے میں تلاشی کسی حالت میں نہیں دوں گا۔"

آفتاب چنا نے آنکھیں نکالیں۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب ہم سب خوشی سے تلاشی دینے کے لیے تیار ہیں تو تم بھی تلاشی دو۔"

میں اب زار و قطار رو رہا تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میرا نام قمبر ہے، مولائی ہوں، بھوکوں مر جاؤں گا چوری نہیں کروں گا۔ میں مولا علیؑ کی قسم کھاتا ہوں کہ میرے پاس سومرو کی اشرفیاں نہیں ہیں۔"

سومرو اب عجیب کشمکش میں تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "یار قمبر! میرے بھائی میرے بچپن کے دوست، میری بات سکون سے سن۔ جب یہ سب جو تیرے بھی یار بیلی ہیں تلاشی دے رہے ہیں تو تو بھی دے دے۔ دو منٹ کی بات ہے معاملہ ختم ہو جائے گا۔"

میں نے کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "یار تو بھی یہ کہہ رہا ہے۔ میں تلاشی دے رہا ہوں مگر پہلے ان سب کو جانے دے۔ میں اکیلے میں اندر کمرے میں تلاشی دوں گا۔"

آفتاب چنا بولا۔ "ٹھیک ہے تیری یہ شرط ہے تو ہم سب جا رہے ہیں۔ سومرو دروازے کی کنڈی لگا لے۔ اللہ سائیں نے چاہا تو تیری اشرفیاں مل جائیں گی۔"

ان کے جانے کے بعد سومرو نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ میں نے اپنی قمیص اتار کر ایک کرسی پر ڈال دی۔ "لے سومرو اطمینان سے پوری پوری تلاشی لے لے۔ میرے مقدر میں بے عزتی لکھی تھی سو وہ تو ہونی ہی ہے۔"

سومرو نے آگے بڑھ کر ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں سے بیڑی کا بنڈل اور ماچس نکال کر میز پر ڈال دی۔ دوسری جیب میں اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی گرم چیز تھی۔ سومرو نے اخبار کھول کر میز پر پھیلا دیا۔ اس میں ایک پراٹھا اور دو کباب تھے۔ میں ایک کرسی پر ڈھے سا گیا۔ "تو یار یہ تھی میری عزت۔ مجھ سے نوالے حلق سے نہیں اتر رہے تھے۔ میرے سامنے کھانا رکھا تھا اور وہاں گھر میں میری بیوی سکینہ صبح سے بھوکی بیٹھی تھی۔ یہ روٹی تیری بھابی کے لیے جیب میں ڈال لی۔"

سومرو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اب رونے کی باری اس کی تھی۔ اس نے روتے ہوئے اپنا سر میرے قدموں پر ڈال دیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اس کو گلے سے لگایا۔ "یہ کیا کر رہا ہے میرے یار، مجھے گناہ گار مت کر جو بے عزتی مقدر میں لکھی تھی وہ ہو گئی قصہ ختم۔"

سومرو بولا۔ "نہیں قمبر تو اپنی جوتی میرے سر پر مار۔ میں اسی قابل ہوں۔ تیری بہت بے عزتی ہوئی۔ اللہ سائیں

مجھے معاف کرے تو بھی مجھے معاف کردے تو واقعی قمر ہے۔"

اسی اثناء میں بجلی آ گئی۔ ساتھ ہی سومرو کی بڑی بیٹی کی آواز آئی۔ "بابا سائیں بجلی آ گئی ہے میں جرنیٹر بند کررہی ہوں۔"

جنریٹر کی کھوں کھوں بند ہو گئی لیکن ساتھ ہی بیٹی کی آواز آئی۔ "بابا سائیں بابا سائیں مجھے جنریٹر کے پاس سے دو سونے کے سکے ملے ہیں، بہت چمکدار ہیں۔" بیٹی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سومرو نے دروازہ کھول کر سکے لے کر دروازہ پھر سے بند کردیا۔ سومرو نے اوپر کی طرف منہ کر کے کہا۔ "اللہ سائیں تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے اور قمر علی تو بھی مجھے دل سے معاف کردے۔"

میں ابھی تک بغیر قمیص کے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں سے کھڑا ہوا اور اپنی قمیص پہننے لگا۔ "چلو شکر ہے۔ تیری حق حلال کی کمائی تھی اللہ نے کرم کیا۔ اب مجھے جانے دے۔"

"تو ابھی کہیں نہیں جائے گا میرے یار۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے ہی بھابی کے لیے کھانا میں نے بھجوا دیا تھا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی میں نے تجھے پہلے نہیں بتایا۔"

"اچھا یار تیرا بہت بہت شکریہ اب مجھے جانے کی اجازت دے دے۔" میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

سومرو بولا۔ "نہیں ابھی نہیں۔ پہلے میری پوری بات سن لے۔ اچھا چل جا بھابی سکینہ تیرا انتظار کررہی ہوگی۔ کل صبح ہی صبح میں تیرے گھر آؤں گا۔"

دوسرے دن صبح جب میں کام پر جانے کے لیے نکلنے والا تھا کہ سومرو آ گیا۔ میرے ساتھ سکینہ بھی کھڑی تھی۔ اس نے سکینہ کو دیکھ کر کہا۔ "ادی سکینہ کیسی ہو، رات کا کھانا پسند آیا۔"

"ادا سومرو کھانا بہت اچھا تھا اور بہت تھا۔ ہم نے صبح .... ناشتے میں بھی وہی کھایا اور ابھی بہت بچا ہوا ہے۔ اللہ سائیں تمہیں خوش رکھے۔"

سومرو نے میرے بازو پکڑ کر کہا۔ "تم کہاں چل دیئے۔ یہ رنگ کا ڈبا یہیں رکھ دو اور میرے ساتھ چلو۔"

"او بھائی مجھے کہاں لے جارہا ہے مجھے دیہاڑی پر جانا ہے۔"

"یار چل تو سہی میں راستے میں پوری بات بتادوں گا۔" سومرو میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف چل دیا۔ "اچھا ادی سکینہ خدا حافظ۔"

راستے میں سومرو نے کہا۔ "یار دیکھ میری بات غور سے سن۔ میں نے دبئی میں بہت کوشش کی کہ اپنے پرانے یار دوستوں کو بھی وہاں بلوالوں مگر بات نہیں بنی۔ اصل میں فلپائنی اور ساؤتھ انڈیا کے لوگ بہت کم پیسوں میں کام پکڑ لیتے ہیں۔ کل صبح بخشو نے مجھے بتایا تھا کہ اپنا کیبن بیچنا چاہ رہا ہے۔ اس نے مین مارکیٹ میں ایک بڑی دکان لے لی ہے۔ وہ اس کے دس ہزار مانگ رہا تھا۔ میں نے آٹھ ہزار میں سودا ڈن کرلیا ہے۔ اس کیبن میں اب تم بیٹھو گے۔ کیا سمجھے۔"

بخشو ہمیں دکان کے سامنے ٹہلتا ہوا مل گیا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کہا۔ "آؤ میرے یارو! یہ لو صبح ہی صبح دودھ کی ٹھنڈی ٹھار بوتلیں چلیں گی۔ میں روزانہ صبح دس گیارہ بجے دکان کھولتا ہوں۔ آج تم لوگوں کی وجہ سے اتنے سویرے آ گیا ہوں۔ میں نے اسٹاک کی پوری لسٹ بنا لی ہے سگریٹ، پان کے علاوہ بوتلوں کے دو کریٹ ہیں۔ آئس بکس برف سے بھرا ہوا ہے۔ یہ پکڑو لسٹ، تالے اور چابیاں۔ مجھے اجازت دو مجھے مین مارکیٹ جانا ہے اور ہاں بھائی قمر جب بھی میری ضرورت ہو مجھے بلا لینا، میں چلا۔"

جب بخشو چلا گیا تو ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "یار سومرو! تو یہ تو بتا یہ اتنا بڑا قرضہ میں کیسے اتاروں گا۔"

"دیکھ بھائی قمر تو اسے قرض حسنا سمجھ لے۔ میں تو دبئی واپس چلا جاؤں گا۔ یہ پیسا یہیں بینک میں پڑا رہے گا لیکن اب تیری آمدنی کا ایک ذریعہ بن گیا ہے تو تو بھی ہمیں نہیں بھولے گا۔ ہر روز پچاس روپیا میرے گھر بھجوا دینا۔ میرے گھر کا خرچ چلتا رہے گا اور تیری پریشانیاں بھی دور ہوتی رہیں گی۔ اب بسم اللہ پڑھ کر اپنی گدی سنبھال۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا، دکان پر جو گاہک آتے ہیں اسے اللہ سائیں بھیجتا ہے۔ ان سے کبھی جھگڑا مت کرنا۔ غلط بھی کہیں تو سر جھکا کر سن لینا۔ اب مجھے اجازت دو۔"

میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ دیر تک اسے پکڑے رہا۔ میرا بدن لرز رہا تھا۔ سومرو نے آہستہ سے مجھے الگ کیا۔ اس کی آنکھیں بھی جھلملا رہی تھیں۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ قمر نے آسمان کو تکتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ "یا اللہ! میرے دوست کی حفاظت کرنا۔ اس کے رزق میں اضافہ کر۔ اسے اولاد نرینہ عطا فرما، آمین۔"

مظلوم

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
عورت کیسی مظلوم ہستی ہے کہ وہ باپ بھائی شوہر اور بیٹے کی خاطر زندہ رہتی ہے۔ اپنے ہر دکھ کو بھول کر زندگی کی گاڑی کو کھینچتی رہتی ہے۔ آمنہ کی زندگی بھی مجبوریوں، محرومیوں کا کینوس بنی رہی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ محرومیوں کے پھندے میں جکڑی رہی۔

امجد اقبال خان
(ساہیوال)

عمارت چار کنال رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں بہت سارے کمرے تھے۔ مجموعی طور پر اس عمارت کو دیکھ کر ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ یہ کسی کروڑ پتی شخص نے اپنی تسکین یا خود نمائی کے لیے بنوائی ہے۔ عمارت کے ڈھانچے کی تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ چار کنال رقبے کو بارہ فٹ بلند چہار دیواری نے گھیر رکھا تھا۔ جب کہ عمارت اور چہار دیواری کے درمیان جو جگہ خالی پڑی تھی، اس میں گھاس اگائی گئی تھی اور کئی قسم کے پھول لگائے گئے تھے۔ دن کے اجالے

میں عمارت میں داخل ہونے والا ہر انسان مالک کے جمالیاتی ذوق کا معترف ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ اور بات تھی کہ عمارت کا مالک وسیم ایک بدنام تاجر تھا۔ کاروبار کی دنیا میں بدنامی کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ڈوبی وسیم چودھری کی اس رہائشی عمارت کے عقب میں ایک نوجوان موجود تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ وہ سانولی رنگت اور صحت مند جسامت کا خوب رو نوجوان تھا۔ پانچ فٹ سات انچ قد پر سیاہ شلوار قمیص نے اسے کھلنڈرے لڑکے کا تاثر دے رکھا تھا۔

اس کے موبائل فون کی اسکرین روشن ہوئی تو اس نے جلدی سے Inbox فولڈر کھول کر میسج پڑھا۔ حسب توقع وسیم کی لاڈلی بیٹی آمنہ وسیم کا میسج تھا۔ آمنہ جو اس نوجوان کی کلاس فیلو اور دوست تھی، اس وقت اس سے چند گز کے فاصلے سے اسے میسج کر رہی تھی۔ ملاقات طے تھی لہٰذا نوجوان کو کامل یقین تھا کہ وہ کچھ ہی دیر بعد اپنی اس خوب صورت محبوبہ کے پہلو میں ہوگا۔ یہ چکر پچھلے چھ ماہ سے چل رہا تھا۔ ویسے تو وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھ رہے تھے۔ ان کی دوستی ابتدائی دنوں میں ہی ہوگئی تھی لیکن یہ ملاقاتوں والا سلسلہ ابھی چھ ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔

ایک روز سلمان نے کہا تھا۔ ''آمنہ! ہماری دوستی کو ایک سال ہوگئے۔ اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

آمنہ نے اسی لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ میں تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

سلمان نے کہا۔ ''میں اب تمہارے قریب آنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے دوری برداشت نہیں ہوتی۔''

آمنہ ہنسی۔ ''جب تک تم کسی قابل نہیں ہو جاتے، میرے ڈیڈی ہماری شادی نہیں ہونے دیں گے۔ جب تک تمہیں صبر کرنا ہوگا۔''

سلمان بے ساختہ بولا۔ ''اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔''

پھر دو تین دن کی سوچ بچار کے بعد وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ شادی تک صبر نہیں کر سکتے۔ انہیں شادی سے پہلے ایک دوسرے کو حاصل کرنا تھا۔ ایسے کاموں میں عاشق قسم کے لڑکوں کا دماغ خوب چلتا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل بھی سلمان نے ڈھونڈ نکالا تھا۔

آمنہ نے بھی کچھ تامل کے بعد اس کی تجویز قبول کر لی تھی۔ یوں اب وہ پچھلے چھ ماہ میں ایک درجن سے زائد مرتبہ راتوں کو مل چکے تھے۔

اسکرین پر آمنہ کا میسج آچکا تھا اس میں لکھا تھا ''کہاں ہو؟''

سلمان نے فوراً ریپلائی کیا۔ ''تم سے چند گز کی دوری پر۔''

جواب میں آمنہ نے میسج کیا۔ ''میں انتظار کر رہی ہوں۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ آہستہ سے کھولنا۔''

سلمان نے جوابی ٹیکسٹ کیا۔ ''اوکے! تھوڑا انتظار کرو۔''

آمنہ نے میسج کیا۔ ''ذرا محتاط رہ کر..... ویسے تو میں نے دیکھ لیا ہے، کوئی بھی جاگ نہیں رہا۔ سوائے مین گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ کے۔ پھر بھی احتیاط کرنا۔''

سلمان نے لکھا۔ ''اوکے میری جان! تم اطمینان رکھو۔ تمہارا سلمان تمہاری محبت میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ٹرسٹ می۔''

سلمان نے موبائل جیب میں ڈالا اور پھر عمارت کی چہار دیواری کی طرف چل پڑا۔ سلمان کے پاس چہار دیواری کو پھلانگ کر آمنہ کے کمرے تک پہنچنے کا کوئی سائنسی طریقہ نہیں تھا بلکہ وہ عام طریقے پر عمل پیرا تھا جو صدیوں پرانا ہے۔

عمارت کے عقب میں سفیدے کا ایک اونچا درخت موجود تھا۔ سلمان پہلے سفیدے کے درخت پر چڑھا۔ پھر درخت کو چھوڑ کر دیوار پر آگیا۔ دیوار پر آنے سے پہلے اس نے ہمیشہ کی طرح سفیدے کی ایک مضبوط شاخ سے ایک مضبوط رسی باندھ دی تھی۔ وہ اس رسی کو پکڑ کر بڑے آرام سے آہستہ آہستہ دیوار سے نیچے اتر گیا۔

عمارت کے صحن میں قدم پڑتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر آواز پیدا کیے بغیر آمنہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس نے سیو میسج سینڈ کیا۔ ''آمنہ میں آگیا ہوں۔''

''کمرے میں آجاؤ۔'' آمنہ نے ریپلائی کیا۔

وہ آمنہ کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا دل خوشیوں سے سرشار تھا۔ آمنہ اس کے آنے سے پہلے خصوصی بناؤ سنگھار کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بنی سنوری اپنے بیڈ پر نئی نویلی دلہنوں کی طرح بیٹھی تھی۔

سلمان نے کمرے کا دروازہ بند کیا، پھر اندر سے بولٹ چڑھا دیا۔ اس کے بعد وہ آمنہ کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ دیر پہلے تک اس پر جو خوف طاری تھا اور رگوں میں جو سنسنی پھیلی ہوئی تھی، آمنہ کو دیکھ کر ہوا ہوگئی تھی۔

وہ آمنہ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ''ہر روز تم سے ملتا ہوں مگر ہر روز یوں لگتا ہے کہ جیسے تم سے پہلی بار مل رہا ہوں۔''

پھر کچھ دیر تک یونہی رومانوی گپ شپ چلتی رہی۔ اس کے بعد ملاقات ان لمحات کی طرف سفر کرنے لگی جو ایسے جوڑوں کی خفیہ ملاقاتوں کا ماحصل ہوتے ہیں۔

جب ان کے خمار میں کمی آئی تو سلمان نے اپنے موبائل پر وقت دیکھا، پھر بولا۔ ''صبح ہونے والی ہے۔ اب چلتا ہوں۔''

آمنہ اس سے چمٹ گئی۔ ''نہیں..... کچھ دیر اور۔''

سلمان نے اسے سمجھایا۔ ''جانِ سلمان! دل تو میرا بھی نہیں چاہتا، تمہیں چھوڑ کر جانے کو مگر حالات کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں فجر کی اذانیں شروع ہو جائیں گی۔ پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''سلمان! کچھ کرو نا۔ ہم کب تک یوں چھپ چھپ کر تشنہ ملاقاتیں کرتے رہیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے سینے سے لگ کر دن کو بھی سوتی رہوں مگر.....'' وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

سلمان نے اس کی زلفوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ہر کام ایک خاص وقت پر ہوتا ہے۔ ابھی یونہی کام چل رہا ہے تو اسے غنیمت جانو۔''

آمنہ نے اس کے چہرے پر اپنی گرم سانسیں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک مرتبہ تم ایم بی اے کر لو۔ پھر میں ڈیڈی کو کہہ کر تمہیں اپنی کمپنی میں جاب دلواؤں گی۔ اس کے بعد تم اپنی قابلیت اور محنت سے ڈیڈی کا دل جیتو گے۔''

''اور اگر میں کوشش کے باوجود تمہارے ڈیڈی کا دل نہ جیت سکا تو؟'' سلمان نے کہا۔ ''سنا ہے، تمہارے ڈیڈی بہت سخت ہیں۔''

آمنہ نے کہا۔ ''وہ سخت ضرور ہیں لیکن قابل اور محنتی لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔ تم قابل ہو، میں جانتی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میری خاطر سخت محنت بھی کرو گے۔''

سلمان نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہاری خاطر تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

سلمان نے روشنی جلائی تو وہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر سلمان الوداعی چٹکی ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے میں رک کر اس نے گردن موڑ کر بیڈ پر بیٹھی، بال سمیٹتی آمنہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صبح ملیں گے یونیورسٹی میں۔'' پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ آمنہ کے کمرے سے نکلا تو رات کی تاریکی کسی حد تک چھٹ چکی تھی۔ صبح کاذب کے آثار تھے۔ وہ رات کے خمار میں باہر نکلا اور عمارت کی عقبی سمت کی طرف چلنے لگا۔ دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی رسی جس کا دوسرا سرا سفیدے کی مضبوط ٹہنی کے ساتھ بندھا ہوا تھا، اس کی مدد سے اسے لٹک کر دیوار پر چڑھنا تھا اور پھر رسی کو کھول کر جیب میں رکھنے کے بعد سفیدے کے درخت پر چڑھ کر نیچے اترنا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا، لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کب گھر کا رخ کرے گا؟ ماں کی وفات کے بعد سے وہ اکیلا تھا۔ ماں کو مرے چار سال ہو چکے تھے۔ ماں سرکاری استانی تھی۔ اس کی پنشن سے سلمان کے تمام اخراجات پورے ہوتے تھے۔

ابھی وہ دیوار کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اسے احساس ہوا جیسے آس پاس کوئی موجود ہے۔ اس نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی ذی روح نظر نہیں آیا۔ گھٹا ٹوپ تاریکی نہیں تھی تو دن جیسا اجالا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں کسی کا ہیولا ہی دیکھا جا سکتا تھا مگر اسے کوئی ہیولا نظر نہیں آیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے دیوار کی طرف بھاگا اور رسی کو تھام کر دیوار پر چڑھنے لگا۔

ابھی وہ وسط میں ہی پہنچا تھا کہ کسی نے پیر پکڑ کر نیچے کھینچا۔ اس کے ہاتھوں سے رسی چھوٹ گئی اور وہ دھم سے نیچے جا گرا۔ اس کا سر کسی گملے جیسی چیز سے ٹکرایا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆

جب سلمان کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک سجے سنورے، بڑے سے کمرے میں پایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے مشکل ہوئی۔ کبھی کبھی روشنی بھی انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ پھر جب وہ کچھ دیر بعد دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک نوعمر لڑکا (جو اپنے پہناوے سے ملازم لگتا تھا) انگیٹھی میں آگ دہکائے ہاتھ تاپ رہا تھا۔

''یہ میں کہاں ہوں؟'' سلمان کے منہ سے نکلا۔ اسے اپنے ذہن پر انجانا سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

لڑکا بڑی پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی طرف آیا۔ ''ارے واہ بھائی جان! آپ کو تو ہوش آ گیا۔ غضب خدا کا، آپ پچھلے چھ گھنٹے سے بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں اور اٹھنے

کا نام نہیں لے رہے۔"

"یہ میں کہاں ہوں؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرے ساتھ.....!" لڑکے نے جو بمشکل سترہ اٹھارہ سال کا تھا، شانے اچکائے۔ "میرے کمرے میں۔"

"تم کہاں ہو؟" سلمان کے منہ سے نکل گیا۔

"اپنے کمرے میں۔" لڑکے نے اختصار پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"تم کون ہو؟" سلمان کے پٹی بندھی ہوئی تھی مگر ابھی تک تکلیف محسوس ہو رہی تھی اس لیے وہ ذرا چڑ کر بولا تھا۔

"میں ملازم حسین ہوں۔" لڑکے نے بتایا تو سلمان کے جی میں آئی کہ اس کے منہ پر گھونسا جڑ دے مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا۔ ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

"یار، ملازم حسین! مہربانی کر کے بتاؤ کہ میں یہاں کیسے اور کیوں پڑا ہوں؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟" سلمان نے کہا۔ "ذرا تفصیل سے۔"

ملازم حسین نے تفصیل سے بتایا۔ "آپ چور ہو بھائی جان! چور..... آپ چوری کی نیت سے حویلی میں داخل ہوئے تھے کہ گارڈ نے آپ کو پکڑ لیا۔ اب آپ یہاں قید ہو۔ یہ وسیم صاحب کا گھر ہے، سرونٹ کوارٹر۔ کچھ پلے پڑا کہ نہیں؟"

اسے سب سمجھ آ گیا۔ یہ سوچ کر اسے پسینا آ گیا کہ وہ قید ہو چکا تھا۔ وسیم چودھری کی سخت مزاجی اور سفاکی مشہور تھی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ کانپ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا کہ بے وقوف! تمہیں وسیم چودھری کی ہی بیٹی ملی تھی بھری دنیا میں؟ کسی اور کو پھانس لیتے۔ اب کیسے بچو گے؟ مگر یہ سر اول بھی بہت بڑا پاگل ہے۔ کسی پر آنے سے پہلے کچھ دیکھتا ہی نہیں۔

ملازم حسین کی آواز نے اسے خیالوں سے باہر نکالا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بھائی جان! آپ تھوڑا ویٹ کرو۔ میں ابھی آتا ہوں صاحب کو بتا کے۔"

سلمان نے بڑی اُمید سے کہا۔ "یار! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے صاحب کو نہ بتاؤ اور مجھے چپکے سے فرار کروا دو؟"

ملازم حسین ہنسا۔ "ارے کیسی باتیں کر رہے ہو بھائی جان! میں ملازم حسین ہوں، صاحب کا ملازم۔ آپ مجھ کو بہکا رہے ہو کہ میں غداری کروں؟" وہ دانت نکالتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سلمان نے سوچا کہ بگڑا اب بھی کچھ نہیں۔ وہ مجھے چور سمجھ رہے ہیں۔ میں روپیٹ کر اپنی مفلسی اور غربت کا یقین دلاؤں گا تو وہ نرمی برتیں گے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ان کی بیٹی سے ملنے آتا ہوں تو وہ مجھے مار مار کر گدھا بنا دیتے۔

کچھ دیر بعد ملازم حسین کی واپسی ہوئی تو وہ بولا۔ "چلو بھائی جان! صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔"

لاچار سلمان اس کے ساتھ چل پڑا۔ ملازم حسین اسے ایک کشادہ ہال نما کمرے میں لے گیا تو وہاں وسیم اپنی پوری فیملی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سلمان اس کثیر فیملی کے ممبرز کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر تعارف کسی سے نہیں تھا۔ آمنہ بھی اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

وسیم نے تین شادیاں کی تھیں اور اس نے حیرت انگیز طور پر بزنس اور سیاست کے علاوہ اس میدان میں بھی فقید المثال کامیابی حاصل کر رکھی تھی۔ اس کی تینوں بیویاں اپنے اپنے بچوں سمیت ایک ہی چھت تلے بڑے سکون سے رہتی تھیں۔ آمنہ پہلی بیوی سے تھی جو مر چکی تھی۔

اسے دیکھ کر وسیم نے درشت لہجے میں اپنے ملازم کو مخاطب کیا۔ "ملازم حسین! اس اُچکے کو مرغا بنا دو۔"

سلمان نے گھبرا کر وسیم کے پہلو میں آرام سے بیٹھی آمنہ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا کہ رات کی کارروائیوں میں وہ بھی تو برابر کی شریک تھی بلکہ اس کے سوجے ہوئے سرخ ہونٹ شب گزشتہ کی کارگزاریوں کا ثبوت فراہم کر رہے تھے مگر وہ ستم پرور بے نیازی سے مسکرا رہی تھی۔

ملازم حسین نے سلمان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "بھائی جان! بن جاؤ مرغا!"

سلمان، آمنہ کے سامنے مرغا بن کر اپنی مردانگی کی تذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا، اس نے رحم طلب انداز میں ہاتھ جوڑ دیئے، پھر وسیم چودھری کو مخاطب کر کے بولا۔ "صاحب! معاف کر دو، میں پیشہ ور چور نہیں ہوں۔ بے روزگار ہوں، دو دن سے کھانا نہیں ملا تھا، اس لیے مجبوراً چوری کی نیت سے ادھر آ گیا۔ غلطی ہو گئی صاحب۔"

اس کی اداکاری پر آمنہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

وسیم چودھری نے درشتی سے کہا۔ "جو کچھ تم نے بھوٹا، وہ ہم نے نہیں سنا۔ جو کہنا ہے، مرغا بن کر کہو = پھر ہم سن پائیں گے۔"

ملازم حسین نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "کیا خیال ہے بھائی جان! خود ہی بن جاؤ گے مرغے یا میں مدد کروں؟

ویسے اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

سلمان تلملا گیا۔ یہ ملازم کم عمر تو تھا مگر ہٹا کٹا تھا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ ''کمینہ عزت کی بات کر رہا ہے۔ بھلا مرغا بننے سے خاک عزت رہ جائے گی؟''

اتنے میں وسیم چودھری کی سب سے چھوٹی بیوی جمیلہ نے جو چوبیس سال کی تھی اور وسیم چودھری سے تیس سال چھوٹی اور آمنہ سے چند سال بڑی تھی، نے ہانک لگائی۔ ''کھڑے کیا سوچ رہے ہو، سنا نہیں مرغا بن جاؤ؟''

منجھلی بیوی نے بچے کو اپنی چھاتی سے چپکاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو تو کیسے سکون سے کھڑا ہوا ہے۔ جیسے کسی فلم کا ہیرو ہو۔''

پہلی بیوی (وہ آمنہ کی ماں کی موت کے بعد پہلے نمبر پر آ گئی تھی) نے جو پینتالیس سال کی بے کشش عورت تھی۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے اسے مرغا بنانا ہی پڑے گا۔ یہ خود نہیں بنے گا۔''

''ملازم حسین!'' وسیم نے ملازم کو تحکمانہ انداز میں ہدایت کی۔ ''بیٹا! یہ ذرا ڈھیٹ مٹی کا معلوم ہوتا ہے۔ اسے بتاؤ نا، مرغا کیسے بنتے ہیں؟''

اتنے میں آمنہ، جو اب تک اپنے عاشق کی حالتِ زار پر محظوظ ہو رہی تھی، بول پڑی۔ ''رہنے دیں نا ڈیڈی۔ بے چارہ مجبور ہو کر ایسی حرکت کر بیٹھا ہے ورنہ کوئی شوق سے چور تھوڑی بنتا ہے؟''

سلمان نے نظر بچا کر اسے آنکھ ماری، پھر دانت نکال کر کہنے لگا۔ ''آپ کتنی اچھی ہیں میڈم!''

آمنہ نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی، پھر بولی۔ ''وہ تو میں ہوں۔''

''ملازم حسین! بیٹا کیا سوچ رہے ہو؟'' وسیم چودھری نے ملازم حسین کو آنکھیں دکھائیں۔ ''یہ گدھے کا بچہ ابھی تک تن کر کھڑا ہے۔''

ملازم حسین نے قسائی کی نظر سے سلمان کو دیکھا۔ ''ہاں بھائی جان! خود بنو گے یا.....'' اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے وارننگ دی تو سلمان نے تسلیم کر لیا کہ اب ایک نہیں چلے گی۔ مرغا بننا ہی پڑے گا۔ پھر اس نے فوراً ملازم حسین کی بات مان لی۔

اِدھر وہ مرغا بنا، اُدھر کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔ وسیم چودھری کی تینوں بیویاں اور ان کے بچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ صرف وسیم چودھری سنجیدہ بیٹھا تھا۔ ملازم حسین کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

پہلی بیوی کا بڑا بچہ جس کی عمر پندرہ سال تھی، فرمائش پر اتر آیا۔ ''ڈیڈی! میں اس پر سواری کروں گا۔''

اس کی ماں بولی۔ ''ہاں ہاں، کیوں نہیں بیٹے! ضرور۔''

سلمان نے گھبرا کر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ بچہ کم از کم ساٹھ کلوگرام کا تھا۔ سلمان گھبرا گیا۔ اس کی نگاہ آمنہ پر پڑی۔ وہ بھی ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی۔ سلمان کو اس لمحے اس پر بہت غصہ آیا۔ کم بخت اپنے عاشق کو مصیبت میں دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ حالانکہ اسے تڑپنا چاہیے تھا۔

مگر پھر اسے اپنی آمنہ پر بے تحاشا پیار بھی آیا۔ اس نے دیکھا کہ آمنہ نے اپنے سوتیلے بھائی کو بازو سے پکڑ لیا تھا۔ ''ندیم! وہ بے چارہ دو دن سے بھوکا ہے..... اچھے بچے بنو۔'' اس پر ندیم کی ماں نے گھور کر آمنہ کو دیکھا۔

آمنہ کافی لطف اٹھا چکی تھی۔ اب وہ اپنے چاہنے والے کی جان بخشی کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ ''ڈیڈی! بے چارہ دو دن سے بھوکا ہے۔ آپ نے اسے مرغا بنا دیا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو دینا چاہیے۔''

وسیم چودھری نے نکتہ اٹھایا۔ ''یہ دو دن سے بھوکا کیسے ہو سکتا ہے؟ اچھے بھلے گھرانے کا لگتا ہے، اس کا منہ بھی لٹکا ہوا نہیں۔ تر و تازہ لگ رہا ہے۔''

آمنہ نے کہا۔ ''ڈیڈی! بے چارے کو ملازمت سے نکال دیا گیا ہو گا..... کہہ تو رہا تھا کہ آج کل بے روزگار ہے۔''

وسیم چودھری قائل ہو گیا۔ ''ہاں! کہتی تو میری شہزادی ٹھیک ہے۔'' اسے آمنہ بہت عزیز تھی۔ ایک تو وہ پہلی اولاد تھی، پھر اس کی ماں بھی فوت ہو چکی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تینوں بیویاں آمنہ سے جلتی تھیں۔

وسیم چودھری اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر جاؤ، اس کے لیے کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔''

''میں ابھی آئی۔'' وہ اپنی تینوں سوتیلی ماؤں پر باری باری فاتحانہ نگاہ ڈال کر اٹھ گئی۔ چند منٹ بعد اس نے سلمان کے سامنے کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ''لو چور صاحب! جی بھر کے کھاؤ۔'' اس نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی، پھر اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔

''ایک چور کے سامنے اتنا کچھ ڈالنے کی کیا ضرورت

تھی؟'' سب سے چھوٹی جمیلہ نے اعتراض اٹھایا۔

''بے چارہ دو دن سے بھوکا ہے۔'' آمنہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آخر ہے تو چور۔'' منجھلی نے کہا۔

وسیم چودھری نے کہا۔ ''بھئی میری بیٹی بہت رحم دل ہے۔ تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے؟''

اس پر آمنہ سرشار ہو گئی۔ اسے اپنے باپ کی حمایت ہمیشہ فاتح بنا دیتی تھی۔ جب کہ دوسری طرف اس کی سوتیلی مائیں جل کر کوئلہ ہو جاتی تھیں لیکن چونکہ وسیم چودھری کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں اس لیے زیادہ شور نہیں مچاتی تھیں۔

اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سلمان ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ آمنہ نے اپنی ہنسی کو دبانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''دیکھو تو، غریب ہفتوں کا بھوکا لگتا ہے۔''

کھانے کے بعد سلمان کھڑا ہو کر بولا۔ ''اب میں جاؤں؟''

''مرغا بن مرغا..... پھر ہی مجھے کچھ سنائی دے گا۔'' وسیم چودھری نے کہا۔

سلمان اسے دل ہی دل میں گالیوں سے نوازتا ہوا دوبارہ مرغا بن گیا۔

''اب بولو، کیا کہہ رہے تھے؟'' وہ مرغا بن چکا تو وسیم چودھری نے خط اٹھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''سر! میری بھوک مٹ گئی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اب میں جاؤں؟''

وسیم چودھری دہاڑا۔ ''مرغا بن مرغا..... جاؤں کا بچہ۔''

اس کی دہاڑ اتنی گونجیلی تھی کہ سلمان ڈر کر فوراً مرغے کی فارم میں آ گیا۔

''وسیم چودھری کے گھر میں گھس کر کہتا ہے، میں جاؤں..... جاؤ گے بیٹا جاؤ گے..... مگر جیل جاؤ گے۔'' وسیم چودھری مونگ پھلی چباتے ہوئے ذرا غصیلے انداز میں بولا تو سلمان کی سانس رک گئی۔ جیل کے تصور سے ہی اس کی پتلون گیلی ہونے لگی تھی اور پھر اس کے پیچھے تھا ہی کون ضمانت کرانے والا۔

''سر! میں آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔''

''بھکاری کا بچہ۔ ابھی تک مانگنے کی باتیں کر رہا ہے۔'' وسیم چودھری کا پارہ اوپر سے اوپر چڑھ رہا تھا۔

''سر! غلطی ہو گئی مجھ سے۔ غریب کو معاف کر دیں۔''

آمنہ کو سلمان کی غیر مردانہ باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ اسے سلمان کی مزید بزدلی کی باتیں سننا پڑتیں۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ''ڈیڈی اوہ کتنے مظلوم انداز میں معافی مانگ رہا ہے، کیا آپ کو ترس نہیں آ رہا ہے اس غریب پر؟''

''نہیں بیٹا! بالکل بھی نہیں آ رہا ہے۔'' وسیم چودھری نے رسان سے کہا۔

آمنہ بولی۔ ''لیکن مجھے آ رہا ہے۔ آپ اسے جانے دیں۔''

''کیسے جانے دوں بیٹی..... یہ چور ہے۔'' وسیم چودھری نے کہا۔

جمیلہ چپ نہ رہ سکی۔ ''آمنہ! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ایک شخص چوری کی نیت سے ہمارے گھر میں داخل ہوا ہے، ہم اسے چھوڑ دیں، کیا عزت رہ جائے گی وسیم کی؟''

آمنہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے بڑے لاڈ سے اپنے باپ کے شانے سے سر ٹکا کر بولی۔ ''ڈیڈی! آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتے؟ بھوک سے مجبور ہو کر یہ روٹی چوری کرنے آیا تھا۔ کوئی پیشہ ور چور تو ہے نہیں، پھر اس نے چوری بھی نہیں کی ہے۔''

وسیم چودھری باقی دنیا کے لیے کرپٹ انسان تھا، سفاک تھا مگر اپنی بیٹی سے محبت کے معاملے میں ایک باپ تھا۔ بولا۔ ''کیوں نہیں..... چلو، ہم تمہارے حکم پر اسے جانے دیتے ہیں۔''

وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ ''تھینکس ڈیڈی! آئی لو یو۔''

اس پر اس کی سوتیلی مائیں سلگ کر رہ گئیں۔

سلمان کو دیکھ کر آمنہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''اب کھڑے ہمارا منہ کیا تک رہے ہو؟ جاؤ اور جان چھوٹنے پر شکر ادا کرو خدا کا۔''

سلمان دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''میڈم! آپ بہت سویٹ ہیں۔ دل چاہتا ہے آپ کا منہ.....''

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ وسیم چودھری کا ہاتھ بے اختیار پاؤں کی طرف گیا۔ ''ابے جاتا ہے اب یا لگواؤں جوتے۔''

سلمان بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

آمنہ اپنے کمرے میں آئی تو فوراً ہی سلمان کی کال آگئی۔ آمنہ نے کال ریسیو کر لی۔ ''گھر تو پہنچ گئے ہوتے، اتنی جلدی کیا تھی کال کرنے کی؟''

''ابھی تو ڈھابے پر بیٹھ کے چائے پی رہا ہوں۔ اس کے بعد گھر جاؤں گا۔ ویسے یار! آج تو پھنس گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ بچت ہوگئی۔'' سلمان نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی شکریہ ادا کرو... ورنہ حوالات میں ہوتے۔'' آمنہ جتانے والے انداز میں بولی۔ ''میں نہ ہوتی تو ابھی تم جوتے کھا رہے ہوتے چائے پینے کی بجائے۔''

''تم نہ ہوتیں تو میں تمہارے گھر میں ہی کیوں گھستا؟'' سلمان نے برجستہ کہا تو آمنہ بے مزہ ہو کر بولی:

''اب میں تمہیں اپنے ڈیڈی کی کمپنی میں جاب کیسے دلواؤں گی؟ وہ تمہیں پہچان لیں گے۔''

''فکر مت کرو۔ میں ہوں ناں تمہاری فکریں سنبھالنے کے لیے۔'' سلمان نے کہا۔ ''میں داڑھی رکھ لوں گا۔ وہ بالکل نہیں پہچان پائیں گے۔''

''تمہارے شیطانی ذہن میں ہر وقت ہر مسئلے کا حل موجود رہتا ہے۔''

''عشق نے نکما کر دیا غالب..... یہ غلط کہا تھا چچا غالب نے۔'' وہ روانی سے بولا۔ ''عشق تو بندے کو کام کی چیز بنا دیتا ہے۔ عاشق پڑھائی میں چاہے کتنا ہی نکما ہو۔ عاشقی کے معاملات میں اس کا ذہن خوب چلتا ہے۔''

''اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔ کل یونیورسٹی میں ملیں گے۔'' آمنہ نے کہا۔ ''آج تو تمہاری وجہ سے چھٹی ہوگئی۔''

''میری وجہ سے؟'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''میڈم! آپ بھی برابر کی شریک ہیں۔''

''بے وقوف، ہم پہلے بھی تو ملتے رہے ہیں لیکن ساری رات جاگنے کے بعد صبح یونیورسٹی بھی جاتے تھے۔ میں نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ تم احتیاط کرتے تو پکڑے نہ جاتے اور نہ ہی میرا حاضری ریکارڈ ٹوٹتا۔'' وہ ذرا غصے سے بولی۔

''ہم آج کے بعد گھر میں نہیں ملیں گے۔''

''تو کہاں ملیں گے؟'' وہ فوراً بولا۔

''یونیورسٹی میں۔''

''لیکن یونیورسٹی میں ''پراپر'' ملاقات کیسے ہوگی؟'' وہ فکر مند ہو گیا تھا۔

''اب پراپر ملاقات شادی کے بعد ہوگی۔'' آمنہ نے کہا۔

''نہیں نہیں نہیں۔'' وہ فلمی انداز میں احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ منظور نہیں۔''

اس عمر میں گناہ و ثواب میں تمیز نہیں رہتی۔ جذبات سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ جوانی پیک پر ہوتی ہے تو جذبات بھی بے لگام ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی جوانی کے جذبات میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''میں تمہارے بغیر ایک پل کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔''

آمنہ نے ہار مان لی۔ ''ٹھیک ہے بابا! تم اپنے شیطانی دماغ سے کوئی دوسرا ٹھکانا ڈھونڈ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اب ہم گھر پر نہیں ملیں گے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم بھی گھر جا کر سو جاؤ بائے۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆.....☆

آمنہ یونیورسٹی جانے کے لیے صبح اپنے کمرے سے نکل کر گیراج میں کھڑی اپنی کار کی طرف جا رہی تھی جب اس کا سر چکرایا اور وہ گھاس کے پلاٹ میں گر گئی۔ ملازم حسین کچھ دور کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف آیا۔

''کیا ہوا باجی! آپ ٹھیک تو ہیں؟''

گرنے کے سبب وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو ملازم حسین چلاتا ہوا وسیم چودھری کے کمرے کی طرف بھاگا مگر پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو رات گھر آیا ہی نہیں تبھی اس کی نظر سکینہ پر پڑی تو اس نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

آمنہ کو اسپتال لے جایا گیا۔ تینوں سوتیلی مائیں اس کے ساتھ اسپتال گئیں۔

جب لیڈی ڈاکٹر نے انہیں یہ بتایا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ آمنہ ماں بننے والی ہے اسی لیے اسے چکر آ گیا تھا۔ وہ بہت کمزور ہے، اس کی خوراک کا خیال رکھیں۔'' تو وہ حیرت سے دنگ رہ گئیں۔ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد ان تینوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ماں؟''

آمنہ کو گھر لایا گیا تو تینوں ماؤں کی طنزیہ نگاہیں اس پر تھیں۔ انہیں تو گویا موقع مل گیا تھا۔ وہ جو اپنے باپ کی لاڈلی بن کر ان کے سینوں پر مونگ دلتی رہتی تھی۔ اب بیڈ پر نم آنکھوں کے ساتھ لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ کسی سوال کا

جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے اور سلمان نے بہت احتیاط برتی تھی مگر وہ ہو گیا تھا، جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''بی بی! کچھ تو اپنے باپ کی عزت کی پروا کی ہوتی۔ اب وسیم کیا شرم سے مر نہیں جائیں گے جب انہیں تمہارے اس کارنامے کی خبر ہو گی؟'' بڑی بیوی سلطانہ نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

منجھلی بیوی سکینہ بولی۔ ''لوگ کیا کہیں گے۔ وسیم چودھری کی بیٹی کی شادی ہوئی نہیں اور وہ ماں بننے جا رہی ہے؟ توبہ توبہ! خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے۔''

چھوٹی جمیلہ کیوں پیچھے رہتی، بولی۔ ''اب یہ تو بتا دو، کس کے ساتھ رات گزارتی رہی ہو؟ کون ہے وہ؟ کوئی بڑے خاندان کا ہی ہو گا۔''

اس پر آمنہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس کی سوتیلی مائیں تھیں، وہ چیخی۔ ''دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے..... تم کون ہوتی ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والی..... آؤٹ!''

''توبہ توبہ! ڈھیٹائی تو دیکھو۔'' بڑی سلطانہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''چوری پر سینہ زوری۔''

''ہم تو چلی ہی جائیں گی!'' جمیلہ نے طنز کیا۔ ''مگر اس بچے کو کیسے روکو گی؟''

سکینہ بولی۔ ''چلو! ہم باہر چلتی ہیں۔ تم اپنے کمرے میں ہی رہنا۔'' آمنہ کو گھورتے ہوئے وہ بولی۔ ''بچوں پر برا اثر پڑے گا۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ان کی بڑی بہن بغیر شادی کے ماں بننے والی ہے؟''

وہ باہر چلی گئیں تو آمنہ دروازہ بند کر کے تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

اس میں اپنے باپ کا سامنا کرنے کی ہمت بالکل بھی نہیں تھی۔ وہ لاڈلی سہی مگر ایسے معاملات میں باپ کہاں باپ رہتے ہیں؟ وہ لرز رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کا باپ دروازے پر کھڑا اسے گھور رہا ہے۔

آہستہ آہستہ وہ کچھ نارمل ہوئی تو اسے سلمان کا خیال آیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے سلمان کا نمبر ملایا۔

''ارے کہاں ہو یار! تم یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟'' سلمان چھوٹتے ہی بولا۔ ''تمہارا نمبر بھی آف جا رہا تھا۔''

''سلمان!'' وہ متانت سے بولی۔ ''تم کہاں ہو؟''

''بھئی، کہاں ہو سکتا ہوں؟ تمہارا انتظار کرتا رہا۔ تم نہیں آئیں تو میں بھی گھر چلا آیا۔ تمہارے بغیر یونیورسٹی میں کیسے جی بہلتا؟''

یہ سن کے آمنہ کو ایک ذرا تسلی ہوئی کہ ابھی وہ بالکل لاچار اور بے سہارا اور تنہا نہیں ہے۔ ابھی سلمان کی محبت اس کے ساتھ ہے۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔

اس نے پوچھا۔ ''سلمان! کتنی محبت کرتے ہو مجھ سے؟''

وہ حیرت سے بولا۔ ''یہ کیسا بے تکا اور اچانک سوال ہے! تم جانتی ہو تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو مگر اس وقت کیوں پوچھا تم نے؟''

وہ بے تابی سے بولی۔ ''سلمان! میں ابھی اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہوں تو تم کر لو گے؟''

''اوہو! آج اتنی بے قراری؟ میری محبت میں بے قابو ہو رہی ہو نا؟'' وہ شوخی سے بولا۔ ''ارے جناب! ہمارا بس چلے تو چشم زدن میں آپ کو اپنے عقد میں لے آئیں۔''

''سلمان! سیریس ہو جاؤ۔'' وہ بولی۔ ''بتاؤ، ابھی مجھ سے شادی کر سکتے ہو کہ نہیں؟''

سلمان کھٹک گیا۔ ''بات کیا ہے؟''

وہ سسک کر بولی۔ ''میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

وہ خوشی سے چیخا۔ ''کیا؟ کیا واقعی؟ اوہ گاڈ! خوشی سے میری دھڑکن تیز ہو گئی ہے۔''

''سلمان! یہ خوشی سے زیادہ فکرمندی کی بات ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''ابھی ڈیڈی کو پتا نہیں چلا مگر رات تک پتا چل جائے گا۔ میں ان کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔ میں ان کے آنے سے پہلے گھر چھوڑنا چاہتی ہوں۔ تم میرا اور ہمارے بچے کا بوجھ اٹھا لو گے نا؟''

''یقیناً!'' سلمان نے جواب دیا۔ ''مگر یہ ٹھیک نہیں ہو گا آمنہ۔ تمہارے ڈیڈی بہت طاقت ور انسان ہیں۔ ہم ان سے چھپے نہیں رہیں گے زیادہ دیر تک۔ وہ ڈھونڈ نکالیں گے ہمیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا میں گھر میں پڑی رہوں؟ وہ زندہ چھوڑ دیں گے مجھے؟'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''سمجھنے کی کوشش کرو آمنہ۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''اس طرح تم نہ صرف پراپرٹی کے حق سے محروم ہو جاؤ گی بلکہ ہم دونوں کی تعلیم بھی ادھوری رہ جائے گی۔''

''تمہیں پراپرٹی کا لالچ ہے؟''

''ارے نہیں یار! تم خود سوچو۔ ہم یوں سب کچھ چھوڑ کر روپوش ہو جائیں گے تو ہمارا بچہ مفلسی میں آنکھ کھولے گا۔ ہمارے پاس تعلیم نہیں ہوگی تو ہم کیا کریں گے؟ کہاں سے کھائیں گے؟''

''میرے اکاؤنٹ میں دس لاکھ ہیں۔ امی کی جیولری بھی ہے۔ تم کوئی بھی بزنس کر لینا۔'' وہ بولی۔ ''ہم بھوکے نہیں مریں گے سلمان۔''

''تم ابارشن کروا لو آمنہ۔ یہی مسئلے کا حل ہے۔'' سلمان نے مشورہ دیا۔ ''بچے تو ہم شادی کے بعد بھی پیدا کرتے رہیں گے مگر ہم بچوں کو ان کے حق سے کیسے محروم کر سکتے ہیں؟''

وہ بھڑک اٹھی۔ ''یوں کہو نا کہ تمہاری نظریں میری پراپرٹی پر ہیں۔ گھٹیا انسان! مجھے ابارشن کا مشورہ دے رہے ہو۔ میں اپنی اولاد کو قتل کر دوں؟ یہ کبھی نہیں ہوگا۔''

''مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔'' وہ ہار مان کر بولا۔ ''تم جو کہو گی، میں وہی کروں گا۔ تم کیا چاہتی ہو؟''

''مجھ سے نکاح کر لو سلمان۔ ہم اپنے بچے کے لیے یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ ہم دل سے ایک دوسرے کو شریک حیات تسلیم کر چکے ہیں۔ نکاح کی رسم بھی پوری کر دو۔'' وہ کم عمر تھی۔ جذباتی تھی، جوانی کے جذبات سے مغلوب تھی، گناہ کر چکی تھی مگر اس وقت ماں بن کر بول رہی تھی۔ مائیں اٹھارہ سال کی ہوں یا اٹھاسی سال کی، مائیں ہوتی ہیں۔ اپنی ممتا سے مجبور ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اس بچے کے لیے فکر مند ہو رہی تھی جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے میری جان۔'' سلمان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم ایسا چاہتی ہو تو میں دل و جان سے تمہارا ساتھ دوں گا۔ اب تم پریشانی چھوڑ دو کیونکہ تمہاری پریشانیوں کو سنبھالنے کے لیے میں ہوں ناں۔''

''اوہ شکریہ سلمان۔'' وہ رو پڑی۔ ''کبھی کبھی خونی رشتے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لیکن ایک ایسا رشتہ ہے جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ حالانکہ وہ خونی بھی نہیں ہوتا۔ وہ رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔'' وہ جذباتی ہو کر بول رہی تھی۔

دوسری طرف سلمان اسے تسلی تشفی تو دے رہا تھا مگر اندر سے خود بھی پریشان تھا۔ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر آمنہ مصر تھی تو اس کی بات کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ فیصلے کے پینڈولم پر اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ سوئی کسی ایک پوائنٹ پر رک نہیں رہی تھی۔ فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆.....☆

ان کی ملاقات عدالت کے باہر ہی ہوئی۔ آمنہ جاتے ہی اس کے گلے سے لگ کر رو دی۔ ''سلمان! تم مجھے چھوڑنا مت، پلیز۔ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔''

یہ بات صرف آمنہ نے نہیں کہی تھی بلکہ یہ بات ہر وہ لڑکی اپنے چاہنے والے سے کرتی ہے جو گھر چھوڑ کر، رشتوں کو ٹھکرا کر نکلتی ہے۔ پچھلے رشتوں کا مان نہیں رہتا تو وہ ساری توقعات صرف ایک انسان سے وابستہ کر لیتی ہے۔ وہ تمام رشتوں پر ایک ایسے رشتے کو فوقیت دیتی ہے جسے قائم ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا ہوتا یا ابھی وہ رشتہ قائم ہی نہیں ہوا ہوتا۔ پھر وقت کے ساتھ کچا ذہن پختگی کی طرف سفر شروع کرتا ہے اور ذہن سے جذبات اور رومانویت کی دھند چھٹتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ وہ کچھ پانے کی جستجو میں کتنا کچھ چھوڑ چکی تھی۔ ''چند دن کی چاندنی پھر اندھیری رات'' والا معاملہ ہوتا ہے۔

بہر حال یہ بات نصیحتوں سے کبھی کسی کی عقل میں نہیں آئی۔ ہر دوشیزہ چوٹ کھا کر سود و زیاں کی شرح سے آگاہ ہوتی ہے۔ یہی بتایا ہے تاریخ نے۔

ان کا نکاح ہو گیا۔ وہ لاہور چلے آئے اور کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔

آمنہ دس لاکھ کیش ساتھ لائی تھی۔ کئی لاکھ کے زیورات بھی ساتھ تھے۔ وہ ایک اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔

سلمان کو کسی کاروبار کا تجربہ نہیں تھا لیکن اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور گارمنٹس کی ایک بڑی دکان کھول لی۔ دکان چل نکلی۔ سلمان کو اوقات سے زیادہ مل گیا تھا۔ وہ جی جان سے محنت کرنے لگا۔

وہ دونوں ہی خوش تھے۔ سلمان تو تھا ہی تنہا لیکن آمنہ کو کبھی کبھی اپنے باپ کی یاد ضرور ستاتی تھی۔ وسیم چودھری کرپٹ آدمی تھا، بدنام زمانہ تھا مگر آمنہ کا باپ تھا اور آمنہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ آمنہ اس کی لاڈلی تھی۔

گھر میں چور گھس آیا تھا اور پکڑا گیا تھا تو اس نے اپنی لاڈلی کے کہنے پر اسے چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس کی سفاکی مشہور تھی۔ کسی کو معاف نہیں کرتا تھا وہ۔

سلمان اور آمنہ کی خوشیوں کو چار چاند اس وقت لگے جب ان کے آنگن میں ایک دل خوش کن پھول کھلا۔ اس

پھول کا نام مشترکہ مشاورت کے بعد دانش رکھا گیا۔ دانش سلمان۔

☆.....☆

دانش سلمان ابھی ڈیڑھ ماہ کا ہوا تھا۔

سلمان گارمنٹس اسٹور پر تھا۔ آمنہ صحن میں بیٹھی دانش سے کھیل رہی تھی۔ اس کی چہکاروں سے خوشیاں کشید کر کے اپنی مامتائی روح میں ڈال رہی تھی جب گیٹ پر دستک ہوئی۔ اس نے گیٹ کھولا تو کوئی اسے دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

وہ دو بدمعاش ٹائپ آدمی تھے۔ ایک جو پستہ قد آدمی تھا، کہنے لگا۔ ''ہم صحیح جگہ پر پہنچے ہیں استاد۔ یہی ہے وہ کڑی؟''

''پھر بھی تصدیق ضروری ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

اور پھر جیب سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے موازنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں سو فیصد یہی ہے۔'' پھر اس نے تصویر بٹوے میں ڈال لی

''کک..... کون ہو تم لوگ؟'' آمنہ نے ہکلا کر خوف زدہ لب و لہجے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ اس نے دانش کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔

''آمنہ نام ہے نا تیرا؟'' ایک نے اس پر نگاہیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بمشکل ہاں میں سر کو جنبش دی تو اس نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''چل ہمارے ساتھ۔''

دوسرے نے بچہ اس سے چھین کر ایک طرف کیا اور پھر وہ اسے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کرنے کے بعد باہر کھڑی گاڑی میں ڈال کر روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

سلمان کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے بیوی بچے پر کیا بیت چکی تھی۔

پڑوسیوں نے جب بچے کے رونے کی مسلسل دلدوز آوازیں سنیں تو اندر چلے آئے۔ جب ان پر انکشاف ہوا کہ بچہ گھر میں تنہا ہے تو انہوں نے ایک لڑکے کو سلمان کی دکان کی طرف دوڑایا۔

سلمان اپنی بیوی کے غائب ہونے پر چکرا گیا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو سینے میں چھپایا تو ننھی روح کو کچھ قرار آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وسیم چودھری کا کیا دھرا تھا۔ پڑوسی چلے گئے تو وہ تنہا سوچتا رہ گیا۔

وہ دو تین دن تک دکان پر نہیں گیا بلکہ اپنے بیٹے کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس نے وسیم چودھری سے رابطہ کیا، اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا کہا تو اسے دھمکایا گیا کہ اگر اس نے اپنے ہونٹ نہیں سیے تو اسے اور اس کے بچے کو جان سے مار دیا جائے گا۔ کچھ اپنے بچے کی سلامتی کی خاطر اور کچھ اپنی بزدل فطرت کے مطابق اس نے ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لی اور بچے کے لیے ایک مقامی عمر رسیدہ عورت کو گورنس رکھ لیا۔ کاروبار چل نکلا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کاروبار میں اتنا مصروف کر لیا تھا کہ آمنہ کا خیال بھی شاذ ہی آتا تھا۔

☆.....☆

آمنہ ایک بار پھر اپنے باپ کے گھر میں پڑی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کا باپ اپنی تینوں بیویوں کے ساتھ اس کے ہی کمرے میں بیٹھا تھا۔

''نہ روؤ میری بیٹی!'' وسیم چودھری پیار سے بولا۔ ''تم جانتی تھیں کہ تم اپنے ڈیڈی کی جان ہو پھر بھی گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ بہت برا کیا تم نے۔''

''مجھ میں ہمت نہیں تھی آپ کا سامنا کرنے کی۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''بیٹی! تم مجھ سے بات تو کرتیں۔ ہم کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیتے۔ میں نے کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کروایا۔'' وہ بول رہا تھا۔ ''بہرحال شکر ہے کہ تم مل گئی ہو... ورنہ میں اپنی طبعی عمر سے پہلے مر جاتا۔''

''ڈیڈی! میرا بچہ۔'' وہ التجائیہ انداز میں روتے ہوئے بولی۔

''بیٹی! اسے بھول جاؤ۔'' وہ پینترا بدل کر بولا۔ ''وہ حرام بچہ ہے، حلال اولاد شادی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔''

''لیکن وہ میرا بچہ ہے ڈیڈی! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''رہ لوگی بیٹی! رہ لوگی۔'' وہ اپنے مخصوص پُرسکون اور دھیمے انداز میں فیصلہ کن انداز میں گویا ہوا۔ ''میں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دن بھر اپنے بچے کے لیے روتی تڑپتی رہی۔ رات کو وسیم چودھری ایک نوجوان کے ساتھ اندر آیا۔ وہ ایک دراز قد اور وجیہہ نوجوان تھا۔

''اس سے ملو بیٹا یہ میرے دوست جواد فیضی کا بیٹا ہے۔ فواد فیضی۔ ان کا اسٹیل کا بہت بڑا کاروبار ہے۔''

آمنہ نے رکی اور قدرے جبری مسکراہٹ کے ساتھ اس کو سلام کیا۔ پھر وہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا باپ ایک غیر آدمی کو اس کے کمرے میں کیوں لے آیا تھا۔

وہ چلا گیا تو اسے رخصت کرنے کے بعد وسیم چودھری آمنہ کے کمرے میں دوبارہ آیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مبارک ہو میری جان! فواد نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ وہ جلد از جلد تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا؟'' وہ حلق پھاڑ کے چیخی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''یہ بہت امیر اور بااثر لوگ ہیں فواد اچھا لڑکا ہے۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''ہم دس دن کے اندر اندر تمہیں بیاہنا چاہتے ہیں۔''

''میں شادی شدہ ہوں ڈیڈی! شادی شدہ عورت کی شادی دوبارہ نہیں ہوتی۔'' وہ دکھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میرا ایک بچہ بھی ہے، آپ بھول رہے ہیں۔''

''اوہو بیٹی! تم ابھی میچور نہیں ہو۔ پہلے تم نے گھر چھوڑ کر غلط فیصلہ کیا۔ اب ہم تمہیں غلط راستے کی طرف جانے نہیں دیں گے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''پہلے بھی تمہاری وجہ سے میری عزت خراب ہوئی ہے۔ اب اچھے بچوں کی طرح میری بات مان لو تاکہ تمہاری سابقہ غلطی کی تلافی ہو سکے۔ اپنے ڈیڈی کی عزت کا خیال کرو میری جان!''

''ڈیڈی! میں اپنے بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

اچانک وسیم چودھری نے پستول نکال کر اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ ''دیکھو میں دس تک گنوں گا، اگر تم نے شادی کے لیے ہاں نہیں کی تو میں گولی چلا دوں گا۔ میری موت کی ذمے دار تم ہو گی۔ میرے مرنے کے بعد تم جہاں مرضی چلی جانا۔'' وہ شاطر آدمی رو دینے کے انداز میں بولا۔ پھر اس نے گنتی اسٹارٹ کر دی۔

جب وہ آٹھ پر پہنچا تو آمنہ کے دل میں ایک ہی نام دھڑک رہا تھا۔ ''میرا بچہ! میرا بچہ۔''

پھر جب وہ نو پر پہنچا تو آمنہ کشمکش کی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ اس وقت بھی اس کے دل سے صدا گونجی ''میرا بچہ.....!!''

''دس.....!'' وسیم چودھری نے کہا۔

''ڈیڈی.....!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''ٹھیک ہے۔'' وہ ہار کر بول رہی تھی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وسیم چودھری نے خالی پستول جیب میں رکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''شاباش بیٹی! تم نے اپنے ڈیڈی کا مان رکھ لیا۔ خوش رہو۔''

اسے روتا چھوڑ کر خوش رہنے کی دعا دے کر وہ باہر نکل آیا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔

اگلے چند دنوں میں سلمان کی طرف سے طلاق نامہ بھی آ گیا۔ سلمان نے کن حالات میں طلاق دی تھی، وہ نہیں جانتی تھی مگر اس پر وہ ٹوٹ کر روئی تھی۔

دسویں روز وہ فواد فیضی کی دلہن بن کر اس کے گھر چلی گئی۔ شوہر اور بچے کی یاد کو اس نے سینے میں دفن کر دیا تھا۔

☆.....☆

فواد فیضی کے جوہر آہستہ آہستہ اس پر کھلتے چلے گئے۔ وہ عادی شرابی تھا۔ امیروں سے منسوب ہر بیماری اس میں تھی۔ اسے آمنہ سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی تو آمنہ کو بھی اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ زندگی گزرتی رہی۔ آمنہ نے فواد کے چار بچے پیدا کیے مگر دانش سلمان کو نہیں بھولی۔ آمنہ کی آنکھیں اکثر نم رہا کرتی تھیں مگر کوئی توجہ دینے والا نہیں تھا۔

شادی کے بارہ سال بعد فواد فیضی چل بسا۔ اسے اس کے کرتوتوں نے چاٹ لیا تھا۔ بچے بڑھتے رہے پھر بڑے جنید نے کاروبار سنبھال لیا۔

پینسٹھ سال کی عمر میں سفید بالوں، سفید جھریوں والی چمڑی اور ویران آنکھوں والی آمنہ نامی بڑھیا کو فالج ہوا۔ بیٹوں نے اسے اسپتال منتقل کر دیا۔ غنودگی کے عالم میں اس کے منہ سے ایک نام برآمد ہو رہا تھا۔

''دانش..... دانش.....''

بڑے بیٹے نے پریشان ہو کر کہا۔ ''یہ کس کا نام لے رہی ہیں؟ کون ہے یہ دانش جو اس حالت میں بھی انہیں یاد ہے؟''

منجھلے نے کہا۔ ''پہلے تو یہ نام کبھی کے منہ سے نہیں سنا۔''

اس سے چھوٹا بولا۔ ''توبہ ہے اس عمر میں بھی کسی نامحرم مرد کا نام لے رہی ہیں۔''

فالج اٹیک کے ساتویں روز آمنہ مر گئی مگر اس کے بیٹے آج تک یہ نہیں جان پائے کہ دانش کون تھا؟

لاٹری

مکرمی جناب
السلام علیکم!
کافی عرصے سے میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی سرگزشت لکھوں لیکن یہ لکھنے لکھانے کا کام بڑا مشکل ہے۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا کر کے لکھتا رہا ہوں اب جاکر سرگزشت مکمل ہوئی ہے۔ میری سرگزشت میں ایسا پیغام ہے جو زندگی کو سنوار دے گا۔ توجہ سے آپ پڑھ کر دیکھیں۔

مراد خان
(فیصل آباد)

جب کبھی میں رشتہ داروں یا کسی دوست کی شادی میں شریک ہونے جاتا تو وہ اور دوسرے شادی شدہ دوست مجھ سے سوال ضرور کرتے۔

''تم ہر دوست کی شادی میں آتے ہو۔ مزے مزے کے کھانے مزے سے کھاتے ہو لیکن تم شادی کب کر رہے ہو؟ ایسے کھانے کب کھلاؤ گے؟ تمہاری عمر بھی ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری عمر شادی کے قابل ہی نہ رہے؟''

''ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے اور اوپر والے نے جوڑا ہی پیدا نہیں کیا۔ بھلا شادی کیسے ہو گی؟'' میں حسب معمول ایک سا جواب دیتا۔

''یار مراد خان! کیا دنیا سے نامراد جاؤ گے؟'' کوئی دوست جملہ کستا۔

''ہاں یار! کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ اگر میں نامراد دنیا سے چل بسوں تو میرا جنازہ دھوم دھام سے اٹھانا۔''

''مراد خان! اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہو۔ انشاء اللہ ایک دن تمہاری بھی دلی مراد بر آئے گی۔''

تشفی اور ہمدردی رکھنے والے میرا دل رکھنے کی غرض سے دو بول محبت کے بول دیتے اور تسلیاں دیتے لیکن میں یہ حقیقت جانتا تھا کہ میری زندگی میں شادی کا خوب صورت چاند کبھی طلوع نہ ہو گا۔ گھپ اندھیرا ہی مسلط رہے گا۔ میں جو خواب دیکھتا ہوں وہ کبھی پورا نہیں ہو گا، خواب میں بھی میری شادی نہیں ہو پائے گی۔

مجھے اپنے والدین پر بہت غصہ آتا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر میرا نام مراد خان رکھ دیا تھا۔ یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ میرا نام نامراد خان رکھ دیتے۔ میرے ایک دوست خوش نصیب خان نے جب مجھے اپنی شادی کی خوش خبری سنائی اور شادی کارڈ دیا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ آخر کیوں نہ خوش ہوتا، برسوں کی کوشش، دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے بعد اس کے سہرے کے پھول جو کھلے تھے۔ سرفراز، شجاع، نسیم اور مختار خان کی شادی پہلے ہو چکی تھی۔ اب خوش نصیب خان کی خوش قسمتی کا در کھلا تو وہ بھی اس شمار میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد میں اکیلا رہ گیا تھا۔ جس پر کنوارہ کا لیبل چپکا ہوا تھا۔

تین دن پہلے خوش نصیب خان کی شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی تھی۔ تیسرے دن ان کا ولیمہ تھا۔ میں اس کی برأت میں اس لیے شامل نہ ہو سکا تھا کہ میری کمپنی والوں نے ایک ضروری کام سے اندرونِ سندھ بھیج دیا تھا۔

ولیمہ سے قبل میں نے اپنے دوستوں سے دریافت کیا۔

''خوش نصیب خان کی بیوی کیسی ہے؟ تم لوگوں نے اسے دیکھا ہے؟''

''یار! وہ بیوی کے معاملے میں بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے۔ شادی والے دن اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ اب شادیوں میں پردہ کہاں ہوتا ہے۔ مخلوط اجتماع ہوتا ہے۔ دلہن اسٹیج پر ہوتی ہے۔ اس کی بیوی کو دیکھا تو سچ پوچھو کہ اس پر بڑا رشک آیا۔ بھابی لاکھوں میں ایک ہے۔'' ''اب تم بھی جلدی سے شادی کر کے شادی شدہ لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔''

''سنا ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن افسوس میرا

جوڑا نہیں بن سکا ہے اسی لیے اب تک میں نامراد ہوں۔ لہٰذا یار! تم لوگ میری شادی کی فکر مت کیا کرو ورنہ وزن گھٹ جائے گا۔"

خوش نصیب خان کے ولیمے میں شرکت ضروری تھی۔ سرفراز نے مجھے بتایا تھا کہ خوش نصیب خان بڑے شاندار طریقے سے ولیمہ کر رہا ہے۔ تم ضرور آنا ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔ کیونکہ تم برات میں بھی نہیں تھے۔

میں جس وقت نئی حسن کے بس اسٹاپ پر بس سے اترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ علاقہ کسی حسینہ کی افشاں بھری مانگ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ان کی روشنیوں کے عکس سے سڑک منور ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف شادی ہالوں کی تیز روشنیاں آرائشی محرابوں سے کسی نئی نویلی دلہن کی طرح جھانک رہی تھیں۔

اب تو بجے کوئی شادی ہال نہیں پہنچتا بلکہ دس بجے کے بعد ہی مہمانوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک روایت اس لیے بن گئی تھی کہ عورتیں بن سنور کر نکلتی ہیں۔ بیوٹی پارلرز جانا فرض ہو گیا ہے تاکہ وہ بھی کسی دلہن سے کم نہ معلوم ہوں۔ یہ چنگلی حسن متوجہ کرنے والا ہوتا ہے کہ ہم بھی کسی دلہن سے کم نہیں ہیں۔ بیوٹی پارلر والوں کی چاندی ہے۔ صبح جب وہ منہ ہاتھ دھوتیں تو غازہ اور ساتھ ساتھ ہزاروں کی رقم بھی سیوریج میں بہہ جاتی ہیں۔

ایسا کوئی شادی ہال دکھائی نہ دیتا تھا جس میں کوئی تقریب منعقد نہ ہو رہی ہو۔ مہمانوں کی آمد تھی۔ خواتین بھڑکیلے ملبوسات اور زیورات سے لدی پھندی ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔ کسی کسی پر دلہن کا گمان ہوتا تھا۔ بعض میک اپ سے مضحکہ خیز اور چڑیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی اور نہ آتی تھی کہ اللہ نے انسان کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ خوب صورت بنایا، اسے جو رنگ روپ دیا وہ دنیا کی کوئی بیوٹی پارلر نہیں دے سکتی ہے۔ پھر یہ میک اپ پر سینکڑوں ہزاروں کیوں خرچ کرتی ہیں۔ دلہنیں بھی پچاس ساٹھ ہزار میں ریج ورچ کرآتی ہیں بلکہ اب تو میک اپ

پر لاکھ تک خرچ کیے جا رہے ہیں۔ صرف ایک رات کی بات ہوتی ہے اور صبح نہانے پر سب ختم۔ اللہ نے جو رنگ و روپ دیا یہ کیا اس کی توہین نہیں۔ کسی ضرورت مند کو سو پچاس دیتے ہوئے دل دکھتا ہے اور پھر عورت کا سنگار تو شوہر کے لیے ہوتا ہے لیکن یہ تو دنیا کے مردوں کے لیے کرتی ہیں؟ میں جب کبھی کسی شادی میں جاتا تو بڑی سنجیدگی سے یہ باتیں سوچنے لگتا تھا۔

فضا مہک رہی تھی۔ چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ لڑکیاں عورتیں چہکتی، تھرکتی پھر رہی تھیں۔ ان کی بے حجابی کے نظارے مردوں اور جوان لڑکوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شادی نہیں مقابلہ حسن کا انعقاد ہو رہا ہے۔

میں کئی ہالوں سے گزرتا ہوا اس ہال کی طرف بڑھا جس میں، خوش نصیب خان کا ولیمہ تھا۔ ہال کے داخلی دروازے پر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کھڑا ہوا وہ مہمانوں کا والہانہ انداز سے استقبال کر رہا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے مبارک باد دی، گال پر بوسہ دیا اور پوچھا کہ کیا سارے دوست آ گئے۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا پھر مسکرایا۔ ''ان کی بیویاں بناؤ سنگھار کر رہی ہوں گی۔ گیارہ بجے سے پہلے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ سنگھار ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہوگا۔ وہ رنگ روغن تھوپے جا رہی ہوں گی۔''

یہ سن کر میں اس کے ساتھ ہی مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اندر اکیلا بیٹھ کر بور ہوتا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا۔ میں نے اس سے باتوں کے دوران اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو دمک رہا تھا اور آنکھوں میں قمقمے جیسی چمک تھی۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ میں نے اسے کبھی کسی بھی موقع پر اتنا خوش نہیں دیکھا تھا اور پھر سرشاری اور مسرت نے اسے پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے دس برس کم دکھائی دیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے نام کی کوئی بڑی لاٹری نکلی ہے۔ شاید شادی بھی کسی لاٹری سے کم نہیں ہوتی۔

میں نے قریب ہو کر اس کے کان میں سرگوشی میں آہستگی سے پوچھا۔ ''بھابی کیسی ہیں؟ تمہیں پسند آئیں؟''

اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ''شادی کے بعد احساس ہوا کہ میں نے شادی میں بہت دیر کی۔ اب تم جتنا جلد ہو سکے شادی کر لو یار مراد خان۔''

''تم جانتے ہو کہ میں نامرادی کے سمندر میں برسوں سے ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ ساحل مراد ہے کہ دور ہوتا جا رہا ہے۔''

وہ کچھ کہنا یا مشورہ دینا چاہتا تھا کہ گاڑیوں سے مہمان مرد، لڑکیاں، عورتیں اور بچے سیڑھیاں چڑھ کر آنے لگے۔ وہ مستعد سا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا:

''کسی دن گھر آنا تو تمہاری بھابی سے ملواؤں گا اور تم سے باتیں ہوں گی اور ہاں اسٹیج پر تمہاری بھابی بیٹھی ہیں، تم درشن کر لو۔'' میں نے اندر جا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ خوش نصیب خان کی بیوی اسٹیج پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا اصل چہرہ میک اپ میں چھپا ہوا تھا۔ میک اپ ہر دلہن کی اصل صورت کو چھپا دیتا ہے۔ ماں باپ اور گھر کے دوسرے افراد بھی شاید اس حالت میں پہچان نہیں پاتے ہوں گے۔ میرے خیال میں عورت سے زیادہ بڑی احمق کوئی نہیں جو صرف ایک رات کے لیے حسین بننے پر ہزاروں کی رقم بہا دیتی ہے۔ اصل زیور شرم و حیا ہوتا ہے جو دلہن کو حقیقی معنوں میں حسین بناتا ہے جو کہیں نظر نہیں آتا۔

اس کی بیوی میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ حالانکہ وہ صرف تین دن کی دلہن تھی۔ وہ چہک رہی تھی اور اپنی سہیلیوں سے نہ صرف شوخی بلکہ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ گریبان خطرناک حد تک کھلا ہوا تھا اور اس نے دوپٹا سے پردہ پوشی نہیں کی تھی۔ بہرحال خوش خان کی زندگی میں خوش نصیبی کا در کھل گیا تھا۔ میں یہ بات سوچے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ نئی نویلی دلہنیں شادی کے دن ہی اسٹیج پر شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ گانے بج رہے ہیں اور وہ دولہا کے ساتھ رقص کر رہی ہے۔ یہ زیب نہیں دیتا تھا۔ آخر یہ دلہنیں بھی اس قدر بے حجاب، بے شرم اور اداکارہ کیوں بنتی جا رہی ہیں۔ ان مناظر پر فلمی شادی کا گمان ہوتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے عمر ایسی گزری تھی کہ میں چھتیس برس کا ہو رہا تھا۔ میں تنہائی بھری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دنیا میں اکیلا تھا۔ میرے والدین حیات تھے اور نہ ہی کوئی بھائی بہن۔ جو رشتے دار تھے وہ اس لیے مجھ سے دور ہو گئے تھے کہ میں ان کی نظروں میں ایک معمولی آدمی تھا۔ میں کرائے کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ ایک فرم میں قلیل تنخواہ پر ملازم تھا جہاں ترقی اور تنخواہ میں اضافہ ہونا دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔

میرے دوست اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ ولیمے میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔ میں انہیں رشک سے دیکھے جارہا تھا۔ میری محرومیاں مجھے جذباتی بنا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے بچے بھی بڑے پیارے، خوب صورت اور گول مٹول سے تھے۔

میرے دل کے ہر کونے میں یہ تمنا تھی کہ میرا اپنا ایک گھر ہو۔ میری بیوی اور بچے ہوں۔ مجھے ایک دوست نے لڑکیوں کی تصویریں دکھانے کا وعدہ کیا بھی مگر میں تیار نہ ہو سکا۔ کیونکہ شادی کرنے کے لیے میرے پاس چار سو بھی نہ تھے۔ میں نے اب تک کوئی رقم پس انداز بھی نہیں کی تھی۔ کہاں سے کرتا کیونکہ ہر ماہ دو تین سو روپے کا مقروض بھی ہو جاتا تھا جب کہ شادی کے لیے ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی رقم درکار تھی۔ شادی کے اخراجات میں ہوشربا اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ شادی مشکل سے مشکل ہونے لگی تھی لیکن اسے جو مشکل بنا رہے تھے وہ لوگ تھے جن کی آمدن ناجائز اور حرام کی تھی۔ کوئی بھی اپنی زندگی سادگی اور شرعی طور پر گزارنے پر تیار نہ تھا اس لیے بدکاری آسان ہوگئی تھی۔

میری شادی اس صورت میں ہوسکتی تھی کہ میں ڈاکو بن جاؤں۔ دفتر میں ایسا کوئی فراڈ کروں کہ لاکھوں کا مالک بن جاؤں لیکن اس کے لیے بس ہمت، ذہانت اور ہوشیاری کی ضرورت تھی، وہ مجھ میں نہیں تھی۔

جب بھی میں کسی جوڑے کو دیکھتا تھا تو میرے دل پر ایک قیامت سی گزر جاتی اور سینے میں سرد آہوں کا غبار بھر جاتا۔ عورت ایک ایسی چیز ہے جس کے حصول کے لیے ہر مرد آرزو کرتا ہے۔ قربت کے خواب دیکھتا اور تصورات کی ایک انجانی دنیا میں دور نکل جاتا ہے۔ جب بھی میں کسی پُرکشش عورت کو دیکھتا تو اس کا سراپا، نشیب و فراز اور اس کے انگ انگ سے ابلتی مستی مجھے ساری رات سونے نہیں دیتی تھی، میں بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ میں نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر میں شادی کروں گا تو کسی حسین و جمیل لڑکی سے جس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیاں واضح ہوں ورنہ پھر کنوارا رہوں گا۔ کنوارا ہی مرجاؤں گا۔

میں ایک دوست کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہال کے اس گوشے کی طرف چلا گیا جہاں دلہن براجمان تھی۔ اسٹیج پر ایک صوفے پر بیٹھی دلہن کو اس بار ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اٹھارہ بیس برس سے زیادہ کی دکھائی نہ دیتی تھی۔ چھریرے متناسب بدن کی تھی۔ سرخ غرارے میں عجیب بہار دکھا رہی تھی۔ خوش نصیب خان عمر میں مجھ سے دو ایک برس چھوٹا ہو گا۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا کہ اس نے کتنا اونچا ہاتھ مارا ہے۔ اس عمر میں بھی اسے اتنی کم عمر، حسین اور دل کش لڑکی مل گئی ہے۔ عمروں کا فرق لڑکی والوں کو نظر نہ آیا، اس کا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ کیا یہ شادی بے جوڑ نہیں؟

خوش نصیب خان کے گھر والے سلامت تھے۔ اس کی تنخواہ اچھی تھی اور اس کا اپنا ذاتی مکان بھی تھا۔ ایک پرانے ماڈل کی کار تھی جو اچھی حالت میں تھی۔ لڑکی والوں نے شاید اس لیے اس سے بہت کم عمر لڑکی اسے دے دی تھی۔

ہال میں کسی حسین خواب کا سا رنگین منظر تھا۔ تیز روشنیوں میں حسین چہروں، پُرکشش اور پُرشباب گداز جسموں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ باتوں کا شور، سرگوشیاں، مترنم ہنسی، قہقہے اور شوخیاں فضا کا حصہ بن گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سب گندم کی پکی ہوئی فصلیں ہوں اور ان میں لہریں پیدا ہورہی ہوں۔ لباس، ان کی تراش خراش اور جدید فیشن نے انہیں ایسا بے حجاب اور نمایاں کیا کہ انہیں جسمانی نشیب و فراز کی نمائش سے کوئی شرم نہیں آرہی تھی۔

میرا دوست خوش نصیب خان کی دلہن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھ لیا تو ہم اسٹیج سے ہٹ کر مردوں کے حصے میں آگئے۔ میرا دوست اپنے بچے کو چپس دلانے کے لیے ہال سے باہر گیا تو میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ مجھے اس وقت احساس محرومی نے بے حد جذباتی اور رنجیدہ بنا دیا تھا۔ میں ایک بے جان شے کی طرح بیٹھا رہا۔ ان لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو شادی ہال میں داخل ہورہی تھیں۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے پورے جسم سے محسوس کررہا ہو جیسے اس کا ہر مسام آنکھ بن گیا ہو۔ جیسے اس کے حواس سو گئے ہوں مگر جذبات جاگ رہے ہوں۔ مجھے اپنی نامرادی پر رونا آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئے گی؟ میں نامراد ہی اس دنیا سے چلا جاؤں گا؟ میرے برابر والی کرسی پر کوئی آکر بیٹھا لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

میں ایک نوبیاہتا جوڑے کو دیکھنے میں محو تھا جو اس تقریب میں شرکت کرنے آیا تھا۔ مرد بھدا اور درمیانے قد کا تھا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی متناسب بدن کی بے حد

پُرکشش عورت تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی۔ کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن اس کی نوجوان اور حسین بیوی اس کے ساتھ یوں خوش دکھائی دیتی تھی جیسے وہ اس کا شوہر نہ ہو ہلکہ لاٹری میں نکلا ہوا انعام ہو۔ وہ بڑی نازاں سی تھی۔

میں نے اپنی ران پر اچانک دباؤ محسوس کیا۔

''کہاں کھو گئے ہو میرے دوست؟ کیا میک اپ زدہ پریاں دیکھ رہے ہو؟'' میں نے چونک کر دیکھا تو برابر والی کرسی پر رشید بیٹھا میری طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

''بدمعاش! یہ تم ہو؟'' میں نے ایک مکا اس کے سینے پر مارا۔

وہ کالج میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ ہم دونوں آپس میں بڑے گہرے اور بے تکلف دوست تھے۔ اس نے کبھی پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ نویں جماعت سے لے کر انٹر تک نقل کر کے پاس ہوتا رہا۔ انٹر کے بعد ہم دونوں نے اپنے مسائل اور وسائل نہ ہونے کے سبب تعلیم ترک کر دی تھی۔

آج میری کوئی تین برس کے بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ تین برس پہلے اس نے ایک گرلز کالج کے سامنے آلو چھولے کا ٹھیلا لگایا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ہنس کے بتایا کہ وہ حسیناؤں کی خدمت کر رہا ہے۔ اس بہانے وہ اپنی آنکھیں سینک لیتا ہے۔ لڑکیوں کو دیکھنا اور انہیں آنکھوں میں جذب کرنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ چھ ماہ بعد اس نے آلو چھولے بیچنا بند کر دیے۔ اس کا جی حسن کے دیدار کی یکسانیت سے بھر گیا تھا۔ پھر مجھے اس کے دوست نذیر نے بتایا تھا کہ رشید شام کے وقت اخبار و رسائل بیچنے لگا ہے۔ اس کی دو خوب صورت جوان بیویاں اور چار بچے تھے۔ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں اور ملازمت بھی کرتی تھیں۔ اس ناکارہ اور غیر ذمے دار شخص کو پال رہی تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک نیام میں دو تلواریں رہ رہی تھیں۔ آپس میں لڑتی جھگڑتی نہیں تھیں۔ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انتہائی چرب زبان تھا۔ اسے دوسروں کو شیشے میں اتارنے کا فن آتا تھا۔

''ابے ڈبل بیرل، تم زندہ ہو؟'' اسے دیکھ کر میری شوخی عود آئی۔ ''میں اب تک تمہاری تین برسیاں منا چکا ہوں۔''

''یار! تم جانتے ہو کہ میں ایک سیلانی آدمی ہوں۔ اس لیے ملاقاتوں کے لیے وقت نہیں ملتا۔ ویسے میں تمہیں تین مہینے سے تلاش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پرانے مکان پر بھی گیا تھا جس میں تم کالج کے زمانے میں رہتے تھے اپنے والد کے ساتھ۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ تمہارے والد کے انتقال کے بعد مالک مکان نے تم سے مکان خالی کروالیا تھا۔ تمہارے دفتر کا نام پتا معلوم نہیں ہو سکا ورنہ تم سے وہیں آ کر مل لیتا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

''تم اس خاکسار کو کس خوشی میں تلاش کر رہے تھے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''کسی مسجد کے لیے چندے کی ضرورت تو نہیں تھی؟''

''چھ مہینے تک یہ کاروبار کر کے بھی دیکھ لیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بڑا منافع بخش کاروبار تھا۔ میں نے فرضی مسجد کی رسیدیں چھپوا کر بہت چندہ وصول کیا لیکن اب اس میں اتنے باریش لوگ آ گئے ہیں کہ میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔''

''تم نے بتایا نہیں کہ مجھے کس لیے تلاش کر رہے تھے؟ کیا کام تھا مجھ سے؟''

''اس لیے کہ میں نے سنا تھا کہ تم نے اب تک شادی نہیں کی؟ میں تمہاری شادی کرانا چاہتا تھا۔''

''کیا فرمایا جناب آپ نے؟ میری شادی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میری شادی ساری زندگی نہیں ہو سکتی۔ کیوں تم میرا اور اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو؟''

اس نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔ ''کیا شادی کوئی جرم ہے؟''

''اس لیے نہیں ہو سکتی کہ شادی کے لیے مال پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس تو دو وقت پیٹ بھر کے کھانے کے لیے پیسے بھی نہیں ہوتے۔ بھلا ایسا شخص شادی کیوں کرے گا؟''

''مال پانی؟'' اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ دوسرے لمحے وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ ''شادی کے لیے مال کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے تم خود بھی کسی مال سے کم نہیں ہو؟''

''یار! میرے پاس دو چار ہزار تو کیا۔ دو چار سو بھی نہیں ہیں بلکہ ہر ماہ چار پانچ سو کا مقروض ہو جاتا ہوں۔'' میں نے اپنی تنگدستی کے بارے میں بتایا۔

''تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ شادی کرنا چاہتے ہو کہ نہیں؟''

''کیوں نہیں یار! لیکن اس کے لیے.....'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اوہ میرے یار مراد خان ایہ تو نامرادی کی بات کیوں کررہا ہے؟'' اس نے بڑے زور سے میری ران پر ہاتھ مارا۔ ''مرد کو شادی کے لیے مال کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی۔''

''ابے او احمق، کہیں پیسوں کے بغیر شادی ہو سکتی ہے؟ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟''

''کیوں نہیں ہو سکتی؟'' وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ ''وہ شادی ہی کیا جو پیسوں سے ہو۔ اب تم مجھے ہی دیکھ لو۔ میں تین چار مہینے کے بعد تیسری شادی کرنے والا ہوں۔ جب کہ میری دو بیویاں موجود ہیں۔ میں ایک قلاش شخص ہوں۔ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔''

''ہیں..... اتم تیسری شادی کرنے جارہے ہو؟'' مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ ''یہ جانتے ہوئے کہ پہلے سے تمہاری دو بیویاں موجود ہیں؟''

''اس دنیا میں گدھوں کی کوئی کمی نہیں۔ ان میں ایک گدھے تم بھی ہو اس لیے تمہاری شادی نہیں ہو رہی ہے۔ لنڈورے پھر رہے ہو۔ ایک گدھا وہ ہے جو اپنی جوان اور حسین بیٹی میرے عقد میں دے رہا ہے... کیونکہ اس گدھے کی پیٹھ پر چھ جوان لڑکیوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ اسے چونکہ اپنا بوجھ کم کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک گدھا دوسرے گدھے پر اپنا بوجھ منتقل کرنا چاہتا ہے۔''

''ایک تم ہو کہ تیسری شادی کررہے ہو۔ ایک میں ہوں کہ اب تک میری ایک شادی بھی نہیں ہوئی۔ میں کیسا نامراد اور بدنصیب شخص ہوں۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے؟''

''تم شاید نہیں جانتے کہ لاٹری اور شادی قسمت والوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ شادی بھی ایک لاٹری ہے۔ یہ لڑکی میری دونوں بیویوں کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ حسین ہے بلکہ خاصہ جہیز بھی لے کر آرہی ہے۔ شادی میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ ڈھنگ کا کرائے کا مکان نہیں مل رہا ہے۔ تینوں بیویوں کو ایک ساتھ رکھنے کے لیے بڑا مکان چاہیے۔ موجودہ مکان صرف دو کمروں کا ہے۔'' وہ بولا۔

''تمہاری دونوں بیویوں نے کیا تمہیں تیسری شادی کی اجازت دے دی ہے؟ یا تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے کررہے ہو؟ یا پھر اپنی بیویوں کی کسی بیماری، کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے نہ صرف ہنسی خوشی اجازت دے دی بلکہ تحریری اجازت نامہ بھی دیا ہے۔ بلکہ شادی کی تیاریاں بھی کررہی ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''یار! تم بیویوں کے معاملے میں بے حد خوش قسمت ہو؟'' میں نے رشک آمیز لہجے میں کہا۔ ''ویسے تم آج کل کر کیا رہے ہو؟''

''میں نے شادی کا دفتر کھول رکھا ہے۔ رشتے کراتا پھرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لیے میں تمہاری شادی کرانا چاہتا ہوں۔''

''شادی دفتر؟ کیا اس میں کچھ مالی فائدہ بھی ہو جاتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''فائدہ؟ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پانچوں انگلیاں گھی میں ہو جاتی ہیں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے تین چار مہینے پہلے یہ نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ اس بزنس میں سب سے پہلے جو کام اور فائدہ ہوا وہ یہ کہ میرا اپنا رشتہ طے ہو گیا۔ ایک رشتہ طے کرانے پر دو ہزار سے پندرہ بیس ہزار تک مل جاتے ہیں۔ بڑی خاطر مدارت ہوتی ہے، جوڑے بھی ملتے ہیں۔ یہ سب رشتوں پر منحصر ہے۔ اب تک خاصی شادیاں کرا چکا ہوں۔ میں ایک دوست ہونے کے ناتے یہ چاہتا ہوں تمہاری ذات کو بھی فائدہ پہنچاؤں کہ تم بھی دل کی مراد پالو۔''

''میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری فیس ادا کرسکوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم میری پوزیشن سے واقف ہو۔ اگر مفت میں فائدہ پہنچا سکتے ہو تو یہ گدھا حاضر ہے۔''

''کون گدھا تم سے فیس مانگ رہا ہے؟'' وہ تنک کر بولا۔ ''شادی کے بعد تمہاری جیب اور حالات اجازت دیں تو خوشی سے دے دینا، ورنہ نہیں۔ کوئی غم نہیں۔ اس دنیا میں آدمی نہیں بلکہ گدھے، گدھے کے کام آتے ہیں۔''

''میری شادی کیسے کراؤ گے؟'' میں نے اشتیاق آمیز تجسس سے پوچھا۔

اس لمحے ہال میں اچانک ایک افراتفری سی مچ گئی۔ ہوا یہ کہ کھانا ''کھل'' گیا تھا۔

مہمان کھانے کی میزوں کی طرف کئی دنوں کے بھوکے، ندیدوں اور فقیروں کی طرح لپک رہے تھے۔ پڑھے لکھے۔ سنجیدہ اور عمر رسیدہ باریش لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ صبر، تہذیب اور شائستگی چھوکر بھی نہیں گئی تھی۔ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ اپنی پلیٹ اس طرح بھر رہے تھے جیسے اب کبھی کھانا

کو نہیں ملے گا۔ کسی کو چمچ نہیں ملے تو اپنے ہاتھ کو چمچ بنا لیا۔ سب سے زیادہ زور چکن بروسٹ پر تھا۔ ایک شخص دو کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں اٹھا رہا تھا۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے کہ جب یہ بھوکے میزوں سے ہٹ جائیں تو پھر کھانا نکالیں۔"

"تم مجھے اپنے گھر کا پتا سمجھا دو۔ میں کل تم سے وہاں آ کر بات کروں گا۔" اس نے کہا۔

وہ دوسرے دن مغرب کے بعد میرے فلیٹ پر قرض خواہ کی طرح آدھمکا۔ میں اس وقت چارپائی پر دراز ایک رنگین فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا جس میں پاکستانی ہندوستانی اداکاراؤں کی رنگین بولڈ تصویریں کلوز اپ سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسی سنسنی خیز تصویریں رسالوں اور اخبارات میں آئے دن چھپتی رہتی ہیں۔ یہ ایک مفت کی تفریح تھی۔ میں پرانے فلمی رسالے اور کتابیں بیچنے والے سے بہت کم رقم میں لے آتا تھا۔ گھر میں ٹی وی نہیں تھا اس لیے یہ دل بستگی کیا کرتے تھے۔ ان اداکاراؤں کا حسن شعلہ بنا ہوا تھا۔ میں ان کی تصویریں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسی حسین عورت میری زندگی میں آ جائے۔

اس گدھے نے اندر آتے ہی فلیٹ کا جائزہ لیا۔ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ اس میں ایک چارپائی، ایک بستر اور صندوق کے سوا کچھ نہ تھا۔ میز اور کرسی تک نہ تھی۔ باورچی خانے میں ایک چولہا تھا اور دو تین برتن تھے۔ ایک توا تھا۔ میری چارپائی ہی میز کرسی اور ڈائننگ ٹیبل کا کام دیتی تھی۔ اس پر میرا سونا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا تھا۔ کوئی دوست یا ملاقاتی آتا تو اسے بھی چارپائی ہی پر بٹھاتا تھا۔ میں ایک خانہ بدوش کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔

"یہ تم کوسٹ گارڈ انسپکٹر کی طرح کیا ہیروئن تلاش کر رہے تھے؟"

"میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس گھر میں ایک ہیروئن کی کمی پوری کی جا سکتی ہے۔"

"تم نے گھر کی حالت دیکھ لی جو ایک بدوش کی رہائش کی طرح ہے۔ اب بتاؤ؟ کیا کوئی گدھا مجھے داماد بنانا پسند کرے گا؟"

"کیوں نہیں۔" وہ میری چارپائی پر تکیے کے سہارے فلوپطرہ کے انداز میں نیم دراز ہو گیا۔ "کل شام تم تیار رہنا، میں تمہیں برد دکھاوا کے لیے لے جاؤں گا۔"

"تمہاری عقل ٹھکانے ہے؟" میں گڑبڑا سا گیا۔ "کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "میں نے آج لڑکی والوں سے بات کی ہے۔ جب کل تم میرے ساتھ چلو گے تو یقین بھی آ جائے گا۔"

"یار رشیدا" میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ لڑکی والوں نے آ کر میرا گھر دیکھ لیا تو نہ صرف انکار کر دیں گے بلکہ تمہاری کھوپڑی چٹخا دیں گے۔ لاوارث اور افلاس زدہ شخص کو کون اپنا داماد بنانا پسند کرتا ہے؟"

"ابے او گدھے تمہیں شادی کرنا ہے یا نہیں؟" اس نے غصے سے مجھے گھورا۔

"کیوں نہیں کرنا ہے۔" میں نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اپنا سر ہلایا۔ "خوابوں میں شادیاں کرتے کرتے بیزار آ چکا ہوں۔"

"تو پھر آم کھانے سے مطلب رکھو، پیڑ گننے سے نہیں۔" اس نے کہا۔ "کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا ہے کہ تمہاری شادی ہر قیمت پر کراؤں گا۔ میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔"

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کیا چار ہزار تنخواہ میں گزارہ ہو جائے گا جب کہ میں چھرا چھانٹ ہونے کے باوجود گزارہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ میری تنخواہ اونٹ کی دم کی طرح ہے جو بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "میں نے فارسی یا فرانسیسی میں تو نہیں کہا تھا؟ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ شادی ایک لاٹری ہے؟ کل تمہارے نام لاٹری نکلنے والی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر یہاں بیٹھا رہا تو تم فضول سوالات کر کے میرا دماغ چاٹتے رہو گے۔ اللہ حافظ۔"

ساری رات میں بڑے رنگین اور سہانے خواب دیکھتا رہا۔ ایک حسین و جمیل بیوی کے خواب جو ایشوریا رائے، کرینہ کپور اور کترینہ کی تھی۔ دفتر میں بھی میری کیفیت جاگتے میں خواب دیکھنے کی سی ہو رہی تھی۔ کبھی میں ایک دم سے خوش ہو جاتا کہ میری ویران، بے کیف اور خزاں جیسی زندگی میں چپکے سے بہار آنے والی ہے اور میں ایک عورت کے دل و جان کا مالک بن جاؤں گا۔ میرے رات دن اس کی معیت میں پُرکیف گزریں گے۔ اس کی بے پناہ محبت، گرم جوشی اور خود سپردگی ایک نشہ بن کر طاری رہا کرے گی۔ بیویاں

تو محبت کا چشمہ ہوتی ہیں۔ کبھی میرا دل اس خیال سے بجھ جاتا کہ میری عمر چھتیس برس سے زیادہ ہو چکی ہے۔ میرا سر گنجا کسی چٹیل میدان کی طرح ہے۔ میں موٹا، بھدا اور بے کشش سا شخص ہوں۔ میری تنخواہ تو ایک معمولی چپڑاسی سے بھی کم ہے۔ اس تنخواہ اور گرانی کے اس دور میں گھر بھی نہیں چلا سکتا۔ کرایہ اس لیے بہت ہی کم ہے کہ میرے مرحوم والد کے ایک بچپن کے دوست میرے باپ سے دوستی نبھا رہے ہیں حالانکہ اب وہ دنیا میں نہیں رہے۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ مجھے لڑکی اور اس کے ماں باپ پسند نہیں کریں گے۔ آج کل لڑکیاں تو لڑکے کو دیکھ کر پسند یا ناپسند کرتی ہیں۔ میں نہ تو ان کے معیار کا ہوں اور نہ ہی تصوراتی محبوب کی طرح ہوں۔ ہاں اگر میں صاحب حیثیت ہوتا اور میرے پاس گاڑی اور ایک آراستہ پیراستہ فلیٹ ہوتا جس کا ہر کمرا اے سی والا ہوتا اور دفتر میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا تو وہ میری بدصورتی کے عیب کو چھپا لیتا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ایسے خواب دیکھ کر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر خود کو فریب نہیں دینا چاہیے۔ مجھے حقیقت کی دنیا میں آجانا چاہیے جس کی زمین سنگلاخ ہے۔ اپنی حیثیت اور اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ اب تک جس طرح زندگی گزارتا آرہا ہوں اس طرح سے کاٹ لینا چاہیے۔ میں مراد خان نہیں نامراد خان ہوں۔

دوسرے دن شام کو میں تیار ہو کر رشید کا بے دلی سے انتظار کرنے لگا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے وہ کسی وجہ سے نہ آئے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ نہ آئے۔ اس میں ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ میرے نام لاٹری نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے کسی غلط فہمی اور خود فریبی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے لیکن رشید ٹھیک وقت پر آگیا اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر لڑکی کے گھر والوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سارا راستہ میری ہمت بندھاتا رہا اور مجھ سے دروغ گوئی سے کام لیتا رہا۔ میں بے حد وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا ہوں اور اپنی عمر سے بھی دس برس کم دکھائی دیتا ہوں۔ لڑکی کے والدین کیا ان کے فرشتے بھی پسند کر لیں گے۔

لڑکی والوں کے گھر ہم دونوں نے قدم رکھا تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جیسے میں کوئی شہزادہ ہوں۔ لڑکی کے ماں باپ اور بھائیوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں آٹھواں عجوبہ ہوں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں کی اوٹ سے لڑکیاں اور عورتیں تاک جھانک کر رہی تھیں اور ان کی دبی دبی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ناشتا بڑا زوردار اور پُرتکلف تھا جس کی توقع نہیں تھی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ شاید صرف چائے یا ایک گلاس شربت پر ٹرخا دیا جائے گا۔ مجھ پر چاروں طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ خدا بھلا کرے رشید کا اس نے میری نمایندگی اور ان کے سوالات کا جواب دے کر میری لاج رکھ لی تھی۔

میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے لڑکی بھی دکھا دیں گے۔ آج کل لڑکی دکھا دی جاتی ہے۔ نہیں تو موبائل پر اس کے درشن کرا دیے جاتے ہیں۔ میرے پاس موبائل اس لیے نہیں تھا کہ اس کا استعمال میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے دو ایک لڑکیوں کی جھلک دیکھی تھی۔ ایک جواں سال عورت جو ناشتا ٹرالی میں لائی تھی وہ گوری رنگت کی تھی۔ اس کے نقوش بھی پیارے تھے۔ وہ جو لڑکیاں دیکھیں وہ بھی خوب صورت اور پُرکشش تھیں۔ اس سے میں نے قیاس کیا کہ میری ہونے والی محترمہ بھی خوب صورت اور کسی اداکارہ کی طرح ہوگی۔

میں نے گھر جاتے ہوئے رشید سے سوال کیا۔ ''تم نے کیا لڑکی دیکھی ہوئی ہے؟ وہ کیسی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اک دم فرسٹ کلاس۔ تمہاری زندگی میں اجالے بکھیر دے گی۔''

''انہوں نے اس نامراد کا کیا فیصلہ کیا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

''یہ کل پتا چلے گا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ مل بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔ وہ کوئی لاوارث لڑکی تو ہے نہیں جو فوراً فیصلہ سنا دے۔ اس کے بھائی ہیں، بھابی ہیں، ایک شادی شدہ بڑی بہن ہے۔ وہ مل بیٹھ کر صلاح، مشورہ کریں گے۔ انہوں نے کل تک مہلت مانگی ہے۔ مجھے کل شام بلایا ہے۔''

دوسرے دن رات آٹھ بجے آیا تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

''یار مراد خان! مبارک ہو، تمہارے نام آخر کار لاٹری نکل آئی ہے۔''

''کیا؟'' مجھے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ ''واقعی انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے؟''

''انہوں نے نہ صرف تمہیں پسند کر لیا ہے بلکہ پندرہ دن کے بعد شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔ اب تم شادی کی تیاری کرو۔''

''کک.....کیا؟'' مجھے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ ''پندرہ دنوں کے بعد شادی اور تم نے مجھ سے پوچھے بغیر ہاں بھی کر دی؟ یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''کیوں نہیں کرتا؟ نیک کام میں دیر کس بات کی؟ اب دیر سویر کرنا بھی کیا ہے اور اگر مجھے دس گھنٹے کا نوٹس ملتا تو میں تیار ہو جاتا۔'' وہ ٹانگیں پسار کر بستر پر دراز ہو گیا۔

''گدھے کے بچے!'' میں نے جھک کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''کیا میری شادی تمہارا باپ کرائے گا؟''

''تیری شادی میرا باپ نہیں لڑکی کا باپ کرائے گا۔'' اس نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''لڑکی کے باپ نے دیئے ہیں۔''

''ڈیڑھ لاکھ روپے؟'' میں بھونچکا سا رہ گیا، لفافہ میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ ''کس لیے؟'' میرے اندر خوشی کی لہر برقی رو کی طرح دوڑتی نس نس میں اترنے لگی۔ میرے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

''اس لیے کہ تم شادی اور ولیمے کے لیے جوڑے بنا سکو۔'' وہ بولا۔

''مگر میرے یار!'' میں نے لفافے میں سے رقم نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس رقم سے میں یہ کام تو کر لوں گا مگر میرے گھر میں پلنگ ہے اور نہ بستر۔ کراکری نہ فرنیچر، اب تو نوکرانیوں کے ہاں فریج اور ٹی وی ہوتا ہے لیکن میرے.....''

''میرے دوست! یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم اس قدر گھبرا کیوں رہے ہو۔'' اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ہونے والی بیوی اپنے جہیز میں اتنا کچھ لا رہی ہے کہ اس سے تمہارے دونوں کمرے اور باورچی خانہ بھر جائے گا۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی کسی بات کی کمی محسوس ہو گی۔ تم ساری زندگی عیش کرو گے۔''

''لڑکی کے بارے میں تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہ کس شکل و صورت اور رنگت کی ہے؟ اس کی عمر کیا ہے؟ جسامت کیسی ہے اور قد کتنا ہے؟ کیا وہ سگھڑ اور سلیقہ مند بھی ہے یا نہیں؟''

''لڑکی چندے آفتاب، چندے ماہتاب تو نہیں ہے لیکن پرکشش ہے۔ ہر رنگ میں ایک حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''اس میں جاذبیت ہے۔ جوانی کے خمار سے لڑکی بہت پیاری لگتی ہے۔ سینا پرونا جانتی ہے۔ وہ نہ صرف تمہیں بلکہ گھر کے سارے کام سنبھال لے گی۔ تمہاری زندگی اور اس گھر کو اس قدر حسین بنا دے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

میں نے دوسرے دن ہی فلیٹ میں رنگ و روغن کرا دیا۔ شادی سے ایک دن پہلے لڑکی کا جہیز آ گیا نہ صرف شاندار قسم کا فرنیچر تھا بلکہ تیس انچ کا دیوار گیر ٹیلی ویژن بھی تھا، ایک ٹرالی میں سی ڈیز جو فلموں کی تھی ریک میں تھی اور اس کے خانے میں ڈی وی ڈی پلیئر بھی تھا۔ فریج، اوون اور باورچی خانے کی ضرورت کا سامان اتنا تھا کہ رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ کراکری جاپانی تھی۔ ڈنر سیٹ انگلستان کا تھا۔ غسل خانے میں شاور نہیں تھا۔ وہ بھی لگ گیا۔ ایک چھوٹا سا باتھ ٹب بھی تھا۔ رشید میں نے اور اس کے دوست نے مل کر حجلہ عروسی سجایا۔ اسے تر و تازہ گلاب کے پھولوں سے مہکا دیا اور رشید نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہاری دلہن ان پھولوں کی خوشبو سے مہک کر تجھے معطر کر دے گی۔''

دوسرے دن میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی ایسی تو میرے دوستوں میں کسی کی نہ ہوئی تھی۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور ان کی بیویوں کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ سب میرے براتی تھے۔ یہ تقریب نخی حسن کے ایک بڑے ہال میں ہوئی تھی۔ عمدہ اقسام کی تین چار ڈشوں کے علاوہ سویٹ میں ربڑی کھیر، گاجر کا حلوا اور کیک بھی تھا۔ آئس کریم، قلفی، کشمیری چائے اور کافی بھی تھی۔ میرے تمام دوستوں کو بڑا رشک آیا تھا۔ مجھے یہ سب کسی خواب کی طرح لگا تھا۔ میرے دوستوں اور دفتر کے ساتھیوں نے جو لفافے دیئے وہ میری جیبوں میں بھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی تحائف تھے۔

رخصتی بارہ بجے کی پابندی کے باوجود ایک بجے ہوئی۔ یہ پرانے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ لڑکی کے والدین کٹر روایتی قسم کے تھے۔ دقیانوسی خیالات رکھتے تھے۔ ویڈیو فلم بنائی گئی اور نہ ہی اسٹیج پر دلہن کی اور عورتوں کی تصویریں کھینچنے کی اجازت دی گئی۔ اس پر ان تمام لڑکیوں عورتوں نے احتجاج کیا تھا جن کے پاس موبائل فون تھے۔ پردے کا اس قدر سخت انتظام تھا کہ بارہ برس سے زائد عمر کے لڑکے کو بھی خواتین کے حصے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ عورتوں میں ویٹرز لڑکیوں مہمان عورتوں کو کھانا کھلانے پر مامور کیا ہوا تھا۔ دلہن برقع میں رخصت کی گئی۔ میں باوجود کوشش کے اس کی ایک جھلک تک دیکھ نہیں پایا تھا۔

رات جب میں دلہن کو لے کر فلیٹ پر پہنچا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرے دوست اور ان کی بیویاں رخصت ہو گئیں۔ پڑوس میں ایک فلیٹ کرائے کے لیے خالی تھا۔ اس کے مالک نے مجھے تین دن کے لیے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے دے دیا تھا۔ رشید اس قدر تھکا ہوا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نہیں گیا بلکہ وہ اس فلیٹ میں سونے چلا گیا تاکہ دلہا دلہن کے لیے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کر سکے۔ اس کی دونوں بیویاں شادی ہال سے ہی رخصت ہو گئی تھیں۔ فلیٹ میں، میں اور میری دلہن عروسہ رہ گئی تھی۔ رشید کو رخصت کر کے میں نے اپنے فلیٹ کا بیرونی دروازہ بند کیا اور حجلہ عروسی کی طرف بڑھا تو میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے دلہن کے والدین پر غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے رخصتی کے وقت بھی مجھے دلہن کے درشن کرنے نہیں دیئے تھے۔ جب کہ آج کل دلہنیں رخصتی کے وقت روتی نہیں تھیں۔ ہنستی مسکراتی اور چہکتی ہوئی جلد رخصتی کے لیے بے قرار ہوتی تھیں۔ وہ شاید والدین سے جدائی کے وقت اس لیے نہیں روتی تھیں کہ ہزاروں کا میک اپ بہہ کر ان کے چہرے کا جغرافیہ نہ بگاڑ دے۔ اب میری راہ میں کوئی رکاوٹ اور دیوار نہیں رہی تھی۔ میرے تصور میں کترینہ کیف جیسا چہرہ اور ایشور یا جیسا بولڈ سراپا لہرا رہا تھا جو حسن و شباب کے کرشمہ سازیوں سے نمایاں تھا۔ مجھے یہ سب کچھ کسی سہانے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ یقین نہیں آیا تھا کہ میں نے اپنی وہ منزل پا لی جس کا خواب نہ جانے کب سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ سارے جسم میں انجانے تصورات خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ قدرت نے ایک ہی دن میں میری کایا پلٹ دی تھی۔ میں اب دنیا کا خوش ترین شخص بن گیا تھا۔ اب نامراد نہیں بامراد ہو گیا تھا۔

میری دلہن بھاری پلنگ کے نرم و گداز بستر پر کسی رنگین گٹھڑی کی طرح سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ میں اس کے سامنے جا بیٹھا تھا تاکہ گھونگھٹ الٹ کر منہ دکھائی میں انگوٹھی دوں اور اس کے کانوں میں اس کے حسن و جمال کی تعریف کا شہد ٹپکاؤں۔ وہ تعریفی کلمات سن کر شرم و حیا سے سرخ ہو کر اور حسین لگے گی۔ میری رگوں میں خون کی گردش لمحہ بہ لمحہ شدید ہوتی جا رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ انجانے خیالات کی لذتیت گدگدانے لگی تھی۔ رشید کی تاکید تھی کہ میں شاعرانہ انداز سے نہ صرف اس کی تعریف کروں بلکہ باتیں اور عہد و پیماں بھی کروں۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ کے کونے پکڑ کر الٹ دیا۔ میں اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اگلے لمحے میرے دل پر چھری سی چل گئی۔

وہ تیس برس کی ایک بدصورت عورت تھی، چھریرے تناسب بدن کی لیکن اس کے باوجود بے کشش تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایک پتھر تڑ سے آبگینہ دل پر آ لگا تو اس کی کرچیاں میرے دل میں چبھنے لگیں۔ میں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر برعکس نکلی تھی۔ وہ کسی ہیروئن کی جوتی کے برابر بھی نہ تھی۔ خوب صورتی تو اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اگر میں شادی سے ایک دن کیا ایک گھنٹا پہلے بھی دیکھ لیتا تو کسی قیمت پر شادی نہ کرتا۔ رشید نے اپنی فیس کے چکر میں مجھے پھنسا دیا تھا اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے۔ وہ اتنا خودغرض اور کمینہ نکلے گا مجھے اس کی توقع نہ تھی۔

میں دوسرے لمحے کسی کمان سے نکلے تیر کی مانند کمرے سے نکلا۔ رشید دوسرے فلیٹ کا دروازہ بھیڑ کر سو رہا تھا۔ میں اس کے کمرے میں گھس گیا کہ اس خبیث کا گلا دبا کر خاتمہ کر دوں کہ اس نے دوستی کا کیا خوب حق ادا کیا تھا کہ مجھے جہنم کی بھٹی میں دھکیل دیا۔ اس بدصورت عورت کے ساتھ زندگی گزارنا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ چارپائی پر گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تھا میں نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کی۔

وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے میری شکل دیکھی۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ حجلہ عروسی کے بجائے یہاں؟“

”خیریت کے بچے۔“ میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کمینے تو نے مجھ سے کس بات کا بدلا لیا ہے۔“

”کون سا بدلا؟ کس بات کا بدلا؟ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تم سے کوئی بدلا لوں۔“ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

”تم نے کہا تھا کہ لڑکی زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے لیکن پرکشش ہے۔ ابے گدھے! وہ خوب صورت نہیں پوری کوی ہے۔ انتہائی بدصورت۔“

”کیا تمہارے خیال میں دلہن کو چودھویں کا چاند جیسا ہونا چاہیے؟“ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔

”ہاں..... کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ وہ ایک دم فرسٹ

کلاس ہے۔ وہ فرسٹ کلاس کیا تھرڈ کلاس بھی نہیں ہے۔ اس سے کہیں بدتر دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی بدصورت عورت ہو گی؟" میں چراغ پا ہو گیا۔

"تم نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "اب کیا تم کسی گینڈے کی طرح نہیں ہو۔ اس پر ستم یہ کہ تم ایک قلاش شخص ہو۔ تمہاری جیب میں رقم ہوتی تو یہ عیب چھپ جاتا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے دن پھیر دیئے۔ کیا تم نے شکرانے کے نفل پڑھے؟ اور پھر میری جان! اس عمر میں عشق اور حسن کی نہیں بلکہ محبت اور رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوشی، حسن و شباب میں نہیں ملتی۔ خوب صورت سے خوب صورت جلد اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ چیز وہ اچھی ہوتی ہے جس کی کارکردگی شاندار اور عمدہ ہو۔ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہارے نام اتنی بڑی لاٹری نکلی۔"

"گدھے کی اولاد! اس لاٹری کی ایسی کی تیسی۔" میں نفرت اور غصے سے دہاڑا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ بڑی چالاکی سے تم نے ایک بدصورت عورت کو میرے سر تھوپ دیا۔ اتنا شاندار قیمتی جہیز اس لیے دیا گیا کہ میرا منہ بند ہو جائے۔ اس سازش میں تم بھی شریک ہو گئے۔ تم سب نے میرے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔ تمہارا مرڈر کروں گا خدا کی قسم۔"

"تم اس لاٹری کو گالی دے رہے ہو جو تمہارا مستقبل بنانے آئی ہے؟" وہ بجائے طیش میں آنے کے سنجیدگی سے بولا۔ "ایک لاٹری وہ ہوتی ہے جو صرف ایک بار نکلتی ہے اور صرف ایک ہی مرتبہ فائدہ دیتی ہے۔ یہ وہ لاٹری ہے جو ساری زندگی تمہارے نام نکلتی رہے گی۔ برسوں زندگی کے اندھیاروں میں اجالے بکھیرتی رہے گی ایک مشعل کی طرح۔"

"بکواس بند کرو۔" میں بری طرح دہاڑا۔ میری نس نس میں لہو ابلنے لگا۔ "تم نے مجھے ایک ایسے جہنم میں جھونک دیا ہے کہ ساری زندگی اس کا عذاب جھیلتا رہوں گا۔ اس زندگی سے مرجانا بہتر ہے۔"

"سنو میرے دوست!" اس نے بڑے پیار سے میرا شانہ تھپتھپایا۔ "جذبات کی رو میں بہہ کر باتیں مت کرو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ حقیقت پسند بن کر دیکھو۔ تمہاری دلہن ایک بینک میں کام کرتی ہے۔ اس کا مشاہیرہ تیس ہزار روپے ماہانہ ہے۔ اس کا ایک فلیٹ کلفٹن میں ہے جس سے اس کا کرایہ پچاس ہزار روپے ماہانہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا بینک بیلنس دو تین لاکھ روپے ہے۔ قومی بچت سے ڈپازٹ سے بیس ہزار کا منافع ملتا ہے۔ وہ یہ رقم تم پر اور گھر پر خرچ کرے گی جس سے تمہاری زندگی پُرسکون اور آرام دہ ہو جائے گی۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی لاٹری ہے جو ہر ماہ ہزاروں روپے کا انعام دیتی ہے؟"

"نہیں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تو پھر تم واپس جا کر اپنی لاٹری کو دیکھ لو جو ڈوبی لاٹری سے بھی بڑی ہے، وہ تمہیں دنیا کی حسین ترین عورت لگے گی۔"

میں واپس حجلۂ عروسی میں آیا تو وہ میرے انتظار میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "آپ میری بدصورتی سے خائف ہو گئے، ہیں نا؟ آپ فکرمند، پریشان اور متنفر نہ ہوں۔ میں آپ کے لیے حسین اور جوان لڑکی تلاش کروں گی آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔ اس شرط پر کہ مجھے اپنی زندگی سے نہیں نکالیں گے۔ بھلے مجھے نہیں چھوئیں، میں یہ اپنی قسمت سمجھ کر شاکر ہو جاؤں گی۔"

یہ الفاظ کہنے کے بجائے وہ میرے منہ پر تھوک دیتی تو شاید خود کو اتنا گھٹیا، ذلیل نہ سمجھتا جو میرے وجود پر کوڑے بن کر لگے تھے۔ وہ اتنی اونچی ہو جائے گی کہ میں اسے چھو نہ سکوں گا۔ میں نے اس وقت خود کو بہت بدصورت محسوس کیا۔ وہ دنیا کی سب سے حسین عورت لگ رہی تھی۔ میں نے جیب سے منہ دکھائی کی انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنائی اور اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

☆......☆

ہماری شادی کو چار برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس گھر میں دو پیارے پیارے خوب صورت پھول مہک رہے ہیں۔ ہر لحاظ سے عروسہ میرے لیے بہترین اور مثالی رفیقہ ثابت ہوئی۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی اپنی کمائی کا رعب مجھ پر نہ ڈالا بلکہ اپنی پوری تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے۔ میری ہر طرح سے خدمت کرتی اور خیال رکھتی ہے۔ بڑی سگھڑ، سلیقہ شعار، بااخلاق اور نیک سیرت اور ٹوٹ کر چاہنے والی بیوی ہے۔ کھانے مزے اور ذائقہ دار پکاتی ہے کہ میں اپنی انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہوں۔ ہماری زندگی بہت حسین اور خوشگوار ہے۔ اس کا حسن روز بہ روز نکھرتا جا رہا ہے۔ سچ پوچھو تو وہ ظاہری حسن رکھنے والی عورتوں سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش دکھائی دیتی ہے۔ میں انتہائی خوش قسمت شخص ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ہر کنوارے کے نام ایسی ہی لاٹری نکلے۔

++

انتخاب

مکرم و محترم مدیر
سلامِ شوق!
تازہ سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ یہ سلیم کی روداد ہے لیکن ہر ایک کے لیے سبق ہے۔ کس آسانی سے لوگ غلط راہوں پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر اس کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلتا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔ بزرگوں کے مشوروں کو یک قلم موقوف رد کردینے کے بعد کیا ہوتا، یہی کچھ میں نے بیان کیا ہے۔

ساگر تلوکر
(پپلاں۔ میانوالی)

میرے گھر سے میرا اسکول 18 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک سرکاری اسکول تھا۔ مجھے پڑھائی سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ بس ابا کی ضد کی وجہ سے صبح سویرے گھر سے نکل آتا تھا۔

اسکول آنے کے لیے پرائیویٹ بسوں میں لٹک کر آنا پڑتا تھا۔ اس طرح لٹک کر آنے جانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ میں اکثر اسکول جانے کی بجائے لاری اڈے پر ہی وقت گزارنے کو ترجیح دیتا۔ لاری اڈے کی اپنی

ہی ایک دنیا ہے۔ چائے خانے، ہوٹل، دکانیں، چلتی پھرتی رنگین پریاں، آتے جاتے مسافر۔ اسکول میں کیا تھا؟

کہنے کو تو اسکول میں جا بہ جا ''مار نہیں پیار'' کے بورڈ آویزاں تھے مگر سارے استاد وہاں پرانے زمانے کے تھے جو ''ڈنڈا پیر ہے وگڑیاں تگڑیاں دا'' پر کامل یقین رکھتے اور عمل کرتے تھے۔

میرے ابا کی خواہش تھی کہ میں میٹرک کر کے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح فوج میں چلا جاؤں۔

میں نے اپنے بھائیوں اور گاؤں کے دیگر فوجیوں سے سخت ٹریننگ اور شالی ڈسپلن کے قصے سن رکھے تھے۔ میں آزاد پنچھی تھا اور آزاد فضا میں ہی سانس لینا چاہتا تھا۔ فوج کی سخت زندگی کا تو سوچ کے ہی میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس لیے میرا فوج میں جانے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھ سے میٹرک ہو رہی تھی۔ میٹرک کا امتحان تیسری بار دیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے آٹھویں میں بھی دو سال لگائے تھے۔ اس بار بھی مجھے کافی اُمید تھی کہ رزلٹ پہلے جیسا ہی آئے گا۔ میری توقع پوری ہوئی اور رزلٹ پہلے جیسا ہی آگیا۔ اسکول سے میری جان چھوٹ گئی۔ ابا نے حسب معمول خوب چھترول کی اور حکم صادر فرمایا کہ اب تو نمبردار کے کھیتوں پر کام کرے گا مگر میں نے کسی نہ کسی طرح ابا کو راضی کر لیا کہ میں مکینک بنوں گا اور یوں میں اپنی من پسند جگہ پر آگیا۔

☆.....☆

لاری اڈے کی دنیا میرے لیے نئی نہیں تھی۔ مجھے سب پتا تھا کہ یہاں کیا کیا ہوتا ہے اور کون کیا کیا کرتا ہے۔

میں استاد بشیر سانول کی ورکشاپ پر آگیا۔ استاد سے پہلے ہی میری جان پہچان تھی اور استاد کے دو خاص شاگرد میرے یار تھے۔ کہنے کو تو یہ گاڑیوں کی ورکشاپ تھی مگر یہاں سب دھندا ہوتا تھا۔ چرس، شراب در پردہ بکتی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے اسکول کے زمانے میں بھی میں بازار میں سپلائی پہنچاتا رہتا تھا اور اپنے حصے کے دام کھرے کرتا تھا۔ ورکشاپ کے پچھلے حصے میں ''رنگین پریوں'' کے لیے بھی جگہ مختص تھی۔ استاد کاؤنٹر پر بیٹھا حکم چلاتا رہتا تھا۔

استاد، علاقہ ناظم کا خاص آدمی تھا اس لیے پولیس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ اکثر گاڑیاں یہاں ہمارے مطلب کی آتی تھیں۔ ان کو ٹھیک کرنے کے بہانے ان سے مخصوص پرزے نکال کر سستے پرزے لوڈ کر دیتے تھے۔

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا اور دو مہینے گزر گئے۔ میں نے استاد سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور گھر کے لیے نکل گیا۔

☆.....☆

گھر آیا تو اماں ابا خوش تھے۔ عیاشیوں سے کئی ہزار روپے بچا کر لایا تھا۔ وہ اماں کو دے دیے تھے۔ جب ابا کو پتا چلا تو ابا نے مجھے بلا کر کہا۔ ''پتر سلیم سچ سچ بتا تو وہاں کیا کرتا ہے۔ تو نے دو ماہ میں اتنے پیسے کیسے کما لیے؟''

''ابا محنت کرتا ہوں تبھی تو اتنے پیسے ملتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ گھر زیادہ پیسے دے بیٹھا تھا۔

''پتر محنت کی کمائی زیادہ نہیں ہوتی اس میں برکت زیادہ ہوتی ہے۔ اتنی تیرے بھائیوں کی تنخواہ نہیں ہے جتنے پیسے تو لایا ہے۔'' ابا فکرمندی سے بولے۔

''اسی لیے تو ابا میں فوج میں نہیں گیا۔ میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتا ہوں۔ میں امیر بننا چاہتا ہوں۔'' میں نے آرام سے جواب دیا۔

''انسانوں کی طرح کما اور کھا، جانوروں کی طرح رزق کے پیچھے نہ لگ۔ غلط رستوں کا انتخاب کر کے انسان کبھی کامیابی کی سیڑھی نہیں چڑھ سکتا۔ تیرا باپ ہوں تجھے اور تیری عادتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔'' ابا کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

اتنے میں اماں آگئی۔ اماں نے آتے ہی کہا۔ ''کیوں ہر وقت میرے سوہنے بیٹے کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔''

''اس کے کرتوتوں کی وجہ سے۔'' ابا نے ترنت جواب دیا۔

اب ابا اور اماں میں تو تو میں میں ہونے لگی تو میں وہاں سے کھسک گیا۔ بعد میں اماں نے مجھے سمجھانا چاہا تو میں نے اماں کو اپنی باتوں سے قائل کر لیا کہ ابا کا خیال غلط ہے، محنت کرتا ہوں کسی برے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔

☆.....☆

استاد بشیر سانول کے ساتھ کام کرتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اب اکثر دوسرے شہروں سے مال لانے اور پہنچانے کے لیے وہ مجھے بھیجنے لگا تھا۔ جب بھی استاد مجھے حکم دیتا کہ لاہور سے مال لانا ہے تو میرا انگ انگ خوشی سے جھوم اٹھتا تھا۔ لاہور میں استاد کے مخصوص لوگوں سے تعلقات تھے۔ وہاں ٹور پر دو سے تین دن ہر بار لگ جاتے تھے۔ وہاں دن کے نظاروں اور راتوں کے جاگنے کا نشہ واپس آ کر بڑی مشکل سے اترتا تھا۔

اس دن میں انہماک سے ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ پپو نے آ کر اطلاع دی۔ ''استاد بلا رہا ہے۔''

میں استاد کے پاس گیا تو وہ گہری سوچوں میں غرق تھا۔ ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ ''لاہور جائے گا؟'' استاد نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا کیوں نہیں۔ حالانکہ پہلے استاد اس طرح کبھی نہیں پوچھتا تھا۔

استاد نے میری طرف دیکھ کر مخصوص انداز میں کہا۔

''بیٹا! عیش کر، زندگی عیش کے لیے ہی تو ہے۔ واپسی پر کامیاب ٹور پر تجھے خاص انعام ملے گا۔''

''استاد جی میرا ٹور ہمیشہ کامیاب ہی ہوتا ہے۔'' میں نے سینہ پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اسی لیے تو تیرا انتخاب کیا ہے۔ تو ہی تو میری کامیابیوں کا راز ہے۔'' استاد کی تعریف سے مجھے خوشی ہوئی۔

''آج رات نکل جانا، جونئی لال کارور کشاپ میں پیچھے کھڑی ہے وہ لے جانا اور واپسی پر مال کے ساتھ تمہیں نئی گاڑی ملے گی۔ اسے وہیں چھوڑ دینا۔'' استاد نے ہدایت کی۔

لال گاڑی، لاہور اور وہاں کی لال پریاں۔ میری سوچیں ابھی سے بے لگام ہونے لگی تھیں۔

میں واپس اپنی جگہ آ کر وقت گزاری کے لیے پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔ وہاں تمام نیوز چینلز پر ایک ہی خبر کا چرچا تھا۔ جنوبی صوبے کی ایک بڑی شخصیت کے بیٹے کو اغواء کر لیا گیا تھا۔ دو ہفتے ہو گئے تھے مگر خبروں میں گرمی ہنوز عروج پر تھی۔ میں نے بیزار ہو کے ٹی وی بند کر دیا اور

لاہور یاترا کے متعلق سوچنے لگا۔

☆.....☆

میں اپنے مخصوص وقت پر رات کے وقت نکلا۔ نئی گاڑی، شراب اور بارش نے سفر کا مزہ دوبالا کر دیا۔ میں فل اسپیڈ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا تاکہ جلد سے جلد لاہور پہنچ جاؤں۔ ابھی سرگودھا سے آگے نکلا ہی تھا کہ مجھے رکنا پڑا۔ پولیس نے ناکہ لگایا ہوا تھا۔

میری گاڑی کے آگے کافی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ پولیس کی اس پھڈے بازی پر دل ہی دل میں انہیں خوب گالیوں سے نوازا۔

گاڑی کے کاغذات میرے پاس تھے۔ مجھے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ مسئلہ کھڑا ہو جائے تو پولیس کو ڈالنے کے لیے میرے پاس تگڑی رقم موجود تھی۔ خدا خدا کر کے میری گاڑی کا نمبر آیا۔

ایک سپاہی نے کھڑکی پر جھک کر کاغذ مانگے تو میں نے کاغذ دیتے ہوئے اسے مخصوص اشارہ کیا مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اتنے میں تین سپاہی اور ایک افسر بھی میری گاڑی کے قریب آ گیا۔

''کاغذ تو مکمل ہیں سر۔'' سپاہی نے افسر کو بتایا۔

میں نے باہر غور سے دیکھا تو وہاں رینجرز بھی نظر آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی سنگین معاملہ ہے۔

''ڈکی چیک کریں۔'' افسر نے سپاہی کو مخاطب کیا۔

''سر جی! ٹائم شارٹ ہے دور جانا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔ چائے پانی لے لیں۔'' میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''چائے پانی کا پتر، جلدی ڈکی کھول اور ساری گاڑی چیک کروا ہمارا ٹائم ویسٹ نہ کر۔'' افسر نے درشت انداز میں جواب دیا۔

''او کے نکال لیں گاڑی سے قارون کا خزانہ۔'' میں نے ڈکی کی چابی پولیس والے کی طرف بڑھاتے ہوئے جلے ہوئے انداز میں کہا۔

پولیس والے ڈکی کی طرف بڑھے۔ میں بیک ویو مرر میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کے ڈکی کھولی۔ ڈکی کا ڈھکن کھلنے سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن افسر سائیڈ مرر میں نظر آ رہا تھا۔ ڈکی کھلتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ بیزار سے چہرے پر حیرت کے ساتھ سنسنی نظر آ رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا۔

وہ مجھے دیکھ کے چونکا۔

''قارون کا خزانہ نہیں ملا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ مجھے سپاٹ سے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ میرے طنز پر دوسرے پولیس والے نے معنی خیز انداز میں اپنے افسر کی طرف دیکھا۔

میں ان کی طرف بڑھا۔ ''چابی تو دے دیں اب۔'' میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے ڈکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''اسپیئر ہو گی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ڈکی میں جھانکا تو ہکا بکا رہ گیا۔ ڈکی میں انسانی وجود ساکت حالت میں موجود تھا۔

اسے ڈکی سے باہر نکالا گیا تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ پولیس نے لاتوں اور مکوں کی برسات شروع کر دی۔ ہوش آیا تو تھانے میں تھا۔ پولیس والوں کے انکشاف سے مجھے حالات کی سنگینی کا علم ہوا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ لاش بڑی شخصیت کے بیٹے کی تھی۔ میں نے ساری روداد اور ورکشاپ استاد اور دونوں شاگردِ خاص کے ایڈریس پولیس کو بتا دیے۔

دوپہر کو کمرے کا لاک اپ کھلا تو پولیس میرے والدین کو پکڑ کر لے آئی تھی کیونکہ باقی ساری ٹیم وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔ جیسے ہی ابا کے چہرے پر نظر پڑی تو مجھے ان کے وہ الفاظ یاد آئے۔

''غلط راستوں کا انتخاب کر کے انسان کبھی کامیابی کی سیڑھی نہیں چڑھ سکتا۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکلے اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

بہت بعد میں جب سزا آدھی رہ گئی تھی تو پتا چلا کہ استاد کو مجھ سے خطرہ ہو گیا تھا کہ میں اب جلد اسے ہٹا کر اس کی جگہ لے لوں گا اسی لیے اس نے یہ کھیل کھیلا۔ تاوان کی رقم نہ ملنے کی وجہ سے اس نوجوان کو قتل کر دیا اور قتل کے الزام میں مجھے پھنسا کر اپنی راہ صاف کر لی۔ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی ایک طویل سزا کا حقدار بن گیا۔ بُرے کام کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

میرا نام سلیم احمد ہے۔ پیشے کے اعتبار سے میں ڈسپنسر ہوں۔ میں نے شہر کے ایک معروف اسپتال میں بیس برس نوکری کی جہاں میرا کام ٹیکے اور ڈرپ لگانا، دوائیاں وغیرہ دینا اور باقی دوسرے کام تھے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

''تمہارے ہاتھ میں جو صفائی ہے۔ وہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔'' وہ دو دن کے بچے کو ڈرپ لگاتے دیکھ کر مجھے تعریفی الفاظ میں کہتے۔

واقعی مجھ پر اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہے کہ میں ایمرجنسی قسم کی سچویشن کو بھی ہینڈل کر لیتا ہوں۔

ہم سفری

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
کافی عرصہ بعد ایک سچ بیانی ارسال کر رہی ہوں۔ یہ سچ بیانی نصیر صاحب اور ان کی بیگم کی ہے۔ مجھے سبق آموز لگی اس لیے سرگزشت میں ہی یہ شائع ہو تو اپنی قدر پائے گی۔ سرگزشت کے قارئین زیادہ میچور ہیں، وہ اس سچ بیانی میں مخفی سبق کو بہ آسانی سمجھ لیں گے۔

شہناز احمد
(لاہور)

بہر حال ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اپنا کام پرائیویٹ طور پر جاری رکھا اور اب میں لوگوں کے گھروں پر جا کر ان کی مدد کرتا ہوں۔

ایک دن کسی صاحب نے فون کر کے کہا کہ وہ مجھ سے باقاعدگی سے ٹیکے لگوانا چاہتے ہیں۔ اپنا نام انہوں نے نصیر احمد بتایا۔ ویسے سب ان کو میاں صاحب کہتے تھے۔ گھر کا پتا بتایا تو وہ میرے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔

میں نے نصیر صاحب کو باقاعدگی سے ٹیکے لگانا شروع کر دیئے۔ وہ مجھے میری توقع سے زیادہ اجرت دیتے اور بے انتہا محبت سے ملتے۔

میاں نصیر صاحب کا گھر شہر کے ایک پوش ایریا میں تھا۔ چار کنال پر بنی ہوئی کوٹھی کافی خوب صورت بھی تھی۔ نچلی منزل پر نصیر صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ مقیم تھے اور اوپر کی منزل پر ان کے بیٹے عامر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

نصیر صاحب ساٹھ سال کے لگ بھگ تھے۔ خوش شکل، قد کاٹھ کے بھی ٹھیک تھے۔ جوانی میں لگتا ہے کہ اسمارٹ ہوں گے۔ اب شوگر کی بیماری نے کمزور کر دیا تھا۔ ان کی بیگم مجھے کافی کم عمر لگتی تھیں۔ ان کا نام سلمٰی تھا۔

ان لوگوں سے میل جول ہونے کے بعد میں ان کو سلمٰی باجی کہنے لگا تھا۔ وہ اردو اسپیکنگ تھیں۔ خاموش طبع، کام سے کام رکھنے والی۔ ان کی زندگی کا محور صرف نصیر صاحب کی تیمارداری اور دلجوئی تھا۔ کھانا بہترین بناتی تھیں۔ بہت نفیس خاتون تھیں۔

مجھے جانے کے ساتھ کچھ نہ کچھ پینے کو دے دیتیں، کئی بار میں نے منع بھی کیا۔ تو مسکرا کر بولیں۔ ''بھائی آپ میاں صاحب کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ تو کیا میں آپ کو چائے بھی نہ بنا کر دوں؟''

☆.....☆

''سلیم میاں! آپ اچھے آدمی ہیں، مجھے ٹیکا اتنے آرام سے لگاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔'' وہ کہتے۔

وہ مجھ سے میری زندگی کے بارے میں بھی پوچھتے رہتے لیکن اپنے متعلق کچھ نہ بتاتے۔''

ایک دن میں ان کا بلڈ پریشر لے رہا تھا۔

''سلیم میاں! آپ کو پتا ہے کہ سلمٰی بیگم میری دوسری بیوی ہیں؟'' میں نے اچانک اوپر دیکھا۔ وہ سوچ میں گم تھے۔ ''میری پہلی بیوی انجم آراء میری محبت تھیں۔ وہ میری خالہ زاد تھیں اور ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے ہمارا آپس میں میل جول بھی کافی رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ان سے شادی کا فیصلہ نہ صرف میرا تھا بلکہ باقی گھر والوں کی بھی خواہشیں اس میں شامل تھیں۔

وہ بہت خوب صورت تھی۔ بالکل میری آرزوؤں کے مطابق۔ میری خواہشات کے مطابق۔ اپنی زندگی کو اس طرح ڈھال دیا کہ وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں چار بچے عطا کیے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔

لڑکیاں شادی کے بعد امریکا میں سیٹل ہیں۔ ایک لڑکا جرمنی ایسا گیا کہ پھر پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ عامر کو تو آپ جانتے ہو، یہیں رہتا ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔

ہمارے درمیان بالکل سکوت تھا۔

سلمٰی باجی شاید دوسرے کمرے میں کچھ مصروف تھیں۔

''پھر ایسا ہوا۔'' وہ اچانک بولے۔ ''کہ میرے ہرے بھرے باغ کو جیسے آگ لگ گئی ہو۔''

''انجم آراء کو کھانسی کا دورہ شروع ہوا۔ پھر پھیپھڑوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ کینسر ہے اور وہ پھیپھڑوں سے دوسرے حصوں میں پھیل چکا ہے۔'' انہوں نے ایک افسردہ سی آہ بھری۔ ''بہت علاج کرایا۔ کیموتھراپی سے ان کے بال جھڑ گئے۔ جسم بالکل کمزور ہو گیا۔ بس ہڈیوں کا ایک پنجر سا تھا جو میری آنکھوں کے سامنے دن بدن گھل رہا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن وہ ہم سب کو روتا چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئیں۔'' نصیر صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میرا دل بھی بہت اداس ہو گیا۔

''ان کے جانے کے بعد مجھے لگا کہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ بچیاں واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ عامر کے دو بچے ہو چکے تھے۔ وہ میرے ساتھ پہلے بھی نہیں رہتا تھا۔ بس مہربانی یہ ہوئی کہ اوپر والے پورشن میں آ کر رہنے لگا۔ دفتر آتے جاتے وہ مجھے سلام کر دیتا تھا۔ بیوی اس کی بس ٹھیک ہی ہے۔ زیادہ فرینڈلی نہیں ہے۔ اس کی اپنی پسند کی شادی تھی۔''

میں اپنے اتنے بڑے پورشن میں اتنا تنہا ہو گیا کہ کئی مرتبہ جی چاہا کہ اپنی جان لے لوں۔ نہ کہیں جاتا تھا نہ کسی کو ملتا تھا۔ ریٹائرمنٹ ہو چکی تھی۔ دوست احباب چھوٹ سے گئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انجم آراء کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے کسی اور کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اب

جب اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا تو سوائے اپنے خانساماں حمید کے علاوہ کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جس سے کوئی بات کر سکوں۔ میں نے ٹی وی پر مذہبی پروگرام دیکھنے شروع کر دیئے۔ نماز باقاعدگی سے شروع کر دی اور پھر سوچا کہ کیوں نہ مسجد میں جا کر نمازیں پڑھنا شروع کر دوں۔ دل بھی بہل جائے گا اور جو جوانی میں کوتاہیاں سرزد ہوتی رہی تھیں عبادت کے معاملے میں ان کی بھی تلافی ہو جائے گی۔

میں نے اپنے گھر کے نزدیک مسجد میں جانا شروع کر دیا۔ وہاں کے خطیب مجھ سے تھوڑا سا ہی چھوٹے ہوں گے۔ میں ان کے خطبات کو بہت انجوائے کرنے لگا۔ ان کی باتوں میں بہت نفاست تھی۔ شستگی تھی۔ دین پر عبور بھی ماشاء اللہ کمال کا تھا۔ میں زیادہ وقت وہیں گزارنے لگا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ایک نماز کے بعد میں دوسری نماز کے انتظار میں مسجد میں ہی ایک کونے میں قرآن پاک کی تلاوت کرتا رہتا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اسی طرح ظہر کے بعد عصر کا انتظار کر رہا تھا۔ قرآن پاک میرے ہاتھ میں تھا کہ مولوی صاحب میری طرف چلے آئے۔ مجھ سے اجازت لے کر وہیں بیٹھ گئے۔ عام بات چیت چلنے لگی۔ میں نے قرآن پاک کو وہیں رکھی چھوٹی سی ریک پر رکھ دیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔

''میاں صاحب! میں نے کچھ دنوں سے نوٹ کیا ہے کہ آپ ماشاء اللہ نہ صرف مسجد میں تمام نمازیں باجماعت پڑھنے لگے ہیں بلکہ یہاں قیام فرما بھی ہو جاتے ہیں نمازوں کے درمیان۔'' دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولے۔

''جی ہاں الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہو گیا ہے۔ جوانی میں تو اللہ معاف فرمائے نمازوں کا ہوش نہ تھا۔ اب جب چل چلاؤ کا ٹائم آ گیا ہے تو مسجد کی یاد آ گئی۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ''اور جہاں تک یہاں زیادہ دیر قیام کا تعلق ہے تو صاف بتاؤں کہ گھر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ کوئی بات کرنے والا نہیں۔'' میں نے افسردگی سے جملہ مکمل کیا۔

مولوی صاحب میرے حالات سے باخبر تھے کہ میری بیگم کا انتقال ہو چکا ہے اور اب میں تنہا رہتا ہوں۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ سر جھکا لیا۔ سر اٹھایا تو ایسا لگا کہ کچھ تذبذب میں ہیں۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں میاں صاحب۔'' وہ رک کے۔ ''مجھے ڈر ہے کہ آپ برا نہ مان جائیں۔''

''ارے مولانا! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بات کا کیوں برا مانوں گا؟''

''میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ احترام کرتا ہوں۔ آپ بلا جھجک فرما دیجیے۔ میں بالکل برا نہ مانوں گا۔'' میں نے عقیدت سے ان کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

''آپ دوسری شادی کر لیجیے۔'' وہ اچانک بولے۔

میں تھرا سا گیا۔ ہاتھ چھوڑ دیا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔

وہ اب اعتماد کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

''جی ہاں! آپ نے درست سنا ہے۔ میں آپ کو دوسری شادی کی رائے دے رہا ہوں۔''

''لیکن آپ نے میری عمر دیکھی ہے پچپن کے پیٹھے میں ہوں۔''

''پھر کیا ہوا۔ ماشاء اللہ خوش شکل ہیں تندرست ہیں اور پھر صاحب حیثیت بھی ہیں۔'' وہ ذرا جوش سے بولے۔

''لوگ کیا کہیں گے؟''

''کون سے لوگ؟ جو آپ کو کبھی ملنے نہیں آتے؟ تنہائی آپ کو مار ڈالے گی اور اس موت کے سبب آپ خود ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اور پھر نبیؐ نے آپ کو دوسرے نکاح کی اجازت دے رکھی ہے۔ تو لوگ کون ہوتے ہیں جو آپ کی اس بات پر اعتراض کریں؟''

اب وہ ذرا زور سے، اعتماد سے کہہ رہے تھے۔

''مگر میرے بچے نہیں مانیں گے۔'' بچیوں اور عامر کو ذہن میں لا کر میں نے جھرجھری سے لی۔

''مان جائیں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ آپ نے اپنی زندگی کو دوبارہ ڈھنگ سے گزارنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''پتا نہیں مولانا! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' میں نے ذرا خاموشی سے کہا۔

''میں آپ کو بالکل مجبور نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات آپ کے لیے بہت ہی ذاتی ہے اور میں اس میں بالکل بھی آپ پر کوئی دباؤ یا زور نہیں ڈالوں گا۔''

وہ ذرا خاموش ہو گئے۔ ہمارے درمیان ایک عجیب قسم کی ساکت خاموشی طاری ہو گئی۔

اذان کا وقت آ رہا تھا۔ وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔

☆.....☆

اس واقعے کے بعد میں نے بھی ذرا سنجیدگی سے اپنے

حالات کے متعلق جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دل و دماغ میں وسوسے اٹھتے تھے۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔

لیکن ایک ہفتے کے دوران ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ مجھے حالات سے ڈر لگنے لگا۔ ہوا یوں کہ عامر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے سسرال اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ خانساماں حمید اپنے کوارٹر میں جا کر سو گیا تھا۔ مجھے بائیں بازو میں درد سا محسوس ہوا۔

دل میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ ماتھے پر پسینا، اوہ میرے خدا۔ یہ کہیں دل کا دورہ تو نہیں ہو رہا۔

میں گھبرا سا گیا۔ ایک زمانے میں مجھے ایک ڈاکٹر دوست نے کچھ گولیاں دی تھیں۔ ''اگر دل کی حالت خراب ہونے کا ڈر ہو تو گولی زبان کے نیچے رکھ لینا۔'' اس نے کہا تھا۔ جلدی جلدی درازوں میں گولی ڈھونڈی۔ شکر ہے مل گئی۔ زبان کے نیچے رکھی تو کچھ افاقہ ہو گیا۔

اس کے بعد بہت پریشانی ہونے لگی اگر واقعی دل کا دورہ پڑ گیا ہوتا اور گولی بھی نہ ہوتی تو شاید جان سے جانے کا خطرہ ہو جاتا۔ تنہائی کی موت۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ ''الٰہی مجھے راستہ دکھا دیں۔'' میں بار بار رو رو کر دعا کر رہا تھا۔ دل کچھ بڑے فیصلے کرنے کے حق میں جانے کا اشارہ دے رہا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن ہی میں مسجد میں کھڑا تھا۔ مولوی صاحب سے خصوصاً ملاقات کی اجازت مانگی۔

نمازی نماز سے فارغ ہو کر جا چکے تھے۔ مولوی صاحب میرے پاس مسجد کے ایک کونے میں آ گئے۔

''جی جناب! کیسے ہیں آپ میاں صاحب۔'' وہ دوستانہ انداز میں مسکرا کر بولے۔

''آپ نے پچھلے ہفتے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میں نے اس بات پر کافی سوچ بچار کی ہے اور سوچتا ہوں کہ آپ کی بات مان لوں۔'' میں نے لجاجت سے نظر جھکا کر کہا۔

''ماشاء اللہ!'' وہ ذرا جوش سے میرا ہاتھ دبا کر بولے۔

''میری نظر میں ایک خاتون ہیں جو آپ کے لیے بہت موزوں ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کے دوست کراچی سے لاہور اپنی بہن کے ساتھ کچھ مہینوں پہلے آئے تھے۔ بہن کی شادی نہ ہو سکی تھی، کچھ حالات کچھ نصیب کے چکر۔ بچی کی عمر بھی اچھے رشتے کے انتظار میں نکل گئی۔ وہ بی اے پاس ہے۔ انتہائی نفیس، شریف، سلجھی ہوئی اردو اسپیکنگ بچی۔ نام سلمیٰ بیگم ہے۔ عمر چھتیس سال کے قریب ہو گی۔'' وہ ذرا رکے۔ ''مجھے یہ ساری باتیں میرے دوست نے بتائی تھیں وہ یہاں آ کر بے حد بیمار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ جوان بہن کا کیا بنے گا۔ یہ فکر اس کو بیماری سے بھی زیادہ بری طرح کھا رہی ہے۔ مجھے اچھا رشتہ دیکھنے کی درخواست کی تو یقین مانیے کہ مجھے سب سے زیادہ موزوں رشتہ آپ کا لگا۔ آپ اچھے مسلمان ہیں۔ شریف النفس ہیں اور میں آپ کو بہت بھلا انسان پاتا ہوں۔'' وہ خوشی سے بولے۔

''لیکن مولانا! ہم دونوں کی عمروں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ یہ تو بچی کے لیے ظلم کے برابر ہے۔'' میں نے ذرا گھبرا کر کہا۔

''نہیں میاں صاحب! کوئی ظلم نہیں۔ اس بچی کے لیے ابھی تک کوئی مناسب جوڑ نہیں ملا۔ کوئی بڑا جہیز مانگتا ہے۔ کوئی اس کی عمر پر اعتراض کرتا ہے۔ آپ کو پتا ہے یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ آدمی کی عمر، شخصیت، تعلیم اتنے اہم نہیں۔ لڑکی کی ہر بات ہی اس کے لیے قابل اعتراض ہو جاتی ہے۔''

''بس میاں صاحب! آپ صرف آمادگی ظاہر کر دیں۔ میں اپنے دوست سے آپ کی ملاقات کرا دوں گا۔ وہیں آپ سلمیٰ بی بی سے بھی ضرور ملاقات کر لیں۔ یقین کریں آپ کو ان سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔''

☆.....☆

قصہ مختصر میں نے سلمیٰ بیگم سے ملاقات کی وہ مجھے اچھی لگیں۔ بہت پروقار، بااعتماد اور نفیس تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ ان کے بھائی صاحب سے رشتہ مانگ لیا اور پھر ہمارا نکاح سادگی سے ہو گیا۔

میں نے بچیوں سے امریکا بات کی۔ ان کو قدرتاً اعتراض تو تھا لیکن وہ جانتی تھیں کہ میں یہاں بہت اکیلا تھا اور یہ شادی میرے لیے ایک ضرورت تھی۔

عامر کو البتہ بہت غصہ آیا۔ اس کو ڈر تھا کہ اس کے سسرالی رشتے دار اور دوست احباب باتیں بنائیں گے۔

''میں اور صائمہ یہیں تو ہیں آپ کے پاس۔'' اس

نے کمزور دلیل دی لیکن خوب جانتا تھا کہ وہ میری زندگی میں کم سے کم شامل تھا۔"

میاں صاحب کی گفتگو بہت لمبی ہو گئی تھی۔ میں بھی جیسے دم سادھے سن رہا تھا۔

"ویسے سلیم میاں! اللہ تعالیٰ بے انتہا رحیم اور علیم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لیے سہاروں کی ضرورت ہے۔ ان کی حکمت ہے کہ مسلمان کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ اس میں عورتیں، مرد دونوں ہی شامل ہیں۔ پاکیزہ رشتے کو حلال کر دیا اور اپنی رضا بھی شامل کر دی۔ حرام کاری سے بچنے کا بہترین طریقہ ہے یہ۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ان کے اس تحفے کو قبول کرتے ہیں یا بے کار کے لوگوں کے ڈر سے تمام عمر تنہا زندگی گزارتے ہیں۔" میاں صاحب بہت طمانیت سے بولے۔

شام کافی ہو چکی تھی۔ میں اجازت لے کر گھر آ گیا۔

☆......☆

اس واقعے کو ایک مہینا ہی گزرا تھا کہ ایک رات ذرا دیر سے مجھے فون آیا۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ نظر ڈالی تو میاں صاحب کی بیگم سلمیٰ صاحبہ کا فون تھا۔ گھبرا کر اٹھا۔ وہ بہت کم مجھے اپنے فون سے فون کرتی تھیں۔

"سلیم بھائی! معاف کیجیے۔ میں آپ کو اس وقت فون کر رہی ہوں۔" وہ بہت گھبراہٹ سے بول رہی تھیں۔

"نہیں......نہیں باجی کوئی بات نہیں۔ بتایئے کیا ہوا؟"

"وہ میاں صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔" وہ بہت پریشانی میں کہہ رہی تھیں۔

"آپ فوراً آ سکتے ہیں؟"

"جی باجی! میں ابھی پہنچتا ہوں فکر نہ کریں۔" میں نے جلدی جلدی فون بند کیا۔ کپڑے بدلے اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہ دروازے پر ہی مل گئیں رنگ اڑا ہوا، سخت پریشان۔

"کیا ہو گیا؟" میں ادھر لپکا جہاں میاں صاحب لیٹے ہوئے تھے۔

"پتا نہیں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے۔ میں سوپ پلا رہی تھی تو وہ بھی پوری طرح سے منہ کے اندر نہیں گیا۔ بات بھی صاف نہیں کر رہے۔" وہ بتا رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی نبض چیک کی۔ آلہ لگا کر دل کی دھڑکن کا معائنہ کیا جو کافی تیز تھی۔ شوگر ٹیسٹ کی تو وہ Low سائیڈ پر تھی۔ ہاتھ پکڑا تو جیسے بے جان سا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ ان پر ہلکا سا فالج کا اٹیک ہوا ہے جس سے ان کے جسم کا بایاں حصہ اثر انداز ہوا ہے۔

"ان کو فوراً اسپتال لے کر جانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"عامر صاحب کو بتایا؟"

"وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں، مری گئے ہوئے ہیں اس لیے آپ کو تکلیف دی۔" وہ انگلیوں کو مروڑ رہی تھیں۔ بہت اضطرابی حالت میں تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔ میں 1122 کو فون کرتا ہوں آپ جلدی سے ان کے ایک دو جوڑے بیگ میں ڈال لیں اور خود بھی تیار ہو جائیں۔ ہم ابھی ان کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ ذرا معائنہ ہو جائے گا۔" میں نے ان سے کہا اور اس دوران میں میاں صاحب سے باتیں کرنے لگا کہ بے ہوش نہ ہو جائیں۔

☆......☆

یہ اللہ تعالیٰ کا بہت کرم تھا کہ ان کو بروقت اسپتال پہنچانے سے وہ جلد ہی بہتر ہونے لگے۔ گھر بھی چار دنوں میں واپس آ گئے۔ زبان ابھی بھی لڑکھڑاتی تھی لیکن بازو پر مالش نے واقعی اثر دکھایا۔

باجی سلمیٰ بیگم کمال کی خاتون تھیں۔ وہ اتنی سگھڑی سے ان کا خیال رکھ رہی تھیں کہ میاں صاحب کی قسمت پر رشک آتا تھا۔

ایک دن وہ انہیں نیند کی گولی دے کر کونے میں بچھے صوفے پر آ کر بیٹھیں تو میں بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگے۔

"باجی! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"اس ماہ کی بیس تاریخ کو چھ سال ہو جائیں گے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے ذرا رکتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھیے میں آپ کو اپنے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں۔"

"آپ نے اپنی زندگی کے چھ سال میاں صاحب کے ساتھ گزارے ہیں۔ وہ ماشاءاللہ بہت اچھے انسان ہیں لیکن آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اللہ نہ کرے ان کو کچھ ہو

گیا تو آپ..... امیر امطلب ہے کوئی گھر، کوئی جایداد آپ نے اپنے نام کروائی؟'' میں نے بہت رکتے رکتے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے شٹ اپ کہہ کر باہر نکال سکتی تھیں۔ بہت پرسنل بات تھی۔

وہ جیسے تڑپ سی اٹھیں۔ ''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، سلیم بھائی۔ اللہ نہ کرے کہ ان کو کچھ ہو۔ ویسے بھی اب میری زندگی کا ہر لمحہ ان کے ساتھ گزر رہا ہے بے حد پُرسکون، محبت بھرا۔ میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال پریشانی میں گزارے تھے جب میں کراچی میں والد صاحب کے ساتھ تھی، والدہ بچپن میں وفات پا گئی تھیں۔ گھر میں غربت، عسرت، پریشانی اور پھر مسلسل بیماریاں۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ خوشی کس کو کہتے ہیں۔ سکون کس چیز کا نام ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ میاں نصیر احمد کا بھلا کرے کہ مجھے وہ تمام آسائشیں اور خوشیاں دے دیں۔ میں تو دعا کروں گی کہ اللہ تعالیٰ ان کو میری عمر بھی دے دے۔ ویسے بھی آپ نے جو پوچھا ہے جایداد وغیرہ کا تو میں کیا کروں گی اگر میاں صاحب کو اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ میں تو شاید ساتھ ہی مر جاؤں۔'' وہ اب خلا میں گھور رہی تھیں۔

لگتا تھا وہ کہیں اور جا چکی ہیں۔ اس ماحول سے دور۔ مجھ سے بے خبر۔

☆.....☆

دسمبر کی سرد ترین شام تھی۔ میاں صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ میں بھی وہیں تھا۔ ان کو اسپتال لے جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔

سلمیٰ باجی غسل خانے میں وضو کے لیے گئیں۔ عامر صاحب باپ کے پاس افسردہ کھڑے تھے بہو بھی وہیں تھی۔ میں ان کی نبض مانیٹر کر رہا تھا، وہ ڈوب رہی تھی۔ میں نے اشارے سے عامر صاحب کو بتایا کہ کوئی اُمید نہیں۔

وہ باپ کو پکار رہے تھے۔ تسلی دے رہے تھے۔

''ابو..... آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس ایمبولینس آ رہی ہے۔''

میاں صاحب خاموش تھے۔ میں نے اچانک دیکھا۔ انہوں نے اوپر دیکھا۔ ایک ہچکی سی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ جا چکے تھے۔ دعا مانگ کر میں نے چادر ان کے چہرے پر ڈال دی۔

عامر صاحب رونے لگے۔

''کیا ہوا؟'' سلمیٰ باجی جلدی سے ہماری طرف آئیں۔

''میاں صاحب جا چکے ہیں۔'' میں نے بہت افسردگی سے کہا۔

''کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ ابھی تو وہ باتیں کر رہے تھے۔''

انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہاں دیکھا جہاں وہ چہرے پر چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو چکے تھے۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ اچانک پیچھے مڑیں۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ دل پکڑ لیا جسم کسی شاخ کی طرح کانپنے لگا۔

''عامر صاحب! پلیز جلدی سے سنبھالیے بیگم صاحبہ کو۔ ان کو اسپتال اسی گاڑی میں لے جائیں۔'' میں تقریباً چیخ کر بولا۔ ''میں میاں صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ پلیز جلدی کریں کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

وہ لپک کر آئے۔ ان کی بیگم نے ان کے ساتھ سلمیٰ باجی کو پکڑا اور جلدی جلدی باہر جانے لگے۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر لی تھی۔

میں باہر تک گیا۔

وہ پچھلی سیٹ پر صائمہ باجی کے ساتھ تقریباً بے ہوش تھیں۔

میں اندر آ گیا۔

اسپتال پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ ابھی صرف دس منٹ ہی گزرے تھے کہ گاڑی واپس پورچ میں آ کر رک گئی۔ میں لپک کر باہر آ گیا۔

عامر صاحب بہت افسردگی سے کہہ رہے تھے۔ ''آپا بھی ابا کے ساتھ ہی سفر پر روانہ ہو گئی ہیں۔''

بڑی احتیاط سے ان کی بیگم اور وہ ان کو نکال کر لا رہے تھے جو واقعی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔

میاں صاحب کے برابر ان کو لٹایا تو ان کے چہرے پر طمانیت تھی۔ سکون تھا۔ میں نے ایک نظر ڈالی۔ آنکھیں پوری طرح سے بند نہ تھیں۔

میں تھرا سا گیا۔ ایسی موت.....؟ واقعی جو کچھ دن پہلے کہا تھا وہ ہی کر دکھایا۔ ان کو واقعی کسی گھر، جایداد کی ضرورت نہ تھی۔ ان کو مرنے کے بعد بھی شوہر کے ساتھ ہی گھر نصیب ہو گیا تھا۔

کھیل قسمت کا

محترم مدیر
السلام علیکم!
ہر انسان کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور پیش آتے ہیں جنہیں دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ یہ تو عجیب ہوا، انہونی ہوئی ہے ایسے ہی واقعات جب کسی اچھے قلمکار کے علم میں آتے ہیں تو وہ اسے خوب صورت الفاظ کا سہارا دے کر ناول یا فلمی کہانی بنا دیتا ہے۔ زہرہ، مسعود اور مسز پراچہ کے ساتھ قسمت نے جو کھیل کھیلا اسے سننے کے بعد سے ہی میں سوچ رہا ہوں کہ اسے کہانی کی شکل میں بیان کروں۔ بالآخر بیان کر ہی دیا۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ روداد ہر ایک کو پسند آئے گی۔

کاوش صدیقی
(لاہور)

بی اے کے دوران ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ملازمت کروں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا اس کی اجازت کبھی نہیں دیں گے لیکن میں اپنے چھوٹے دونوں بھائیوں اور سب سے چھوٹی بہن کی ان حسرت بھری نگاہوں کی چمک کو کبھی نظرانداز نہیں کرسکتی تھی جو کپڑوں، کھلونوں اور بازار میں بکتی مزیدار اشیاء کو دیکھ کر ابھرتی تھی۔ میں نے ٹیوشن پڑھا کے گھر میں چھوٹے موٹے کام کر کے پیسے ضرور کمائے تھے لیکن یہ بمشکل میری پڑھائی کا خرچ پورا کرتے تھے۔

مہنگائی اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ اب دیگر لوازمات تو ایک طرف کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔ دال

سبزی کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے تھے مگر ابا کی سالانہ تنخواہ میں دو چار سو روپے کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

پھر میں نے نوکری کی ٹھان لی لیکن جہاں نوکری کی بات ہوئی وہ ایک ڈسپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ اگر ابا کو بتاتی، اوّل تو وہ نوکری کے سخت مخالف تھے، اس بات سے تو بالکل ہی گھر سے نکلنا بند کر دیتے، ناچار میں نے اماں کو اعتماد میں لیا۔

صبح جب ابا اپنے دفتر چلے گئے اور اماں نے حسبِ معمول چائے پراٹھا میرے سامنے رکھا تو میں نے کہا۔ ''اماں مجھے سادی روٹی دے دیا کریں۔ مجھے پراٹھا ہضم نہیں ہوتا.....''

اماں نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولیں ''میں تو تمہیں اور بچوں کو پراٹھا اس لیے دیتی ہوں کہ دیر سے ہضم ہوتا ہے۔ جلدی بھوک نہیں لگتی۔ ویسے بھی دوپہر میں ہم کیا کھاتے ہیں۔ تینوں بچے بھی بس پانچ پانچ روپے لے کر اسکول جاتے ہیں۔ اب اس میں کیا ملتا ہے سوائے چند میٹھی ٹافیوں کے.....'' انہوں نے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا اور اپنی آنکھوں کو پونچھا۔

''اماں آپ فکر نہ کریں ہمارے اچھے دن ضرور آئیں گے۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔

''ہاں---'' وہ ایک گہری سانس بھر کے بولیں۔ ''انشاء اللہ''۔

''اماں مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ وعدہ کریں انکار نہیں کریں گی۔''

''بس اب کوئی پڑھائی نہیں۔ میں تیری شادی کا سوچ رہی ہوں۔''

''کیا ہے ہمارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''سب جہیز کے بھوکے نہیں ہوتے۔'' اماں نے کہا۔

''اتنی اچھی شکل وصورت ہے۔ اتنا اچھا قد ہے۔ بی اے کر لیا ہے۔ تیرے لیے رشتوں کی کیا کمی؟'' ان کے لہجے میں ممتا کا مان بول رہا تھا۔

''ذرا کسی رشتے والے سے مل کے دیکھیں جہیز کی کہانی نا سنا دے تو میرا نام بدل دیجیے گا۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اب غریب سے غریب ماں باپ بھی اپنی اولاد کو خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کرتے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ میں چپ ہو گئی۔

اماں چونک کے بولیں۔ ''ہاں تم بات کیا کہنے والی تھیں؟''

''اماں میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لو بھلا ابھی خالی پرچے دیے ہیں۔ بی اے کا نتیجہ آیا نہیں اور نوکری چلی ہیں کرنے۔'' اماں نے گھورا۔

''ملازمت کے لیے میں نے فرزانہ سے کہا تھا، جہاں وہ کام کرتی ہے وہیں جگہ خالی ہے۔''

''کیا؟'' اماں نے چونک کر کہا۔ ''مگر وہ تو اسٹور میں کام کرتی ہے۔ نہ بابا نا۔ تمہارے ابا تو نوکری کے مخالف ہیں وہاں تو ہرگز اجازت نہیں ملے گی۔'' اماں نے صاف صاف انکار کر دیا۔

''اماں سن تو لیں.....'' میں نے جھنجلا کے کہا۔ ''بغیر بات سنے فیصلہ مت سنایا کریں۔''

''کہو.....'' اماں نے بیزاری سے کہا۔

''میری تنخواہ سترہ ہزار روپے ہو گی۔ پروموشن الاؤنس جو ٹارگٹ پورا کرنے پر ملے گا وہ دو فیصد علیحدہ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ سب مل ملا کے اٹھائیس تیس ہزار ہو جائیں گے جبکہ ٹائم بھی صبح دس بجے سے چھ بجے تک کا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری تنخواہ کا حساب سن کر اماں کی آنکھوں میں چمک سی ابھری جو فوراً ہی اندیشوں میں ڈوب گئی۔ ''نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ کشور اپنی بیٹی کی کمائی کھا رہی ہے۔ رہنے دو۔ جس حال میں ہیں اللہ کا شکر ہے۔''

''نہیں اماں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ملازمت کروں گی۔ جس طرح میں نے ترس ترس کے اپنا بچپن گزارا ہے میں اپنے بہن بھائیوں کو ترسنے نہیں دوں گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ کون سا گھر بیٹھی رہے گی۔ کچھ دنوں میں شادی ہو کے چلی جائے گی۔ پھر یہ ذمے داری کون اٹھائے گا۔ ایک بار آسائش کی چاٹ لگ جائے تو پھر دوبارہ غربت برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

میں نے کہا۔ ''کل صبح نو بجے میں چلی جاؤں گی۔ شام کو آؤں گی۔''

اماں کچھ نہ بولیں اور باورچی خانے میں بیٹھ کے برتن دھونے لگیں مگر اتنی دور ہونے کے باوجود ان کی بھری ہوئی آنکھیں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ رات میں ابا آئے۔ امی نے انہیں میرے ارادے سے باخبر کیا مگر وہ

کچھ نہ بولے۔ شاید گھر کے حالات نے انہیں خاموش کرادیا تھا۔

☆.....☆

کے بی اسٹورز ایک بڑی سی عمارت میں پھیلا ہوا بہت بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ میں گھر سے نکلی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے دن فرزانہ کے ساتھ ہی چلی جاؤں تو بہتر رہے گا لہٰذا میں فرزانہ کے ساتھ ہی کے بی اسٹورز پہنچ گئی۔

کے بی اسٹورز کے جنرل منیجر ریاض صاحب بزرگ صورت نرم مزاج آدمی تھے۔ فرزانہ نے میرے ڈاکیومنٹس انہیں پہلے ہی دے دیے تھے۔

انہوں نے رسمی سلام دعا کے بعد کہا۔ ''دیکھو زہرہ، یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ تم نے کسی کی بات کا برا نہیں ماننا۔ نہ ان کی ٹٹولتی نگاہوں کا برا ماننا ہے۔ یہ لحاظی تاثر ہوتا ہے۔ تمہیں اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ تم پر فقرے اور نگاہیں اثر انداز نہ ہوں۔ جب گھر سے نکلی ہو تو ان سب چیزوں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔''

''جی .....'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''مجھے یہی اُمید ہے۔'' انہوں نے کہا اور فرزانہ سے مخاطب ہوئے۔ ''تم جا کر انہیں کام کے متعلق بتاؤ اور آج کے دن اپنے ساتھ ہی رکھو۔ اُمید ہے کہ شام تک یہ کافی کام سمجھ لیں گی۔''

''جی .....'' فرزانہ نے کہا اور ہم دونوں ریاض صاحب کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں نے کہا۔ ''تم تو ریاض صاحب کے متعلق بتا رہی تھیں کہ بہت سخت آدمی ہیں مگر وہ تو مجھے بہت دھیمے مزاج کے لگے۔''

''بالکل بجا فرمایا آپ نے۔'' فرزانہ نے ہنس کر کہا۔ ''ذرا غلطی کرو تو پتا چلے گا کہ پھول جھڑتی زبان سے کیسی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ خیر ہمیں کیا۔ یہ سب تو نوکری کا حصہ ہے۔ تم کسی چیز کو دل سے لگا کے نہ بیٹھ جانا۔'' فرزانہ نے کہا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

پہلے دن میں فرزانہ کے ساتھ ہی رہی۔ وہ گارمنٹس کے سیکشن میں تھی۔ میں کسٹمرز کی پسند کا سامان فرزانہ کی ہدایت کے مطابق مختلف شیلفوں سے نکال کے دیتی رہی۔ آنے والی خواتین میں سے بعض خواتین کے فرزانہ کے ساتھ بڑے اچھے مراسم استوار ہو گئے تھے۔ فرزانہ خوش گفتار بھی تھی اس لیے اکثر خواتین کو ایک سے زائد اشیاء کی خریداری پر بہ آسانی راضی کر لیتی تھی۔

''یہ تو بڑے گر کی بات ہے کہ تم خواتین کو ایک سے زائد چیزیں خریدنے پر آمادہ کر لیتی ہو۔'' میں نے فرزانہ کی تعریف کی۔

''ہاں یہی بات ہے یہاں ٹکے رہنے کی۔'' فرزانہ نے بتایا۔ ''تمہارے کاؤنٹر کی جتنی زیادہ سیل ہو گی تمہاری ضرورت اور کمیشن دونوں ہی بڑھیں گے۔

''کیا مطلب؟''

''اچھا ورکر اور اچھی پبلک ڈیلنگ ہی ہر اسٹور کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ بعض اوقات مختلف اسٹورز کے سپروائزر، ایچ آر والے بھی اسٹوروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی بہتر ڈیلنگ والا مل جائے تو اس کو اچھی آفر پر بلا لیتے ہیں اور دوسرا یہ کہ نوکری کو خطرہ نہیں ہوتا ورنہ یہاں تو گاہک کی ذرا سی شکایت پر بعض اوقات فارغ کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی پکی نوکری تو نہیں۔'' فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے اس کی بات سن کر تائید میں سر ہلایا۔

پورے دن میں کوئی خاص قابلِ ذکر واقعہ نہ ہوا۔ شام کو میں فرزانہ کے ساتھ ہی واپس آ گئی۔ گھر میں جیسے ہی داخل ہوئی۔

امی نے کہا۔ ''تیار ہو جاؤ۔ آج سلیم کی امی آ رہی ہیں۔''

''تو اس میں نیا کیا ہے'' میں نے سینڈل اتارتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ تو پہلے بھی آتی رہی ہیں۔''

''اس مرتبہ وہ تمہیں اپنے بیٹے کے لیے دیکھنے اور مانگنے آ رہی ہیں۔'' امی نے کہا۔

''امی آپ جانتی ہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔'' میں نے تیزی سے جواب دیا۔

''بس بی بی بہت ہو گیا۔'' امی نے اطمینان سے کہا۔ ''ان کو جہیز کا کوئی لالچ نہیں اور نہ ہی کوئی برأت ولیمے کے لیے بڑے بڑے ہال کی فرمائش ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میں یہ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔'' میں نے صاف صاف کہا۔ ''اگر آپ نہیں کہیں گی تو میں انکار کر دوں گی۔''

''کیا.....؟'' امی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''تم ایسا کرو گی۔ تم یعنی کہ تم.....'' پتا نہیں انہیں حیرت زیادہ ہوئی

تھی یا رنج پہنچا تھا۔
مجھے افسوس تو بہت ہوا لیکن یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ امی کو آیندہ کے لیے روکا جا سکے۔
پتا نہیں رات تک کیا ہوا، لیکن وہ نہیں آئیں۔
میں اپنے کمرے سے باہر نکلی تو امی باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں ان کے پاس جا کے زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ امی نے مجھے دیکھا مگر کچھ بولیں نہیں۔
''امی .....'' تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''آپ کو اچھا نہیں لگا مگر کیا صرف شادی ہی میری منزل ہے۔ کیا ہم ہمیشہ غربت میں ہی رہیں گے؟ شادی تو آپ کی بھی ہوئی۔ شوہر بچے اور گھر تو آپ کا بھی ہے لیکن اس کی کیا قیمت ادا کی ہے آپ نے؟''
انہوں نے میری باتوں پر سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ''ہر چیز کی قیمت نہیں ہوتی۔ کیا تیری کوئی قیمت ہے۔ کیا تیرے باپ کا، بہن بھائی کا کوئی بھاؤ ہے؟''
''نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر آپ مسلسل اس کی قیمت چکا رہی ہیں۔ ہر معاملے پر اپنا دل مار کے۔ روٹی، کپڑا، ضرورت کی چیزیں، بچوں کے لیے ان کی پسند کی چیزیں، کس بھاؤ ملتی ہیں ہمیں؟''
وہ چپ رہیں۔
''امی میں اب مزید اور سسکنا نہیں چاہتی۔ مجھے جینا ہے اپنے لیے آپ کے لیے۔ اپنے بہن بھائیوں کے لیے۔'' میں نے ان سے چپک کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بس مان جائیں۔''
''کیا مان جاؤں؟'' اس بار ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔
''بس پانچ سال تک کے لیے مجھے شادی کا نہ کہیے گا۔ میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔''
''کب تم نے میری بات مانی ہے، ہمیشہ اپنی ہی منواتی ہو۔'' امی نے کہا۔ ''ذرا پیچھے ہٹو۔ روٹی ڈال دوں تم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' امی نے مجھے پرے ہٹاتے ہوئے غصے سے کہا۔
مجھے ہنسی آ گئی۔
''اب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' انہوں نے منہ پھیر لیا اور آٹے کا کونڈا قریب کر کے روٹی بنانے لگیں۔

☆.....☆

شب و روز آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی دن میں، میں نے کام کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور فرزانہ کی اچھی شاگرد بن گئی۔
کچھ دن بعد ہی ریاض صاحب نے مجھے دوسرے فلور پر منتقل کر دیا جہاں متفرق گھریلو اشیا تھیں، جن میں برتن، تیار شدہ کپڑے اور بچوں کے کھلونے وغیرہ شامل تھے۔ اس فلور پر پہلے سے شبنم نسیم اور فراز موجود تھے۔ ہم سب گھل مل گئے۔ چند ہی دنوں میں ہمارے فلور کی سیل بہتر ہونے لگی۔
ریاض صاحب نے اس کا کریڈٹ مجھے دیا۔ اس پر نسیم نے احتجاج کیا۔
ریاض صاحب بولے ''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تین مہینوں سے تم لوگ اس فلور پر ہو۔ تمہاری سیل کمپیوٹر میں محفوظ ہے۔ اس ماہ میں نے زہرہ کو اس فلور پر لگایا تو اس کی سیل میں تیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس کا کیا مطلب لیا جائے؟'' انہوں نے نسیم کو گھورا۔
نسیم خاموش رہی۔
میں نے چونکہ اپنے دل میں تہیہ کیا ہوا تھا کہ مجھے اپنے آپ کو ثابت کرنا ہے اس لیے خاموشی سے کام کرتی رہی۔ جونہی مجھے موقع ملتا تھا میں اپنے موبائل پر سیلز کی ٹپس دیکھتی رہتی تھی۔ گھر میں تو انٹرنیٹ نہیں تھا اور پیکیج بڑی جلدی ختم ہو جاتا تھا مگر یہاں انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ اس لیے میں کبھی یوٹیوب، کبھی گوگل پر مارکیٹنگ، سیلز اور خریدار کے رویے کے متعلق پڑھتی رہتی تھی۔
جبکہ میرے دوسرے ساتھی سمجھتے تھے کہ میں اپنے دوست یا کسی محبوب سے چیٹنگ میں لگی ہوئی ہوں۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی اس تاثر کی تردید نہیں کی تھی۔ غربت نے مجھے راز پوشیدہ رکھنا اور پسند کے حصول کے لیے انتظار کرنا سکھا دیا تھا۔

☆.....☆

ایک دن میں ابھی جا کے کھڑی ہی ہوئی تھی کہ دو خواتین میرے فلور پر آئیں۔ لباس اور جیولری سے وہ کسی امیر گھرانے کی لگ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک پانچ سال کا اور ایک دس سال کا بچہ بھی تھا جو آتے ہی شرارتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔
وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی میری طرف سیدھا ہی بڑھ آئیں۔ ان میں قدرے بڑی عمر کی خاتون نے بڑے ہی نخرے بھرے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو لڑکی، میں ایک ڈھنگ کا ڈنر سیٹ لینا چاہتی ہوں مجھے اچھا سا دکھاؤ اور ہاں میں فضول خرچی نہیں کرتی اس لیے مجھے بے وقوف نہیں بنانا۔''

اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ میرے ساتھ کھڑی ہوئی شبنم کا منہ بن گیا مگر میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ صحیح کہہ رہی ہیں میم۔ جو پیسے خرچ کرے گا اس کے لیے اپنی تسلی کر کے چیز خریدنا لازمی ہے۔ آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو بہترین چیز دکھاؤں گی اور دام بھی مناسب ہوں گے۔'' میں انہیں لے کر برتنوں والے سیکشن میں چلی آئی۔

دو دن پہلے ہی تھائی لینڈ سے بہت خوبصورت برتن آئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں کہ آپ ڈنر سیٹ گھر کے استعمال کے لیے لینا چاہتی ہیں یا پھر کسی کو تحفے میں دینا چاہتی ہیں؟''

''تم تو سمجھ دار معلوم ہوتی ہو۔'' پہلی بار خاتون کے لہجے میں ہلکی سی نرمی آئی تھی۔ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے لینا چاہ رہی ہوں۔ ایک ماہ بعد اس کی شادی ہے۔''

میں نے انہیں دو تین ڈنر سیٹ دکھائے۔ انہوں نے اس میں سے ایک پسند کر لیا۔ یہ سیٹ تقریباً پچپن ہزار روپے کا تھا۔

جب وہ اس کو پیک کروانے کا آرڈر دے چکیں تو میں نے کہا۔ ''میم اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو۔''

''دیکھیں یہ آپ نے بہت قیمتی سیٹ لیا ہے اور عموماً سسرال میں نئے برتن کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک درمیانی قیمت کا ڈنر سیٹ بھی خرید لیں تو آپ کی صاحبزادی کی سسرال میں تاثر بڑا اچھا پڑے گا۔ برعکس ان بہوؤں کے جو اپنا سامان ٹوٹنے کے ڈر سے پیک رکھتی ہیں اور ساس کی نظروں میں بے وجہ برا بنتی ہیں۔''

خاتون نے میری بات سن کر کہا۔ ''تم تو بڑی سمجھدار معلوم ہوتی ہو۔ تم نے بڑی اچھی رائے دی۔ اس طرح تو میں نے سوچا ہی نہیں اور شاید اکثر لوگ بھی نہ سوچتے ہوں، کیوں؟''

میں نے کہا۔ ''سب آپ کی طرح بات کی اہمیت کہاں سمجھتے ہیں؟''

''مجھے دوسرا سیٹ تم اپنی پسند کا دکھاؤ۔'' انہوں نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

میں نے انہیں ایک سیٹ دکھایا، جو تائیوان کا بنا ہوا تھا۔ میلا مائن، وزنی اور خوش رنگ پھولوں والا۔ انہوں نے اسے بھی پیک کروانے کا کہہ دیا۔

پھر وہ بولیں ''مجھے تین چار سیٹ گلاسوں کے بھی دے دو۔ گلاس فرانس کے ہوں تو اچھا ہے۔''

میں نے انہیں دو گلاس سیٹ فرانس کے دکھائے جو کافی مہنگے تھے اور پھر دو تقریباً ان ہی کی طرح مگر قیمت میں کم۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ فرانس کے تھے اور یہ ملائشیا کے۔ دونوں میں بظاہر فرق نہیں تھا۔

انہوں نے کافی چیزیں لے لیں۔ جب ان کی خریدی گئی متفرق چیزوں کا بل بنا جو تقریباً ایک لاکھ پینتالیس ہزار مالیت کا تھا۔ وہ اپنا پرس کھول کر پیسوں کا جائزہ لیتی ہوئی بولیں۔

''لڑکی تم نے تو میرا حساب بگاڑ دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار... خرچ ہو گا مگر تم نے تو بل کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ کیا تم کریڈٹ کارڈ لو گی؟''

''بالکل میم آپ فکر مت کیجیے۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

میں نے انہیں ریاض صاحب کے کمرے سے ملحقہ ایک کمرے میں بٹھایا۔ ان کو جوس دیا اور کارڈ لے کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔ انہوں نے کارڈ چارج کیا۔ ریاض صاحب نے پوچھا۔ ''کیا یہ تمہاری جاننے والی ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ان کی بیٹی کی شادی ہے، یہ اس لیے خریداری کر رہی ہیں۔ آپ دیکھئے گا یہ مزید خریداری کے لیے ضرور آئیں گی۔''

''چلو اچھی بات ہے۔'' ریاض صاحب خوش دلی سے بولے۔

میں نے ان کا سامان گاڑی میں رکھوایا۔ وہ بڑی خوش دلی سے رخصت ہوئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے دینے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''سوری میم ہمیں اجازت نہیں کسٹمرز سے ایک بھی روپیا لینے کی۔''

''لیکن یہ تو میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں اور ویسے بھی کون دیکھ رہا ہے۔''

''نہیں میم، یہ اصول کے خلاف ہے۔'' میں نے نرمی سے ان کا مٹھی بنا ہاتھ تھام کے چھوڑ دیا۔

''تم اچھی لڑکی ہو۔'' وہ کہہ کر چلی گئیں۔

اسی وقت فرزانہ آ گئی۔ ''مبارک ہو۔ تم نے تو ریکارڈ توڑ دیا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ریکارڈ؟''

''اس اسٹور میں ایک کسٹمر سب سے زیادہ سیل کا ریکارڈ میرا تھا، ستر ہزار نو سو تیس روپے۔ مگر تم نے تو کمال ہی کر دیا۔'' فرزانہ نے خوش دلی سے کہا۔

سچی بات تو یہ ہے مجھے بھی بہت خوشی ہوئی تھی پھر بھی میں نے کہا۔ ''شکریہ۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''ارے ایک مہینے میں ایسی تین سیل کر لیں یعنی ریٹ ٹرک تو تم اسٹار آف دی منتھ بن جاؤ گی اور کل سیل کا دو فیصد بونس علیحدہ ملے گا۔'' فرزانہ نے مجھے تفصیل بتائی۔

''اچھا یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

اسی وقت ریاض صاحب آ گئے۔ ''زہرہ تمہاری کارکردگی بہت اچھی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت ترقی کرو گی۔''

''شکریہ سر۔''

وہ میرے سر پر پیار سے تھپکی دے کر چلے گئے۔ میں اپنے سیل فون پر دوبارہ جھک گئی۔ مجھے نسیم کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ شبنم سے کہہ رہی تھی۔ ''دیکھا لگ گئی اپنے عاشق کے ساتھ.....''

''تو مجھے کیا؟'' شبنم نے جواباً کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے ہنسی آ گئی مگر میں نے ضبط کر لیا۔ میں یوٹیوب پر ایک ڈاکومنٹری دیکھ رہی تھی۔ جذبات کو استعمال کر کے آپ لوگوں کو کیسے فیصلہ تبدیل کر لینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ میں دو دن سے اس وڈیو کے مختلف ٹپس ذہن نشین کر رہی تھی اور آج میں نے پہلا تجربہ کیا تھا۔

بھلا کون سی ماں ہو گی جو سسرال میں اپنی بیٹی کی عزت نہیں چاہے گی؟ اور مجھے اس کا بہت اچھا نتیجہ ملا تھا۔

☆.....☆

مجھے پہلی تنخواہ سترہ ہزار اور بونس کمیشن کی رقم کل ملا کے انتیس ہزار چھ سو پچاس روپے ملے۔

اتنے سارے پیسے وہ بھی میرے اپنے، میری محنت کی کمائی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابو کی تنخواہ کل ملا جلا کر بیس بائیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں امی اور ابو کے لیے، بہن بھائیوں کے لیے چیزیں خرید کر لے جاؤں مگر کچھ سوچ کر میں نے اپنا یہ فیصلہ مؤخر کر دیا اور شام کو تنخواہ کا سارا لفافہ امی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہ میری پہلی تنخواہ ہے۔''

''تو اس کو سنبھال کے رکھو۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہمیں جیسے گزارہ چل رہا ہے ویسا ہی کرنا ہے۔''

''امی میری بات مانیں۔ یہ پیسے آپ کے ہیں اور آپ جیسے چاہیں خرچ کریں۔''

''کیا دماغ خراب ہے میرا جو پیسے اڑا دوں۔'' انہوں نے غصے سے کہا اور پتا نہیں کیا ہوا وہ انھیں اور مجھے گلے سے لگا کر رونے لگیں۔

میں ان کے ممتا بھرے سینے سے لگی رہی۔ آج میں نے عملاً اپنی ماں کا اعتماد جیت لیا تھا۔

☆.....☆

اسٹورز میں میری سیل سب سے زیادہ ہونے لگی۔ ایک چیز جو میں نے کسی کو نہیں بتائی تھی، وہ یہ تھی کہ میں نے سیلز اور مارکیٹنگ کے دو آن لائن کورس جوائن کر لیے تھے جس کا مجھے رفتہ رفتہ بہت فائدہ ہو رہا تھا۔

سوشل میڈیا کو لوگ نجانے کیوں برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور میں سیکھ رہی تھی۔ اس سے میری انگریزی بھی بہتر ہو رہی تھی اور میری پیشہ وارانہ صلاحیت بھی نکھر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ گراؤنڈ فلور پر فلور منیجر کی حیثیت سے کام کرنے والا فہد رحمن مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے نیچے سے کوئی چیز منگوانی ہوتی تو وہ بجائے اسٹاف کے خود آ کر مجھ سے کہتا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے نسیم اور شبنم کی باتوں سے بھی ہوا۔

نسیم نے کہا۔ ''تم کو معلوم ہے کہ تمہیں کوئی پسند کرتا ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''کیا مطلب؟'' شبنم نے حیرت سے پوچھا ''تم کو دلچسپی نہیں کہ تم میں کوئی دلچسپی لے رہا ہے؟''

''نہ۔ یہ اس کا مسئلہ ہے میرا تو نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کمال بے نیازی ہے جی ہماری زہرہ کی۔'' فراز نے چہکتے ہوئے کہا۔

''یہ ہماری زہرہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

فراز میرے انداز پر گڑبڑا گیا۔ ''وہ تو بس میرے منہ سے یونہی نکل گیا تھا۔''

''لڑکیاں اتنی سستی ہوتی ہیں کہ بغیر کسی رشتے اور

تعلق سے انہیں ہماری بنا لیا جائے؟'' مجھے سچ مچ اچھا نہیں لگا تھا۔

شبنم نے کہا۔ ''اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے بعض اوقات منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔''

''اچھا.....'' میں نے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''تو پھر اس نے تمہیں ہماری شبنم، ہماری نسیم کیوں نہیں کہا؟''

''اب یہ تو اس سے پوچھو۔'' نسیم صاف اپنا دامن بچا گئی۔

''میں معافی چاہتا ہوں کہ میری رواروی کی ایک بات تمہیں اتنی بری لگی۔ میں نے تو صرف ایک کولیگ سمجھ کر کہہ دیا۔''

''چلو چھوڑو کوئی اور بات کرو۔'' شبنم نے مصالحانہ لہجے میں کہا۔

فراز اٹھ کے چلا گیا۔

میں بھی خاموش ہو گئی۔

مگر اس سے فائدہ یہ ہوا کہ فہد رحمٰن کی غیر ضروری آمد بند ہو گئی اور انٹر کام پر ہی جو منگوانا ہوتا وہ منگوا لیتا۔

مجھے سکون آ گیا۔ میں ہرگز عورت مرد کے چکر میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے خواب تھے اور میں ان خوابوں کو ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتی تھی اور اس میں محبت نامی کسی فضول شے کا کوئی بھی گزر نہیں تھا۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرے موبائل کے استعمال کی وجہ سے ان سب کو یہ یقین ہو گیا کہ میرا چکر بذریعہ فون چل رہا ہے مگر میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

☆.....☆

اس بات کے دو ہی دن کے بعد وہی خاتون دوبارہ آ گئیں جنہوں نے اپنی بیٹی کے لیے ڈنر سیٹ وغیرہ خریدے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھی میری طرف آئیں۔

رسمی سلام دعا کے بعد وہ بولیں۔ ''بھئی غلطی ہو گئی تھی اس دن میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔''

''میرا نام زہرہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت اچھا نام ہے مختصر سا۔ یاد ہو جاتا ہے فوراً۔'' انہوں نے مسکرا کے کہا۔

''جی شکریہ۔'' میں نے کہا اور پوچھا۔ ''آج کیا خریداری کا ارادہ ہے؟''

''میں فہرست بنا کر لائی ہوں، مجھے کہیں اور بھی جانا ہے، اس میں گروسری کے ساتھ ساتھ کچھ مزید برتن وغیرہ کے سیٹ بھی کروا دینا اور تقریباً ایک درجن بیڈ شیٹس بھی کروا دینا۔ کنگ سائز میں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''تم سامان پیک کروا دینا میں بل دے کر اٹھا لوں گی۔''

''تو کیا آپ دیکھیں گی نہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اتنا زیادہ سامان لینا ہے تو آپ کی پسند بھی تو لازمی ہونی چاہیے۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم مجھے نہایت سمجھ دار لڑکی معلوم ہوئی ہو۔ پچھلی بار بھی تمہارے مشورے پر جو چیزیں لی تھیں وہ سب کو بہت پسند آئی تھیں۔''

''مہربانی آپ کی۔''

''بس ..... بس ..... مجھے زیور کے لیے جانا ہے۔ تم بس لسٹ کے مطابق پیک کر دو، دو گھنٹے تک میں واپس آؤں گی۔''

''جی بہتر.....'' میں نے جواب دیا۔ وہ فوراً ہی مڑ کے سیڑھیاں اتر گئیں۔

میں نے ان کی فہرست پر نظر ڈالی۔ کافی طویل فہرست تھی جس میں کافی گھریلو آرائشی چیزیں شامل تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا تو فہرست کے مطابق تقریباً مالیت ڈیڑھ پونے دو لاکھ بن رہی تھی۔

میں اللہ کا نام لے کر ان کی دی گئی فہرست کے مطابق ہاتھ میں لیے چیزیں نکلوانے لگی۔ مجھے اس طرح چیزیں نکلواتے دیکھ کر شبنم نے پوچھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ خاتون بعد میں چیزیں واپس کرنا شروع کر دیں کہ یہ اچھا نہیں یہ ٹھیک نہیں۔''

''ہاں شکل سے ہی بڑی نک چڑھی نظر آ رہی تھیں۔'' نسیم نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

میں نے جواب دیا۔ ''پریشان نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ وہ خاتون کافی معاملہ فہم لگتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بے وجہ میں میخ نہیں نکالیں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' نسیم نے کندھے اچکائے۔

میں نے فہرست کے مطابق سامان نکلوانا شروع کر دیا۔ اس کام میں کوئی دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ اچانک میری نظر ایک بیڈ شیٹ پر پڑی جو رجیکٹڈ تھی۔ ''یہ نکالو۔'' میں نے سلیم سے کہا۔ جو چیزیں پیک کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں پتا نہیں چلے گا۔'' سلیم نے بے پروائی سے کہا۔

''لیکن مجھے تو پتا ہے خبردار جو آیندہ میرے کسی کسٹمر کی چیزوں میں ہیرا پھیری کی۔'' میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''اس سے نہ صرف میرا بھروسا خراب ہوتا ہے بلکہ کسٹمرز کا اسٹور پر سے اعتماد بھی ختم ہوتا ہے۔ جب ہم چیز کی کوالٹی کے پیسے لیتے ہیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے خراب چیز دینے کی؟'' میرا لہجہ ہنوز سخت تھا۔

سلیم نے خاموشی سے بیڈ شیٹ نکال کے علیحدہ رکھ دی اور باقی چیزیں پیک کرنے لگا۔ ابھی سامان کی پیکنگ مکمل ہی ہوئی تھی کہ وہ آگئیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایک نظر دیکھ لیں تو بہتر ہوگا۔

انہوں نے کہا۔ ''تو پھر تم کو ذمہ داری دینے کا فائدہ ہی کیا جو میں بھی بیٹھ کے چیک کروں۔ تم تو بس بل بنواؤ۔''

بل جتنی دیر میں بن کر آتا میں نے ان کے لیے چائے منگوالی۔

وہ بولیں۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس وقت مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ تھک گئی ہیں۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ایسے میں کولڈ ڈرنک سے بہتر چائے ہے۔''

وہ ہنسنے لگیں اور بولیں۔ ''لڑکی تم مجھے ہمیشہ اپنی سمجھ داری سے حیران کر دیتی ہو۔''

میں چپ رہی۔

بل بن کر آ گیا۔ انہوں نے پیسے گن کے میرے حوالے کیے اور خدا حافظ کہہ کر نیچے چلی گئیں۔ میں نے سلیم سے کہا کہ وہ سارا سامان ٹرالی میں رکھ کر ان کی گاڑی تک پہنچادے اور احتیاط سے رکھے کیونکہ اس میں کانچ کی چیزیں بھی ہیں۔

شبنم اور نسیم نے یہ سارا ماجرا دیکھا۔

شبنم نے کہا۔ ''اللہ تم جیسا ہمارا نصیب بھی کرے۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں مجھ سا کیوں۔ مجھ سے بھی اچھا نصیب کرے۔''

''تم بڑی عجیب چیز ہو۔'' نسیم نے بے تکلفی سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم پر کسی خوشی کا اثر نہیں ہوتا۔''

''یہ خوشی کا کون سا مقام ہے۔ وہ ایک کسٹمر ہیں جہاں ان کو بہتر ری پیشن ملے گا وہ وہاں چلی جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور اسٹور پر جائیں تو یہاں کو بھول جائیں۔''

''یا اللہ تم کس ٹائپ کی لڑکی ہو؟'' شبنم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''وہ کسی اور جگہ جائیں تو تم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟''

''بالکل.....'' میں نے جواب دیا۔ ''میری ان سے کوئی جذباتی وابستگی یا لالچ نہیں ہے۔ اگر ہم کسٹمرز کے ساتھ جذباتی ہو کے منتھی ہو گئے تو پھر ہم اگلے کسٹمر پر توجہ نہیں دے سکتے جس کے نتیجے میں ہماری کارکردگی متاثر ہوگی۔''

''کمال ہے.....'' فراز نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں تو برسوں کے تجربات کے بعد آتی ہیں، تمہاری تو یہ پہلی جاب ہے پھر تم اتنا سب کچھ کیسے سوچ لیتی ہو؟''

''میں وقت ضائع نہیں کرتی۔'' میں نے جواب دیا ''سمجھنا اور سیکھنا چاہو تو ہمارے اطراف میں تجربات کی وسیع و عریض دنیا موجود ہے لیکن ہم اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔''

''بات تو تم بالکل صحیح کر رہی ہو لیکن صبح سے شام تک گھر جاتے جاتے اور یہاں سارا دن کھڑے ہو کے ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں۔ گھر جا کے تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ بستر پر گریں تو پھر نہ اٹھیں۔'' شبنم نے کہا۔

''صحیح کہہ رہی ہو.....'' میں نے بھی ان کی تائید کی۔

یہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کے آیندہ منصوبے بس تنخواہ، بونس اور پیسے جمع کر کے جہیز کی تیاری ہوتے ہیں جبکہ میرے ارادے ان سے قطعی مختلف تھے۔

میرے خواب بہت اونچے تھے لیکن میں نے ان خوابوں کو کبھی بیان نہیں کیا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ارادے کا اظہار وقت سے پہلے کرنا آپ کی طاقت کو گھٹا دیتا ہے۔ میں بھی کسی صورت اپنے ارادے کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے میں دن رات اپنے ارادے دہراتی تو ضرور رہتی تھی لیکن کبھی کسی سے اظہار نہیں کرتی تھی۔

☆.....☆

یہ تنخواہ ملنے والے دن کی بات ہے کہ میں ڈیوٹی آف کر کے باہر نکلی تھی۔ فرزانہ ذرا پہلے ہی جا چکی تھی۔ میں تھوڑا آگے ہی بڑھی تھی کہ میرے عقب میں آ کے موٹر سائیکل رکی اور ساتھ ہی ایک مانوس آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا فہد رحمٰن میرے پاس ہی موٹر سائیکل روکے کھڑا تھا۔ مجھے پلٹتا دیکھ کر اس نے کہا۔

''کیا تم مجھے چند منٹ دے سکتی ہو؟''

''کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں صرف چند منٹ۔'' اس کا

لہجہ بے حد التجا آمیز تھا۔ میں نے سوچا چلو روز روز کا یہ مسئلہ ختم ہی کر دوں۔ لہٰذا میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دور واقع ایک کیفے پر پہنچ کر اس نے بائیک سائیڈ میں لگائی اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

ایک کونے میں خالی میز دکھائی دی، ہم وہاں بیٹھ گئے۔

میں نے بیٹھ کر کہا۔ ''ہاں کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم اتنی ہی سنگ دل ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا تم نے مجھے میری شخصیت کی خامیاں اور خوبیاں بتانے کے لیے یہاں مدعو کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نن ..... نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''شاید تمہیں برا لگا۔''

''میں اچھے برے کی بات نہیں جانتی۔ تم وہ بات کہو جس کے لیے تم مجھے یہاں لے کر آئے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''وو..... تم مجھے اچھی لگتی ہو۔'' دفعتاً اس نے کہا۔

''اچھا .....'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''میں تمہارے اس جملے کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور مزید کچھ کہنا ہے یا بس کافی ہے۔''

''دیکھو'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''مجھے غلط نہ سمجھو میں سچ مچ تمہیں پسند کرتا ہوں میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو محض وقت گزاری کے لیے لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ میں بے حد سنجیدہ ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں خوش رکھوں گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنا جملہ مکمل کیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہارے جذبات کا شکریہ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یقین کرو کہ میں اپنے گھر سے رشتہ ڈھونڈنے نہیں نکلی ہوں۔ جس دن میں نوکری کے لیے نکلی تھی اس دن میرا رشتہ میرے گھر موجود تھا۔ مجھے اپنے کچھ خواب مکمل کرنے ہیں۔ اس لیے آئندہ مجھ سے اس قسم کی باتیں مت کرنا۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بولا۔ ''مگر وہ خواب ہم مل کر بھی پورے کر سکتے ہیں۔''

''مثلاً'' میں نے پوچھا۔

''ہم دونوں جیسے ابھی کام کر رہے ہیں ویسے ہی کریں گے۔ گھر بنائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''کیا تنخواہ ہے تمہاری ستائیس ہزار نو سو پچاس پلس بونس سب ملا جلا کے پینتیس یا اڑتیس ہزار بنتے ہیں جن میں سے ہر ماہ پانچ ہزار کا قرضہ کٹ جاتا ہے۔ ابھی مزید تمہاری تین بہنیں بیٹھی ہیں۔ گھر تمہارا اور تمہارے چچا کا آدھا آدھا ہے۔ وہ بھی ساڑھے تین مرلے کا۔ اس میں میری کب اور کہاں گنجائش نکلتی ہے؟'' میرا لہجہ خاصہ تلخ تھا۔

''بہت خوب لگتا ہے تم نے میری ساری جاسوسی کر لی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا جن پر ذمے داریاں ہوتی ہیں وہ خواب نہیں دیکھتے؟''

''بالکل دیکھتے ہیں لیکن اپنے اپنے خواب، اپنی اپنی تعبیریں۔ میں ان چیزوں میں الجھنا نہیں چاہتی ہوں جس میں دب کر ہمیشہ جلتی کڑھتی اور سسکتی رہوں۔'' میں نے جواب دیا ''میں تم سے تو کیا کسی سے بھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ بھی یاد رکھنا کہ مجھے تم سے کوئی پرخاش نہیں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم بے وجہ میرے چکر میں پریشان ہوتے پھرو۔ زندگی میں مجھے بہت آگے جانا ہے۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تم آگے جانے کے چکر میں پیچھے رہ جاؤ۔ وہ کیا کہتے ہیں تجھ کو تنہا کر گیا منفرد رہنے کا شوق۔ اب اکیلے بیٹھ کے یادوں کے منظر دیکھنا۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں پچھتانے والوں میں نہیں ہوں۔ میں اپنی یادوں کو خود تخلیق کرنا چاہتی ہوں۔ اگر عورت ماں بن سکتی ہے، خواب دیکھ سکتی ہے تو اپنے لیے یادیں بھی تخلیق کر سکتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں ہی غلطی پر تھا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ تم نے مان لیا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا دل توڑنا نہیں چاہتی لیکن شادی میرا مقصد حیات نہیں ہے۔ غربت دیکھنا اور چیز ہے۔ غربت کو بھگتنا اور چیز ہے۔ اس لیے خوب کماؤ اور اپنے لیے ایک مناسب لڑکی کا انتخاب کر لینا۔''

''تم واقعی بہت پتھر دل ہو۔''

''جو چاہو سمجھو۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اب میں چلتی ہوں۔''

''میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' فہد جلدی سے بولا۔

''کیوں کیا روز تم گھر چھوڑنے جاتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''عجیب چیز ہو۔'' وہ بڑبڑایا۔

میں اس کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکل آئی اور گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆.....☆

مجھے ملازمت کرتے ہوئے پانچ ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ میرا سیل کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ ایک دن میں اسٹور سے نکلی ہی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے بار بار کار کا ہارن سنائی دیا۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو سیاہ مرسڈیز میں کھڑکی کا شیشہ نیچے کیے وہی خریداری والی خاتون میری طرف متوجہ تھیں۔

''کہاں جارہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''چھٹی ہوگئی ہے۔ گھر جارہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا چند منٹ مجھے دے سکتی ہو؟'' انہوں نے پوچھا اور ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

میں گاڑی کے اندر بیٹھ گئی۔

انہوں نے ڈرائیور سے قریبی ریسٹورنٹ چلنے کو کہا۔ میں خاموش رہی۔ انہوں نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔ چند منٹ میں ہی ریسٹورنٹ آگیا اور ہم دونوں وہاں اتر گئیں۔

ہم ایک میز پر بیٹھ گئیں۔

انہوں نے کہا۔ ''کیا کھاؤ گی؟''

''کچھ نہیں۔ میں گھر جا کے ہی کچھ کھاتی ہوں۔ باہر کی عادت نہیں مجھے۔''

''لڑکی مجھے تمہارے اصول پسند ہیں مگر ابھی تھوڑی دیر کے لیے تم میری مہمان ہو۔ ملک شیک منگواتے ہیں۔ مجھے چیکو پسند ہے اور تم؟''

''میرے لیے بھی یہی منگوا لیجیے۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے فوراً آرڈر نوٹ کروایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں ''تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟''

''جی مجھے علم نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''کبھی آپ نے اپنا تعارف ہی نہیں کروایا۔''

''میں زریں پراچہ ہوں۔'' انہوں نے اپنا نام بتایا۔

''شاید تم نے کبھی پراچہ گروپ آف انڈسٹریز کا نام سنا ہو۔''

''جی بالکل سنا ہے۔ یہ تو کئی قسم کی اشیاء کے مینوفیکچررز ہیں، مگر ان کی زیادہ تر اشیاء ملک سے باہر ہی جاتی ہیں۔''

''تم تو زبردست معلومات رکھتی ہو۔'' انہوں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''میرا شوق مارکیٹنگ اور سیلز ہے اس لیے میں اکثر اس حوالے سے کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ کیا تم نے ایم بی اے وغیرہ کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں تو بس سمپل بی اے ہوں۔ زیادہ پڑھائی کے تو ہمارے حالات اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔''

''مگر تم اس حوالے سے پریشان مت ہونا۔'' انہوں نے کہا۔ ''بعض اوقات تجربہ ڈگریوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔''

''جی ہاں، آپ درست کہتی ہیں۔'' میں نے ان کی تائید کی اور شیک کا ایک گھونٹ بھرا۔

''میں نے آن لائن کورسز کرنا شروع کیے ہیں۔ چار ماہ کا ایک کورس ہے۔ سرٹیفکیٹ چند ہی دنوں میں ملنے والا ہے۔ بس اصل چیز تو درست وقت پر درست فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔''

''دیکھو لڑکی.....'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں نہیں جانتی کہ تم مجھے کیوں اچھی لگتی ہو لیکن مجھے تمہارے اعتماد اور بھروسے نے حیران کیا ہے۔ میں تمہیں ایک ٹپ دینا چاہتی ہوں اب اگر تم میں اہلیت ہے تو تم آگے بڑھو اور اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرلو۔''

''خوابوں کی تعبیر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کیا جانتی ہیں میرے خوابوں کے بارے میں؟''

''تم بہت آگے جانا چاہتی ہو۔ اپنا بزنس کرنا چاہتی ہو۔ کسی کی محکوم نہیں رہنا چاہتی ہو۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''کمال کی قیافہ شناسی ہے آپ کی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہم کاروباری لوگ ہیں۔ اگر انسان کے ٹیلنٹ کو نہ پہچان سکیں تو پھر ہم کاہے کے کاروباری ہوئے۔ میں نے پہلے ہی دن تمہارے اندر اسپارک دیکھ لیا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آگے بڑھو۔''

''شکریہ۔ لیکن وہ کون سی ٹپ ہے جو آپ مجھے دینا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''جہاں تم کام کرتی ہو، وہ اسٹور عملاً ڈوب رہا ہے اور سال ڈیڑھ سال میں ڈوب جائے گا۔''

''کیا؟'' ملک شیک کا بھاری گلاس میرے ہاتھ میں لرز گیا۔

''اتنی اچھی سیل ہے پھر بھی ڈوب جائے گا؟ میں کس

طرح مان لوں؟'' میں نے بحث کی۔

''اس کے مالک میرے جاننے والے ہیں۔ وہ دُبئی میں سیٹل ہو چکے ہیں اور اس سے اپنا پیسا نکال کے وہاں انویسٹ کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مال سپلائی کرنے والوں کی پے منٹس رک رہی ہیں۔ ابھی خبر نہیں پھیلی لیکن جونہی خبر پھیلے گی۔ سپلائیاں بند ہونے لگیں گی اور جب کسٹمرز کو سامان نہیں ملے گا تو وہ آنا بند کر دیں گے۔ ٹائی ٹینک بہت تیزی سے ڈوبتے ہیں۔''

''لیکن مجھے تو کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی اسٹورز میں مال بھرا ہوا ہے دو چار مہینے وہ چلے گا اس کے بعد نئے آرڈرز کے معاملات دیکھنا۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن اس ٹپ کا مجھے کیا فائدہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''درست وقت پر درست فیصلہ۔'' انہوں نے میری بات دہرائی۔

''کیا مطلب؟''

''تم اس اسٹور کو خرید لو۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا اور ایک لمبا گھونٹ بھر کے اپنا گلاس خالی کر دیا۔

''لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''اتنی بھاری انویسٹمنٹ اور پھر میرا چند ماہ کا تجربہ۔ یہ تو ناممکن ہے۔ میرے لیے آپ کی ٹپ موثر نہیں لیکن شکریہ کہ آپ نے میرے لیے اچھا سوچا۔''

''احمق لڑکی۔'' انہوں نے مجھے جھڑکا۔ ''بغیر سوچے سمجھے انکار کر دیا کہ بھاری پتھر تھا چوم کے چھوڑ دیا۔'' دفعتاً زریں پراچہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''مجھے تم جیسی لڑکی سے اتنی کم ہمتی کی توقع نہیں تھی۔ تم جانتی ہو کہ جب پراچہ انڈسٹریز کا آغاز ہوا تھا تو ہمارے پاس صرف تین ہزار روپے تھے اور کروڑوں کی ہمت۔ اربوں کے خواب۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بس تم پھر سوچو۔ تمہارے پاس تقریباً ایک سال کا وقت ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور تم مجھے ثابت کر کے دکھاؤ گی۔''

''لیکن .....'' میں نے سوال کیا۔ ''آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟''

''میں ہر ہمت والے کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں جس دن تم کامیاب ہو جاؤ گی میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتا دوں گی۔ زہرہ.....'' انہوں نے جواب دیا۔

آج پہلی بار انہوں نے مجھے اے لڑکی کی بجائے میرے نام سے پکارا تھا۔ دفعتاً جیسے میرے اندر ہمت کا سیلاب آ گیا۔

میں نے ان کا ہاتھ تھام کے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔''

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' انہوں نے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔

ملک شیک کے گلاس خالی ہو چکے تھے۔ ٹپ مل چکی تھی۔ ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

☆.....☆

وہ رات میرے لیے بہت بے چینی کی رات تھی۔ جب کسی کا دھیان کسی خاص طرف موڑ دیا جائے تو پھر خیالات کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اب تک میں ملازمت کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں بہت آگے جانے کے خواب تھے لیکن میں نے اس حوالے سے کبھی نہیں سوچا تھا کہ جہاں میں ملازمت کرتی ہوں میں اس اسٹور کو ہی خرید لوں۔ ایسا خیال میرے دل میں زرین پراچہ نے ڈالا تھا۔ لیکن کیوں؟ آخر انہوں نے مجھ میں ایسی کیا صلاحیت دیکھ لی تھی جو مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانے پر اکسا رہی تھیں۔ میرے پاس تو میری تنخواہ کے معہ بونس و کمیشن ملا کے بمشکل ڈیڑھ لاکھ روپے تھے اور وہ بھی امی نے جوڑ کے رکھے ہوئے تھے۔

مجھے بہت دیر بعد نیند آئی۔ صبح اٹھی تو سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں لال تھیں۔

امی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے خیریت تو ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟''

''پتا نہیں کیوں رات میں نیند صحیح سے نہیں آ سکی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ناشتے کے بعد گولی کھا لینا اگر طبیعت بحال نہ ہو تو چھٹی کر لینا۔'' امی نے مشورہ دیا۔

''نہیں چھٹی تو ممکن نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''ہاں ناشتے کے بعد گولی کھا لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے پہلے میں تمہیں چائے دے دیتی ہوں۔'' امی نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں چائے کا کپ لے کر اندر کمرے میں آ گئی۔

مسئلہ پھر اسی ادھیڑ بن کا شروع ہو گیا کہ کیا یہ ممکن ہے؟

میرے ذہن میں مختلف باتیں گھومنے لگیں۔ پھر میں نے سوچا کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ پہلے اسٹور کے مالی معاملات سمجھنے کی کوشش کروں پھر دیکھوں کہ کیا معاملہ سامنے آتا ہے۔ ویسے بھی تو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ تو مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے۔

میں گویا ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہوگئی۔

تھوڑی ہی دیر میں میرے سر کا درد ختم ہوگیا اور میں اسٹور جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اسٹور پہنچی تو معلوم ہوا کہ مجھے ریاض صاحب دو مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔

''خیریت تو ہے نا۔'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' شبنم نے کندھے اچکائے۔ ''دو مرتبہ پوچھا کہ مس زہرہ آئی ہیں کہ نہیں۔''

''میں معلوم کرتی ہوں۔'' میں نے کہا اور نچلے فلور کی طرف چلی آئی۔

ریاض صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے رجسٹروں میں گھرے ہوئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی بولے۔ ''کیا بات ہے آج تم لیٹ ہوگئیں۔''

''میں صرف پندرہ منٹ لیٹ ہوں۔ دراصل آج میرے سر میں بہت درد تھا اس لیے آنے میں تاخیر ہوگئی۔''

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اب پہلے سے بہتر ہے۔'' میں نے کہا اور پوچھا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے تھے کوئی خاص کام ہے کیا؟''

''ہاں'' انہوں نے کہا۔ ''فہد دو دن سے چھٹی پر ہے۔ آج اس کا فون آیا کہ ابھی پندرہ دن مزید نہیں آئے گا۔''

''کیوں خیریت تو ہے نا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے لیکن مجھے ایک لڑکے نے بتایا ہے کہ وہ دبئی جا رہا ہے۔ اس کو وہاں کوئی اچھی جاب مل رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ محض وقت لے رہا ہے شاید وہ وزٹ ویزے پر جا کر ٹرائی کرنا چاہتا ہے۔ خیر اچھی جاب ڈھونڈنا اچھا موقع تلاش کرنا ہر ایک کا حق ہے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''تو اس میں پریشانی کیا ہے؟'' میں نے دوبارہ سوال کیا۔

''بات یہ ہے کہ فہد بہت اچھا کام کرنے والا لڑکا تھا۔ اسٹور کی پرچیزنگ اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ میں تو صرف بل سائن کرتا ہوں اور چیک بنا کر پارٹی کو دے دیتا ہوں۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آگے جو سپلائی وغیرہ آئے گی اس کی دیکھ بھال، اسٹور کا حساب کتاب کیسے ہوگا؟''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ میں اس کو کیسے ڈیل کر سکتی ہوں؟'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''ہاں ..... میں یہی چاہ رہا تھا کہ تم اس کو دیکھو۔ تمہارا درد سر ہے اب .....!'' ریاض صاحب فوراً ہی خوش ہوگئے۔

میں خاموش رہی لیکن یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ جونہی انسان کی ذہنی کیفیت میں تبدیلی آتی ہے باہر کے حالات میں اتار چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے۔

''سلیم .....!'' ریاض صاحب نے دروازے کے سامنے سے گزرتے سلیم کو آواز دی۔ ''یہاں آؤ اور زہرہ کو نیچے اسٹور میں لے جاؤ۔ آج سے یہ فہد کی جگہ کام دیکھیں گی سارا.....!''

''جی اچھا۔ آیئے مس زہرہ۔'' سلیم نے جواب دیا۔

میں اٹھ کے باہر آگئی۔

اسٹور بیسمنٹ میں تھا۔ یہاں پر دو عورتیں کام کرتی تھیں جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ اناج منڈی سے آیا ہوا سامان مثلاً دال چاول مصالحے وغیرہ صاف کریں اور ان کو ایک کلو، پانچ کلو کے پیکٹ میں بناتی جائیں۔ اسی طرح مختلف اشیاء کی پیکنگ اور وزن کے لیے دو لڑکے اور کام کرتے تھے جو اپنے کام میں مصروف تھے۔

سلیم بولا۔ ''چلو اچھا ہوا کہ اب چارج آپ کے پاس آگیا۔''

''اس میں اچھا ہونے کی کیا بات ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہر وقت تو وہ غصے میں رہتے تھے۔ اچھا ہوا چلے گئے۔''

''وہ چلے نہیں گئے۔ پندرہ دن کی چھٹی پر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہ جی وہ چلے گئے ..... شوں۔'' سلیم نے ہاتھ سے جہاز کا اشارہ بنایا۔ ''وہ واپس نہیں آئیں گے۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' میں نے پوچھا۔

''خود ہی کہہ رہے تھے کہ اسٹور کا تو تیا پانچا ہونے والا ہے۔ میں تو چلا۔'' اس نے بتایا پھر بولا۔ ''ویسے باجی یہ تیا پانچا کیا ہوتا ہے؟''

میں کیا جواب دیتی مگر میرا دل دھڑکنے لگا تھا گویا

کہ اسٹور کی مالی حالت فہد کے علم میں تھی۔

میں نے اپنا سر جھٹک کے رجسٹر کھولا اور اسٹاک کا جائزہ لینے لگی۔ ایک بات جو میں نے غور سے دیکھی کہ پورے بیس منٹ میں کوئی سکیورٹی کیمرا نہیں تھا۔ بیسمنٹ سے جو دروازہ سیڑھیوں کے ذریعے باہر جاتا تھا وہ براہ راست باہر نکل جاتا تھا۔ یعنی جب جس کا جی چاہے اسٹور کی انتظامیہ کے بتائے بغیر آئے جائے اور..... جو چاہے وہ لے بھی جائے۔

میں نے نوٹ کیا کہ کام کرنے والی خواتین کافی ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے تھیں اسی طرح جو لڑکے کام کررہے تھے وہ بھی شلوار قمیص میں ہی ملبوس تھے۔

میں حساب چیک کرنے لگی۔

ایک عورت نے کہا۔ ''آج سے چارج آپ کے پاس ہے۔''

''ہاں .....'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''زبیدہ جی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمارا خیال رکھئے گا۔''

''بالکل تمہارا خیال رکھوں گی۔ تمہاری تنخواہ میں تو دیر نہیں ہوتی؟'' میں نے سوال کیا۔

''کبھی پانچ کو کبھی سات کو کبھی پندرہ کو ملتی ہے۔''

''فکر مت کرو۔ اب تنخواہ ہر مہینے کی سات تاریخ کو ملے گی۔''

''بس باجی جو بھی تاریخ ہو پکی ہو۔''

اسی وقت سلیم نے بتایا کہ ''باجی وہ گھی کمپنی والے آئے ہیں۔ اوپر آجائیں۔''

میں اوپر آگئی۔

باہر کاؤنٹر کے پاس ہی ایک کونے میں چھوٹی سی میز کرسی رکھی تھی۔ جس کے آگے دو ملاقاتیوں کے لیے پلاسٹک کی کرسیاں پڑی تھیں۔ اس پر ایک خوش پوش شکل آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''مس زہرہ آپ ہیں اب آپ ہی پرچیزنگ دیکھیں گی؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بڑی شائستگی تھی۔

''جی غالباً آپ کو ریاض صاحب نے بتایا ہوگا۔''

''جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں آپ سے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ ہمیں سپلائی کس طرح دیتے ہیں؟''

''مس زہرہ بات یہ ہے کہ ہم ہر سپلائی کے دس دن کے بعد ریکوری کرتے ہیں۔ اس طرح کھاتہ چلتا رہتا ہے۔''

''کیا آپ آج سپلائی لائے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''جی .....'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے میرا نام سفیر احمد ہے۔''

''لیکن آج پے منٹ تو نہیں ہو سکے گی اس لیے کہ مجھے آج صبح ہی ریاض صاحب نے یہ ذمے داری دی ہے اور اسٹور کی پرچیزنگ کے معاملات کو سمجھنے میں مجھے ایک ہفتہ لگے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''کوئی بات نہیں۔'' سفیر احمد نے اپنائیت سے کہا۔ ''آپ اطمینان سے دیکھ لیجئے گا۔ میں اگلے ہفتے پتا کرلوں گا اور ہاں رمضان شریف دو ماہ کے بعد شروع ہو رہا ہے اس کے لیے کمپنی کچھ اسکیم دینے والی ہے۔''

''اس پر بعد میں بات کرلیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جی بہتر۔'' سفیر احمد نے ڈلیوری واؤچر میرے سامنے رکھا۔ میں نے دیکھا کہ بل ساڑھے تین لاکھ کا تھا۔

''اس میں ہماری پرسنٹیج نہیں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ..... میرا خیال ہے کہ بل شاید جلدی میں غلط بن گیا۔'' سفیر احمد نے جلدی سے بل اٹھالیا۔ اور باہر نکل گیا۔

میں چپ رہی۔ مجھے اس جاب کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ پرچیزنگ میں اچھا خاصہ گھپلا ہوتا ہے اور اکثر پرچیزر اپنا کمیشن ضرور رکھتے ہیں۔

دو تین دن میں ہی معلوم ہو گیا کہ اسٹور میں چوری بھی ٹھیک ٹھاک ہو رہی ہے اور پرچیز میں ماہانہ ڈیڑھ دو لاکھ کا گھپلا ہو رہا تھا۔

لیکن یہ سب جو کچھ بھی ہو رہا تھا کیا ریاض صاحب

شمارہ دسمبر 2019ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: وہ رات..... مسز ریاض (کراچی)

☆ دوم: میری بہن ہے..... عشرت محمود (کراچی)

☆ سوم: ملاپ..... کرن (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ کی منتخب کہانی
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

کے علم میں تھا یا نہیں۔ مجھے خاموشی سے یہ معلوم کرنا تھا۔ بقول ان کے کہ وہ تو بس سائن کر دیتے ہیں چیکوں پر۔ سارا معاملہ تو فہد ہی دیکھتا تھا۔

لیکن اس کی وضاحت کے لیے اور صورتحال کو سمجھنے کے لیے کچھ سوالات اور حالات دونوں کو ہی دیکھنا ضروری تھا۔

ایک دن میں نے بہت سرسری انداز میں پوچھا ''اوپر تو تمام جگہ کیمرے لگے ہیں لیکن نیچے بیسمنٹ میں کیمرے نہیں لگے۔ وہاں تک جانے کے لیے مجھے نیچے جانا پڑتا ہے۔''

''تو کیا ہوا۔'' ریاض صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''تھوڑی ٹانگوں کی ورزش ہو جائے گی۔''

میں ہنس دی ''یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔''

وہ بھی ہنسنے لگے۔

☆.....☆

تباہی تب آتی ہے جب نیت خراب ہو۔ میں نے ایک ہفتے میں ہی اندازہ لگا لیا کہ اسٹور میں اچھا خاصہ گھپلا ہو رہا تھا اور بیسمنٹ میں سے چاول، چینی، آٹا، مصالحہ جات اور گھی تیل وغیرہ باقاعدگی سے کم ہو رہا ہے یا کھلے لفظوں میں کہیے کہ چوری ہو رہا تھا اور یہ جان کے مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ یہ سب ریاض صاحب کے علم میں تھا۔ ایسا وہ کیوں کر رہے تھے۔ چند دنوں میں معلوم ہو گیا۔

اس اسٹور میں سب سے پرانا ملازم سلیم تھا اور دوسری اس کی خالہ زبیدہ۔ اسٹور کسی مسعود عجمی کا تھا جو اب دوبئی میں بمعہ فیملی سیٹلڈ ہو گئے تھے اور وہاں بھی انہوں نے ایک کافی بڑا اسٹور کھول لیا تھا۔

ریاض صاحب ان کے پرانے دوست تھے جو اسٹور کی دیکھ بھال کر رہے تھے مگر چوری اور بدانتظامی کے ساتھ ساتھ مالک کی عدم توجہی کے باعث اسٹور کی مالی حالت دن بہ دن مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن چھٹی کے بعد فرزانہ نے مجھے کہا کہ وہ کچھ بات کرنا چاہتی ہے لہٰذا ہم لوگ اسٹور سے کچھ دور ایک کافی شاپ میں بیٹھ گئے۔

''کہو کیا ایسی بات ہے جو وہاں نہیں ہو سکتی۔'' میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''دیکھو زہرہ۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم ترقی اور تجربے کی سیڑھیاں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہو لیکن ذرا احتیاط کرنا کہیں بری طرح پھسل نہ جانا۔'' فرزانہ کا انداز ناصحانہ سا تھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا ''کھل کے کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''دیکھو زہرہ ہم لوگ تو ملازم ہیں۔ اپنی محنت کرتے ہیں اور کھاتے ہیں لیکن یہ جو اوپر کے لوگ ہیں نا یہ خالی کھاتے ہی نہیں کماتے بھی ہیں۔ کہیں تم ذمہ داری اور ایمان داری کے چکر میں پڑ کے اپنی نوکری سے ہاتھ مت دھو بیٹھنا۔''

''یہاں کون بددیانتی کر رہا ہے؟''

''اب مجھ کو بناؤ مت۔'' فرزانہ ہنسی ''جیسے تم جانتی نہیں ہو۔''

''دیکھو فرزانہ اگر تم مجھ سے مخلص ہو تو کھل کے بتاؤ کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' میں پوری طرح فرزانہ کو کریدنا چاہتی تھی۔

''ریاض صاحب، فہد اور زبیدہ ..... ان تینوں کی بڑی پکی شلٹ بنی ہوئی ہے۔ یہ دیمک کی طرح اندر ہی اندر اسٹور کو کھا رہے ہیں۔ ایک دن یہ ہوگا کہ اسٹور دیوالیہ ہو جائے گا۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں چار سال سے یہاں کام کر رہی ہوں۔ میرے کان اور آنکھ کھلی اور زبان بند ہے تو کیا میں کچھ نہیں جانوں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہی کہ جب فہد نے حد سے زیادہ بڑھنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔''

''کیا مطلب۔ یہاں تو سب کہہ رہے ہیں کہ فہد دبئی گیا ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دبئی چلا گیا ہوگا مگر یہاں بھی تو اس کی دُبئی گلی ہوئی تھی۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''مگر سارا دُبئی خریدنے کے چکر میں وہ دُبئی بدر ہو گیا۔'' فرزانہ ہنسی پھر بولی۔ ''میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم ہوشیار رہنا اور غیر ضروری طور پر بے وجہ ریاض صاحب سے، زبیدہ اور سلیم سے پنگا مت لینا۔'' فرزانہ نے مجھے نصیحت کی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لینے کی۔''

''بالکل ٹھیک۔'' فرزانہ نے ہنس کر کہا۔ ''تمہاری بات سن کر میری ساری ٹینشن دور ہو گئی۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔'' فرزانہ کے لہجے میں

بہت خلوص تھا۔

میں نے چائے منگوائی اور ہم دونوں چائے پینے لگیں۔ چائے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے گھر کا رخ کیا۔

☆.....☆

جو پھانس میرے دل میں تھی جو کشمکش میرے دل میں کئی دنوں سے برپا تھی، فرزانہ کی گفتگو کے ساتھ ہی تحلیل ہو گئی۔

جہاں سب اپنے اپنے مفاد میں سرگرم عمل تھے، جہاں اگر میں اپنا مفاد سوچتی تو برا کیا تھا اور ویسے بھی ترقی کے لیے جذبات کو علیحدہ رکھنا چاہیے۔

میں اسٹور پہنچی تو دیکھا ریاض صاحب سیٹ پر نہیں تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کا فون آ گیا کہ ان کی بیٹی کے ہاں ولادت میں پے چیدگی ہو گئی ہے اور وہ فوری طور پر دوسرے شہر روانہ ہو رہے ہیں اس لیے کچھ دن نہیں آ سکیں گے۔

''تم سب سنبھال لو گی نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی آپ فکر مت کریں۔ سب بہتر ہو گا آپ تسلی سے جائیں واپسی کب ہو گی؟'' میں نے انہیں حوصلہ دیا۔

''دیکھو دو چار دن لگ جائیں گے۔ کوئٹہ یہاں تھوڑی ہے اور پھر بیگم بھی جا رہی ہیں تم تو جانتی ہو نفیسہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔'' ان کے لہجے میں پریشانی اور باپ کی فکرمندی عیاں تھی۔

''جی سب بہتر ہو گا۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے کہا۔ ''دیکھو ڈوپلیکیٹ چابیاں فلاں جگہ رکھی ہیں وہاں سے اٹھا لو میرے دفتر کی۔ میری دراز میں کچھ چیک رکھے ہیں مختلف پارٹیوں کے جو دو تین دن میں قابل ادا ہیں اگر ٹال سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ پھر دے دینا۔ ویسے بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ پارٹیوں کو پے منٹ کھینچ کر کرنی چاہیے ورنہ یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ہمیشہ دو تین سپلائیاں روک لو پھر پے منٹ کرو۔'' وہ ہنسے۔

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں تھا کہ کاروباری سمجھ بوجھ ان میں بلا کی تھی۔

''جی ایسا ہی کروں گی۔ بلکہ دن میں دو ایک مرتبہ آپ سے رابطہ بھی رکھوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا.....'' انہوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں اٹھی اور سنبھلتی ہوئی اس جگہ گئی جہاں انہوں نے ڈوپلیکیٹ چابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ نکالیں اور ان کے کمرے کا لاک کھولا۔ دروازہ ایسے ہی بند رہنے دیا اور سب کو بتا دیا کہ دو چار دن کے لیے ریاض صاحب نہیں آئیں گے اور اب چارج فی الحال میرے پاس ہے سارے اسٹور کا۔

فرزانہ نے کہا۔ ''یعنی کہ اب تم ہماری باس ہو گئی ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''صرف ذمے دار ورکر۔''

وہ ہنسنے لگی۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے اس جملے سے نسیم، شبنم، فراز کے چہرے کے اعصاب قدرے معمول پر آ گئے تھے۔

میں سب کے سامنے ہی ریاض صاحب کے کمرے میں گئی۔ ان کی پہلی دراز میں متفرق نمبر، رسیدیں اور چیک رکھے ہوئے تھے جبکہ نچلی دراز میں کیش پڑا ہوا تھا۔ یقیناً یہ کل رات کا کیش تھا جو آج بینک میں جمع ہونا تھا مگر ان کے نہ آنے کی وجہ سے جمع نہیں ہو سکا۔

چھ لاکھ پچھتر ہزار نو سو تیس روپے کا بینک واؤچر بنا ہوا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی علیحدہ علیحدہ مالیت کے نوٹ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ دس ہزار چار سو انیس روپے علیحدہ پڑے تھے جو کہ غالباً روزانہ کا پیٹی کیش تھا۔

میں نے بینک کا نام دیکھا جو ہم سے دو بلڈنگ دور واقع تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کیش مجھے جمع کرا دینا چاہیے تاکہ اتنی بڑی رقم چھوڑ دوں بلاوجہ دراز میں۔ باوجود اس کے کہ دراز میں لاک موجود تھا۔

میں نے پیسے ایک شاپر میں ڈالے اور واؤچر نکال کر اسٹور سے باہر نکل آئی۔ ابھی صبح کے سوا نو ہی بجے تھے اس لیے کہیں کوئی رش موجود نہیں تھا۔ چند منٹوں میں ہی میں بینک پہنچ گئی جہاں اِکا دُکا آدمی ہی موجود تھے۔ میں کیش کاؤنٹر پر جمع کرانے پہنچی تو کیشیئر کو دیکھ کر چونک گئی۔

اس نے بھی مجھے دیکھا اور بولا ''آپ آج یہاں؟''

وہ ندیم جو کہ اکثر اسٹور میں خریداری کے لیے آتا رہتا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ قریبی بینک میں کیشئر ہے۔

''ریاض صاحب ذرا ذاتی کام سے گئے ہوئے ہیں اس لیے مجھے آنا پڑا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا.....اچھا۔'' اس نے گردن ہلائی اور جلدی سے مجھ سے پیسے لے کر گننے لگا۔ پیسے گن کر اس نے مہر لگائی اور رسید میرے حوالے کر دی۔

''کوئی بینک کے متعلق کام ہو تو مجھے آگاہ کیجیے گا۔''

اس نے کہا۔

''ضرور کیوں نہیں۔'' میں کہہ کر واپس آ گئی۔

میں ابھی پہنچی ہی تھی کہ یکے بعد دیگرے سپلائی آنا شروع ہو گئی۔ سپلائی دے کر انہوں نے مینیجر کا کہا تو میں نے انہیں بتایا کہ ریاض صاحب کو ایمرجنسی میں بیرونِ شہر جانا پڑا ہے ایک ہفتے کے لیے لہٰذا تمام ادائیگیاں ایک ہفتے کے بعد ہوں گی۔ وہ تو ہاں میں سر ہلا کر خوش دلی سے چلے گئے۔ ایک نے اپنے آفس سے بات کروائی اور دو سپلائر معمولی تکرار کے بعد رخصت ہو گئے۔

میں نیچے بیسمنٹ میں گئی تو زبیدہ اور سلیم آپس میں سر جوڑے باتیں کر رہے تھے۔ مگر مجھے دیکھتے ہی دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

میں نے ان کے ردِعمل پر کوئی توجہ نہیں دی اور کہا کہ ریاض صاحب ابھی دو چار دن نہیں آئیں گے لہٰذا زبیدہ باجی ہی نیچے کی انچارج ہوں گی۔

ان کے چہرے پر میرے جملے کا بڑا مثبت ردِعمل ہوا اور زبیدہ باجی نے فوراً ہی کہا۔ ''بیٹا آپ بالکل فکر مت کرو، نیچے تو تمہیں جھانکنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ۔''

''جی بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہاں روشنی کم ہے۔ سلیم تم آج ہی یہاں کے جو بلب فیوز ہیں وہ فوراً لگا دو۔ چوہے، چھپکلی اور کیڑے مکوڑوں کا دکھائی دینا ضروری ہے تاکہ فوراً ہی صفائی کی جا سکے۔''

''بالکل ابھی تھوڑی دیر میں ہی کر دیتا ہوں۔'' سلیم نے مستعدی سے کہا۔ میں سر ہلاتی ہوئی پلٹ آئی مگر میں نے کنکھیوں سے جائزہ لیا تھا کہ ایک بڑی بوری بیرونی دروازے کے بالکل پاس رکھی ہوئی ہے جس کا منہ اچھی طرح سے بند تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی واپس آ گئی۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے اس معاملے سے کیسے نمٹنا ہے۔

☆.....☆

دوسرے دن صبح تقریباً ساڑھے نو بجے کے قریب زبیدہ باجی اپنے بھاری بدن کے ساتھ ہانپتی کانپتی اوپر میرے پاس پہنچیں۔ ان کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں سانس بری طرح پھول رہی تھی۔

''کیا بات ہے خیریت تو ہے نا؟'' میں نے ان کے حواس باختہ چہرے کی طرف دیکھا۔

''ارے خیریت کہاں؟'' انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ ہو گیا جو آج تک نہیں ہوا میں تو مر گئی۔''

''پسلیاں ہی بجھائیں گی یا کچھ کہیں گی بھی۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

''ارے گودام کا تالا ٹوٹا ہوا ہے۔ سامان بکھرا ہوا ہے۔ اللہ جانے ذرا نیچے کی خبر تو لو۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا.....؟'' میں اچھل کے اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔ ''یہ کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ میں ریاض صاحب کو کیا جواب دوں گی۔'' میری پریشانی میں جیسے ایک دم اضافہ ہو گیا ہو۔

''کیا چوری ہوا ہے؟'' میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ بھاری بھاری قدموں سے نیچے اترتی ہوئی بولیں۔ ''میری تو جیسے ہی نوٹے تالے پر نظر پڑی اور میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوئی میری تو جان ہی نکل گئی۔''

میں نے نیچے اتر کے معائنہ کیا۔ تالا باہر سے توڑا گیا تھا اور اندر دو تین بوریوں سے چینی چاول اور آٹے کے کچھ ڈبے مصالحوں کے کچھ لفافے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔

''یہ تو پولیس کیس ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پولیس کو فون کرنا چاہیے۔'' میں نے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''سلیم ذرا دیکھو کہ کیا چوری ہوا ہے۔''

''پولیس'' زبیدہ باجی کا منہ کھل گیا۔ ''وہ تو بس شبے ہی میں دھر لیتے ہیں اور بڑی پٹائی کرتے ہیں۔''

''زبیدہ باجی اسٹور تو میری ذمے داری ہے نا۔ پتا نہیں کیا کچھ ہوا ہو گا۔ میں ریاض صاحب کو کیا جواب دوں گی؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''ایک تو یہاں نہ لائٹ ہے نہ کوئی سیکیورٹی کیمرے کا بندوبست۔ پوری مارکیٹ میں جگہ جگہ ہر شاپ میں کیمرے لگے ہیں مگر یہاں نہیں۔''

''اوپر تو سارے ہال میں لگے ہیں۔'' زبیدہ باجی نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''تو پھر اس کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ چوری کرنے والے کو معلوم ہے کہ اوپر کیمرے لگے ہیں نیچے نہیں.....'' میں نے فوراً کہا۔ ''اور یہی وجہ ہے کہ چور نے اس کا مکمل فائدہ اٹھایا۔''

''کہہ تو باجی آپ ٹھیک رہی ہیں۔'' سلیم نے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے شاید چور کو۔ موقع نہیں مل سکا کچھ باہر پہنچانے کا۔ بظاہر تو چوری نہیں لگتی۔''

''یعنی کہ کوشش کی گئی ہے چاہے اس بار ناکامی ہوئی تو اگلی بار تو کامیابی ہو سکتی ہے۔''

وہ چپ ہو گیا۔

اتنی دیر میں اوپر سے دیگر اسٹاف بھی آ گیا۔

فرزانہ نے یہ سب دیکھتے ہی کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ فالٹ دروازہ تبدیل کرواؤ اور کیمرے لگواؤ۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' فراز اور نسیم نے بھی تائید کی۔

میں اوپر آ گئی۔ میں نے درازیں کھول کے چیک کیں تو نچلی دراز میں ایک سیکیورٹی کیمرے والے کا کارڈ مل گیا۔ میں نے فوراً ہی فون کیا۔ جیسے ہی میں نے انہیں اسٹور کا نام بتایا وہ کہنے لگے۔ ''ہم نے ہی آپ کے ہاں سیکیورٹی سسٹم لگایا ہے۔ آپ فکر مت کریں ہم تھوڑی دیر میں وزٹ کر کے کیمرے لگا دیں گے۔''

''شکریہ۔'' میں نے گہری سانس لے کر فون بند کر دیا۔

پھر میں نے فراز کو بلوایا اور کہا کہ وہ فوراً ہی کسی لوہے کے گیٹ بنانے والے کے پاس جائے اور بہت مضبوط شٹر لگوائے تاکہ آج ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

چوری کا معاملہ ایسا ہوا تھا کہ کسی کو کچھ کہنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی اور شام تک سارا کام مکمل ہو گیا۔ ایک ڈیڑھ کنال پر پھیلی ہوئی بیسمنٹ نا صرف یہ کہ مکمل روشن ہو گئی تھی بلکہ اب اس کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں تھا جو کہ کیمرے کی زد سے باہر ہو۔

فرزانہ نے کہا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا جو کام برسوں میں نہیں ہو سکا وہ ایک دن میں کر ڈالا۔''

''اس کی صرف اتنی سی وجہ ہے کہ میرے اوپر ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جب ریاض صاحب واپس آئیں تو میں ان کے سامنے کسی وجہ سے شرمندہ دِکھوں۔''

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔'' شبنم نے فوراً جواب دیا۔

ریاض صاحب کا تقریباً تین بجے فون آیا کہ وہ ابھی سفر میں ہیں۔ کوئی خاص بات ہو تو اپنی سطح پر دیکھ لیا جائے۔

میں نے انہیں دورانِ سفر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

پہلے دن کی جو سیل ریاض صاحب کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی اس سے دو لاکھ تیس ہزار روپے زیادہ تھی۔ میں نے خاموشی سے لکھ کے رکھ لی۔

آئندہ تین چار دن بھی سیل کا ایوریج دو چار ہزار کے فرق سے ہی رہی جبکہ پچھلے پورے ماہ کی سیل اوسطاً چھ سے

ساڑھے چھ لاکھ کے درمیان ہی تھی۔

دوسری طرف میں نے بیسمنٹ میں آنے جانے کا راستہ مین سے کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اس قدم سے بیسمنٹ کے اسٹاف میں خاصی بددلی پھیل گئی ہے۔ خصوصاً زبیدہ باجی کافی پریشان سی تھیں لیکن انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

☆.....☆

اس واقعے کے چوتھے دن ریاض صاحب کا فون آیا کہ ان کی بیٹی کی بچی کا دورانِ ولادت انتقال ہو گیا ہے لہٰذا ابھی پندرہ دن تک وہ نہیں آسکتے۔

میں نے پوچھا۔ ''لیکن جو ادائیگی وغیرہ کرنی ہے وہ کس طرح ہوگی کیونکہ پارٹیاں پیسے مانگ رہی ہیں۔''

''اچھا.....'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسا کرو کہ جو سیل آرہی ہے اس میں سے کر دو، ویسے کیا سیل چل رہی ہے؟''

''وہی جو آپ کے سامنے تھی۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''چھ ساڑھے چھ لاکھ روپے روزانہ''۔

''کیا مطلب ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' انہوں نے بے ساختہ تیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب۔ آپ آکے دیکھ لیجئے گا۔ یا آپ کسی اور کو ذمے داری دے دیجیے۔'' میں نے اُسی اطمینان سے جواب دیا۔

وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔ ''نہیں میں تمہارے علاوہ کسی اور کو یہ ذمے داری نہیں سونپ سکتا۔ تم اطمینان سے کام کرو آکے بات کروں گا۔ اُمید ہے کہ تم سمجھ داری سے کام لوگی۔''

ان کا لہجہ بہت نرم اور ٹھنڈا تھا۔

''جی بہتر۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں لیکن مجھے ان کی اب کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جب آپ دوسرے کی چوری پکڑ لیتے ہیں تو پھر آپ کو اس پر اخلاقی برتری حاصل ہو جاتی ہے بشرطیکہ آپ خود چور نہ ہوں۔

☆.....☆

اس واقعے کے دو تین دن کے بعد مجھے فون آیا۔ میں مخاطب کو پہچان نہ سکی۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے سوال کیا۔

''میں مسعود نجمی بات کر رہا ہوں۔ ابھی تک مجھے اس ماہ کے پیسے نہیں پہنچے۔''

''سوری سر میں جان نہیں سکی کہ آپ کون اور کہاں سے بول رہے ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''ریاض کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ تب وہ کہنے لگے ''میں مسعود بات کر رہا ہوں اسٹور کا مالک۔ مجھے ابھی تک پیسے نہیں پہنچے ہیں۔''

''جی سر اگر آپ کہیں تو میں بھجوا دیتی ہوں۔ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیجیے۔''

''میں تمہارے موبائل پر اپنی بینک ڈیٹیل بھیجتا ہوں مجھے اپنا موبائل نمبر لکھواؤ۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے اپنا موبائل نمبر لکھوا دیا۔

''کیسا چل رہا ہے اسٹور؟'' انہوں نے پوچھا۔

دفعتاً مجھے یاد آگیا کہ اس اسٹور کے متعلق کہانیاں خسارے کی چل رہی ہیں۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا اور کہا۔ ''سر اسی طرح جیسے ریاض صاحب چلا رہے تھے۔ یہاں مہنگائی بہت زیادہ ہوگئی ہے لوگوں کی قوتِ خرید کم ہو رہی ہے۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اسٹور کو بیچ دوں۔''

''سر آپ بہتر سمجھتے ہیں لیکن اس وقت جب مارکیٹ ساری کی ساری ہی ٹھنڈی ہو تو کیا آپ کی منہ مانگی قیمت مل سکے گی؟''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''ریاض تو باقاعدگی سے طے شدہ رقم بھی نہیں بھیج رہا ہے۔''

''جی میں ابھی بھجواتی ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

مسعود صاحب نے فون بند کر دیا۔

دو چار منٹ بعد ہی ان کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات مل گئیں۔

تین ماہ سے ریاض صاحب نے مسعود نجمی کو ایک روپیا نہیں بھیجا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ کے اعتبار سے ان کے ساڑھے چار لاکھ روپے بقایا تھے جو دس دنوں کے بعد چھ لاکھ ہو جانے تھے۔

اس کا صاف صریح مطلب یہی تھا کہ ریاض صاحب جان بوجھ کر اسٹور کو تباہ کر کے اپنا گھر بھر رہے تھے۔ میں

بینک گئی اور میں نے دو ماہ کی رقم ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی۔ چند منٹ بعد ہی ان کا فون مجھے آ گیا۔

''شکریہ بیٹی۔'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے اس وقت پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔''

''کوئی بات نہیں آپ کو میں آیندہ ماہ کوشش کروں گی کہ بروقت پیسے بھجوا سکوں اور آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔''

''انشاء اللہ۔'' کہہ کر مسعود صاحب نے فون بند کردیا۔

مجھے حیرت ہوئی زرین پراچہ نے بتایا تھا کہ وہ دبئی میں بہت خوشحال زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کے انداز سے بالکل بھی ایسا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بہرکیف میں ان خیالات سے دامن چھڑا کے پارٹی سے میٹنگ کرنے کے لیے اٹھ گئی جو مین کاؤنٹر پر میرا انتظار کر رہی تھی۔

☆.....☆

''کیا بات ہے آج کل تمہارے پاس گھر کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہوتا۔'' امی نے مجھے دیر سے آنے پر کہا۔

''اپنی صحت کا خیال رکھو۔''

''امی آپ کو بتایا تو ہے کہ آج کل اسٹور کی ساری ذمے داری میرے اوپر ہے۔ ریاض صاحب دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔''

''زہرہ بیٹا برا مت ماننا۔ اتنا بڑا اسٹور ہے۔ لاکھوں کا لین دین ہوگا کسی مشکل میں نہ پھنس جانا یہ بڑے لوگ بس اپنا مطلب نکالتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں امی لیکن مطمئن رہیں آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' میں نے امی کو تسلی دی۔

''اللہ پاک ہر آزمائش سے بچائے۔'' امی نے کھانا لگاتے ہوئے کہا۔

''ابو نہیں آئے ابھی تک؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ابو بہن کے گھر گئے ہیں ان کی طبیعت خراب ہے کبھی وقت نکال کے پھپھو کو دیکھ آنا۔''

''جی بالکل۔'' میں نے جواب دیا اور کھانے کے لیے ہاتھ دھونے لگی۔

☆.....☆

ہفتے اور اتوار کے دن اکاؤنٹنٹ صاحب آتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اسٹور کے تمام مالی معاملات کی تفصیلی فائل مجھے دیں۔

وہ خاموشی سے مجھے فائل پکڑا گئے۔ غالباً ان کو بتا دیا گیا تھا کہ اب ذمہ داریاں میرے سپرد کردی گئی ہیں۔

میں نے اطمینان سے فائل کو دیکھا۔ میں کوئی اکاؤنٹنٹ تو نہیں تھی لیکن چند ہی منٹوں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ فائل دکھانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اتنے دنوں کام کر کے میں یہ تو سمجھ ہی گئی تھی کہ حسابات میں دو نمبری چلتی ہے۔

میں نے اکاؤنٹنٹ کو بلوایا اور بغیر کسی لیت و لعل کے سوال کیا ''اس کی اوریجنل فائل دیجیے۔ یہ تو فائل آپ نے دکھانے کے لیے بنائی ہوئی ہے۔''

''جی..... جی.....'' ان کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی غالباً انہیں مجھ سے دو ٹوک سوال کی اُمید نہیں تھی۔ ''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''بات صرف اتنی سی ہے کہ میں یہ چاہتی ہوں کہ اس ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں آپ کہیں غبن کے الزام میں نہ دھر لیے جائیں۔ جب مصیبت آتی ہے تو ہمیشہ کمزور ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اتنا تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ بیس دن سے جو اسٹور کی سیل ہو رہی ہے وہ کچھ اور کہہ رہی ہے۔ آپ کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ بیس دن سے کیش میں دیکھ رہی ہوں۔'' میرا لہجہ بہت سخت اور دو ٹوک تھا۔

''دیکھیے میڈم میں تو حسابات ویسے ہی بناؤں گا جیسا کہ مجھ سے ریاض صاحب کہیں گے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اب ریاض صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ بوکھلا گئے۔

''جو میں پوچھ رہی ہوں وہ بتایئے۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''میں تمام حسابات آپ کے سامنے رکھتا ہوں آپ بس میری نوکری کا خیال کیجیے گا۔ میری دو بیٹیاں ہیں مجھے ابھی ان کی شادی کرنی ہے۔'' ان کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے۔

یا اللہ..... انسان کو کتنا مجبور کر دیا ہے اس معاشرے نے۔ رسمیں نبھانے کے لیے۔ اگر خود سے بے ایمانی نہیں بھی کرنا چاہتے تو ہم سب مل کر اسے مجبور کر دیتے ہیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔''

وہ تھوڑی ہی دیر میں چھ سات فائلیں اٹھائے آ گئے اور اسٹور کا تمام لین دین مجھے سمجھانے لگے۔

کئی سالوں کا گھپلا تھا۔ عملاً اسٹور منافع میں تھا لیکن

کاغذات ثابت کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ہر ماہ ایک سے ڈیڑھ لاکھ کا خسارہ ہو رہا ہے۔

میں نے کئی گھنٹوں میں ان فائلوں کو سمجھا۔ اکاؤنٹنٹ صاحب جن کا نام امجد تھا، انہوں نے نہایت نرمی اور چابکدستی سے تمام معاملات سے مجھے آگاہ کیا۔

جب وہ جانے لگے تو بولے: "مس ایک بات کہوں آپ سے؟"

"جی فرمایئے۔"

"اگر مجھے نکالنا چاہیں تو ایک ماہ کا نوٹس دے دیجیے گا... تاکہ میں ملازمت ڈھونڈ سکوں۔" ان کے لہجے میں بڑی بے چارگی تھی۔

میں نے انہیں ایک نظر دیکھا اور کہا۔ "امجد صاحب خاطر جمع رکھئے۔ میں جب تک ہوں آپ کو میں یہاں سے نہیں نکالوں گی۔ میرا مقصد تو صرف حسابات کو سمجھنا تھا اور بس....."

انہوں نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دھیمے قدموں سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆

اسی اثناء میں پہلی تاریخ آ گئی۔ اسٹور میں خریداری اٹھائیس تاریخ سے ہی شروع ہو جاتی تھی کیونکہ اکثر سرکاری محکموں کی تنخواہیں اس تاریخ سے ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو پھر دس تاریخ تک چلتی ہیں۔

دو تاریخ تک اچھی خاصی سیل ہو گئی تھی۔ میں نے وعدے کے مطابق ڈیڑھ لاکھ روپے مسعود صاحب کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کے شکریے کا پیغام آ گیا۔

ابھی میں نے دوپہر کا لنچ ختم ہی کیا تھا کہ ریاض صاحب کا فون آ گیا: "کیا حال ہے سب کیسا چل رہا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے بس آپ کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اچھا۔ لگتا ہے بہت خوش ہو۔" انہوں نے مشکوک سے انداز میں کہا۔

"سیل اس ہفتے اچھی رہی ہے۔" میں نے انہیں بتایا۔ میں ان کی واپسی تک ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا ایسا کرو کہ میرے موبائل نمبر پر مجھے فوراً پچیس ہزار بھجوا دو۔ میری بیٹی کے آپریشن کے بعد بلیڈنگ رک نہیں رہی ہے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"میں ابھی بھجواتی ہوں۔"

"ہاں فوراً بھجوا دو۔ میں یہاں شاپ پر ہی موجود ہوں لیتا ہوا اسپتال چلا جاؤں گا۔" انہوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پہلے میں نے سوچا کہ میں فراز یا سلیم کے ہاتھ پیسے بھجوا دوں مگر پھر میں خود ہی اٹھی اور اسٹور کے برابر والی بلڈنگ میں ایزی پیسا شاپ سے انہیں پیسے بھجوا دیے۔ جو انہوں نے چند ہی منٹوں میں وصول کر لیے۔

ابتدائی دنوں کی وجہ سے کام کافی بڑھ چکا تھا۔ اسٹور کا ٹائم بارہ بجے تک تھا لیکن آف ہوتے ہوتے ایک بج جاتا تھا۔ مجھے ان دنوں ابو لینے آ جاتے تھے۔ کیونکہ ہم نے قسطوں پر موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ میں اسٹور کو لاک کروا کے ابو کے ساتھ گھر روانہ ہو گئی۔

راستے میں ابو کہنے لگے: "تم اتنی محنت کرتی ہو بس اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ مجھے اپنی بیٹی چاہیے اس کے پیسے نہیں۔" ان کے لہجے میں محبت تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بس اپنی دوائیں وقت پر لیتے رہیں۔" میں نے الٹا ان سے کہا۔

"تم نے تو بیٹا بن کے دکھا دیا۔ اب دوا میں کہاں ناغہ ہوتا ہے۔ نہ تمہاری ماں کے اور نہ میرے۔"

"یہ تو میری ذمے داری ہے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

ان ہی باتوں میں گھر آ گیا۔

☆.....☆

چار تاریخ کا دن تھا اور صبح تقریباً گیارہ بجے کا وقت۔ جب ایک دبلا پتلا اسمارٹ سا شخص جو سنہری بال کمانی کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ دستک دے کر میرے آفس میں داخل ہوا۔

میں اس وقت بل پڑھ رہی تھی جو ہیں تاریخ تک قابل ادائیگی تھے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"جی ضرور..... تشریف رکھئے۔" مجھے نجانے کیوں ان کی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ "بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"خدمت تو تم کر چکی ہو۔" تو وارد نے اطمینان سے کہا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ میں اٹھ

کھڑی ہوئی۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔

''مسعود صاحب آپ؟'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی بڑا تیز حافظہ ہے تمہارا۔'' انہوں نے کہا۔

''مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پہلے یہ بتایئے کہ آپ چائے یا کافی لیں گے۔ آپ نے ناشتا کیا؟'' میں نے کئی سوال ایک دم پوچھ لیے۔

''بس اچھی سی چائے پلوادو۔ اور ہاں دیکھو ابھی کسی سے میرا تذکرہ مت کرنا۔ سمجھیں۔''

''جی بہتر.....'' میں نے کہا۔

اسی وقت سامنے سے ریحانہ گزری۔ میں نے اسے چائے لانے کا کہا۔

''آپ یہاں آکر بیٹھیے۔'' میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کے انہیں کہا۔ ''یہ آپ کی جگہ ہے۔''

''میں تمہاری سعادت مندی سے خوش ہوا۔'' مسعود صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔ ''لیکن اب وہ کرسی تمہاری ہے۔''

میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔

''آپ مجھے اطلاع کر دیتے تو میں آپ کو لینے خود آ جاتی ایئرپورٹ پر۔'' میں نے کہا۔

''اچھا اب رسمی باتیں چھوڑو۔'' انہوں نے میری بات کاٹی۔ ''میں یہاں صرف دو دن کے لیے آیا ہوں اور وہ بھی ایک فیصلہ کرنے کے لیے۔ اور تم سے ملنے کے لیے۔''

''جی ضرور۔'' میں نے کہا۔ دل میں مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی چیز رک سی گئی ہو۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ انہیں اسٹور کے لیے کوئی اچھا گاہک مل گیا ہے اور وہ اب ڈیل فائنل کرنا چاہتے ہیں اور اسی کے لیے آئے ہیں۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' انہوں نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی۔ ''یہ ریحانہ ابھی تک چائے کیوں نہیں لائی؟''

''وہ تو آ جائے گی۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''ریاض ہمیشہ مجھے دس بیس ہزار کر کے پیسے بھیجتا تھا۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بچے دبئی سے امریکا شفٹ ہو گئے مگر میرا دل دبئی میں لگ گیا۔ اچھے دنوں میں، میں نے وہاں ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ اب اسی میں اکیلا رہتا ہوں۔''

''جی.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے تم سے پیسوں کا کہا تو تم نے فوراً ہی بھجوا دیے اور پھر ابھی بھی تم نے پیسے بھجوائے تو میں ..... سمجھا کہ تم ایک ذمے دار اور وعدہ پورا کرنے والی لڑکی ہو۔''

''جی شکریہ.....'' میں نے کہا۔

اسی دوران ریحانہ چائے اور بسکٹ لے کر اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔

اس کے جانے کے بعد مسعود صاحب نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''میں نے برسوں سے اسٹور کو ریاض کے سپرد کر رکھا ہے اور اس کے بار بار نقصان کے کہنے سے میں نے سوچا کہ اب اسٹور کو بیچ ہی دوں لیکن گزشتہ چند دنوں سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ.....''

انہوں نے چائے کا کپ اٹھا کے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ غالباً وہ تیز دم چائے پینے کے عادی تھے۔

میں خاموش رہی۔

وہ بولے۔ ''تو پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان جا کے دیکھوں کہ کیا چل رہا ہے۔''

''تو آپ کو ریٹ مناسب مل گیا۔'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ریٹ..... کون سا ریٹ؟'' انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر ہنس پڑے۔

مجھے خجالت سی محسوس ہوئی۔

''لڑکی تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا مطلب سر؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اسٹور کو بیچنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس کو قانونی طور پر تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔'' انہوں نے ایک چھوٹا سا بریف کیس جو وہ ساتھ لائے تھے۔ کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ''یہ پاور آف اٹارنی ہے جو میں تمہارے نام بنوا کر آیا ہوں۔ یہ پاکستان ایمبیسی سے تصدیق شدہ ہے اس لیے اس کی حیثیت یہاں بھی قانونی ہے۔ اس کی رو سے اب تم اسٹور کے تمام معاملات کی مالک و مختار ہو، جو چاہو کرو۔ جس کو چاہو رکھو اور نکالو۔'' انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''لیکن آپ کو میرا نام وغیرہ کیسے پتا چلا اور پھر.....''

میں چپ ہو گئی۔

''اور پھر کیا؟'' انہوں نے کہا۔

''آپ کو مجھ پر اتنا اعتبار کیسے آ گیا؟''

''بس آ گیا۔'' وہ ہنسے ''اور تمہاری اطلاع کے لیے

بتاؤں کہ تمہاری تمام تر تفصیلات فیس بک پیج پر موجود ہیں۔ نام، ولدیت اور تمہارے لیے ہوئے مارکیٹنگ کے سرٹیفکیٹس جو تم نے فیس بک پر لگائے ہوئے ہیں۔"

تم نے لکھا تھا کہ مجھے جاب مل گئی ہے جب میں نے اپنے اسٹور کے نام کو سرچ کیا تو مجھے تمہارا ابھی لنک مل گیا۔ یہ فیس بک کی دنیا بڑی چغل خور ہوتی ہے۔ یہاں ڈھونڈنے والے کو سب کچھ مل جاتا ہے۔"

وہ بات مکمل کر کے ہنسے۔

"تم چائے کیوں نہیں پی رہی؟" انہوں نے مجھے ٹوکا۔

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"پہلی بار مجھے بھی ایسی ہی حیرت ہوئی تھی جب مجھے جاب انٹرویو کے ساتھ ہی پہلی ملازمت کی خوشخبری ملی تھی۔" انہوں نے کہا۔ "کافی دیر تک یقین ہی نہیں آتا۔"

"میں کوشش کروں گی کہ آپ کے اعتماد پر پوری اتر سکوں۔"

"اگر تم نے چائے ختم کر لی ہے تو ذرا میرے ساتھ بینک تک چلو۔" انہوں نے کہا۔

"کون سے بینک؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"اسٹور کا جہاں اکاؤنٹ ہے بھئی۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"چلیے....." میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے آفس کا دروازہ لاک کیا اور ان کے ساتھ باہر آ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ بینک پہنچ گئے۔ وہ سیدھے منیجر کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں ان کے ساتھ ہی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو منیجر کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا۔

"ارے تم....." بینک منیجر تیزی سے اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ وہ ادھیڑ عمر کے فربہ اندام شخص تھے۔

ان کے باہمی تپاک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اچھی طرح ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

"ارے بھئی مسعود اب واپس بھی آ جاؤ۔"

"نہیں مجھے وہاں کی عادت پڑ گئی ہے رئیس۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں تمہارا ٹرانسفر نہ ہو گیا ہو۔"

"میں تو بس یہیں سے چپک گیا ہوں۔" رئیس صاحب نے ہنس کر کہا۔

"میں کچھ چیزیں تبدیل کروانا چاہتا ہوں۔" مسعود صاحب نے کہا۔ "ایک تو میں سائن تبدیل کرنا چاہتا ہوں میرا مطلب ہے اب میں چاہتا ہوں کہ اکاؤنٹ آپریٹنگ کے اختیارات تبدیل کروں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" رئیس صاحب نے کہا۔ "ابھی ہو جائے گا۔"

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

مسعود صاحب بولے۔ "یہ میری بھانجی ہے۔"

میں نے مسعود صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ رئیس صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اسٹور کے تمام معاملات کا اٹارنی اس کو مقرر کر دیا ہے۔ ایک تو اس کا ذاتی اکاؤنٹ بھی کھولو اور اب سائننگ اتھارٹی میں مکمل طور پر اس کو دے رہا ہوں۔ بلکہ اسٹور کی اور کاروبار کی تمام اتھارٹی قانونی طور پر اس کو منتقل کر دی ہے۔

"کیا آپ نے ریاض صاحب کو فارغ کر دیا ہے؟" رئیس صاحب نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ ان کے کچھ نجی معاملات تھے تاہم اس نے کئی برس میرا ساتھ دیا۔"

رئیس صاحب نے انٹرکام پر ایک صاحب کو بلایا اور کہا۔ "احسن جس طرح یہ صاحب کہیں ویسا ہی کر دو۔ ایک اکاؤنٹ بھی نیا ان مس کا اوپن کرو اور یہ تمام کام جلد سے جلد کر کے میرے پاس آؤ۔"

"جی بہتر۔"

میں اور مسعود صاحب اٹھ کر احسن کے کیبن میں آ گئے۔ اس کو میں نے اسٹور کا بتایا تو اس نے فوراً ہی تمام تفصیلات کو اوپن کر دیا۔ مسعود صاحب نے تمام تر امیم کروائیں اور ایک گھنٹے میں اٹارنی لیٹر کی موجودگی میں اسٹور کے تمام لین دین کی دستخطی میں ہو گئی۔

"میں کچھ فارم پُر کرتا ہوں آپ اس پر اپنے اے ٹی ایم کے لیے سائن کر دیجیے۔" احسن نے کہا اور کیبن سے باہر نکل گیا۔

"لڑکی اب تم مجھ بوڑھے کو بھول نہ جانا۔ بس ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو میرے پیسے بھیجتی رہنا اور چاہو تو کبھی کبھی زیادہ بھی....." اور وہ ہنسنے لگے۔

"سب کچھ تو آپ کا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو صرف نگراں ہوں۔"

"لڑکی باتوں سے دل موہ لینا تمہیں خوب آتا ہے۔"

وہ ہنسے۔

تھوڑی ہی دیر میں تمام کارروائی مکمل ہوگئی۔

اب اسٹور کے تمام معاملات کو جو بھی بینکنگ سے متعلقہ تھے میرے اختیار میں تھے۔ ہم واپس آ گئے۔

''کیا اب میں آپ کو اسٹور کا وزٹ کراؤں؟''

''ہاں بالکل۔'' انہوں نے کہا۔

میں ان کو اسٹور کے تینوں فلور دکھانے لگی۔ ہر سمت کی صفائی ستھرائی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ''یقیناً یہ تم نے کروائی ہوگی۔۔۔ تبدیلی۔''

''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''میں نے کئی بار ریاض کو کہا مگر اس نے کبھی کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔''

''جی بس ایسا ہی ہے۔''

''یہاں ایک خاتون ہوتی تھیں زبیدہ۔ کیا اب نہیں ہیں وہ؟''

''دو دن سے انہیں بخار تھا اس لیے نہیں آ رہی ہیں۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ چلیں تھوڑا آرام کرلیں۔'' میں نے کہا۔ ''لنچ میں کیا لیں گے؟''

''کچھ نہیں۔ ناشتہ اچھا خاصا کرلیا تھا اور پھر چائے بھی پی لی تھی۔۔۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں البتہ شام کا کھانا کھاؤں گا۔''

''ضرور۔۔۔!'' میں نے کہا۔

وہ اسی کمرے میں چلے گئے جہاں عارضی طور پر آرام کرنے کا انتظام تھا۔ میں نے شام پانچ بجے کے قریب چائے اور لائٹ اسنیکس ان کے لیے بھجوا دیے۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گئے اور اسٹور کی سرگرمیاں دیکھنے لگے۔ اسٹور کا سارا اسٹاف یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ میرے عزیز ہیں اور کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب میں نے کہا۔ ''اب تو آپ کو یقیناً بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''بالکل۔'' انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔

''تو پھر چلیں۔۔۔''

''کہاں کھانے کا پروگرام ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''امی ہاؤس۔''

''اچھا کوئی نیا ریسٹورنٹ ہے کیا؟ نام تو بڑا گھریلو سا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''چلو پھر۔''

میں نے ٹیکسی منگوائی اور ہم روانہ ہوگئے۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سو گئے۔ تھوڑی دیر میں ٹیکسی رکی تو میں نے انہیں اٹھایا۔

ٹیکسی میرے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

''یہ کون سا ریسٹورنٹ ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''امی ہاؤس..... میرا گھر.....''

''لڑکی تم بہت تیز ہو۔'' وہ ہنسے۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو فضا پلاؤ اور کباب کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

''زبردست خوشبو آ رہی ہے۔'' انہوں نے فضا میں ناک پھلا کے گہری سانس لی۔

میں نے دوپہر کو ہی امی سے کہہ دیا تھا کہ میرے باس آ رہے ہیں۔ وہ رات کا کھانا ہمارے ہی ساتھ کھائیں گے۔

گھر پر ابو بھی موجود تھے۔ تینوں چھوٹے بہن بھائی بھی تھے۔ مسعود صاحب جلد ہی سب سے بے تکلف ہوگئے اور بہت اچھی گفتگو کے دوران کھانا چلتا رہا۔

''آج بہت دنوں کے بعد ایسا کھانا کھایا ہے کہ گھر کی یاد آ گئی۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

ان کے انداز میں ہنسی تھی لیکن آنکھیں اداس تھیں۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر انہوں نے امی ابو کو بتایا کہ قانونی طور پر مجھے اپنے اسٹور کے تمام معاملات کا ذمے دار بنا دیا ہے اور اسٹور کو چلانا زہرہ کی ذمے داری ہے۔ ابو اور امی خاموش رہے۔ بس ابو نے اتنا کہا۔ ''خدا کرے کہ یہ ہر آزمائش میں پوری اترے۔ ذمے داری سے بڑھ کر بھلا آزمائش کون سی ہوتی ہے۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' مسعود صاحب نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے ہوٹل چلے گئے اور بولے میں کل بارہ بجے تک آؤں گا اگر کوئی مسئلہ ہے تو اس کو ڈسکس کرلینا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ تینوں بچوں کو ایک ایک ہزار روپے دے کر بولے۔ ''بھئی مجھے کیا پتا تھا کہ یہ لڑکی مجھے اپنے گھر لے آئے گی ورنہ میں خالی ہاتھ نہیں آتا۔''

وہ خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

امی اور ابو خوش تو تھے لیکن فکر مند بھی بہت تھے۔ میں نے انہیں اٹارنی لیٹر دکھایا جو مسعود صاحب مجھے دے گئے تھے۔

ابا کو بحیثیت کلریکل اسٹاف ان سب چیزوں کا بہت تجربہ تھا۔ انہوں نے پڑھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔

''کیا لکھا ہے اس میں؟'' میں نے ان کے تاثرات بھانپے۔

''اس میں تو تمہیں اسٹور کے خرید و فروخت، کرائے پر دینے، اس پر قرضہ لینے، رہن رکھنے الغرض ہر قسم کے قانونی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں بیٹا یہ تو بہت بڑا کام ہے۔''

''مجھے تو خود حیرت ہوئی کہ انہوں نے مجھ پر اتنا اعتبار کیسے کر لیا۔''

میں اسی ادھڑ بن میں سو گئی۔

☆.....☆

صبح حسب معمول جلدی میری آنکھ کھل گئی۔ آج مجھے بہت سے اہم فیصلے کرنے تھے۔ میں تیار ہو کر اسٹور پہنچی تو میں نے اپنے ذہن میں لائحہ عمل بنا لیا تھا۔

میرے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی فروزن آئٹم کی سپلائی آ گئی۔ میں نے فراز سے کہا۔ ''اب کوئی بھی مال اتروانے سے پہلے پارٹی کو میرے پاس لانا۔''

''خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ فروزن والے کو لے کر میرے پاس آ گیا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام اختر ہے میں کافی دنوں سے کیا کئی سال سے یہاں مال دے رہا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''کوئی شکایت ہے آپ کی؟''

''ہاں ہم آپ کا مال بند کر رہے ہیں۔''

''کیا.....؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''خیریت کیا شکایت ہے میڈم آپ کو؟''

''آپ دیگر اسٹورز کو جو آئٹم سپلائی کر رہے ہیں اس میں ریفریجریٹر بھی آپ کا ہے۔ جگہ کا کرایہ بھی دے رہے ہیں۔ بجلی کا بل بھی دے رہے ہیں۔ کیونکہ آپ نے ہمارے ساتھ فرق رکھا ہے اس لیے میں اس کی جگہ دوسری کمپنی کا مال رکھوں گی۔''

''لیکن ریاض صاحب تو بس دو ہزار روپے ماہانہ لیتے تھے۔'' اختر نے کہا۔

''ریاض صاحب کو بھول جائیں۔ اگر آپ کو منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ پندرہ دن کے بعد اپنا حساب لے جائیں۔'' میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ''اب آپ جا سکتے ہیں۔''

میں نے حساب لگایا فروزن آئٹم کے مختلف کمپنیوں کے ہمارے ہاں چودہ فریزر اور چلرز تھے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اب کمپنیاں اپنا سیلز مین، جگہ کا کرایہ اور بجلی کا بل بھی پے کرتی ہیں۔ اس سارے معاملے میں مجھے گائیڈ کرنے والا سفیر احمد تھا۔

وہ فروزن والا رخصت ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مسعود صاحب بھی آ گئے۔ ابھی وہ آ کر بیٹھے ہی تھے کہ نیچے سے زبیدہ آ گئی۔ وہ ان کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کیسی ہو زبیدہ؟'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

مسعود صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ زبیدہ بہت اچھی ہے اور زبیدہ اب اسٹور کے تمام معاملات ان کے سپرد ہیں۔ ریاض کو میں نے نکال دیا ہے۔''

''جی ..... اچھا .....'' زبیدہ نے آہستہ سے کہا اور سلام کر کے نیچے چلی گئی۔

وہ تھوڑی دیر ہی بیٹھے پھر بولے۔ ''میں جا رہا ہوں۔ سات بجے کی میری فلائٹ ہے۔ تم کوئی بھی مسئلہ ہو بلا جھجک فون کر لینا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں خاموش انہیں دیکھتی رہی۔

''لڑکی کیا ہوا تمہیں؟'' انہوں نے میرے سر پر چپت لگائی۔

''ایک بات پوچھوں سر؟''

''کیا؟''

''زریں پراچہ آپ کی کون ہیں؟''

''کیا؟'' انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا ''اس نے تمہیں کیا بتایا؟''

''کچھ نہیں .....'' میں نے سچائی سے کہا۔

''لڑکی جب اس نے نہیں بتایا تو میں کیا بتاؤں۔ اگر وہ کبھی ملے تو اس سے پوچھ لینا اگر وہ مناسب سمجھے گی تو بتا دے گی۔''

مسعود صاحب یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے زینے اترتے چلے گئے۔

☆☆

دو ہفتوں میں ہی اسٹور کی شکل بدل گئی۔ تمام کمرشل کمپنیوں سے میں نے نئے اگریمنٹ کیے۔ ڈسپلے کا بھی کرایہ چارج کیا۔ کوئی مشروب ساز کمپنی، چائے والے، کوئی ایسا نہیں تھا جو کہ ہماری شرائط پر کام نہ کر رہا ہو۔

اسٹور کا بجلی کا بل اور ٹیکسز ہم نے پہلے پینتالیس دنوں میں ہی فری کر لیے اور اس کے علاوہ ہر کمپنی کے خوش شکل خوش مزاج سیلز بوائے اور سیلز گرلز اسٹور کی رونق بڑھا رہے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے تمام اسٹاف کے لیے بہت خوبصورت وردی سلوائی جس میں سوائے فرنٹ میں پنسل لگانے کے کوئی اور جیب نہیں تھی۔ ہر ایک کو چار چار سوٹ دیے گئے۔

سب نے اس یونیفارم کو بہت پسند کیا۔ صرف زبیدہ باجی نے کہا۔ ''اس بہانے تم نے جیبیں ختم کر دیں۔''

''باجی آپ تو بہت سمجھ دار ہیں۔'' میں نے کہا۔

زبیدہ پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگی۔

اسٹور کی سیل میں اضافہ ہونے لگا۔ ہر شے کی ڈسپلے میں قرینہ اور سلیقہ تھا۔ تینوں فلور اے سی ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کسٹمرز ایزی محسوس کرتے تھے۔ پھر میں نے دو تین بینکوں کی کریڈٹ مشینیں بھی لے لی تھیں جن کی وجہ سے گاہکوں کو بذریعہ کریڈٹ کارڈ پیمنٹس کرنے میں آسانی ہو گئی تھی اور سب سے بڑھ کر ہم کارڈز کی ٹرانزیکشن پر دو پرسنٹ بھی نہیں لیتے تھے۔

میں دفتر میں صرف ضرورت کے وقت ہی بیٹھتی تھی ورنہ زیادہ تر مختلف فلور پر ہی ہوتی تھی۔ بہت دنوں کے بعد اچانک مجھے وہ مانوس چہرہ دکھائی دیا۔

''مسز زریں پراچہ۔'' میں ان کے پاس جا کے کھڑی ہو گئی۔

''لڑکی تمہاری یادداشت بہت تیز ہے۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''لڑکی میں بہت مصروف ہوں۔'' انہوں نے عذر تراشنے کی کوشش کی۔ ''مجھے کچھ سامان خریدنا ہے۔''

''سب لے لیجیے گا۔ بس مجھے چند منٹ دے دیجیے۔''

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور انہیں دفتر لے آئی۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''اب آپ اتنی بھی انجان نہ بنیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''مجھے بتائیں کہ یہ آپ نے کیوں اور کیسے کیا؟''

''کیا مطلب۔ کیا اور کیسے کیا؟'' انہوں نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ اسٹور بک رہا ہے۔ یہاں کے حالات کیا ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''دیکھو تم اچھی لڑکی ہو۔ میں نے تو تمہاری مدد کی کیونکہ تم اس قابل ہو۔ تم نے ثابت کر دیا۔''

''اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن مجھے بھی کچھ تفصیل تو بتائیں۔''

''بھئی میں نے مسعود کو کہا کہ یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ اگر تم اپنے بڑھاپے کی میراث کو بچانا چاہتے ہو تو ریاض کی جگہ اس لڑکی کو دے دو۔''

''تو مسعود صاحب پاکستان میں کیوں نہیں رہتے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ قسمت بعض اوقات امتحان لیتی ہے۔ مسعود بہت اچھے انسان ہیں۔ بس ان کی ازدواجی زندگی طوفان کی نذر ہو گئی۔ ان کے تین بچے تھے۔ اچھی خاصی عمر کے کہ ان کی بیگم نے اپنی بچپن کی محبت کے چکر میں آ کر ان سے طلاق لے لی۔ مسعود کا دل ٹوٹ گیا اور وہ یہاں سے اپنے بچوں کو لے کر چلے گئے۔ بس چند لفظوں کی کہانی ہے۔'' اچانک وہ ہنسنے لگیں۔ پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''لڑکی تم بے وجہ کی باتوں میں مجھے الجھا رہی ہو۔''

''مگر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مسعود صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ ''آپ کے کہنے پر انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔'' زریں پراچہ نے کہا۔ ''بس دل کے معاملات پر بہت سوچ سمجھ کر عمل کرنا۔ یہ مسعود ہمیشہ سے ہی ایسا ہی ہے۔ پتا نہیں کیوں کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ ضد نہیں کرتا۔ غصہ نہیں کرتا۔''

وہ اٹھ کر باہر جانے لگیں۔

میں خاموش کھڑی رہی۔

وہ پلٹ کر بولیں۔ ''لڑکی شاید تم اب بھی نہ سمجھ سکیں۔ مسعود میرے سابق شوہر تھے۔'' وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔